
July 2014

ابتدائیہ

متفرق کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی، پرنٹر جمیل حسن، مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

مغرب سے انتخاب

سلسلے وار ناول

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتہ: "آنچل" پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 کے زیر مطبوعات سے آنچل پبلیکیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

معاشرتی برائیوں میں ہر شخص مجرم ہوتا ہے!

پاکستان کو قائم ہوئے تقریباً 67 سال ہونے کو آئے۔ وطن عزیز اسلام کے نام لیواؤں کے لیے اسلام کے نام پر بنا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم مسلمان کہلائے جانے والے، پاکستانی ہونے کے ناتے سے اپنے معاشرے کو ایک مثالی معاشرہ بنا لیتے جس کی تعلیم اسلام نے بھی دی ہے اسلام بذات خود ایک تہذیب ایک تمدن ہے۔ لیکن ہم نے سب کچھ پیچھے چھوڑ دیا ہے، ہم کہیں اور کسی اور ہی طرف نکل پڑے ہیں ہمارا اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ ہم نہ تیتر رہے نہ ہی بٹیر۔ میرے سامنے اخبارات کئی پڑے ہیں جن میں متعدد حادثات و سانحات کی تصاویر نمایاں ہیں، کہیں کوئی نوجوان لہولہان ہے تو کہیں کوئی ماں، کوئی بہن، اپنے پیاروں کی لاشوں پر نوحہ کناں ہے۔ ہر روز دو چار قتل ہو جانا بم دھما کا ہو جانا اب معمول کی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ خون انسان ارزاں ہو کر رہ گیا ہے۔ معاشرے میں بے حسی نے جنم لے لیا ہے۔

ہمیں سوچنا سمجھنا چاہیے کہ جب ایک فرد پیدا ہوتا ہے تو دراصل ایک خاندان جنم لیتا ہے۔ خاندان مل کر ہی شہروں کو آباد کرتے ہیں اور شہروں سے ایک معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کی بقا و استحکام کے لیے حسن اخلاق، مروت، محبت، تعلقات باہمی، امداد باہمی، ایثار اور قربانی اور آداب زندگی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ تمام ضروریات مذہب فراہم کرتا ہے۔ یوں تو سارے ہی مذاہب انسانی زندگی کو سنوارنے کا کام انجام دیتے ہیں لیکن تمام مذاہب کا اگر تقابل کیا جائے تو اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو روشن کرنے کا کام سرانجام دیتا ہے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات نہ صرف دین کو مکمل کرتی ہیں بلکہ انسانی زندگی کو اعلیٰ و ارفع اقدار سے مزین بھی کرتی ہیں۔

اسلامی معاشرے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کے ذریعے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے ذریعے جو اصول مرتب کر دیے ہیں وہ رہتی دنیا تک قائم رہنے والے اور کارآمد اصول ہیں۔ ان سے اگر کوئی معاشرہ انحراف کرتا ہے تو وہ معاشرہ انتشار، بے چینی اور بدامنی کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ اخلاقی گراوٹوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اسلام کی تعلیمات کا ایک اہم عنصر بچوں، عورتوں، بزرگوں کی حفاظت کرنا اور حالت امن قائم کرنا اور ان سب سے محبت و مروت کے سلوک کی تعلیم دیتا ہے اور جنگ میں ان کی حفاظت کی ذمہ داری دیتا ہے دنیا کا کوئی بھی مذہب اپنے بچوں، بڑوں اور عورتوں کی حفاظت اس طرح کرنے کو نہیں کہتا جس طرح اسلام کہتا ہے کسی بھی معاشرے کو پرکھنے کے لیے جانچنے کے لیے اس معاشرے کی عورتوں، بچوں اور بزرگوں کو تحفظ حاصل ہے۔ نہ ہی بزرگ قابل احترام سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے اعصاب پر بے حسی طاری ہو چکی ہے ہم تو جانوروں سے بھی بدتر معاشرے تشکیل دے رہے ہیں۔ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں

آج سڑکوں پر جب کوئی قاتل کسی بھی طرح کسی انسانی جان کو قتل کر دیتا ہے تو ہم ہجوم تو لگا لیتے ہیں لیکن اس ہجوم میں سے کوئی جرأت نہیں کرتا کہ مقتول کی کوئی مدد کرے اس کی جان بچانے کی کوشش کرے یا قاتل کو ہی پکڑنے کی کوشش کرے کیونکہ قاتل کو پکڑنے میں خود اپنی جان کو خطرہ ہوتا ہے اور مقتول کی مدد کرنے میں پولیس کی کارروائیوں میں الجھنے کا خوف راستا روک دیتا ہے ہاں تماش بینی ضرور کر لی جاتی ہے۔

اخبارات کے اس ڈھیر میں میرے سامنے ایک ماں اپنے بیٹے کے لاش پر نوحہ کناں نہیں ہے بلکہ وہ فرط غم سے بے ہوش پڑی ہے بے حس اور تماش بین چاروں طرف کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ معاشرتی طور پر ہم میں بے حسی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ وطن عزیز میں انسانی جانوں کی اب کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے ہر روز سڑکوں پر گھروں میں بے دردی سے ہلاکتیں ہو رہی ہیں کوئی پرسان حال نہیں اب تو مذہبی جلوسوں، جلسوں میں بھی اجتماعی ہلاکتیں ہو رہی ہیں حکمران صرف تعزیتی بیان دے کر اور اپنا آہنی ہاتھ استعمال کرنے کے بیان تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں اب انسانی جان کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی بچہ مرے یا جوان وہ اب آبادی کم ہونے کا ذریعہ بن گیا ہے۔ (پیدا ہونے کے بعد یا پیدا ہونے سے پہلے) ہر صورت اب انسانی آبادی پر بوجھ بن رہا ہے جب ہماری سوچیں ہی منفی ہو جائیں تو بے حسی تو اللہ کے عذاب کی مانند ہم پر نازل ہونا ہی ہے۔ جب کوئی معاشرہ ہر قسم کی اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو چکا ہو تو اس معاشرے میں سب سے زیادہ ارزاں اور بے کار شے انسانی زندگی ہو جاتی ہے لیکن بچوں کی حفاظت نہ کرنا ان کی زندگیوں کو نہ بچانا تو کھلی شیطانیت سے بھی آگے کی چیز ہے کیونکہ شیطان بھی بچوں کو نہیں تنگ کرتا۔

آج ہمارا یہ مزاج بن چکا ہے کہ اپنی ہر غلطی ہر قصور ہر برائی حکومت وقت پر ڈال دیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں اس طرح ہم اپنی کوتاہیوں کی پردہ پوشی کی مذموم کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہم سب بطور محب وطن ایک مسلم معاشرے کی تشکیل پر کمر کس لیں تو وطن عزیز سے ہر برائی ہر خرابی ہر ظلم و ستم نہ صرف دور ہو جائے گا بلکہ ایک مثالی معاشرہ از خود پھلتا پھولتا جائے گا۔ ہمارے معاشرے کی خرابیاں ہمارے گھروں سے شروع ہوتی ہیں جس طرح نیکی گھر سے شروع ہوتی ہے اسی طرح بدی بھی گھر سے ہی شروع ہوتی ہے گھر میں ہی تربیت پاتی ہے اگر مائیں اپنی اولادوں کو بیرونی معاشرے کی طرف نہ دھکیلیں کسی حرص ہوس میں نہ مبتلا ہوں اور اپنی مذہبی اسلامی تعلیمات، اسلامی اقدار کے اخوت کا سبق بچوں کو دے کر معاشرے کے سپرد کریں تو یہ ناممکن ہی ہوگا کہ کوئی ماں اپنے لخت جگر کے لاشے کو دیکھ کر بے ہوش ہو جائے یا نوحہ کرتی ہو۔ اگر ہم یہ بات سمجھ لیں کہ معاشرتی برائی میں ہر شخص مجرم ہوتا ہے جس نے برائی کی وہ بھی جس نے برائی میں معاونت کی وہ بھی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے وطن عزیز کی حفاظت فرمائے آمین۔

گفتگو

عمران احمد

"حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی سب کے سب جہنم میں جائیں گے سوائے ایک امت کے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا یارسول اللہ! وہ کون سی امت ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔" (الترمذی، ابوداؤد، احمد)

عزیزان محترم ..... سلامت باشد۔

چلچلاتی دھوپ آگ برساتے سورج کی تپش کو قدرے کم کرنے کے لیے نئے افق حاضر مطالعہ ہے۔

ملک خصوصاً ہمارا کراچی ایک بار پھر دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ کراچی ائرپورٹ جس کا شمار انتہائی اہم اور حساس تنصیبات میں ہوتا ہے جہاں ایک عام شہری اگر غلطی سے ماچس بھی لے جائے تو اسے نجانے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی ائرپورٹ پر انتہائی جدید ہتھیاروں سے لیس دس سے زائد دہشت گرد جو خودکش جیکٹس بھی پہنے ہوئے تھے "سلیمانی ٹوپیاں" پہن کر داخل ہوئے اور انہوں نے ائرپورٹ کے ایک حصہ پر قبضہ کر کے درجنوں افراد کی جان لے لی اور وطن عزیز کو کروڑوں روپے کا نقصان بھی پہنچایا اس سے چند گھنٹے قبل بلوچستان کے علاقہ تفتان میں زائرین کی بس پر حملہ کر کے پچیس سے زائد افراد کی زندگیوں کے چراغ بھی بجھا دیے گئے۔ میڈیا نے اسے بھارتی ایجنسی "را" کی کارروائی قرار دیا لیکن اس کی آشا کا راگ الاپنے والے حکمران اور خاموش رہی میڈیا کا الزام اپنی جگہ درست سہی لیکن بیرونی قوتیں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک انہیں اندر سے مدد نہ ملے۔ اس موقع پر ایک پرانی کہاوت یاد آ رہی ہے جنگل میں رہنے والے ایک لوہار نے محنت شاقہ کے بعد ایک کلہاڑا بنایا تو جنگل کے تمام چھوٹے بڑے درخت سہم گئے انہوں نے ایک قدیم اور بوڑھے درخت سے خدشات کا اظہار کیا تو اس نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا کہ فکر نہ کرو اگر حضرت انسان ایسے دس کلہاڑے تیار کر لے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ ہم میں اتحاد ہے اور ہم میں سے کوئی اس کا مددگار نہیں۔ کچھ عرصہ بعد اس لوہار نے اس کلہاڑے میں لکڑی کا دستہ لگا دیا تب بوڑھے درخت نے کہا کہ اب یہ ہماری موت ہے کیونکہ ہم میں سے کوئی اس کا مددگار بن گیا ہے سو دشمن چاہے کتنی سازشیں کر لے لیکن وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک ہم میں سے کوئی اس کا ساتھی نہ ہو۔ کیا یہ دہشت گرد ہم میں سے کسی کی مدد کے بغیر مہران بیس، کراچی ائرپورٹ یا جی ایچ کیو میں داخل ہو سکتے تھے؟ اپنی مصروفیات میں سے فرصت کی چند گھڑیاں کشید کر کے اس پہلو پر بھی سوچیے اپنے اندر چھپے دشمنوں کو تلاش کیجیے جو چاہے اور جانیے کون اس شاخ کو اور کیوں کاٹ رہا ہے۔

ستمبر کا نئے افق پراسرار کہانی نمبر ہوگا جبکہ 290 صفحات قیمت 50 روپے ہوگی۔ تمام قارئین سے التماس ہے کہ وہ اس حوالے سے اپنی کہانیاں یا اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات جلد سے جلد ارسال کر دیں۔ قارئین مختصر واقعات کو شن کے لیے بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ ادارہ ہر تین ماہ بعد ایک نمبر شائع کرے گا قارئین اس سلسلے میں اپنی آراء سے ادارہ کو آگاہ کریں کہ کن کن سے موضوعات پر نمبر آنے چاہیے۔

ریحانہ سعیدہ ..... لاہور۔ محترمی عمران صاحب آداب امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے تمام اہالیان کراچی شام میں سمندر کی نم آلود ہواؤں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے جبکہ ہم پنجابی تو آج کل گرم ہواؤں سے

جھلس رہے ہیں تاہم جب رحمت خداوندی جوش میں آتی ہے تو ہم بھی گرم موسم میں اچھے موسم کا لطف اٹھا لیتے ہیں تو جناب اس گرم موسم میں جب نئے افق ہاتھ میں آیا تو دل کا موسم بدل گیا میر صاحب کی آنکھوں کی مستی کے بارے میں تو پڑھا تھا پر آنکھوں میں اگا یہ جنگل پہلی دفعہ دیکھا تھا تاہم یہ بات واضح ہوئی کہ ہر انسان دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے پھر جناب تبصرے پڑھے۔ محترم محمد بخش صابر نے بیٹے کی شادی کر دی اور بیٹیوں کو نہ مٹھائی کھلائی اور نہ بد ہضمی بہر حال بھیا جی کو شادی مبارک ہو۔ ریاض صاحب تبصرے کی پسندیدگی پر شکریہ۔ شاعری پر تبصرہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ یہ ذاتی واردات ہوتی ہے تاہم لفظوں کے ہیر پھیر اور طرح مصرعے کے حوالے سے میں ابھی اتنی ماہر نہیں کہ دوسروں پر تنقید کر سکوں عمر اسرار صاحب یہ کام بخوبی کر رہے ہیں۔ ابن مقبول صاحب آپ جتنے اچھے خود ہیں ویسے اچھے انداز میں آپ تبصرہ بھی لکھتے ہیں اشفاق احمد کا کہنا تھا کہ اتنا میں نے کتابوں سے نہیں سیکھا جتنا میں شاہ پور کے راستے میں بیٹھنے والے موچی سے سیکھا۔ صرف کتابیں نہیں بلکہ تجربہ بھی بہت کچھ سکھاتا ہے اور آپ تو خود ایک کتاب ہیں یہ بات میں نے عمر صاحب کے لیے لکھی تھی۔ ساحل صاحب دل سنبھال کر رکھیں آج میری نظم نے دل مٹھی میں لے لیا کل کوئی چرا بھی سکتا ہے۔ اب ہو جائے کہانیوں پر تبصرہ۔ ارشد صاحب کی کہانی کا آغاز اچھا ہے مزہ آیا پڑھ کے محمد ندیم کی چالاک لومڑی اور آغاز صاحب کی غیر متوقع مختصر مگر دلچسپ تھیں۔ سید بدر کی آتش زیر پا امجد صاحب کی قلندر ذات تسنیم صاحب کی جگت سنگھ اچھی جا رہی ہیں۔ جلیل صاحب کی کہانی بار بار ہونے کے باوجود دلچسپ نہ تھی۔ آپ کی عذاب آگہی انگلش ادب کی ایک کہانی کا ترجمہ ہے اور انڈیا کا ڈراما تھا سو مزہ نہیں آیا۔ ریاض حسین کی ہندو وزن بورڈی دھوکے باز بھی کچھ خاص نہیں تھی ریاض بٹ کی کہانی حسب معمول چونکا دینے والی تھی اب اجازت کیونکہ تبصرہ لمبا ہو گیا ہے۔ نیک دعاؤں اور تمناؤں کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں اللہ حافظ۔

عالیہ انعام الٰہی ...... کراچی

محترم عمران بھائی السلام علیکم آپ کی خیریت کی طالب اور ترقی و کامرانی کے لیے دست بہ دعا پھر حاضر خدمت ہوں۔ نئے افق سے میری محبت بہت پرانی ہے اور بہت ہی پختہ بھی کہ سوائے اس کے کسی اور کی جانب نظر اٹھا کر دیکھنے کا دل ہی نہیں کرتا۔ تبصرہ میں نے حاضری دینے کی پابندی قائم رکھی مگر اب کافی عرصہ سے یہ تسلسل ختم ہوتا جا رہا ہے کہ زندگی سے فرصت و فراغت ذمہ داریوں کے ہاتھوں رخصت ہو چکی ہے۔ اب قلم بے گانہ سا لگتا ہے جملے بے ربط ہونے لگے ہیں اور کہانی تو ماشاءاللہ کبھی کہ ٹکڑے دکھائی دینے لگی ہے۔ خیر جیسے تیسے اس ماہ کوشش کر کے حاضری لگا رہی ہوں۔ جون کا شمارہ تو لگتا ہے کہ کرچی کرچی نگاہوں رکھتا ہے یا پھر یہ وقت کی آنکھ ہے جو دیکھ رہی ہے اس جہاں سے رخصت ہوتی ہوئی رعنائی کو اجڑے ہوئے در و بام، ہر کونپل سے محروم شد و مند درختوں کی عریانی فضا میں ٹھہرا ہوا سناٹا کھنڈر ہوتی ہوئی زندگی، انسانی رویوں کے ہاتھوں اس دنیا کی خوب صورتی تو ویسے ہی معدوم ہو چکی ہے۔ انسان کی ناعاقبت اندیشی خدا نہ کرے کہ ہمیں وہ وقت دکھائے کہ جب سبز زمین کسی انجانے سیارے کی صورت اختیار کر جائے اور بے رونقی اس کا مقدر بن جائے۔ ملکی پس منظر میں انکل مشتاق کے تجزیے انتہائی درست اور پر مغز ہوتے ہیں۔ جنہیں ہر صاحب دل اور حساس دل اپنا ترجمان قرار دے سکتا ہے۔ گفتگو کی محفل حسب دستور رونقوں کا مجموعہ تھی۔ تارا کا تبصرہ مختصر رہا بخش انکل کو اللہ جلد از جلد صحت عطا فرمائے آمین۔ انکل چھوٹے بھائی کی شادی بہت بہت مبارک ہو۔ تعلیمین سے کہیے گا کہ اچھا کیا جو ہمیں بھلا دیا اللہ آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں اور رونقیں عطا فرمائے آمین۔ عمر فاروق کا تبصرہ رسالے پر کافی دلکش اور خوب تھا مگر شہزی کے لیے کیا گیا ان کا تبصرہ بہت برا معلوم ہوا۔ بھائی اچھی اچھی خیال آرائیاں کیا کرو، اللہ کرے جو شہزی کو سمجھ ہو۔ عبداللہ شاہد، شہناز آپی، ریاض بٹ، عبدالمالک کیف اور بہت سے نام جو اس وقت یاد نہیں آرہے مگر غیر حاضر ہیں تو جلدی جلدی اپنی خیریت سے مطلع فرمائیں اقرا کا سلسلہ نا صرف معلومات کا خزانہ ہی ثابت ہو رہا ہے بلکہ ہمیں راہ راست دکھانے کا ہنر بھی آزما رہا ہے۔ ارشد علی ارشد کی "دیدبان" ایک دکھ سے اشاک کی تحریر ثابت ہوئی جس میں اتنا

پردازی کے لطف کو سمونے کی کوشش بھی انتہائی شاندار طریقے سے کی گئی ملک دشمن عناصر کا بھیانک چہرہ قلم کے زور پر بے نقاب کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ پراسراریت کے لبادے میں ملفوف کر کے اس تحریر کو نئے آہنگ سے ہمکنار کر دیا گیا ہے۔ بہت سے جذبوں کو ابھارتی بہت سے سوال کھڑا کرتی ہوئی یہ نامکمل تحریر حقیقتاً مکمل اور خوب صورت ثابت ہوئی۔ محمد ندیم کی ''چالاک لومڑی'' پہلے پڑھا اور سیر پہ سوا سیر کا دلکش نمونہ تھی۔ جبھی کہتے ہیں کہ عقل بڑی ہوتی ہے جس کا درست استعمال ہی اصل میں کامیابی کا ضامن ٹھہرتا ہے۔ ''غیر مترقبہ'' ایک فارسی تحریر کا ترجمہ جسے ہمارے ماحول میں ڈھالنے اور ہمارے مزاج کے مطابق رنگ دینے میں جو محنت کی گئی وہ قابل آفرین قرار پائی۔ بچپن میں دہرائے جانے والے دلدوز واقعات انسانی ذہن کو جس ابتری کا شکار کر دیتے ہیں اس کا تجربہ تو مجھے بھی ہے۔ ہمارے امی ابو کی شادی سے پہلے ہمارے چچا کے پہاڑی میں ڈوب کر ہلاک ہونے کے واقعہ کو بچپن میں اتنا سنا کہ دہشت کا یہ عالم رہا کہ میں لبالب بھری ہوئی پانی کی بالٹی میں بھی جھانک لیتی تھی تو میرا سانس رکنے لگتا تھا اب تو خیر اپنی اس کمزوری پر قابو پا چکی ہوں کہ صبح شام پانی کا ٹینک کھول کر چیک کرنا کہ پانی آ رہا ہے کہ نہیں اب میری ہی ذمہ داری بن چکا ہے۔ رضا اور نیلوفر کے درمیان دوری ڈالنے والے ایک واقعہ کو ایک دوسرے واقعہ نے جس طرح کاٹ ڈالا وہ بہت پسند آیا۔ حالات واقعی انسانی زندگی پر بہت شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتے ہیں۔ خان شفیق کی ''پہلی غلطی'' بلاشبہ معیاری ادب میں شامل کیے جانے کے لائق تحریر تھی۔ دل کو غم کی آنچ دیتی ہوئی یہ احساسات سے لبریز سادہ سی تحریر انتہائی اداس کر دینے والی تھی۔ اس تحریر کی اثر انگیزی اس کے واقعات میں نہیں بلکہ واقعات کے بیان میں پنہاں تھی کہ جہاں لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے والے قلب کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ خلیل جبار کی ''آسیبی کارخانہ'' بھی کافی اچھی لگی اسرار سے بھرپور قصے سننا ویسے بھی اچھا معلوم دیتا ہے بے شک ان کی کہانیوں کی تمام تر جزئیات ابتدا اور اختتام ایک سا جیسا ہوتا ہے مگر پھر بھی حالات و واقعات کے معمولی تبدیلی سے بھی یہ تحریر انسانی ذہن پر کافی اثر انداز ہوتی ہیں۔ ''عذاب آگہی'' الگ سے مزاج کی حامل ایک ایسی خوب صورت تحریر تھی جس پر تبصرہ کافی مشکل ہے۔ مزار والے بابا کی زوار خان سے گفتگو دل کے پار اترتی ہے۔ تصوف کا اظہار کرتی ہوئی انسانی ضمیر سے ہم کلام ہوتی ہوئی۔ دلوں کی دھڑکنوں کو ایک انوکھا پیغام دیتی ہوئی یہ تحریر بے حد حسین ثابت ہوئی ہے۔ ہر شخص کو اپنے اندر کی آنکھ کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ دنیا ایک ایسے شیشے کی مانند ہے جس پر کی جھوٹ فریب، انا پرستی اور سیکڑوں اخلاقی برائیوں کی آلودگی انسان کو کچھ بھی سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ ''بلند روزن'' بہت سادگی گہری فلسفیانہ سوچوں کے اردگرد بنی گئی کہانی تھی۔ انسان اپنی سوچ اور فکر سے ہی اپنی زندگی کی کھیتی کی بہترین آبیاری کر سکتا ہے اگر سوچ ٹھیک نہ ہو تو زندگی مشکل ہو کر رہ جاتی ہے۔ ''دھوکہ باز'' ایک مشکل پلاٹ پر ایک اچھی گرفت کی حامل تحریر تھی۔ مصنف نے بہت سی جگہوں پر بکھرتی ہوئی تحریر کو کافی سلیقہ مندی سے سنبھالا ہے۔ ورنہ یہ تو آموزی کا اچھا نمونہ بن کر رہ جاتی۔ ''کبوتر کی چوری'' ریاض بٹ صاحب کی ایک اور خوب صورت اور بھرپور کاوش رہی۔ وقتاً آنے پر اصل واقعہ بتانے کی ان کی روش کہانی میں جان ڈال دیتی ہے۔ پڑھنے والے کے تجسس کو وہ بڑی خوبی کے ساتھ ابھارتے رہتے ہیں۔ انسانی خواہشیں، انا پرستی، ہوس اور نفس پرستی اخلاقی ابتری انسانی زندگی کے سکون کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیتی ہے۔ عمران بھائی بہت سے سلسلے تبصرہ کرنے سے رہ گئے ہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیں اجازت دیں خدا حافظ۔

دعا مسلم خان..... حیدر آباد۔ محترم عمران صاحب اسلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے جون کا شمارہ ملا پڑھ کر خوشی ہوئی کہانیوں میں خان شفیق، خلیل جبار، ریاض حسین شاہد، محمد حنیف قادری، ریاض بٹ اور دیگر لوگوں کی کہانیاں اچھی تھیں۔ سلسلے بھی اچھے جا رہے ہیں جون کے پرچے میں ادیب صبح چمن کا تبصرہ پڑھ کر انتہائی دکھ ہوا کہ وہ ایک طرف ادیب ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں تو دوسری طرف حاسد اور منفی ہونے کا ثبوت دے

رہے ہیں۔ نئے افق کے قلمکاروں کے بارے میں جس طرح کے ریمارکس انہوں نے دیئے ہیں اس سے ان کا قلمکاروں کے لیے دل میں جو کینہ ہے وہ ایک دم ظاہر ہو گیا ہے ادیب سمیع چمن نے جو قلمکاروں پر الزام لگایا ہے تو موصوف کا اپنی کہانی کے بارے میں کیا خیال ہے جو مئی کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ دوسروں پر کیچڑ اچھالنے سے پہلے خود کے گریبان میں انسان کو جھانک لینا چاہیے میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر وہ خود کو نئے افق کے قلمکاروں سے بہتر ادیب سمجھتے ہیں تو ان سے اچھا لکھ کر دکھائیں۔

شجاع حسین جعفری...... اکوال۔ السلام علیکم محترم عمران بھائی امید ہے کہ آپ اور تمام اسٹاف، قارئین بخیر و عافیت ہوں گے۔ دستک میں مشتاق احمد صاحب کو پڑھا اور علم میں اضافہ کیا۔ اس کے بعد گفتگو کی طرف آ گئے۔ سب سے پہلا خط طاہرہ جبیں کا تھا آداب جی اس کے بعد محمد بخش فقیر صابر لنگاہ صاحب تشریف لائے اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ اس کے بعد ادیب سمیع سے ملاقات ہوئی سلام و آداب جی، ریاض حسین قمر صاحب کیا حال ہیں آپ کے، آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ عمر فاروق تشریف لائے محترم آپ تنقید برائے تنقید کے بجائے تنقید برائے اصلاح کریں تو بہتر ہوگا۔ ان مقبول جاوید صاحب کیا حال ہیں آپ کے آپ کا تبصرہ بہت اچھا ہے۔ کنیز فاطمہ کراچی سے تشریف لائیں محترمہ میری طرف سے آداب، انجم فاروق اور ساحل دعا بخاری بھی میری طرح مختصر تبصرے کے ساتھ شریک ہوئے۔ دونوں کو سلام۔ کہانیاں تمام اچھی تھیں۔ پہلی غلطی تا آخری کارخانہ عذاب آگہی، ہندرود ڈن، دھوکے باز، کبوتر کی چوری، دیدبان، قلندر ذات آتش زیرپا، جگت سنگھ، خوشبوئے سخن میں تمام کا کلام اچھا تھا آخر میں دعا ہے کہ اللہ وطن عزیز کو دشمن کے ناپاک عزائم سے محفوظ رکھے۔

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ السلام علیکم امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ چند دن ہوئے شہر جانے کا اتفاق ہوا ایک اسٹال پر نظر نئے افق پر پڑی۔ اس مہنگائی کے دور میں اتنا خوب صورت پرچہ نکالنا آپ کا ہی کام ہے۔ اس کے تمام سلسلے انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑے ہیں۔ آغاز گفتگو، دستک، خوشبوئے سخن سمیت تمام کہانیاں اپنی اپنی جگہ خوب سے خوب تر تھیں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہتا ہوں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد صاحب السلام علیکم امید واثق ہے کہ آپ اور آپ کے رفقا خیریت سے ہوں گے۔ جون کا شمارہ پراسرار سے ٹائٹل کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب دہشت گردوں کے اصل عزائم سے پردہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ دہشت گرد ہمارے اور ہمارے دین کے دشمنوں کے آلہ کار ہیں جو وطن عزیز اور اللہ تعالیٰ کے سب سے پسندیدہ دین اسلام کے دشمن ہیں۔ خدا انہیں ہدایت نصیب فرمائے عمران صاحب آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ اصل عام آدمی کو پہچان کر ہم قارئین کی مشکل کو آسان کر دیا ہے مفلس لوگ ہم تو نگروں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ رب العزت ان کو مفلسی سے نجات عطا فرمائے اور انہیں ہم جیسی امارت عطا فرمائے یہ ہم دولت مندوں کی دلی دعا ہے۔ گفتگو میں اس بار طاہرہ جبیں تارا صاحبہ متمکن ہوئیں انہوں نے جریدے پر مختصر مگر جاندار تبصرہ کیا ہے۔ وہ نہایت ہی سلجھے ہوئے پاکیزہ خیالات کے ساتھ تشریف لائیں۔ رب کریم ان کے نیک ارادوں اور خیالات کو شرف قبولیت بخشے آمین اس بار گفتگو میں سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے نہایت ہی واجب الاحترام بزرگ ساتھی جناب محمد بخش صابر لنگاہ صاحب تشریف لائے ہیں خداوند عالم انہیں صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے کہ وہ دوبارہ محفل کی رونق کو دوبالا کر سکیں۔ انہوں نے عزیزی محمد ثقلین کی شادی کی بہت بڑی خوشخبری سنائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بہو کو خوش رکھے اور اسے جناب صابر لنگاہ کا فرمانبردار اور خدمت گزار بنائے۔

آمین۔ بزرگوار ہم اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہیں قادر مطلق ہماری دعاؤں کو شرف قبولیت بخشے آپ اپنے کسی صاحبزادے سے محفل گفتگو پڑھوالیا کریں تاکہ قارئین کے آپ کے بارے میں جو تاثرات کا آپ کو پتا چلتا رہے جس طرح آپ نے فرداً فرداً ہمیں اپنی یاد میں رکھا ہوا ہے یہ آپ کا بڑا پن ہے۔ بھائی عمر فاروق ارشد صاحب حسب عادت ایک اچھے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے پاک بھارت تعلقات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا جو قابل غور ہے عمر فاروق ارشد بھائی ہم من حیث القوم احساس کمتری کا شکار ہیں۔ دشمن کا ہماری شہ رگ پر ہاتھ ہے ہم اس کے گن گاتے نہیں تھکتے ہماری تہذیب و ثقافت سے بالکل مختلف ہے۔ ہم اس قوم سے پیار کی پینگیں بڑھانے پر تلے ہوئے ہیں اور وہ ہمارے وطن عزیز کو بنجر بنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ رب کعبہ ہمیں سمجھ عطا فرمائے اور دوست دشمن کو پہچاننے کی توفیق بخشے آمین۔ بھائی آپ کو میری غزل اور شاعری پسند آئی اس کے لیے میں آپ کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ شکر ہے بھائی مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب بھی عرصہ دراز کے بعد محفل میں تشریف لائے بھائی جی آپ کے آنے سے تو محفل کی رونق دوبالا ہوگئی۔ یہ آپ محفل کو بے رونق بنانے پر کیوں تل جاتے ہیں۔ بہر حال آپ کا تبصرہ بھرپور اور جاندار تھا۔ عمران بھائی اور عمر اسرار نے خوش بو تخن کی ڈاؤن سائزنگ کردی ہے۔ بات سمجھ سے باہر ہے حالانکہ بہت سے قارئین خوش بو تخن کی وجہ سے جریدہ لیتے اور پڑھتے ہیں۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب محترم آپ کو میرا تبصرہ پسند آیا شکریہ قبول فرمائیے۔ محترمہ کنیز فاطمہ صاحبہ بھی بڑی دیر سے تشریف لائی ہیں اور ہر بات بڑی وضاحت سے بیان کررہی ہے۔ کنیز فاطمہ محفل میں آتی رہا کریں اس بار بھی فاروق ساحلی صاحب مختصر نویسی کا مقابلہ جیت گئے 258 صفحات کے جریدہ پر صرف چند سطروں میں تبصرہ دریا کو کوزے میں نہیں بلکہ اس سے چھوٹی چیز میں بند کرنے کی کوشش ہے۔ ویل ڈن انجم فاروق ساحلی صاحب آخر میں ساحل دعا بخاری صاحب کا شگوفوں بھرا خط اور محفل برخاست۔ اقرا کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے اتنا پیارا سلسلہ رسالے کی جان ہے۔ ریاض بٹ صاحب کی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اس بار وہ کبوتر کی چوری کی صورت میں بڑی اچھی کہانی لائے ہیں ریاض بٹ صاحب مبارک ہو۔ اس بار آپ خط لکھنا بھول گئے یا محکمہ ڈاک کی نذر ہو گیا۔ محفل میں ضرور تشریف لاتے رہیں۔ بزم سخن میں جناب حنیف عاطر تند مبرانا اور صبیح جمال کی غزلیں مثالی تھیں۔ اسلم جاوید کو ابھی اور محنت کی ضرورت ہے۔ شاعری میں بہت محنت کی ضرورت ہوتی تب بات بنتی ہے۔ سید عبداللہ شاہد آپ کا گیت پسند آیا بھائی محفل میں تشریف لانا شروع کردیں میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔ ریحانہ سعیدہ صاحبہ اور طاہرہ جبیں تارا صاحبہ آپ دونوں کی آزاد نظمیں بہت پسند آئیں۔ ذوق آگہی کا انتخاب خوب رہا۔

عمر فاروق ارشد..... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ ماہ جون کا نئے افق ذرا دیر سے موصول ہوا لیکن ہم نے تبصرہ کرنے میں ذرا بھی دیر سے کام نہیں لیا سو حاضر ہیں۔ ٹائٹل کیا سوچ کر بنایا گیا تھا۔ ہم خاک بھی نہ سمجھ سکے۔ اب دیکھیں نا کہ اوپر آنکھ بنی ہوئی ہے اور نیچے کسی بڑی بستی کا تباہ شدہ مکان، بندہ اس سے کیا مطلب اخذ کرے؟ گفتگو میں عمران بھائی نے ایک دفعہ پھر عام آدمی کا ذکر کیا۔ واقعی اس اعلیٰ نسل کا عام آدمی پاکستان کے علاوہ شاید ہی کہیں اور دستیاب ہو۔ اس عام آدمی نے ہی سب خاص آدمی تشکیل دیے ہیں مگر اپنی اتنی اہم صلاحیت سے لاعلم ہے جس دن اسے اس چیز کا احساس ہوگیا تو ہر خاص آدمی گلی محلوں میں کھمبوں کے ساتھ لٹکا ہوا نظر آنے لگا۔ ادیب آپی نے طاہرہ جبیں کی کہانی کا انتہائی مناسب پوسٹ مارٹم کیا۔ پچھلی دفعہ میں نے بھی سوچا تھا کہ طاہرہ کے دماغی پرزوں کا احوال پوچھ لوں مگر پھر کچھ سوچ کر چپ رہا محترمہ تبصرہ بھی اس انداز میں کرتی ہیں گویا کسی پر احسان کررہی ہوں۔ سوائے اپنی کہانی کے سب کہانیوں

پر تنقید کرنے کے بعد فرما دیا کہ اچھی اچھی تحریریں شائع کیا کریں۔ سبحان اللہ۔ نئے افق کے ایڈیٹر چنگھوڑے سے اٹھ کر انہیں آ گئے آپ کا ہماری کو کہانی میں کسی جھول کا بتا سکتے ہیں لیکن یہ نہایت بے ہودہ پن ہے کہ آپ سارے شمارے کی کہانیوں کو خارج از اشاعت قرار دیں۔ ریاض حسین قمر بھائی نیک خیالات کا شکریہ آپ کی غزل اس مرتبہ شامل نہیں تھی؟ آپ نے لکھی نہیں یا امر اسرار صاحب نے کرشمہ دکھا دیا؟ ان مقبول صاحب آپ بہت صالح طبیعت کے مالک ہیں مگر ناپسندیدہ کو پسندیدگی کی سند سے مت نوازا کریں۔ تعمیری تنقید کرنے کی عادت ڈالیں۔ باقی آپ فورٹ عباس سے کافی واقف لگتے ہیں۔ کبھی چکر لگا ہے آپ کو بہاولپور کے آم کھلائیں گے۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ نئے ناول ویدہان کی بنیاد بہت ہی اچھی رکھی گئی ہے امید ہے کہ بہتر ثابت ہوگا۔ جگت سنگھ بھی دھیرے دھیرے منزل کی جانب گامزن ہے۔ جگت کا کردار اب محدود سا ہو کر رہ گیا ہے۔ خیر دیکھتے کیا ہوتا ہے۔ آتش زیر پا نے گل ریز خان کی موت کے بعد بڑا دلچسپ موڑ لے لیا ہے۔ قلندر ذات کی حالیہ قسط پچھلی تمام تحریروں سے زبردست رہی۔ اگر اس طرح ناول چلتا رہے تو بہت بلندیوں پر جا سکتا ہے۔ دیگر کہانیوں میں ریاض بٹ کی کہانی توقع کے مطابق بہت مزیدار ثابت ہوئی۔ دیگر مواد اپنی جگہ ٹھیک تھا۔ عمران بھائی بس ذرا کتابت کی غلطیوں پر قابو پانے کی کوشش کریں۔ یہ تحریر کا حسن بگاڑ دیتی ہیں۔ اس دفعہ اتنا ہی کیوں کہ میرے مزاج کے اعتبار سے اس بار کا تبصرہ بہت مختصر ہے کیونکہ وقت کی کافی قلت ہے زندگی رہی تو آئندہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ شمارہ نمبرا کا بچھے حساب ادھار رکھ رہا ہوں جو کہ اگلی دفعہ بے باق کر دیا جائے گا۔ والسلام

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ ماہ جون 2014 کا شمارہ اس بار معمول سے ذرا پہلے یعنی 25 مئی کو ہی مل گیا۔ سرورق حسب معمول منفرد اور منفرد ہے بہت خوب۔ اس کے بعد اشتہارات دیکھتے ہوئے آگے بڑھے تو فہرست میں اپنی کہانی دیکھ کر خوشی اور اطمینان ہوا بہت شکریہ۔ آج کل مجھے مہروں کی تکلیف زیادہ ہو گئی ہے۔ جس کی وجہ سے لکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ پھر بھی نئے افق سے محبت اور قارئین کی اتنی زیادہ محبت، عنایت اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے لکھنے کا کام دوبارہ شروع کر دیا۔ آپ لوگ میرے لیے دعا کریں کہ خدا بزرگ و برتر مجھے صحت کاملہ عطا کریں اور پہلے کی طرح آپ ہر ماہ میری تحریر کردہ کہانیاں پڑھ سکیں۔ اب بڑھتے ہیں اپنی پیاری محفل کی طرف۔ پہلا خط طاہرہ نسیم تارا کا ہے۔ بہن آپ کی باتیں قابل غور ہے۔ واقعی انڈیا ہمارا دشمن نمبر 1 ہے۔ وہ پاکستان کو ہر وقت نقصان پہنچانے کے در پے رہتا ہے۔ اگلا خط ہمارے محترم بھائی محمد بخش لنگاہ صاحب کا ہے شکریہ کہ آپ [illegible] تو ہوا کہ آپ نے خط تحریر کر کے ارسال کر دیا۔ ہم تو ہر وقت آپ کے لیے دعا گو رہتے ہیں کہ خدا بزرگ و برتر آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے آمین۔ میرے لیے بھی دعا کیجیے گا۔ بیٹے کی شادی مبارک ہو مجھے یاد کرنے کا بے حد شکریہ۔ ادیب آتش جی آپ نے کراچی والوں کا دھیان کیا ہے۔ بھائی ہم تو دور ہیں لیکن وہاں جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہم اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ دل بوجھل اور آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں اور کوئی نئی ایسی خبر سننے کو ملتی ہے اور ہاتھ بے ساختہ دعا کے لیے اٹھ جاتے ہیں کہ اے باری تعالیٰ ہمارے شہر کراچی کو دوبارہ امن کا گہوارہ بنا دے۔ ریاض حسین قمر بھائی اچھی غزل یا نظم کو اچھا ہی کہا جائے گا آپ کے اشعار کی تعریف کرنا ہمارا حق بنتا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ بھائی عمر فاروق ارشد آپ کا خط ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت ہے۔ آپ نے بھارتیوں کے متعلق بالکل ٹھیک لکھا ہے لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے آپ نے اس بار میری کہانی کو رسالے میں موجود نہ پا کر دکھ کا اظہار کیا ہے یہ تو آپ کی محبت ہے اور یہی محبت میرے اندر لکھنے کا حوصلہ جوان رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ میں اپنی موجودہ حالت کے متعلق شروع میں لکھ چکا ہوں۔ ارے بھائی اس بار جناب ان مقبول جاوید احمد صدیقی موجود ہیں جناب اتنا عرصہ کہاں غائب رہے۔ یقین کریں ہم محفل میں آپ کی کمی بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں کہانی شائع نہ ہونے کے متعلق لکھ چکا ہوں۔ بھائی یہ بات تو بالکل سچ ہے کہ

سچ بات پہ ملتا ہے یہاں زہر کا پیالہ

آپ غیر حاضری نہ کیجیے گا۔ کنیز فاطمہ آپ بھی بڑی مدت کے بعد تشریف لائیں اور خوب لکھا۔ بہنا میری حوصلہ افزائی کرنے کا بے حد شکریہ۔ انجم فاروق ساحلی اور ساحل دعا بخاری کی مختصر حاضری بھی رسالے کی شان بڑھا رہی ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ سکھی اور خوش رکھے۔ کہانیوں پر تبصرے سے پہلے ذرا باقی سلسلوں کے متعلق بات ہو جائے اس بار کترنیں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہیں۔ ان کی تعداد اور زیادہ کریں۔ خوش بو سخن میں تمام کلام تعریف کے قابل ہے۔ کسی ایک کو زیادہ نمبر دینا زیادتی ہوگی۔ تمام لوگوں نے محنت سے لکھا ہے۔ ذوق آگہی میں اس بار میرا انتخاب نہیں تھا۔ بہر حال عبید ایوب کی معلومات نے واقعی ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ نوشیروان عادل کا قصہ بھی سید مظہر حسین شاہ آف گجرات کا اچھا انتخاب تھا۔ باقی لوگوں نے بھی اچھا لکھا۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی مغرب سے دونوں کہانیاں، چالاک لومڑی اور غیر متوقع پسند آئیں۔ متفرق کہانیوں میں بندروزن کی ایک منفرد اور خوب صورت کہانی ہے۔ انہوں نے انسان اور بانسری کا تعلق خوب بیان کیا ہے۔ حنیف قادری صاحب کی کہانی دھوکے باز بھی اچھی ہے۔ اب اجازت اللہ حافظ۔

ادیب سمیع چمن ..... حیدر آباد۔ تمام قارئین نئے افق اور تمام اہالیان مجلس نئے افق آپ کو اور محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کی خدمت میں ڈھیروں سلام، ڈھیروں دعائیں۔ عمران میاں آپ کی صورت دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ پر کیا کریں آپ مغل اعظم بن کر اپنا دیدار کروانا ہی نہیں چاہتے یہ ستم نہیں تو اور کیا ہے؟ جون کا شمارہ حیدر آباد میں 17,18 تاریخ کو آیا تھا مگر ہمارے لیے اعزازی پرچہ روایت کا شکار ہو کر ابھی تک موصول نہیں ہوا۔ آپ کو باور کرایا تھا کہ بھائی آپ پرچہ کوریئر سروس سے ارسال کر دیا کریں۔ آپ کے اس کالم کو پڑھ کر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ نے اس کا نام گفتگو بالکل بے معنی رکھا ہوا ہے۔ اس کا نام رکھیں (چپ چاپ) جی ہاں ایسا کیا پردہ کیا راز ہے ذرا آپ زبان تو کھولیے جناب کہ ہم اور بے شمار قارئین آپ کو محبت تو جو محنت کر کے وقت صرف کر کے ڈاک خرچ کر کے تبصرے لکھیں رائے مشوروں کا اظہار کرتے رہیں مگر آپ یہاں کسی کے بھی خط کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ عمران میاں اگر آپ بھی آخر میں چند سطروں میں جواب دے دیا کرو تو کیا بگڑے گا! بلکہ خط لکھنے والے کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ آپ ہر ماہ موصول شدہ تحریروں کی لسٹ اور ناقابل اشاعت کی لسٹ دے دیا کریں تاکہ لکھنے والے کی بے چینی ختم ہو سکے۔ اللہ ہم سب کے حال پر رحم فرمائے۔

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف اور خوشخط لکھیں۔
☆ صفحے کے دائیں جانب کم از کم ڈیڑھ انچ کا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں۔
☆ صفحے کے ایک جانب لکھیں۔
☆ خوشبوئے سخن کے لیے جن اشعار کا انتخاب کریں شاعر کا نام ضرور تحریر کریں۔
☆ ذوق آگہی کے لیے بھیجے جانے والے تمام انتخاب کے کتابی حوالے ضرور دیں
☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ اصل مسودہ ارسال کریں اور فوٹو اسٹیٹ کروا کر اپنے پاس محفوظ رکھیں کیونکہ ادارہ نے ناقابل اشاعت کہانیوں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔
☆ مسودے کے آخری صفحہ پر اردو میں اپنا مکمل نام پتا اور موبائل فون نمبر ضرور خوشخط تحریر کریں۔



ترتیب: طاہر قریشی

آداب معاہدہ

گزشتہ سے پیوستہ:

اس معاہدے سے بطور اسوۂ حسنہ یہ بات معلوم ہوئی کہ مسلمانوں کے سربراہ اگر کافروں سے صلح کا معاہدہ کرنے میں اسلام اور مسلمانوں کا نفع سمجھیں تو صلح کر لینا جائز ہے اور اگر صلح کا معاہدہ کرنے میں اسلام اور مسلمانوں کا فائدہ نہ ہو تو پھر صلح جائز نہیں کیوں کہ یہ فریضہ جہاد کے خلاف ہے۔ اس معاہدہ سے ایک اصول یہ بھی معلوم ہوا کہ کافروں سے معاہدہ کے وقت بلا معاوضہ اور معاوضہ دے کر اور معاوضہ لے کر تینوں طرح معاہدہ جائز ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد یہود مدینہ سے معاوضہ لیے اور دیے بغیر معاہدہ فرمایا اسی طرح معاہدہ حدیبیہ میں بھی معاوضہ کا تذکرہ نہیں ہے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نصارائے نجران سے جو معاہدہ فرمایا اس میں مال لینے کی شرط ٹھہرائی اس معاہدہ میں یہ تھا کہ اہل نجران ہر سال دو ہزار یمنی چادروں کے جوڑے دیں گے ایک ہزار صفر میں اور ایک ہزار رجب میں اور غزوۂ احزاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیینہ بن حصن فزاری کو مدینہ کی نصف کھجوریں دے کر صلح کا ارادہ فرمایا معلوم ہوا کہ معاہدہ میں معاوضہ کی تینوں صورتیں جائز ہیں۔

معاہدات کے بارے میں اسوۂ حسنہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ معاہدات کو لکھوا لینا چاہیے۔ جیسا کہ احادیث اور تاریخ کی کتب میں مختلف معاہدات کے لکھنے کا حکم موجود ہے جیسے معاہدہ صلح نامہ "حدیبیہ" اہل نجران سے کیا گیا معاہدہ ثقیف سے کیا گیا معاہدہ بنو ثقیف کے مسلمانوں سے کیا گیا معاہدہ دومۃ الجندل کے باشندوں کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ۔ ہجر کے باشندوں کے لیے معاہدہ اہل مدینہ اور یہود کے درمیان کیا گیا مشہور معاہدہ۔

معاہدات کے بارے میں اسوۂ حسنہ سے یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف کسی بات پر معاہدہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ جب اہل نجران نے معاہدہ کے وقت خلاف اسلام شرائط پیش کیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ماننے سے انکار فرمایا اور معاہدہ نجران میں یہ لکھوایا کہ یہ ان پر پابندی ہوگی کہ یہ سود نہیں لیں گے اور جو سود لے گا وہ معاہدہ سے خارج ہو جائے گا۔

معاہدہ کے بارے میں یہ ادب بھی اسوۂ حسنہ سے معلوم ہوا کہ عہد نامہ کی دو نقلیں ہونی چاہیئے تاکہ ہر فریق کے پاس ایک ایک کاپی محفوظ رہے۔ جیسا کہ صلح نامہ حدیبیہ کی ایک کاپی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہی اور دوسری کاپی سہیل بن عمرو کے پاس رہی۔

معاہدات کے لیے ایک بات یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی کہ جب معاہدہ ہو جائے تو

دونوں فریقوں کے ذمہ دار افراد ان دستاویزات پر دستخط کریں۔ جیسا کہ حدیبیہ میں جب عہد نامہ لکھا گیا تو مسلمانوں کی طرف سے حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ، حضرت عمر بن الخطاب، حضرت عثمان بن عفان، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے دستخط کیے اور معاہدہ لکھنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی دستخط فرمائے اور مشرکین کی طرف سے بھی کئی افراد نے دستخط کیے ان میں سے ایک حویطب بن عبدالعزیٰ اور مکرز بن حفص کے دستخط ہوئے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی معاہدے فرمائے ان میں یہ بات بہت نمایاں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدات میں انسانی حقوق کا خوب خیال رکھا۔ ہر علاقہ کے شہریوں کو بنیادی حقوق عطا فرمائے مذہبی حقوق بھی دیے۔ چنانچہ معاہدات میں عقیدوں کی آزادی رکھی جاتی ہے۔ کسی شہری کو اپنا مذہب چھوڑنے اور اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ عبادت کی آزادی دی گئی اور ثابت کیا کہ اسلام کے زیر سایہ رہنے والے غیر مسلموں کی عبادت گاہیں بالکل محفوظ رہتی ہیں۔ چنانچہ معاہدہ نجران میں یہ بات شامل تھی کہ اہل نجران کی جان و مال، مذہب، عبادت گاہیں اور ان کے راہب محفوظ رہیں گے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں سے معاہدہ فرمایا ان کے معاشی اور تجارتی حقوق کا بھی خیال رکھا۔ چنانچہ بنو ثقیف کے معاہدے کی تحقیق بھی تھی اور اس میں اس کی واضح مثال موجود ہے اور پھر معاہدات کی پابندی اور پاسداری کرنے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے ان معاہدات کی پابندی اور پاسداری کا ایک اعلیٰ معیار امت کے سامنے رکھ دیا۔ اس لیے کہ وہ ذات امین اور صادق ہے جس کے معاہدات بھی دین اسلام کی دعوت کا ذریعہ ہیں۔

اللہ رب العزت ہمیں زندگی کے تمام معاہدات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سکھائے ہوئے آداب کی پابندی کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ دنیا میں یہ معاہدات امن و سکون اور باہمی اعتماد کا ذریعہ بنیں اور آخرت کی فلاح کا سبب بنیں۔

عہد کی پابندی دینداری کی علامت ہے

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بہت کم ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اور یہ ارشاد نہ فرمایا ہو کہ جس میں امانت نہیں اس کا ایمان (کامل) نہیں اور جس میں عہد (کی پابندی) نہیں اس کا دین (کامل) نہیں۔"

(جاری ہے)

بشکریہ "درس حدیث" مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفی
نائب مہتمم واستاذ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور



قسط نمبر 2

ارشد علی ارشد

صیہونی قوتیں صدیوں سے مسلم امہ کے خلاف ہر محاذ پر سرگرم ہیں۔ مسلمانوں میں جنم لینے والے فرقوں اور فسادات کے پس پشت میں بھی انہی کا ہاتھ کارفرما ہے۔ کبھی ان کی سازشیں حسن بن صباح کے روپ میں سامنے آتی ہیں تو کبھی غلام احمد قادیانی کی شکل میں خلافت ترکی کا خاتمہ کرکے انہوں نے پورے عالم کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور اب ان کا نشانہ مسلم دنیا کی واحد ایٹمی طاقت پاکستان ہے' جو ہمہ وقت خار کی طرح تکلیف پہنچا رہا ہے زیر نظر ناول انہی سازشوں کے پس منظر میں ہے۔ گو اس کے حالات و واقعات خیالی ہیں' اس کے کسی کردار و علاقہ کا تعلق حقیقت سے نہیں ہے لیکن اس کا تھیم اور خمیر اصل واقعات سے ہی اٹھایا گیا۔

وطن پرستوں کے لیے بطور خاص دلوں کو جھنجوڑتا ہوا ایک دلچسپ ناول

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ کام بھی ہم نے کرنا ہے۔"

"تم اکتاہٹ سے کیوں بول رہی ہو؟" مارشل نے جولی کی بات اچک لی تھی۔

"لگتا ہے جولی کو ہمارا ذائقہ بدلنے والا آئیڈیا پسند نہیں آیا۔" بوتھم نے جولی کو چڑانے کے لیے سابقہ موضوع چھیڑ دیا تھا۔

وہ لوگ ڈنر کرکے گپ شپ کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ کوئی نیم دراز تھا کوئی تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ جوزف دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر ایک بڑے پتھر پر دراز تھا۔ روشنی کے لیے وہاں تین بڑی ہیڈ لائٹس جلائی گئی تھیں۔ وہ پہاڑی کے ایک بڑے شگاف کے اندر تقریباً پچاس میٹر دور بیٹھے تھے۔ یہاں اردگرد کئی بڑے بڑے شگاف تھے۔ جنہیں حسب ضرورت استعمال میں لایا گیا تھا۔ بیڈ روم، اسٹڈی، کچن، لیبارٹری، اسٹور سب کچھ وہاں تھا۔ جولی بوتھم کی بات پر بولی۔

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں تم لوگ اپنا شوق پورا کر سکتے ہو۔"

"لو بھئی دوستو اجازت مل گئی ہے۔ کل کی رات کے لیے مقامی جل پری کا بندوبست کرلو۔" بوتھم نے چہک کر کہا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔

"تم لوگ بھی کرلو اور ہم بھی بندوبست کر لیتے ہیں۔" ثریا نے بڑا ترت جواباً کہا۔

"تم دونوں کو کوئی نہیں ملنے والا۔" مارک نے مسکرا کر جولی کو دیکھا۔

"خوش فہمی ہے تمہاری۔ ہم ابھی وادی میں اتریں تو مردوں کی لائنیں لگ جائیں گی۔" اس بار ثریا نے جواب دیا تھا۔

"تمہاری طرح نکلیں ہیں ایک اہم مہرہ بھی گنوا دیا اور لڑکی بھی حاصل نہ کر سکے۔ اب کیا کریں ہم۔ بندہ ہی عجیب فطرت کا ملا تھا۔ کہتا تھا غیرت گوارہ نہیں کرتی کہ قوم کی بیٹی تمہارے حوالے کردوں۔ ان لوگوں کی غیرت کا تقاضا بھی عجیب ہے۔ مرد خود چاہتے کچھ بھی کرتے پھریں عورتوں کو چاردیواری میں قید کرکے رکھتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو جوزف۔ ہمیں جو مقامی این جی او نے ابتدائی معلومات فراہم کی تھی اس کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ مرد دوسری عورت کے پاس بھی چلا جائے تو

اسے نہ شرم آتی ہے نہ غیرت مگر عورت کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کے دیکھ لے تو اسے جان سے مار دیتے ہیں۔"

"یہ اصول غلط ہے۔ ہم بھی انسان ہیں سوچ کو کھلا اور دراز رکھتے ہیں۔ انسانی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اگر ہمیں کوئی لڑکی پسند آئی ہے اور ہم اس کے پاس جاتے ہیں تو ذہن بھی کشادہ رکھتے ہیں۔ ہماری عورت بھی اپنی پسند کے پاس جا سکتی ہے۔ اتنا کمپرومائز ہونا چاہیے۔" مارشل نے تبصرے کو آگے بڑھایا۔

"یہ مشرق ہے مارشل اور یہ مسلم کنٹری ہے خود بھی عذاب جھیلتے ہیں اور دوسروں کو بھی عذاب دیتے ہیں زندگی کو تاریک کوٹھری میں قید کر رکھا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے بہت سے اسلامی ممالک جدید دنیا سے ہم آہنگ ہو کر چلتے ہیں ان کی عورتیں منی اسکرٹ پہنتی ہیں اور نقاب جیسے فضول جھنجٹ سے آزاد کھلی سرعام بازار جاتی ہیں۔ اسلامی پابندیوں کا عذاب اگر اترا ہے تو اسے پاکستان نے سب سے زیادہ قبول کیا ہے۔ زندہ ہو کر بھی زندہ جیسی زندگی گزار نہیں پاتے۔ اپنی دانست میں یہ اسلاف کی پیروی کرتے ہیں۔"

"فکر مت کرو۔ دھیرے دھیرے ان کے دل و دماغ سے اسلاف کی تمام تعلیمات کو کھرچ دیں گے۔ ان کے یہاں صرف مغرب کے نغمات گونجیں گے۔ ہم ان کے اندر سرطان کی طرح سرایت کر جائیں گے۔" مارک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"اس کے لیے مغرب کو صداقت علی خان جیسے لوگوں پر پہلے قابو پانا ہوگا۔ جولی نے قیاس آرائی کی۔ جو اپنے بیٹوں کے لیے سب کچھ کرتا ہے مگر جان نہیں دیتا لیکن ایک وطن کی بیٹی کے لیے جان پر کھیل جاتا ہے۔ ایسے لوگ بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ جولی جب سرطان کی وبا پھیلتی ہے تو پھر سب کو نگل جاتی ہے۔ ہم سرطان ہیں جو سب کو نگل جائیں گے۔" مارک نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔

"صداقت نے اگر دوست کی بیٹی کے لیے جان قربان کی تو اس صداقت خان نے دو بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ بھیجا ہوا تھا۔ یہ بلی کی طرح آنکھیں بند کر کے دودھ پیتے ہیں کہ انہیں کوئی دیکھ نہیں رہا۔ صداقت خان تو گیا اب اس کے بیٹوں کا کیا ہوگا۔ باپ کی طرح بیٹوں کا باب بھی بند ہو جانا چاہیے۔ اب وہ ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔" مارشل نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"مارشل! ہمارا مطلوبہ تمام سامان پورا ہو چکا ہے۔ ان دونوں لڑکوں کو چھوڑ دینا چاہیے۔" ثریا نے کہا۔

"ثریا تم عورت کی فطری نفسیات کے تحت بول رہی ہو انہیں بجائے چھوڑ دینے کے مار دینا چاہیے۔"

"مار دینے کی بات تم انتقاماً کہہ رہے ہو بوقھم شاید اس لیے کہ صداقت خان نے تم پر حملہ کیا تھا۔"

"اس نے مجھ پر نہیں خود پر حملہ کیا تھا۔ یہ بے وقوفی نہ کرتا تو اب تک زندہ ہوتا۔" بوقھم نے قریب پڑا ہوا چھوٹا سا پتھر ایک طرف اچھال دیا۔

"بوقھم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اگر صداقت کے بیٹوں کو زندہ چھوڑ دیا جائے تو وہ پاکستان واپس آ کر میڈیا میں تہلکہ مچا دیں گے۔" مارک نے اس کی تائید میں کہا۔

"تم بچکانہ باتیں کر رہے ہو۔ جوزف نے مارک کے انداز کو رد کر دیا تھا۔ بھلا ان کے واویلا پر کون کان دھرنے والا ہے۔ یہ لوگ مغرب کی تقلید تو کر سکتے ہیں مگر از خود اپنی محدود اور ناتواں میڈیا سے اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ زمین والے بھی آسمان کو نہیں چھو سکتے تو پھر انہیں رہا کر دینے کے لیے ہیڈ کوارٹر اطلاع دی جائے۔" جولی نے سوالیہ نگاہوں سے جوزف کو دیکھا۔ کیونکہ اس مشن کا جوزف ہی سربراہ تھا۔

"جب رابطہ ہو اور بات یاد رہے تو کہہ دینا۔" اس نے ایسا ہی کہا جیسے یہ معاملہ اتنا اہم بھی نہیں کہ اس کے لیے خصوصاً ہیڈ کوارٹر رابطہ کیا جائے۔

"صداقت خان نے جوان پہاڑیوں کی انفارمیشن دی تھی۔ جن دہریوں کے حوالے سے وہ ہمارے بہت کام

آئی ہے۔" مارشل کہہ رہا تھا۔

"صداقت خان اور اس سے پہلے ہلاک ہو جانے والے شخص کی موت کو لوگ جنات کی کارروائی کہہ رہے ہیں۔ اس سے ہمارا مشن مکمل طور سے محفوظ ہے۔"

"یہ دقیانوسی لوگ ہیں یار۔ پراسرار فضا ازل سے قائم ہے اور ابد تک رہے گی۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی بھی بندہ اس حصار کو توڑنے کی کوشش کرے گا۔ پھر بھی بوقت ضرورت ہم ایک دو مزید لاشیں گرا سکتے ہیں۔"

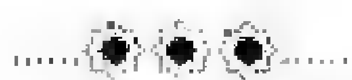
"جوزف! کیا خیال ہے۔ ہمیں کتنا مزید وقت درکار ہوگا۔"

"جولی! ہماری این جی اوز نے جو ہمیں لسٹ فراہم کی ہے اس کے مطابق 102 دیہات ہیں جو ان پہاڑوں سے نکلنے والے پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔" جوزف کا لہجہ ایک بار پھر غیر معمولی سنجیدہ تھا۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں پانی کے کتنے بڑے ذخائر موجود ہیں۔

"رپورٹ سے ہٹ کر دیکھا جائے تو پھر ہم نے اب تک جو کام کیا ہے اس سے کیا پتہ چلتا ہے ہمیں مزید کچھ وقت لگے گا۔" ٹوتھم نے بات کو آگے بڑھایا۔

"ہیڈ کوارٹر کی طرف سے فائنل مدت متعین نہ کرنا بھی اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ مشن پر وقت لگے گا۔"

"اچھا دوستو! تم لگاؤ گپ شپ میں تو چلا۔ آج بدن میں بہت درد ہو رہا ہے۔" جوزف نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔



ریسیور ہاتھ میں پکڑے اسد محمود خان تذبذب میں گرا ہوا تھا۔ انگلیاں نمبروں تک جا کر واپس پلٹ رہی تھی وہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

جب شانی کی تلاش میں اس رات گہرے سناٹے میں اسد محمود خان گھر سے نکلا تھا تو سیدھا جن د بھوت کی پراسرار پہاڑیوں پر پہنچا تھا۔ اندھیرا اس قدر گہرا تھا کہ دو تین میٹر تک کچھ بھی دیکھنا کار محال تھا۔ پرندوں کی آوازیں نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ دور افتادہ کتوں کی آوازیں بھی کبھی سنائی دیتی تھیں۔ البتہ نثار پور کی وادیوں کی ازلی خوشبو پوری فضا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ رات کی خاموشی اور گہری تاریکی اپنی جگہ پہاڑوں کا خوف اور ان کی غیر معمولی پراسراریت دل میں انجانے خوف کو لوٹ پوٹ کر رہی تھی۔

اسد محمود خان کے ہاتھ میں ٹارچ تھی جسے انتہائی ضرورت کے تحت استعمال کر رہا تھا۔ ورنہ حتی المقدور کوشش سے ٹارچ جلانے سے پرہیز کر رہا تھا۔ شاہد پرویز کے ملازم رفیق کی پراسرار موت نثار پور کے لوگوں کے تبصروں سے نکل کر سرد خانے میں چلی گئی تھی اب اس کا ذکر شاذ ہی ہوتا تھا۔ مگر صداقت علی خان کی موت نے پرانے حادثے کو بھی پھر سے ان تبصروں کا حصہ بنا دیا تھا۔ نثار پور اور قرب و جوار کے پہاڑوں میں صداقت علی خان کی موت کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی تھی۔ لوگوں کا سمندر نثار پور میں امڈ آیا تھا۔ پراسرار پہاڑیاں مزید پراسرار اور خوفناک ڈراؤنا روپ دھار چکی تھی۔ بلکہ زیادہ تر لوگ اب انہیں موت کی پہاڑیاں کہنے لگے تھے۔ اسد محمود خان جو اپنے اہل خانہ کے ساتھ شانی کی گمشدگی پر برف کی طرح پگھل رہا تھا۔ اس نے اپنے دوست صداقت خان کی موت کے بعد واضح نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اب شانی کو ڈھونڈنے کے لیے کوئی بھی بشمول پولیس کے موت کی پہاڑیوں کی طرف نہیں جائے گا۔ اسد محمود خان خود ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کا لخت جگر غائب تھا وہ کیسے موت کے خوف سے چپ بیٹھ سکتا تھا۔ اس کی غمزدہ آنکھوں میں شانی کی صورت چپک کر رہ گئی تھی۔

لوگ کچھ بھی کہیں۔ حالات کا تقاضہ کچھ بھی ہو اسد محمود خان نے بیٹے کو کھوجنا تھا۔ وہ محاورتاً نہیں حقیقتاً اندھیرے میں تیر چلا رہا تھا۔ جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے وہاں بیٹے کو تلاش کر رہا تھا۔ اب اس نے ٹارچ جلا کر پہاڑیوں کو کھنگالنا شروع کر دیا تھا۔ پتھروں، درختوں، قد آور گھاس پودوں، جھاڑیوں، غاروں، شگاف، پیچ و خم، اتار چڑھاؤ غرض ہر جگہ وہ ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسد محمود کی اندرونی کیفیت کوئی بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ اس

کے تلاش کرنے کا انداز غیر ارادی طور پر بے ہوش شائی یا دوسرے الفاظ میں مردہ شائی کو تلاش کرنے کا تھا۔

اسد محمود کے بارعب چہرہ پر غم اور سنجیدگی کا لیپ تھا۔ آنکھوں میں افسردگی اور فکر مندی کی جھلک تھی۔ دوران تلاش جب پاؤں سے ٹھوکر کھا کر کوئی پتھر نشیب میں گرتا تو وہ چونک پڑتا۔ پتھر گرنے کی آواز رات کی خاموشی میں بہت بھیانک محسوس ہوتی تھی۔ یہ تیز اور بھیانک آواز اسد محمود خان کے چہرے کے نقوش جیسے بدل کر رکھ دیتی تھی۔ وہ بے ساختہ چوکنا ہو جاتا اور تیزی سے دائیں بائیں دیکھنے لگتا تھا۔ ایسی ہی تیز آواز کیساتھ اسے زور کا دھکا لگا تھا۔ دھکا اتنا اچانک اور شدید تھا کہ وہ خود کو سنبھال نہ پایا اور لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔ ٹارچ اس کے ہاتھ سے گر کر بند ہو چکی تھی۔ یا پھر کہیں جھاڑیوں یا گھاس میں چلی گئی تھی۔ اسد محمود خان جہاں گرا تھا وہاں کانٹے اور جھاڑیاں تھیں کئی کانٹے اس کے جسم میں پیوست ہو گئے تھے۔ دھکے کی شدت نیچے گرنے اور کانٹوں کی چبھن نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصہ میں اسے اپنی پراسرار موت کا احساس ہوا تھا۔

سب سے خطرناک احساس موت کا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ دہشت ناک چیز بھی موت ہے۔ تمام تر ڈر، خوف، دہشت اور ہولناکی کی شان موت پر آ کر ٹوٹتی ہے۔ اگر موت کا احساس جاتا رہے تو تمام تر ڈر اور خوف مٹ جاتا ہے۔ موت واحد چیز ہے جو کسی محافظ کی طرح زندگی کو متعین کردہ مدت تک لے جاتی ہے۔ انسان معمول طور پر صد درجہ کاہل ہو سست ہو اور کسی بھی اضافی صلاحیت سے محروم ہو جب اسے موت اپنا جلوہ دکھاتی ہے تو وہ لاشعوری طور پر تمام تر صلاحیتوں کو یکجا کر لیتا ہے۔ اسد محمود خان بھی چوٹوں کی پروا کیے بغیر فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اندھیرے میں دھکا دینے والے کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بھی دیکھنے میں کامیاب تو نہیں ہوا البتہ اسے عقب میں سرسراہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً دائیں طرف جھک کر پیچھے کی طرف گھوما۔ تب ہی کوئی بھاری بھرکم چیز اس سے ٹکرائی۔ اسد محمود نے اسے دبوچنا چاہا تو احساس ہوا بھاری چیز اصل میں انسانی جسم ہے۔ جو شاید اس پر عقب سے حملہ آور ہوا تھا۔ مگر عین موقع پر اسد محمود کے دائیں طرف جھکنے کے سبب حملہ آور کا وار خالی گیا اور توازن بگڑ جانے کی وجہ سے اسد محمود پر آن گرا۔ اسد محمود خان کو قدرت نے پراسرار موت سے بچا لیا تھا۔ اسے جیسے ہی احساس ہوا کہ حملہ آور کوئی نادیدہ مخلوق نہیں بلکہ انسان ہے تو اس نے حملہ آور پر تابڑ توڑ گھونسے برسانا شروع کر دیے تھے۔ حملہ آور کے منہ سے جب درد کی آوازیں ابھریں تو اسد محمود خان کا حوصلہ مزید سوا ہوا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ حملہ آور جن بھوت نہیں بلکہ انسان ہے یہ انوکھا احساس تھا۔ جس نے اس کے اندر برقی رو دوڑا دی تھی۔ اس کے جوش میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے حواس بحال ہو گئے تھے اور وہ دیکھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس سارے معاملے میں بمشکل ایک منٹ کی صرف ہوا۔ جب حملہ آور کی گھومتی ہوئی لات اسد محمود کی کمر پر پڑی یہ ضرب اتنی کاری تھی کہ اسد محمود خان لڑھکتا ہوا تین چار میٹر دور جا گرا شاید وہ ڈھلوان میں گرا تھا۔ اس لیے وجود کو بحال نہ رکھ سکا اور نشیب میں قلابازیاں کھاتا ہوا گرنے لگا تھا۔ وہ کئی فٹ نیچے گرنے کے بعد ایک پتھر سے ٹکرا کر رک گیا تھا۔ کئی فٹ بلندی سے گرنے سے اسے کئی چوٹیں آئی تھیں۔ بازوؤں میں تو کیلے پتھر کے ٹکراؤ سے خون کا بہاؤ شروع ہو گیا تھا۔ چہرے پر درد کی ٹیس جلن کا احساس ہو رہا تھا ہاتھ لگانے سے اسے پتہ چلا کہ چہرے سے بھی خون کا رساؤ جاری ہے۔ جسم کے کئی حصوں میں چوٹیں لگی تھیں۔ مگر اسد محمود نے ہمت کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ہر حال میں اس شخص کو پکڑنا چاہتا تھا۔ اچانک اور شدید حملے کی وجہ سے اسے ریوالور کا استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا لیکن تین گھنٹے مزید تلاش کے بعد وہ پھر حملہ آور کو نہ پا سکا تھا۔ شاید اندھیرے کی وجہ سے اس نے سمت کا غلط تعین کر لیا تھا۔ وہ کہیں اور بھٹک رہا تھا اور حملہ آور کہیں اور تلاش کر رہے تھے۔

گھر آتے ہی اس نے غسل کیا تھا۔ بین کلر ٹیبلٹ اور فرسٹ ایڈ لی تھی بازو کا زخم گہرا تھا چہرے پر ہلکی خراشیں تھیں بہر حال وہ کسی سے کچھ چھپانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ صبح سب کو بتانا پڑا تھا بیگم کلثوم، کنزہ اور منزہ یہ سن کر دہل گئی تھیں۔ کامران اور ازان نے بھی حیرت سے پاپا کو دیکھا تھا۔ تاہم ان کی دونوں بیویوں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ صبح بیگم کلثوم کا بھائی راحت بھی اپنی فیملی کے ساتھ آ گیا تھا۔ راحت شہر میں بزنس کرتا تھا۔ ان سب نے مل کر اسد محمود خان کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ان کے لیے خطرناک پہاڑیوں پر جانا دانشمندی نہیں ہے۔ اسد محمود خان نے سب کو انتہائی سختی سے منع کر دیا تھا کہ یہ بات گھر کی چار دیواری سے باہر نہ جائے۔

اب اسٹڈی روم میں اسد محمود خان تذبذب کا شکار سوچ رہا تھا کہ اسے اگلا قدم کون سا اٹھانا چاہیے۔ مقامی تھانے کے انسپکٹر اس کے دوست شاہد بخش کا بیٹا تھا۔ پھر بھی اس پر اعتماد کرتے میں اسد محمود کو دشواری ہو رہی تھی۔ ایس پی کوئٹہ سلامت اللہ بھی اس کا دوست تھا۔ جبکہ ازان اور کامران کا بھی اپنا حلقہ احباب تھا۔ وہ ہر زاویے پر غور کر رہا تھا۔ کون سا قدم فائدہ مند ہوگا۔ کیونکہ اسے شبہ ہو چلا تھا کہ صداقت علی خان اور شاہد کے ملازم رفیق کی موت حادثاتی نہیں بلکہ قتل ہے۔ لمبی سوچ و بچار کے بعد اس نے دن کی روشنی میں ایک بار پھر پہاڑیوں کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ فیصلہ کرتے ہی وہ ڈائری میں اہم نوٹس لکھنے لگا تاکہ جب پولیس کو کارروائی سنائی جائے تو کوئی اہم بات رہ نہ جائے۔ وہ ایک گھنٹہ سر جھکائے ڈائری لکھتا رہا۔

* * *

ڈیوڈ کے چہرے پر غیر معمولی خوشی اور جوش ہچکولے لے رہا تھا۔ ٹیبل پر اس کے سامنے چند فائلیں کھلی ہوئی تھیں۔ ایک فائل کا وہ مکمل مطالعہ کر چکا تھا۔ وہ جو پڑھنے کا خواہاں تھا فائل میں اس نے وہی پڑھا تھا۔ اس کا مشن اس کی مرضی کے مطابق رواں دواں تھا۔ سیاسیات کے شعبے میں بہت سے اہم اقدام اٹھائے گئے تھے۔ جو ڈیوڈ نے ہی سربراہان کے دماغوں میں ڈالے تھے۔ خود وہ آئیڈیا پر عمل درآمد انوکھے انداز میں شروع تھا۔ قوتیں اور خطے ان کے آگے یوں بچھ رہے تھے جیسے چکنے فرش پر دبیز قالین کا رول بچھ جاتا ہے۔ اس نے مشن کو اس انداز میں آگے بڑھایا تھا کہ تاوان دنیا انہیں اپنا محسن سمجھ کر گلے لگا رہی تھی۔

بین الاقوامی متحدہ ادارہ میں دنیا کی شمولیت بتدریج بڑھ رہی تھی اور ادارے کا سرعت سے پھیلاؤ منصوبہ تھا۔ اس طرح اس کی قدر و قیمت گر جاتی تھی۔ اس لیے انہوں نے اب باقاعدہ ایک جنرل کمیٹی بنائی تھی۔ جنرل کمیٹی ہی کسی بھی ملک کی رکنیت کی درخواست منظور یا رد کر سکتی تھی۔ منظوری کے لیے 2/3 اکثریت ہونی چاہیے تھی۔ چند ذیلی ادارے بھی بنا دیے گئے تھے جو پہلے ہی طے کر لیا گیا تھا۔

عالمی ادارہ صحت، بین الاقوامی بینک، بین الاقوامی غذا اور زراعت کی تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ ان کے آفس اسرائیل سمیت دیگر نو ممالک میں قائم کیے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ چند بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی وجود میں لائی گئی تھیں۔ ان سب اقدام کا ڈیوڈ نے دور رس نتائج کا تعین کیا تھا۔ ڈیوڈ اسرائیل اور عالمی ادارہ کے لیے ریڑھ کی ہڈی بن چکا تھا۔ ڈیوڈ کے اعلیٰ دماغ سے نت نئے منصوبے ایسے پھوٹتے تھے جیسے پھولوں سے خوشبو کی سوتیں پھوٹتی ہیں۔ جیسے ڈھلوان میں تیزی سے پانی بہتا ہے۔ انہوں نے منظم طریقے سے قوموں کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔

ڈیوڈ جانتا تھا مستقبل میں ادارہ جس ملک کو چاہے گا مٹا دے گا جیسے تیز ہوا تنکے، خس و خاشاک اڑاتی ہیں۔ جیسے تیز سونامی بڑی بستیوں کو ملیا میٹ کر کے ان کا وجود تک ختم کر دیتا ہے۔ ڈیوڈ کے پلان کا زیادہ جھکاؤ مسلم ممالک کی طرف تھا۔ کیونکہ مسلم ممالک ہی اس کا بڑا ہدف تھے اور انہی کو وہ اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا۔ نان مسلم ممالک اس کے ہمنوا تھے۔ ہم سوچ اور ہم خیال تھے۔ اس لیے پلان میں جو اصل مراعات کا حصہ رکھا گیا ہے وہ ہم خیال اور نان مسلم ممالک کے لیے وقف کیا گیا تھا۔ جبکہ مسلم ممالک کے لیے ان کے اصول اور حکمت عملی

الگ تھی۔ سفارتی سطح اور سیاسی سطح پر ڈیوڈ مکمل طور سے مطمئن تھا۔ نیو ورلڈ آرڈر کے لیے دوسرا اہم پہلو نیو کیمیائی سائنسی ایجادات کا تھا۔ جس کے طفیل ہی وہ دنیا کو کنٹرول کر سکتا تھا۔ اس لیے سائنسی شعبے پر وہ خود مکمل ارتکاز کیے ہوئے تھا۔ وہ سرچ کی دنیا میں بہت آگے نکل چکے تھے۔ ہارورڈ کی نگرانی میں بنائی جانے والی جدید ترین لیبارٹریز میں بہت سے انوکھے تجربات کیے تھے۔ کچھ نئی ایجادات بھی کر لی گئی تھیں۔ ڈیوڈ کو اب کسی ایسے مقام کی تلاش تھی جو مکمل طور پر انتہائی خفیہ ہو۔ بیرون دنیا حتیٰ کہ نیو ورلڈ آرڈر کے اتحادی ممالک کی نظریں بھی وہاں تک نہ جا سکیں۔ اس سلسلے میں اس نے بااعتماد لوگوں کی کمیٹی تشکیل دی تھی۔ جس کا کام ایسی ہی کسی جگہ کی تلاش تھی۔ ایسا خفیہ مقام جو اسرائیل میں ہو یا اس کے گردونواح میں جہاں اسرائیل کی بآسانی پہنچ ہو۔ کمیٹی کی طرف سے بھیجی گئی فائل کا وہ مطالعہ کر رہا تھا۔ فائل میں چار اہم ٹھکانوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس کی وجہ بھی بتائی گئی تھی۔ ڈیوڈ نے جب برمودا ٹرینگل کے بارے میں پڑھا تو اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی تھی وہ دلچسپی سے برمودا ٹرینگل کے بارے میں رپورٹ پڑھ رہا تھا۔

برمودا ٹرینگل بحر اوقیانوس کیوبا سے پہلے پورٹو ریکو کے قریب ہے۔ برمودا تکون میں لاتعداد جہاز غائب ہو چکے ہیں۔ عجیب اور پراسرار بات یہ تھی گمشدہ جہازوں کا پتہ لگانے کے لیے جب طیارے اس علاقے میں روانہ کیے گئے تو وہ طیارے بھی غائب ہو گئے۔

یوں تو برمودا تکون کے ساتھ بہت سی عجیب و غریب داستانیں وابستہ ہیں مگر رپورٹ میں پہلا واقعہ 1874ء میں جہاز کے غائب ہونے کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا تھا۔ 1874ء میں جو جہاز برمودا تکون میں غائب ہوا تھا اس میں تین سو سے زیادہ افراد سوار تھے جو بمع کیپٹن کے غائب ہو گئے تھے مگر بحری جہاز بحفاظت ساحل پر مل گیا تھا۔ دوسرا واقعہ اس کے برعکس ہوا تھا۔ یعنی جہاز کے مسافر ساحل پر دیوانگی کے عالم میں پائے گئے تھے اور جہاز غائب تھا۔ مسافروں سے جب تفصیل پوچھی گئی تو انہوں نے بتایا کہ جب اس علاقے میں جہاز پہنچا تو جہاز کو ایک جھٹکا لگا ایسا شدید جھٹکا تھا کہ وہ ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانے ہو گئے تھے۔ اس کے بعد انہیں کچھ پتہ نہیں چلا کہ وہ ساحل پر کیسے پہنچے برمودا تکون کی پراسراریت پر اب تک کوئی حتمی رپورٹ دنیا کے سامنے نہیں آئی تھی۔ ڈیوڈ کی نظریں رپورٹ کی آخری سطروں پر دوڑ رہی تھی۔ برمودا تکون سے اکثر پانی سے آگ نکلتی دیکھی گئی ہے۔ جو پانی سے نکل کر واپس پانی میں ہی غائب ہو جاتی ہے۔ برمودا تکون کے بارے میں کوئی بھی حتمی بات نہیں جانتا تھا۔

"کوئی بھی حتمی بات نہیں جانتا۔" ڈیوڈ نے رپورٹ کی آخری سطر بلند آواز میں پڑھی۔ پھر آسمان کی طرف منہ کر کے بلند قہقہہ لگایا۔ "کوئی نہیں جانتا۔ دنیا میں کوئی بھی نہیں جانتا۔" وہ جذباتی انداز میں چیخ رہا تھا۔ بے سری آواز میں کان پھاڑ دینے والے قہقہوں میں ڈیوڈ زور سے بول رہا تھا۔ "کوئی نہیں جانتا۔ مگر ڈیوڈ جانتا ہے۔ ہاں صرف ڈیوڈ۔" اس لمحے اس کا چہرہ بدلنے لگا تھا۔ وہ کوئی خطرناک چڑیل کی طرح لگنے لگا تھا۔ وہ ہنستا رہا اور بار بار کوئی نہیں جانتا صرف میں جانتا ہوں دہراتا رہا۔

● ● ●

شانی کے لیے وہ درخت بہت عجیب اور بالکل نئے تھے ایسے درخت اس نے پاکستان میں کہیں نہیں دیکھے تھے۔ جبکہ یہاں جا بجا یہی درخت نظر آ رہے تھے۔ دل میں جنم لینے والے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے بوڑھے جن سے پوچھا۔

"یہ درخت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ جبکہ یہاں زیادہ تعداد انہی کی ہے۔"

"یہ غیرقد کے درخت ہیں۔ اسرائیل نے جب سے گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ جمایا ہے یہاں بڑی تعداد میں غیرقد لگائے ہیں۔ اس لیے کہ غیرقد یہودیوں کا درخت ہے۔" بوڑھے جن نے اسے بتایا۔

"میں سمجھا نہیں کیا درختوں کو بھی کسی خاص قوم یا

مذہب سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو قدرتی چیز ہے۔" شانی نے حیرت سے کہا۔

"میں تمہیں ایک حدیث شریف سناتا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں رسول کریمؐ نے فرمایا قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک مسلمان یہودیوں سے جنگ نہ کریں۔ چنانچہ (اس لڑائی میں) مسلمان (تمام) یہودیوں کو قتل کریں گے یہاں تک کہ یہودی پتھروں اور درختوں کے پیچھے چھپ جائیں گے تو پتھر اور درخت یوں کہیں گے۔ اے مسلمان۔ اے اللہ کے بندے۔ ادھر آ میرے پیچھے یہودی چھپا بیٹھا ہے۔ اسے مار ڈال مگر غیر قد نہیں کہے گا کیونکہ وہ (غیر قد) یہودیوں کا درخت ہے۔"

جن کے منہ سے حدیث کا بیان سن کر شانی کو بہت عجیب و غریب لگ رہا تھا۔ مگر یہ طے تھا کہ بوڑھے جن کی شکل میں وہ ہستی اس کے ہمدوش تھی۔ جو اندر تشنگی کو ہوا دے رہی تھی۔ بوڑھے جن کی بدولت ہی جنات کے بچوں کا عتاب اب اس سے دور تھا۔ نہ ہی وہ اکیلا پن محسوس کر رہا تھا۔ بوڑھے جن کے محبت بھرے پروں نے اسے ڈھانپ لیا تھا۔ بابا، ممی، کنزہ، منزہ، اسکول کے دوست، ٹیچر، اشاد پور کی وادیاں جنگل اور سرسبز میدان سب اسے یاد آتے تھے۔ سب باری باری آنکھوں کی اسکرین پر روشن ہوتا تھا۔ وہ انہیں یاد کرتا تو واپس پلٹ جانے کا خیال شدید ترین ہو جاتا تھا۔ اپنی دنیا میں واپس پلٹ جانے کی خواہش لیے وہ بوڑھے جن کے پاس جاتا مگر اس ہجوم میں بھٹک کر رہ جاتا تھا۔ جو بوڑھا جن اپنی سحر انگیز باتوں کیساتھ برپا کر دیتا۔ جب تمام حوصلہ یکجا کر کے خواہش کا اظہار کر بیٹھا تو جن جواباً بولا۔

"تم نماز پڑھنا اور نماز ادا کرنا سیکھ لو میں تمہیں تمہاری دنیا میں واپس چھوڑ آؤں گا۔"

"میں بہت کوشش کر رہا ہوں جلد از جلد نماز سیکھ لوں مگر حروف میری زبان پر اترتے نہیں۔" شانی نے اپنی کمزوری کا اظہار برملا کیا تھا۔

"اس کی بڑی وجہ یہ تمہارا اسلام سے دور رہنا ہے۔ تم خوش قسمت ہو اللہ تعالیٰ نے تمہیں انسان بنایا ہے۔ اس کے بعد مسلمان بنایا اور سب سے بڑی خوش نصیبی امت محمدیؐ میں پیدا فرمایا۔ اتنے سارے احسانات کا اگر تم تمام عمر سجدے میں گزار دو تب بھی بدلہ نہیں اتار سکتے۔"

"واقعی! کیا میں اتنا خوش نصیب ہوں۔" شانی نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔ وہ ناقابل یقین نظروں سے جن کو دیکھ رہا تھا۔

"اس سے بڑا اور ثبوت کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو انسان بنایا اور ملائکہ کو حکم دیا کہ انہیں سجدہ کرو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بناؤں گا۔"

"خلیفہ مطلب؟" شانی کچھ نہیں سمجھ پایا تھا۔

"میں بتاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے دنیا کو ایک انوکھے انداز میں بنایا ہے اور صرف چار دنوں میں دنیا کو بنایا۔ اس دنیا کو آباد کرنے والے پہلے جنات تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جنات کو پیدا فرما کر انہیں دنیا آباد کرنے کا حکم دیا۔ جنات نے حکم خداوندی کو بجا لاتے ہوئے دنیا کو آباد کیا اور خدا تعالیٰ کی عبادت شروع کر دی مگر ساتھ ہی جنات آپس میں لڑ جھگڑ کر خون بہانے لگے اس میں اتنا آگے نکل گئے کہ جنات نے نافرمانی شروع کر دی۔ طویل عرصہ نافرمانی میں گزرا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سبق سکھانے کے لیے آسمان سے فرشتوں کا لشکر بھیجا جس کا لقب جن تھا۔ انہیں میں ابلیس بھی تھا۔ لشکر کی تعداد چار ہزار تھی۔" شانی انتہائی دلچسپی سے بوڑھے جن کی باتیں سن رہا تھا۔

"کیا جنات نے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے لشکر سے جنگ کی تھی؟" شانی نے پوچھا۔

"اللہ تعالیٰ نے جب لشکر بھیجا جب جنات نے ایک بادشاہ جس کا نام یوسف تھا کو قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے لشکر نے جنات کو زمین سے بھگایا اور دریاؤں کے جزیروں میں چھوڑ دیا۔ اس کے بعد فرشتے اور ابلیس زمین پر رہنے لگے۔"

"لشکر کب تک زمین پر رہا؟ اور وہ لوگ کیوں اور کہاں چلا گیا۔" شانی کے اندر تجسس کا سمندر موجزن ہو گیا تھا۔

"ابلیس اور اس کا لشکر آدم علیہ اسلام کے پیدا ہونے سے قبل چالیس سال تک زمین پر رہے تھے۔"

"میں نے بابا سے سنا تھا کہ شیطان کو ابلیس کہا جاتا ہے تو کیا یہ وہی ابلیس تھا۔"

"شیطان کا نام ہی ابلیس ہے۔ ابلیس پہلے آسمان اور زمین کا بادشاہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رفیع الاعلیٰ میں یہ طے فرما رکھا تھا کہ عنقریب میں زمین پر اپنا خلیفہ پیدا کروں گا۔ ابلیس کو اس کی اطلاع ہو گئی اس نے پڑھ لیا کہ یہ خلیفہ ملائکہ میں سے نہیں ہو گا۔ تب ہی اس نے اپنے دل میں یہ سوچ لیا کہ میں اسے ہرگز سجدہ نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ اسلام کو جب پیدا فرمایا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ انہیں سجدہ کرو ابلیس نے یہ کہہ کر سجدہ کرنے سے انکار کیا کہ میں آگ سے بنا ہوں اور یہ مٹی سے میں اسے سجدہ نہیں کر سکتا۔ تبھی سے اس پر لعنت بھیجی گئی ہے اور تا قیامت اس پر کی جاتی رہے گی۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا' دنیا کو جنات نے آباد کیا تھا مگر نافرمانی کے سبب مٹا دیے گئے ہیں جو دنیا میں حق و باطل، خیر اور شر، ظلم اور انصاف کے درمیان توازن نہیں رکھ پائے اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل فرماتا ہے' اس لیے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں رہنا ورنہ عنقریب سب کو مٹا دیا جائے گا۔"

باتوں کے دوران شانی کے دماغ میں اپنے کلاس فیلو یوسف کا خیال لپکا۔ یوسف کو ایک بار جنات نے بہت ستایا تھا۔ وہ ایک ماہ تک مسلسل اذیت میں رہا تھا۔ کپڑے پھاڑتا تھا۔ گھر کی چیزیں توڑ دیتا تھا۔ چیختا اور چلاتا تھا اور کبھی کہتا تھا میرے بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے اسے بجھاؤ تمام ڈاکٹروں کی سر توڑ کوشش کے باوجود جب یوسف کی حالت نہ سنبھلی تو اس کے پاپا اسے ایک مولوی صاحب کے پاس لے گئے تھے۔ مولوی صاحب نے ہی انہیں بتایا تھا کہ یوسف پر جنات کا سایہ ہے۔ پھر مولوی صاحب نے ہی جنات کو بھگایا تھا۔ یہ واقعہ شانی کے دماغ میں تازہ ہوا تو کئی سوالات نے سر اٹھا لیا۔

"جنات انسانوں کو تنگ کیوں کرتے ہیں۔ کیا اس لیے کہ انسان ان سے اعلیٰ ہے؟"

"جنات کے انسان کو تنگ کرنے کی بہت سی وجوہات ہیں کبھی جنات انسان کو عشق و محبت کی وجہ سے تنگ کرتے ہیں کبھی بغض و عداوت کی وجہ سے کبھی بدلہ لینے کی غرض سے اور کبھی محض اپنی شرارت بھری طبیعت کی وجہ سے۔"

"عشق و محبت کی وجہ میں سمجھ نہیں سکا۔"

"کبھی کبھی کسی جن کو کسی انسان سے عشق ہو جاتا ہے مادہ جن کو مرد انسان سے اور نر جن کو عورت انسان سے بس اسی چکر میں کبھی تو جنات اس پر حد درجہ مہربان ہو جاتے ہیں اور کبھی انسان کے نہ ملنے سے زچ ہو کر اسے پریشان کرتے ہیں۔ کبھی کوئی انسان جنات کو تکلیف دے یا جنات کو گمان ہو جائے کہ انسان مثلاً انہیں پریشان کر رہا ہے تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔"

"مگر انسان جنات کو کیسے پریشان کر سکتا ہے۔ جبکہ جنات انسان کو نظر نہیں آتے۔" شانی کا سوال بہت معقول تھا۔

"اصل میں تنگ کرنا نادانستگی میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ انسان نادانستگی میں کسی جن پر پیشاب کر دے یا ان پر گرم پانی ڈال دے۔ یا کسی جن کو قتل کر دے تبھی جن اس کا بدلہ لیتے ہیں حالانکہ انسان نہ جاننے کی وجہ سے یہ افعال سرزد کرتا ہے۔ مگر جنات اپنی جہالت و ظلم کی وجہ سے یہ گمان کرتے ہیں کہ انسان نے قصداً یہ حرکت کی۔ جس کے عوض جن انسان کو اس سے زیادہ تکلیف دیتے ہیں اور پریشان کرتے ہیں۔"

"میں اب سمجھا۔ شانی فوراً بولا جیسے مجھ سے غلطی ہوئی اور بطور سزا مجھے یہاں لا کر طرح طرح کی تکالیف دی گئی ہیں۔"

"ہاں بالکل تم جنگل میں شکار کر رہے تھے شکار پر چلائی جانے والی گولی نے جنات کے کھیلتے بچوں کو زخمی کر دیا'

بس تم ان کے زیر عتاب آ گئے۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں جنات میں بہت سے جادوگر جن ہیں جادوگر جنات جادو کے بل بوتے پر بہت کچھ کر گزرتے ہیں۔"

"مثلاً ایسے جنات کیا کرتے ہیں؟" شانی نے پوچھا۔

"جنات کو ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے کچھ صفات عطا فرمائی ہیں جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے دربار میں کہا تھا کہ بلقیس کا تخت کون جلد سے جلد پیش کر سکتا ہے۔ تب وہ جن ہی تھا جس نے پلک جھپکنے کی دیر میں بلقیس کا تخت پیش کرنے کی بات کی تھی اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے پلک جھپکتے ہی دیکھا تو ملکہ سبا بلقیس کا تخت ان کے برابر موجود تھا۔ اس طرح ان سے کچھ انسان جادوگر جنات سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر ایسے مسلمان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ انسان جنات کی پناہ مانگتا ہے۔ خود کو جنات کے سامنے ذلیل کرتا ہے جس سے جنات کی سرکشی بڑھ جاتی ہے تب وہ انسان جنات کے بادشاہوں کے نام کی قسم کھا کر منتر کرتا ہے یہ بات جنات کو پسند آتی ہے کہ تم جنات سب جانتے ہیں کہ انسان جنات سے افضل ہیں تو افضل انسان جب خود کو جنات کے سامنے ذلیل کہتا ہے اس کے سامنے خود کو پستی میں گراتا ہے تب جنات انسان کی یہ خستہ حالی دیکھ کر اپنی تعظیم کے گھمنڈ میں گر جاتا ہے۔ اسی گھمنڈ میں انسان کے کام اس کی مرضی کے مطابق سر انجام دے دیتے ہیں۔"

"یہ کام کیا ہو سکتے ہیں؟" شانی نے معصومیت سے پوچھا۔

"جب تم واپس اپنی دنیا میں جاؤ گے تو جائزہ لینا تم کو بہت سے نام نہاد عامل، بابا، فقیر تعویذ کرنے والے مل جائیں گے۔ ان میں سے بہت سے لوگ ہیں جو جنات سے کام لیتے ہیں۔ ان میں ایک کام ایسا ہے جو صرف خدا تعالیٰ کی ذات کی شان ہے۔ جیسے کوئی عامل تم سے کہے کہ تمہارا بھائی جو فلسطین میں ہے میں بتا سکتا ہوں اس نے اس وقت کون سے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور وہ کیا کر رہا ہے۔ بظاہر یہ ناممکن اور عقل کو دنگ کر دینے والی بات ہے۔ مگر جن سے کام لے گا۔ جن فلسطین پہنچ جائے گا۔ عامل پانچ منٹ آنکھیں بند کیے منتر پڑھے گا۔ دراصل وہ جن کا منتظر ہوگا۔ جن چند منٹوں میں آ کر بتا دے گا کہ فلسطین میں تمہارا بھائی کیا کر رہا ہے اور کون سے کپڑے زیب تن کیے ہوئے ہے عامل تمہیں بتاتا ہے اور تم بھائی سے فون پر پوچھتے ہو بات حرف بہ حرف سچی ہوتی ہے۔ یوں سادہ لوح اور کمزور عقیدہ لوگ ایسے ہی عامل باباؤں کے پیچھے لگ کر دین و دنیا دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔"

"یہ تو انتہائی حیرت انگیز بات ہے۔" شانی واقعی انتہائی حیران تھا۔

"میری ایک بات دل میں ہمیشہ کے لیے بٹھا لو۔ توحید کا دامن کبھی نہ چھوڑنا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہرانا۔ یہ شرک ہے اور شرک اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں فرماتا۔" جن کی بات پر شانی نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میں الجھ رہا ہوں۔ ایسی باتیں جو مسلمان عالم کرتا ہے وہ آپ ایک جن ہو کر کیسے جانتے ہیں۔"

"اس لیے کہ میں مسلم جن ہوں۔ جنات میں بہت سے مذاہب ہیں۔ انسانوں کی طرح ہم میں بھی مسلمان، ہندو، عیسائی، یہودی، قدریہ، رافضی، مجوسی اور ستارہ پرست مذاہب ہیں۔ میں مسلم جن ہوں اس لیے اسلام کی پوری معلومات رکھتا ہوں۔"

شانی کو اب صحیح معنوں میں احساس شرمندگی نے گھیر لیا تھا۔ کیونکہ وہ انسان تھا۔ اشرف المخلوقات جس کے لیے ساری کائنات کو وجود میں لایا گیا تھا۔ مگر وہ اپنے مذہب کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ جو باتیں اسے معلوم ہونی چاہیے تھیں وہ ایک جن اس کے دل میں اتار رہا تھا۔

"چلو نماز کا وقت ہے۔ ہم مل کر نماز ادا کرتے ہیں۔"

جن نے اسے سوچوں سے واپس کھینچ لیا تھا۔

"تم نماز سیکھ لو۔ اس کے بعد میں تمہیں تین چیزوں کا

تحفہ دیکر تمہیں تمہاری دنیا میں واپس چھوڑ آؤں گا۔" شانی کو اس پر بہت یقین تھا۔ وہ جانتا تھا بوڑھا جن جو کہہ رہا ہے وہ ویسا ہی کرے گا۔ شانی کے لیے واپس جانے کا خیال انتہائی خوش کن اور پر مسرت تھا۔



نثار پور کی پرفضا وادیاں، تصوراتی میدان اور خوبصورت چوٹیاں ایک بار پھر خوف و ہراس کی لپیٹ میں تھیں۔ گردونواح کے تقریباً پچاس کے اوپر گاؤں کے لوگ وہاں جمع تھے۔ بزنس مین، ملازم پیشہ، زمیندار، کسان، مزدور، آفیسر، غریب اور امیر بھی جمع تھے۔ زندگی کے تمام طبقوں کے حامل لوگ اس لیے جمع ہوئے تھے کہ بیان کا مشترکہ مسئلہ تھا کہ نثار پور کی پراسرار پہاڑیاں ایک اور جان نگل گئی تھیں۔

صداقت علی خان کے بعد اسد محمود خان بھی موت کی وادیوں میں زندگی کی بازی ہار گئے تھے۔ دوسری اموات کی طرح اسد محمود خان کی موت بھی ان کے پاؤں چھنے بڑے سانپ کے پھنے سے واقع ہوئی تھی۔ جنازے پشت عین دل کے عقب میں رسید کیا گیا تھا۔ اب ہر چہرہ خوف زدہ تھا۔ پریشان اور اندیشوں میں گرا ہوا نثار پور، دراوڑ، کوٹ چکلی، کالو بار، تیر آباد اور سیکڑوں دیہاتوں کے لوگ پر دلکر کی بجلی گر پڑی تھی۔ کیونکہ ان دیہات کے لوگ جنگل میں لکڑیاں کاٹنے آتے تھے۔ نثار پور کی وادیوں کا نظارہ کرنے جمع ہوتے تھے۔ ان کے لبوں پر ایک سوال بار بار آ کر دم توڑ رہا تھا اگر پراسرار پہاڑیوں میں جو انسانوں کے قاتل چھپے بیٹھے ہیں خواہ وہ جنات ہوں، بھوت، پریاں، عفریت، چڑیل یا کوئی بھی ہو اگر ان کا رخ پہاڑیوں سے نکل کر دیہات کی طرف ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے اور مزید کسی جان کے ضائع ہونے سے پہلے کوئی مربوط لائحہ عمل طے کرنے کے لیے نثار پور میں جمع ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ پہاڑیوں کے بارے میں جو روایت نسل در نسل لوگوں کے دلوں میں منتقل ہو رہی تھی کہ حضرت سلیمان جب جن و پریوں سے ناراض ہو جاتے تھے تو انہیں یہاں قید کر لیتے تھے۔ اسی تناظر میں بہت سے لوگ کہہ رہے تھے کوئی ایسا جن یا بھوت اس زمانے کا یہاں قید تھا اور چونکہ جنات کو جوانی میں موت نہیں آتی بلکہ انہیں طویل زندگی ملتی ہے تو وہ قیدی جن ہنوز زندہ رہا اور اب قید سے نجات پا کر اپنی سزا کا لوگوں سے بدلہ لے رہا ہے۔

جمال خان، ریحان، اصغر اور طارق محمود نثار پور کے امرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان میں صداقت علی خان اور اسد محمود خان بھی شامل تھے جو اب مرحومین کی لسٹ میں جا چکے تھے۔

جمال خان اور ریحان اصغر نے مل کر ڈی ایس پی کو بلا امجد بخاری کو تمام روداد سنا کر انہیں مقامی تھانہ کے انسپکٹر کے ساتھ بلوا لیا تھا۔

"میں ڈی ایس پی امجد بخاری اور انسپکٹر فرید شاہ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔" ریحان اصغر نے کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہنا شروع کیا۔

"میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا علاقہ دہشت اور خوف کے زیر سایہ سانس لے رہا ہے۔ انسانی درندے ہمارے انسانوں کو نگل رہے ہیں۔ ہمارے لیے خوف کے سائے میں دن گزارنا دشوار ہو چکا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ انسانی جانوں کے ان دشمنوں کو تباہ نہ کیا گیا تو ہماری بستیاں یوں ہی اندھیرے درندوں کا شکار ہوتی رہیں گی۔"

"ریحان اصغر! مجھے پوری طرح احساس ہے لوگ پراسرار پہاڑیوں میں چھپے موت کے سوداگروں کا شکار بن چکے ہیں۔ ارد گرد کے کئی دیہات خوف کی لپیٹ میں ہیں۔ خصوصاً نثار پور کے باسی ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ مگر ہم خاموش نہیں بیٹھے ہیں۔" انسپکٹر فرید شاہ نے جواباً کہا اور ڈی ایس پی امجد بخاری کو تفصیل بتانے لگا۔ فرید شاہ اپنے معقول مشوروں اور فصیح و بلیغ دلائل کے ساتھ لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر لوگوں کے دہشت زدہ اذہان انہیں بلا تاخیر قبول نہیں کر رہے تھے۔ عوامی مجمع کا

شدید تقاضا تھا کہ ہمیں فی الفور اس مصیبت سے نجات دلائی جائے۔ لوگوں کے ہجوم میں سے مجدا کبر منت بھرے لہجے میں بولا۔

"صاحب ہمیں اس نادیدہ قوت سے نجات دلائی جائے۔ ہمارے بچے ڈر اور خوف سے راتوں میں سو نہیں پاتے۔ سوجائیں تو چیختے ہوئے اٹھ بیٹھتے ہیں۔"

"اکبر ٹھیک کہتا ہے جی پے در پے اموات نے ہمارے بچوں اور عورتوں کا سکون چھین لیا ہے۔" شیراز کمہار نے اکبر کی تائید میں کہا۔

لوگ ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ جس سے متفرق آوازوں کا بے مقصد شور اٹھ رہا تھا۔ جمال خان نے اٹھ کر خاموش رہنے کی استدعا کرتے ہوئے کہا۔

"ہم یہاں اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں جو کہا جا رہا ہے اسے خاموشی سے سنیے۔"

"جمال خان! ہمارا صبر و قرار غارت ہوا ہے ہم صبح کام کے لیے نکلتے ہیں تو ہماری عورتیں دروازے کی زنجیر چڑھا دیتی ہیں۔ نہ وہ خود اکیلی گھر میں رہ سکتی ہیں نہ باہر جانے دیتی ہیں۔ ہم گھروں میں قید رہ کر بال بچوں کا پیٹ کیسے بھریں؟" شیر خان نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

"موت کا خوف ہمیں چوہوں کی طرح نوچ نوچ کر کھا جائے گا۔" پھر محمود کی آواز ابھری۔

ڈی ایس پی امجد بخاری سمجھ گئے تھے لوگ کس قدر خوف میں مبتلا ہو چکے ہیں انہوں نے کھڑے ہو کر لوگوں کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔

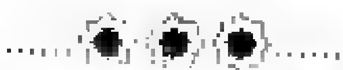
"میں آپ لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ یہ خوبصورت سرسبز وادیاں مزید کوئی ایسی پراسرار موت نہیں دیکھیں گی۔ جو کچھ میرے علم میں لایا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید آج تک ان پہاڑوں میں کوئی تحقیقاتی ٹیم نہیں بھیجی گئی۔"

"بالکل جی۔ آج تک وہاں پولیس نے جانے کی جرأت نہیں کی۔"

"میں ایک تحقیقاتی ٹیم تشکیل دوں گا اس ٹیم میں پولیس فورس کے نوجوان دو چیدہ علماء اور جن و بھوت کو قابو کرنے والے عامل کو شامل کروں گا۔ ہم مادی طاقت اور کلام الٰہی سے انہیں ان شاء اللہ زیر کرلیں گے۔" امجد بخاری کی بات لوگوں کے دل میں اتر گئی تھی۔ اگر وہ فقط پولیس فورس کی کمیٹی بنانے کا کہتے تو کوئی بھی یقین کرنے والا نہیں تھا۔ مگر لوگوں کو چیدہ علماء اور جن و بھوت کو قابو کرنے والے عامل کا سن کر سکون ملا تھا۔

"ہمارے خیال میں یہ کام ہمارے دینی بزرگوں کا ہی ہے۔ وہی ان شاء اللہ ان پر قابو پائیں گے۔" لوگوں کی کثیر تعداد اس بات پر متفق تھی۔

ڈی ایس پی امجد بخاری انہیں مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ آخر میں لوگوں سے پہاڑوں کی طرف نہ جانے کی درخواست کی گئی تھی۔ جنگل میں شکار یا لکڑیاں کاٹنے سے بھی پرہیز کرنے کی ہدایت جاری کی گئی تھی۔ لوگوں نے وعدہ کیا تھا۔ ویسے بھی ان پر موت کا خوف اس قدر حاوی ہو چکا تھا کہ وہ جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔



بیگم کلثوم پر زندگی کا اصل روپ مجازی خدا چھن جانے کے بعد آشکار ہوا تھا۔ شوہر کی زندگی میں وہ رشتوں کے کچے دھاگوں کو تحفظ نہیں پائی تھی۔ نہ ہی رشتوں کے روشن کنوؤں میں جھانک کر تاریکی کا اندازہ کرنا چاہا تھا۔ پہلے ماں کی فطری محبت غالب رہی تھی وہ اور تین بچوں کے باپ بن جانے والے بیٹوں کو تا حال معصوم اور نا سمجھ تصور کرتی رہی تھی۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ تصور کا محل کانچ کی طرح ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ تب وہ جان پائی تھی کسی کے چلے جانے سے نظام کائنات رکتا نہیں مگر ویسا رہتا بھی نہیں۔ انتہائی سہل چلنے والا نظام بری طرح انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر مشکل ترین بن جاتا ہے۔ شوہر بیٹے کی تلاش میں موت کی بھینٹ چڑھ گیا تھا اور پیچھے غم کا ایسا سیلاب رواں کر گیا

جس کی تلاطم خیز موجیں بیگم کلثوم عمزہ اور کنزہ کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔ اب ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا چاہیے تھا۔ بیگم کلثوم پر یہ خوفناک راز کھلا کہ جب بندہ ڈوبنے لگے تب تنکا بھی میسر نہیں ہوتا۔

شانی یا پھر اسد محمود خان! آج کس کے غم میں آنسو بہائیں۔ دونوں کے غم کا توازن نہیں ہو پا رہا تھا۔ دل میں ہوک اٹھتی تھی۔ جو وجود کے آر پار چلی جاتی تھی۔ شوہر سپرد خاک ہو چکا تھا اور بیٹے کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اسے یہ غم شدت سے کھائے جا رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جس امتحان میں انہیں ڈال دیا ہے اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ شوہر کے چالیسویں پر وہ اذان اور کامران سے بات کر کے دیکھ چکی تھی۔ شاہ پور میں زمینوں کا ایک بہت بڑا حصہ ان کی ملکیت تھا۔ زمینوں کی دیکھ بھال اسد محمود خان خود کرتے تھے۔ اب اسے کامران یا اذان کی ضرورت تھی۔ مگر اذان نے کئی تاویلیں گھڑی تھیں۔ کامران نے بھی بچوں کی تعلیم اور بزنس کا کہہ کر صاف الفاظ میں معذرت کر لی تھی۔ بیگم کلثوم کو ان جوابات کا قطعی اندازہ نہیں تھا۔ اسے شدید ذہنی صدمہ پہنچا تھا۔ اپنی کوکھ سے جنم لینے والے بیٹے تب تک بیٹے رہتے ہیں جب تک باپ نہ بن جائیں۔ باپ ہو جانے کے بعد وہ بیٹے نہیں رہتے۔ صرف باپ اور شوہر رہ جاتے ہیں۔ یہی عصر حاضر کا قانون ہے۔

بیگم کلثوم کو گھر میں مرد کی کمی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اس کا ایک بھتیجا اور دو بھانجے جوان تھے بھائی اپنے مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ بیٹا اس کا ہاتھ بٹانے میں مگن تھا۔ بہنیں دور دراز شہروں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ اسد محمود خان کی موت پر بمشکل آپائی تھیں۔ پھر گھر میں دو جوان بیٹیاں تھیں۔ کسی بھانجے یا بھتیجے کو گھر میں لانا مناسب ہوگا۔ مگر جب اولاد نے ماں کا حکم واجب التعمیل نہیں جانا تو کسی اور سے کیا امیدیں؟ اسے شوہر کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

بیگم ایک بات یاد رکھنا۔ یہ حویلی تمہارا گھر تمہاری عزت ہے تمہارا وقار اور مان ہے۔ اپنا گھر انسان کا بھرم رکھتا ہے۔ شہر میں جو دو گھر ہیں وہ تمہارے نہیں تمہارے بیٹوں اور ان کے بیٹوں کے ہیں۔

بیگم کلثوم اب سمجھی تھیں۔ اسد محمود خان ہمیشہ اپنے گھر میں رہنے کو کیوں ترجیح دیتے تھے۔ بالخصوص اپنی زمینوں پر کیوں انحصار کرتے تھے۔ یہ منطق بیگم کلثوم کو شوہر کے چلے جانے کے بعد بہت اچھی طرح سمجھ آگئی تھی۔ بیگم کلثوم نے ہمیشہ گھریلو خاتون کی زندگی بسر کی تھی۔ تمام سہولیات زندگی ہونے کے باوجود بھی دکھاوا نہ کبھی اعلیٰ سوسائٹی میں موو کیا تھا۔ نہ ہی نام نہاد این جی اوز میں شرکت کی تھی۔ مگر اب اسے معاشی توازن برقرار رکھنے کے لیے گھر سے باہر قدم رکھنا پڑا تھا۔ زمینوں کی نگرانی بے حد ضروری تھی۔ ورنہ مزدور الٹے تلے کرتے رہیں گے۔ شہر میں جو مکانات و مارکیٹیں کرائے پر گئی ہوئی تھیں وہاں کا چکر بھی ضروری تھا۔ اسے شانی کی واپسی تک یہ سب کرنا تھا۔ وہ رات دن اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے شانی کی خیریت کی دعائیں مانگتی تھی۔ وہ سجدوں میں گر گر کر اللہ تعالیٰ سے شانی کی زندگی مانگتی تھی شانی کب لوٹے گا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

* * *

"بہت گڈ تھامس! آپ لوگوں کی حکمت عملی اعلیٰ ہے۔ بہترین کامیابی اور قابل ستائش طریقے سے تم لوگوں نے کام کیا ہے۔" وزیر دفاع ایلن مالکس نے تحسین آمیز نظروں سے تھامس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تھینک یو سر! ہمیں یہ احساس شدید تر ہے۔ اپنی حکمت عملی کامیابی کی گئی ہے۔ ہم نے اگر دنیا پر حکمرانی کرنی ہے تو پورے ارتکاز کے ساتھ صلاحیتوں کے تالے کھلوانا ہوں گے۔"

"یوں تو جس محنت اور لگن کے ساتھ تم لوگوں نے پلان کے بیج بوئے ہیں اس سے کامیابی کے پھل سو فیصد اگنے کے چانس ہیں مگر ہم مسلم ممالک پر کی جانے والی سرچ اور ان پر اپنائی جانے والی حکمت عملی کو سنا

چاہیں گے۔ وزیر دفاع مسٹر ایلن گنّس کا تقاضا ہے کہ ہمیں دوسروں کے مقابلے میں اسلامی ممالک پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔" وزیر خارجہ نے این اے میتھوس نے مسکرا کر ایلن کی طرف دیکھا۔ پھر تھامس اور ان کے پہلو میں براجمان ماہر سیاسی تجزیہ نگار اور ماہر پلانر کریس جوئیل کو دیکھا۔

"عسکری قیادت۔ سفارتی اور سائنسی قیادت کے عزائم جان لینے کے بعد اپنا راستہ متعین کرے گی۔ بالفاظ دیگر ہمیں آپ لوگ پلیٹ فارم مہیا کریں گے اور ہم دھاوا بول کر راستوں کی تمام رکاوٹوں کو دور کریں گے۔ تاکہ نیو ورلڈ آرڈر کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ چاہے وہ چھوٹے چھوٹے بم یا پٹاسے کی شکل میں ہی کیوں نہ ہوں۔ ہم نے تھامس کی نگرانی میں عقل و دانش رکھنے والے تین لوگوں کی کمیٹی بنائی ہے جن کی سیاسی بصیرت مثالی ہے۔ یہ گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ کرہ ارض پر رونما ہونے والی تبدیلی کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں۔ خصوصاً اسلامی ممالک پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ رپورٹ تیار کرتے ہیں۔ آپ جو رپورٹ سن رہے ہیں یہ انہی کی مرتب کردہ ہے۔" تھامس تفصیل بتا رہا تھا۔

"دنیا میں اس وقت سات بڑے مذاہب ہیں۔ عیسائیت، اسلام، ہندومت، بدھ مت، سکھ، یہودی اور پارسی دنیا میں مسلمانوں کی کل تعداد 1,126,325,000 ہے۔ تمام اسلامی ملکوں کا مرکز سعودی عرب ہے۔ سعودی عرب ٹاپ ٹین آئل ریزروز ممالک میں پہلے نمبر پر ہے۔ اس کی آئل ریزروز 261.8 بلین بیرل ہے۔ سعودی عرب کے علاوہ اس لسٹ میں چھ مزید اسلامی ملک شامل ہیں۔"

"ان چھ ممالک کی کوئی تفصیل؟"

"جی سر وہی بتانے جا رہا ہوں۔ عراق 112 بلین بیرل کے ساتھ تیسرے نمبر پر ہے۔ متحدہ عرب امارات 97.8 بلین بیرل، کویت 96.5 بلین بیرل، ایران 89.7 بلین بیرل، لیبیا 29.5 بلین بیرل اور نائیجیریا 24.0 بلین بیرل ہے۔ وسائل میں کینیڈا، امریکہ، آئس لینڈ کے ساتھ سعودی عرب بھی شامل ہے۔"

"یہ بتایئے سعودی عرب ملٹری، معیشت اور ٹیکنالوجی میں کہاں کھڑا ہے؟"

"ان شعبوں میں وہ پیچھے ہے۔"

"اور سعودی عرب کے دفاعی اخراجات کہاں ہیں؟"

"سعودی عرب پہلے دس ممالک میں 25.2 بلین ڈالرز کے ساتھ دفاعی بجٹ میں آٹھویں نمبر پر ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ سعودی عرب پر کنٹرول پورے اسلامی ممالک پر کنٹرول کے مترادف ہوگا۔" وزیر دفاع نے سوالیہ نگاہوں سے تھامس کو دیکھا۔ مگر اس کا جواب تھامس کے بجائے کریس نے دیا۔

"ہاں مگر یہ کنٹرول طاقت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔"

"کریس! میں طاقت کو حق یا غلبہ حاصل کرنے کا واحد ذریعہ سمجھتا ہوں۔ کیونکہ حق طاقت کے اندر ہی پوشیدہ ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں دنیا میں باشعور، عقل و دانا اور اچھے لوگوں کی نسبت بے شعور کم عقل، ناسمجھ لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس طبقے کو ہم عوام کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ ان پر کامیاب حکمرانی جبر تشدد کے بل بوتے پر بہت آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ اس طبقے کو علمی بحث و مباحثوں سے قائل نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس سے دور ہوتے ہیں۔"

"یہ آپ کی اپنی سوچ ہے۔ جبکہ ہماری سوچ اس سے مختلف ہے کیونکہ سعودی عرب کے ساتھ پوری دنیا کے مسلمانوں کی مذہبی وابستگی ہے۔ اس پر طاقت کا استعمال گویا پورے عالم اسلام کو سڑکوں پر نکال دینے کے مترادف ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ہم وہاں مربوط پلاننگ کے ساتھ ان کی رضامندی کے ساتھ ایسے گھسیں جیسے لکڑی میں جھونک گھس جاتا ہے اس کے بعد دھیرے دھیرے جھونک کی طرح اسے کھوکھلا کرنا شروع کر دیں تو اس سے

بہتر کوئی پلان نہیں ہوگا۔"

"ہوں......" وزیر دفاع نے طویل ہنکارا بھرا۔

"اس کے ساتھ ہم نے دیگر عرب ملکوں پر کام شروع کر دیا ہے۔"

"مثلاً......؟"

"مثلاً دیگر تمام عرب ممالک کی ترجیحات میں دفاعی امور پر کوئی خاص توجہ مرکوز نہیں بلکہ ان کی ترقی اور جدید ملک کا پیمانہ اونچی اونچی عظیم الشان عمارتیں، کشادہ روڈ، نائٹ کلب، بڑے سے بڑے ہوٹل، عجیب و غریب شاپنگ مال اور پارکس، محلات چیونٹی کی طرح لاتعداد ان نئے ماڈل کی گاڑیاں اور سیر و تفریح پر آ کر رک جاتا ہے۔ایسے ملک پکے ہوئے پھل کی طرح ہماری جھولی میں گرتے ہیں۔"

"جی ہاں بالکل ہم نے انہیں ذہنی طور پر مفلوج کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہماری محنت کا پھل یوں ملنا شروع ہو چکا ہے کہ وہ سمندروں کو بھر کر جزیروں میں تبدیل کر کے جدید نئے شہر آباد کر رہے ہیں۔ سمندروں کی تہہ میں جا کر ہوٹل تعمیر کرنے لگے ہیں۔ سمندروں کے نیچے سے سرنگیں کھود کر کشادہ روڈ نکال رہے ہیں۔ اپنا سرمایہ فضول قسم کے پراجیکٹس میں صرف کر رہے ہیں۔ مگر سیکڑوں ایکڑ بنجر اراضی کو آباد کرنے کا کبھی نہیں سوچا۔ ہماری رپورٹ کے مطابق اگر عرب ممالک بنجر اراضی پر توجہ دیں تو وہ دوسرے ممالک کو چاول، کپاس، کاٹن، چینی اور دیگر بہت سی اشیاء برآمد کر سکتے ہیں۔"

"آپ کا کہنا یہ ہے کہ عرب ممالک اسلامی ملکوں کی معیشت کو سنبھال سکتے ہیں؟"

"بالکل سنبھال سکتے ہیں مگر ہم انہیں ایسا کرنے نہیں دیتے۔ ان کی کئی کمزوریاں ہیں جن سے ہم خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"گڈ! کامیاب انسان وہی ہے جو دوسروں کی کمزوریوں سے بروقت فائدہ اٹھائے۔"

"ہم نے عرب ممالک کو جنت بنانے کے مشن پر گامزن کر دیا ہے۔ جس پر وہ بلا تاخیر دوڑ رہے ہیں اس لیے ان کی غذائی پیداوار نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے ہم نے وہاں ڈبہ بند خوراک پہنچانا شروع کر دی ہے۔"

"اس کے لیے کون سا طریقہ اپنایا ہے؟"

"اس وقت غذائی اشیاء کی سب سے بڑی کمپنی نیسلے ہے ہم نے اس کا بجٹ کسی بھی تیسرے درجے کے ملک کے بجٹ سے بھی زیادہ رکھا ہے۔ اس کمپنی کی مدد سے ہم چاکلیٹ، مٹھائیاں، کافی، دودھ، پاؤڈر، بچوں کا دودھ، پانی آئس کریم مختلف قسم کی چٹنیاں، سوپ وغیرہ پوری دنیا میں پھیلا دیے ہیں۔ یہ ابتدائی قدم ہے۔ بہت جلد اگلے قدم پر ہم تمام غذاؤں کو نیسلے کے بند ڈبوں میں محدود کر دیں گے۔"

"گڈ ورک! اس کا مطلب یہ ہوا کہ غذا اور پانی ہمارے کنٹرول میں آ سکتے ہیں۔"

"بالکل عرب ممالک کی زمینیں بنجر ہیں۔ لوگ دھیرے دھیرے نیسلے کی خوراک کے عادی ہو جائیں گے۔ پھر ایک وقت آئے گا جب ہم وہاں خوراک پانی اور بجلی جیسے وسائل پر پورا کنٹرول کر لیں گے۔"

"کیا اس مشن پر صرف نیسلے کام کر رہی ہے؟"

"نہیں نیسلے کا نام میں نے بطور مثال لیا ہے۔ دیگر بہت سی کمپنیاں بھی اس میدان میں موجود ہیں۔ وزیر خارجہ نے خوش ہو کر کہا۔ "ہم طاقت کو ہوشیاری سے دبیز پردوں میں ملفوف کر کے استعمال کر رہے ہیں۔" ماہر سیاسی تجزیہ نگار کرین نے وزیر خارجہ کو دیکھا اور بولا۔

"ہمیں ایک ملک کو بالخصوص کنٹرول کرنا ہوگا۔"

"آپ کس ملک کی بات کر رہے ہیں؟"

"پاکستان کی۔"

"پاکستان......!" حیرت سے چند اکٹھی آوازیں ابھریں۔

"پاکستان تیسرے درجے کا ملک ہے دنیا میں اس کی بھلا کیا اہمیت ہے؟"

"پاکستان کو اسلامی ممالک میں ایسی ہی حیثیت حاصل ہے جیسے جسم میں ریڑھ کی ہڈی کو حاصل ہے۔ جیسے بدن میں دل کو حاصل ہے۔"

"ہمیں حیرانی ہے۔ اس بات پر کھل کر بتایئے!"

"پاکستان اسلامی ممالک میں سپر پاور کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ پاکستان ہی واحد اسلامی ملک ہے جو ایٹمی طاقت ہے پاکستان کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ہم نے ایک مفصل رپورٹ تیار کی ہے۔ رپورٹ 300 صفحات پر مشتمل ہے۔"

"ہم سننا چاہیں گے۔ اس لیے بھی کہ ہمارا تجسس بڑھ گیا ہے۔ آپ چند اہم نکات سے آگاہ کریں۔"

"پاکستان میں 97 فیصد مسلم آبادی ہے جبکہ صرف 3 فی صد ہندو مت، بدھ مت، عیسائی، سکھ اور پارسی ہیں۔ اقوام متحدہ اسلامی کانفرنس تنظیم، دولت مشترکہ، موتمر عالم اسلامی، غیر جانبدار تحریک، سارک اور دیگر دو بین الاقوامی تنظیمیں ہیں جن سے پاکستان کی وابستگی ہے۔ خصوصی خارجہ تعلقات میں چین، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات قابل ذکر ہیں۔ آرمی، نیوی اور ایئر فورس کی شکل میں مسلم افواج کی تقسیم کی گئی ہے۔ 28 اور 30 مئی 1998ء کو پاکستان 6 ایٹمی دھماکے کر کے دنیا کا ساتواں ایٹمی ملک بنا ہے۔ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن (PAEC) نیوکلیئر پاور انرجی سپلائی کرنے کا ذمہ دار ہے PAEC نے 1971ء میں KANUPP کا پہلا نیوکلیئر پاور پلانٹ لگایا جس کی استعداد 228.64MW ہے۔ 2000ء میں چشمہ نیوکلیئر پاور پلانٹ CASHNUPP نے بھی کام شروع کر دیا۔ اس کی استعداد 300MW ہے۔ پاکستان کی معیشت کا دار و مدار زیادہ تر زراعت کے شعبے پر ہے۔ کیونکہ یہ ملک کی کل لیبر فورس کے 43.4 فیصد حصے کو روزگار مہیا کرتا ہے اور کل داخلی پیداوار 20.9 حصہ ہے۔

پاکستان واقعی اہمیت کا حامل ملک ہے۔ پاکستان کے

پاس ایٹمی ہتھیار کی تعداد کیا ہے؟ تقریباً 30 سے 50 اس کے مقابلے میں پاکستان کے پڑوسی ملک بھارت کے پاس 45 سے 90 ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کے لیے ہمارے انفرادی اقدام کیا ہیں۔ جو اسلامی ممالک کے خلاف اٹھائے گئے ہیں۔ ہم نے منظم طریقے سے اسلامی ممالک میں درجہ بندی کی ہے۔ جہاں نسل در نسل بادشاہت چلی آرہی ہے وہاں ہم نے عوام کو باور کرانا شروع کر دیا ہے کہ نصف صدی سے ایک ہی فرد کی حکومت کا بہانہ کبھی عوام کی یکسوئی پر پورا نہیں اتر سکتا۔ نسل در نسل حکمرانی کا تاج ایک ہی خاندان کے اصرار پر کب تک سجا رہے گا۔ ایسے بادشاہوں کی سوچ اور فکر کیا ہوگی۔ جنہوں نے کبھی محلات سے نکل کر غریب عوام سے ملنا بھی گوارا نہ کیا ہو۔ ان کی حکمت عملی ملک و عوام کے لیے کیے گئے اقدام ناکامی کا شکار ہوتے ہیں کیونکہ یہ بادشاہ فقط درباری مسخروں کے درمیان گھرے رہتے ہیں۔ ان کی خوشامدیں بجتے ہیں اور اپنے محلات کو نت نئی آرام گاہوں سے سجاتے ہیں یہ عوام کی جڑیں کھوکھلی رکھتے ہیں بلکہ انہیں جبر و تشدد سے دبائے رکھتے ہیں تاکہ کبھی ان میں جذبہ انقلاب جنم نہ لے سکے۔ ایسی کئی مشکوک باتیں ہم نے مختلف ذرائع سے عرب عوام کے ذہنوں میں ڈال دی ہیں۔"

"ویری گڈ۔ اس مشن میں جتنا پیسہ خرچ ہوتا ہے دریغ نہ کیا جائے۔"

"ہم بہت جلد عرب ممالک کے اقتدار اعلیٰ اور عوام کے مابین اتنی وسیع اور گہری خلیج حائل کر دیں گے کہ دونوں ایک دوسرے کے مقابلے میں اندھے ہو جائیں گے جب کوئی اندھا ہو جائے تو اسے لاٹھی کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ان اندھوں کو لاٹھی ہم تھمائیں گے۔ عوام اور حکومت کے درمیان دوری کو بڑھانے کے لیے ہم وہاں اقتصادی بحران کا پلان ترتیب دے چکے ہیں۔ یہ بحران زر میں ایسی دراڑیں ڈالے گا جس سے معاشی نظام جام ہو کر رہ جائے گا۔ دولت کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں ہم اسے لٹا کر اور بعض دفعہ روک کر وہ معاشی بحران پیدا کریں گے۔ ہم عربوں میں گھس چکے ہیں اب ان کی اہم املاک، تیل، زر، عسکری طاقت، سول ایوی ایشن، عدالتوں اور سیاست پر قابض ہونا ہے۔ بلکہ بعد میں ہم انہیں دیمک کی طرح دھیرے دھیرے چاٹیں گے۔ ایسے کہ انہیں اپنے کٹنے کا احساس تک نہ ہوگا۔ جب ہوگا تب وہ کچھ کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ سوائے واویلا مچانے کے کچھ نہ کر پائیں گے کیونکہ ہماری املاک ان کے لیے پہلے سے ناقابل تسخیر ہیں۔ یہ ہلکی سی جھلک عرب ممالک کی ہے۔ اب ہم دنیائے اسلام کے اہم ترین ملک پاکستان کی طرف آتے ہیں۔ ہم کسی بھی ملک میں بکھر ہیں، اختلاف رائے، انتشار، بدنظمی اور خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کر کے ملک کے اندرونی معاملات میں براہ راست گھس رہے ہیں۔ اسی طرح پاکستان کی حکومت، فوج اور عوام پر ہم پوری نظر رکھے ہوئے ہیں اور ان کی اندرونی پالیسیاں ہماری من مرضی سے چل رہی ہیں۔"

"من مرضی سے کیا مراد لی جائے؟"

"میں ایک مفصل رپورٹ پڑھ کر سناتا ہوں۔ اس سے پاکستان آپ کے سامنے بالکل واضح ہو جائے گا۔"

"فوج پاکستان کا واحد ادارہ ہے جو کرپشن سے پاک ہے اور نظریہ پاکستان کا حامی ہے دنیا کی سخت ترین اور جنگجو پاکستانی فوج ہے۔ ہماری حکومت جو بھی آئی نظریہ پاکستان سے دور اور اخلاق نظر آئی۔ یہاں ایک بار پھر ہم نے ہر دور میں فائدہ اٹھایا۔ پاکستان اسلامی ملک ہے اور اگر منصفانہ کہا جائے تو اسلامی قانون دنیا میں عدل و انصاف اور انصاف معاشرہ اور امن کا پیغام دیتا ہے سو ہم نے وہاں بھی اسلامی قانون پنپنے نہیں دیا۔ ہاں جمہوریت ڈھال بھی ہے جس سے وہ دشمنوں کو بچا لیتے ہیں۔ اخلاقی قدروں کا علمبردار شخص کبھی ماہر سیاستدان نہیں بن سکتا۔ سیاست اور اخلاق دو متضاد چیزیں ہیں اخلاق میں نظم و ضبط ہے سادگی ہے، سچائی اور خلوص ہے اور اسلام میں اخلاق ہے۔ اس لیے پاکستان میں

سیاست کو فروغ دیا گیا ہے۔ ایسی سیاست جس میں مکرو فریب، عیاری، ظاہری بناوٹ اور سنگ دلی ہے۔ جو مسلمان لیڈر امین ہو قومی کردار کا حامل ہے۔ حق گوئی اور سچ بات کرنے کا عادی ہے اسے ہم نے مذہب کا پابند کر دیا ہے۔ مستقبل میں اگر حسن اتفاق سے عوام کی اکثریت انہیں حکمران بنا بھی دیتے ہیں اور ہماری جڑیں وہاں اس قدر پھیل چکی ہیں کہ ہم جلد انہیں تخت تاج سے تختہ دار تک پہنچا دیں گے۔“

”میں آپ کی سہولت کے لیے اپنے سیاسی کیریئر کے تجربے کی بنا پر ایک بات بتاتا ہوں۔“ کرپس جوائل نے کہہ کر بات کو روک دی تھی۔

”عوام الناس میں چند فطری کمزوریاں ہوتی ہیں۔ کمزوریاں ان کے پاؤں میں ہمیشہ غلامی کی بیڑیاں ڈالے رکھتی ہیں۔ بظاہر وہ آزاد ہوتے ہیں مگر انہیں ایسے شکنجے میں جکڑ لیا جاتا ہے کہ وہ آزاد ہو کر بھی غلام زدہ زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ عوام اندھے، کم عقل اور بے شعور ہونے کی وجہ سے اپنے اندر ایک ایسی دنیا بسائے رہتے ہیں جنہیں چھیڑ کر من چاہے نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔“

”میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں۔“ وزیر خارجہ این اے متھوس نے کہا۔

”ہم نے دیکھا ہے ایک اوسط درجے کا معاشرہ جو اپنے ووٹ سے ہمیں اعلیٰ سطح کی کرسی پر فائز کرتا ہے ان میں بدمعاشی، بدذاتی، پاگل پن، قانون توڑنا، شور وغل مچانا، ہنگامہ آرائی، توڑ پھوڑ املاک کی تباہی اور سڑکوں پر دھرنا دینے کی ہر بات ہر وقت موجزن رہتی ہے۔ انہیں ہوا دے کر ہی ہم لوگ ان سے من چاہے نتائج حاصل کر لیتے ہیں۔ اب عوام کی کم عقلی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو۔ جمہوریت میں دس دانش ور، بیرسٹر اور علماء اگر ایک امیدوار کو دس ووٹ دیتے ہیں اور دوسرے کو گیارہ جاہل، اجڈ دیہاتی اور ان پڑھ لوگ ووٹ دیتے ہیں تو کامیاب گیارہ ووٹ والا ہوگا۔“

”آپ کا کہنا بجا ہے تھامس! کتنی مضحکہ خیز بات ہے دانش ور اور جاہل کا ووٹ برابر ہے۔ بیرسٹر اور رکشے والے کی پرکھ ایک جیسی ہے۔ خبطی پاگل جیسے امیدوار حیلے بہانے سے پولنگ اسٹیشن لے کر جاتے ہیں اس کے ووٹ اور یونیورسٹی سے فارغ تعلیم یافتہ نوجوان کی ووٹ یکساں شمار ہوتے ہیں۔“

”میرے خیال میں ہم موضوع سے ہٹ گئے ہیں۔“ ایلین گیٹس نے انہیں یاد دلایا۔

ایلین گیٹس کی یاد دہانی پر پاکستان پر مرتب کی جانے والی رپورٹ پڑھی جانے لگی۔ وہ سب ہمہ تن گوش رپورٹ سن رہے تھے۔



سمجھا جاتا تھا کہ زمین کی گردش اپنے محور میں ہر صدی کے دوران 1.4 ملی سیکنڈ سست ہو رہی ہے۔ یہ گردش دراصل دن اور رات تخلیق کرنے کا سبب ہے۔ تین بڑے اسباب کی وجہ سے زمین کی سست روی بعض دفعہ تیزی سے مزید کھینچ کر جاتی ہے۔ مختلف سیاروں کی کشش ثقل زمین کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

یہ کھنچاؤ بھی زمین کی رفتار میں کمی کا بڑا سبب بنتی ہے۔ اس کے علاوہ گردش میں سستی لانے کا 90 فی صد عمل ہواؤں کا ہوتا ہے۔ ہواؤں کی تبدیلی اس گردش پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ ہوا کی رفتار بڑھ جانے سے کرہ ارض کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ یہ دو سبب قدرتی ہیں مگر تیسرا سبب یہودی سرمائے سے بنائے جانے والا HAARP نامی ادارہ ہے یہودی سائنسدانوں کی زیر نگرانی چلنے والا یہ ادارہ صرف زمین کی محوری گردش میں سستی لاتا ہے بلکہ بعض دفعہ زلزلے کا سبب بھی بنتا ہے۔ ڈیوڈ کے لیے خوش کن بات یہ تھی کہ مذکورہ ادارہ اس کی من مرضی کے مطابق چل رہا تھا۔ کیونکہ ہائی فریکوئن سی ایکٹو آرورل ریسرچ پروجیکٹ HAARP نے ایک ایسا ہتھیار پیٹنٹ کروا دیا تھا۔ جو زمین کے آیونی کرہ یا مقناطیسی کرہ کے کسی بھی حصے کو تبدیل کر سکتا ہے۔ یہ

عسکری ہتھیار کی شکل میں یہودی سائنس دان برنارڈ جے اسٹیلنڈ نے ایجاد کیا تھا۔ یہ ہتھیار ڈیوڈ کے مشن کو آگے بڑھانے میں انتہائی معاون ثابت ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس ہتھیار سے ماحولیاتی دباؤ پیدا کر کے دنیا کی فطری قوتوں میں رد و بدل کیا جا سکتا تھا۔ گویا زلزلوں کی شدت میں اضافہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اب یہ زلزلے وہیں رونما ہوں گے جو علاقے ڈیوڈ یا نیو ورلڈ آرڈر کے آقاؤں کے ناپسندیدہ ہوں گے۔

جوں جوں وقت کے قدم آگے کی طرف اٹھ رہے تھے ہر سحر ڈیوڈ کے لیے نئی ایجادات و ترقی کی نوید لا رہی تھی۔ ڈیوڈ ایسی ایجادات کرنا چاہتا تھا جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہ ملتی ہوں۔

فرانس اور سوئٹزرلینڈ نیو ورلڈ آرڈر کے دوست ممالک میں شامل تھے۔ ان کی سرحدوں پر دنیا میں طبیعات کا سب سے بڑا اور طاقتور تجربہ شروع کیا گیا تھا۔ اس تجربہ کا مقصد کائنات کی تخلیق کا راز جاننا تھا۔ اس کے لیے 27 کلومیٹر لمبی سرنگ کھودی گئی تھی۔ سرنگ میں ذرات کی پہلی میل بیم یا شعاع چھوڑ دی گئی تھی۔ نئی طبیعات میں تباہی کی علامتوں کو آشکار کرنے کے لیے جس مشن میں ذرات کو دہشت ناک طاقت سے آپس میں ٹکرایا جائے گا اس پر پانچ ارب پاؤنڈ جھونک دیئے گئے۔ یہ تجربہ انتہائی خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر اس کی کامیابی کی اُمید پر بہت بڑی کھودی گئی سرنگ میں ایک ہزار سلنڈر کی شکل میں مقناطیسوں کو ساتھ ساتھ رکھا گیا تھا۔ ان مقناطیسی سلنڈروں سے پروٹون ذرات کی لکیر پیدا ہونے لگی۔ جو ستائیس 27 کلومیٹر سرنگ کی چوڑائی اور لمبائی بے تک دائرے کی شکل میں گھومے گی۔ سرنگ میں پروٹون ذرات کے ٹکرانے سے دو لکیریں پیدا ہوں گی جنہیں مشین کے اندر روشنی کی رفتار سے مخالف سمت میں موڑ دیا جائے گا۔ اس عمل میں ایک سیکنڈ میں یہ لکیریں گیارہ ہزار جست مکمل کریں گی۔ اس تجربے کا بنیادی مقصد کائنات میں بگ بینگ سے چند ثانیے بعد کے حالات کو از سرنو تخلیق کرنا ہے۔ اس تجربے میں ایک اندیشہ بلیک ہول کی کیفیت کا ہے کیونکہ بلیک ہول اس وقت انتہائی خطرناک ہوتا ہے جب اس کی توانائی اور زندگی کافی زیادہ ہو۔ کیونکہ اس کے بعد چیزوں کو اپنی جانب کھینچنے کی صلاحیت ابھر آتی ہے۔ ڈیوڈ کو یقین تھا کہ اگر وہ اس تجربے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر موسم، بارش، ہوا میں سب پر وہ کنٹرول حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد نیو ورلڈ آرڈر ہوگا۔ جوان کا آنے والا لیڈر اسرائیل میں بیٹھ کر اعلان کرے گا۔

نیو ورلڈ آرڈر کی زیر نگرانی زمین کا چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ سٹیلائٹ کی نگرانی میں دے دیا گیا تھا۔ اس سے خشکی و سمندر کی مکمل اسکیننگ کا کام تیزی سے جاری تھا۔

ڈیوڈ بحر الکاہل سمندر کے اس مقام پر کھڑا تھا جسے ماریانہ ٹرنچ دنیا کی گہری ترین جگہ سمجھا جاتا ہے۔ ماریانہ ٹرنچ کی تہہ میں خوفناک آتش فشاں ہیں۔ اسی کا ایک حصہ شیطانی سمندر کے نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ شیطانی سمندر بھی برمودا تکون کی طرح انتہائی پراسرار اور عقل کو دنگ کرنے والا سمندر ہے۔ دنیا میں برمودا تکون اور شیطانی سمندر دو ایسی جگہیں ہیں جہاں قطب نما کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ جس طرح برمودا تکون میں بہت سے جہاز غائب ہو گئے اسی طرح بحر شیطان میں بھی جہاز غائب ہونے کے واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ان میں دونوں جگہوں میں مقناطیسی کشش یا برقی لہریں موجود ہیں۔ انہیں لیزر شعاعیں بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ ہماری بجلی سے ہزار گنا زیادہ طاقتور ہیں۔ انتہائی تعجب کی بات یہ ہے کہ بحر شیطان اور برمودا تکون کے درمیان ایسے جہازوں کو سفر کرتے بھی دیکھا گیا ہے جو بہت عرصہ پہلے غائب ہو گئے تھے۔"



"ہاہاہا...... دنیا ہماری محکوم اور ہم حاکم۔ دنیا ہماری مٹھی میں قید ہو رہی ہے۔ عنقریب ہم کرہ ارض کے واحد بادشاہ ہوں گے۔" گرو نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ گرو ترنگ میں

تھا۔ جواباً چیلے خوشی سے ناچ رہے تھے۔

"آپ کی ہر چال بلاشبہ ٹھوس اور ناقابل شکست ہے گرو۔"

"دنیا ہماری ہے اور اس میں ہمارا حکم چلے گا۔" جوش جنوں میں گرو کے حلق سے ایک ہی آواز نکل رہی تھی۔

"آپ حق اور سچ ہو گرو! ہم نے آپ کی ہدایت کے مطابق دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں فریب کاری، دغا بازی بھر دی ہے۔ ان کے دماغوں میں بد عنوانیاں، عداوتیں اور جھوٹ ڈال دیا ہے۔"

"مجھے تمام چیلوں پر فخر ہے۔" گرو نے جیسے ہی کہا چیلے خوشی سے ناچنے لگے۔

"گرو! آپ کے حکم کے مطابق ہم نے اصل ہدف مسلم ممالک کو خصوصی کنٹرول کیا ہے اور غیر مسلم ممالک کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ہم گروہ ان کے ہر فرد کے تعاقب میں ہیں۔ آپ نے جو بھی ہداف منتخب کیے تھے ہم نے وہاں ٹھیک نشانے لگائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اسٹیج پر اسی فیصد لوگ ہماری مرضی کے کردار ادا کر رہے ہیں اور ہمارے لکھے ڈائیلاگ بول رہے ہیں۔"

"یہ میرے جاں نثار اور وفادار چیلوں کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں ہر شخص خودی کی پستی میں ڈوب گیا ہے۔ ذات کے اسیر ہیں۔ وہ سگے بھائی بہنوں کو بھی بھول گئے ہیں۔ بدچلنی، آوارہ گردی، بے ضابطگی، جھوٹ، قتل و غارت ان ممالک میں ہی عام ہو رہی ہے۔ جنہیں دین اسلام کا گڑھ تصور کیا جاتا تھا۔ آج دنیا کے نقشے پر نظر جاتی ہے تو گرو کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ کوئی ایسا ملک نہیں جہاں ہماری مرضی کے کردار موجود نہ ہوں۔"

"گرو جی! ہم نے لوگوں کے دل و دماغ میں اس قدر نفرت، بغض، کینہ بھر دیا ہے۔ کوئی بھی شخص رضا کارانہ طور پر اخلاقی اقدار کو قبول نہیں کرتا۔ کوئی کسی کی مدد رب کے نام پر کرنے کو تیار نہیں۔ سبھی مفاد پرستی کی دنیا میں ڈوبے پڑے ہیں۔"

"اس سے میرے خواب کو تقویت ملی ہے۔ ہم نے دنیا کے اصول اور چال چلن بدل دیا ہے۔ ایک دور تھا جب عوام الناس تخت شاہی پر بیٹھے انسان کو ظل الٰہی کہتے اور سمجھتے تھے۔ اسے منشائے الٰہی کا مظہر تصور کرتے تھے۔ تخت شاہی کا فرمان واجب الاتباع سمجھتے تھے۔ جھک کر آداب بجالاتے تھے مگر ہم نے دھیرے دھیرے غلام زدہ دماغوں میں اپنا تصور بٹھا دیا۔ اپنی باتوں سے ان کے ذہنوں کو پراگندہ کیا۔ اب حالات یہ ہیں کہ وہ تخت نشیں جو انہیں خدا کے بعد ایک اور خدا نظر آتا تھا وہ اسے عام انسان کی طرح فانی مخلوق سمجھنے لگے ہیں۔ تخت شاہی عوام کی نظروں میں بے وقعت ہو چکے ہیں اور ہمارا اگلا قدم ان کو خدا کے تصور سے محروم کرتا ہے۔" گرو اور چیلے انتہائی خوش تھے۔ خوشی میں کبھی ناچتے کبھی قہقہے لگاتے۔

"میں سب دیکھ اور سمجھ رہا ہوں۔ میرے قابل فخر چیلو اگر آج پوری دنیا میں مذہبی گروہی اور نسلی تعصبات کو وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا دیکھ رہا ہوں تو یہ میرے ہی چیلوں کی مرہون منت ہے۔"

"گرو جی! آپ کا دست شفقت ہمارے سروں پر رہا تو ہم عنقریب کائنات کو آپ کے تابع کر دیں گے۔ بس ہمیں اگر شدید جدوجہد کا سامنا ہے تو مسلمانوں کے اس گروہ کا ہے جسے آپ نے من کے انسان کا نام دیا ہے۔ گرو جی آپ کا کہا بجا ہے۔ ہم شدت سے ان پر حملے آور ہوتے ہیں مگر ان کے پاس چند ایسے ہتھیار ہیں جن کے استعمال سے ہماری کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ ہماری تمام صلاحیتوں کو بروقت موت آجاتی ہے۔ گرو جی! آپ نے جیسا پہلے کہا تھا وہ ویسے ہی عجیب و غریب ہتھیار ہیں۔ انہیں انفرادی، اجتماعی جیسے بھی استعمال کیا جائے ان کا اثر یکساں اور شدید ترین ہوتا ہے۔"

"یہ یاد رکھو میرے باوفا ساتھیو جب تک ہم نے انہیں قابو نہ کیا کرہ ارض پر من مرضی قائم نہیں کر سکتے باقی دنیا تقریباً ہمارے ہاتھ میں ہے، کچھ بن چکی ہے اور کچھ بنتی جا رہی ہے۔ بس من کے انسان باقی ہیں۔ میں اپنے چیلوں کو وہ اہم حربے بتاتا ہوں۔ یہی وہ حربے ان

ہتھیاروں کا بہترین توڑ ثابت ہوں گے۔"

"ہم جانتے ہیں گرو جی! آپ کے پاس ہر ہتھیار کا توڑ موجود ہے کیونکہ آپ ہی حاکم ہو، طاقتور اور ناقابل شکست۔" سنتو گرو نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"غیبت...... غیبت وہ حربہ ہے جو نیکیوں کو چاٹ جاتا ہے۔ غیبت کرنے والا اپنے حصے کی نیکیاں دوسروں کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ اس حربے سے انہیں تہی دامن کردو جب اس کا نیکیوں والا پلڑا خالی ہو جائے گا تو دلوں میں وسوسہ ڈال دو۔ وسوسہ غیبت کو مزید تقویت دیتا ہے ایک کے دل میں دوسرے، دوسرے کے دل میں تیسرے اور تیسرے کے دل میں چوتھے کی غیبت وسوسہ ڈال دو۔ جب وہ وسوسے کی منفرد پٹری پر دوڑنے لگیں تو سمجھو انسان کا دفاعی سسٹم ناکارہ ہو چکا ہے۔ تب وہ سب دفاعی ہتھیار بھول جائیں گے۔"

"واہ گرو وہ...... آسان اور شر انگیز حربوں سے نواز کر آپ نے ثابت کر دیا دنیا میں آپ کے مدمقابل کوئی نہیں جو آپ کی ذہانت اور اعلیٰ دماغ کو پہنچ سکے۔ آپ حق اور سچ ہو گرو جی۔" چیلوں کی خوشامد اور تصدیقی کلمات سے گرو کا سینہ فخر سے پھول رہا تھا۔

"سیلبا! تیرا ہدف کہاں ہے؟ ابھی تک بوڑھے جن کی پناہ میں ہے؟ یا لوٹ آیا ہے۔"

"وہ اپنی دنیا میں لوٹ آیا ہے گرو جی۔"

"تو پھر جا سیلبا اسے اپنی اخذ کردہ راہ میں دیکھنا ہے۔ ایسا بنا دے کہ وہ صرف ہمارا ہو کر رہے۔"

"ٹھیک ہے گرو جی ایسا ہی ہوگا۔"

حق گرو، سچ گرو نعرہ بازی شروع ہو گئی تھی۔ گرو قاتل فخر نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

......●●●......

جدید اسپتال کا افتتاح انسانی حقوق کی این جی او کا بڑا او نثار پور میں خوشگوار تبدیلی کی ابتداء تھی دونوں کاموں میں سماجی کارکن سیٹھ ابراہیم بلوچ کا بہت عمل دخل تھا۔ انہی کی محنت کے طفیل پہلے این جی او کا آفس کھلا پھر اسی این جی او کے تعاون سے جدید اسپتال کا افتتاح ہوا۔ اسپتال کے لیے سیٹھ ابراہیم نے اپنا خوبصورت ولا پیش کیا تھا۔ اسپتال کے افتتاح سے صرف نثار پور بلکہ اردگرد کے کئی دیہاتوں کو فائدہ ہوا تھا۔ پورے علاقے میں کوئی بڑا جدید اسپتال قبل ازیں موجود نہیں تھا۔ قسمت کی مہربانی کا یہ سلسلہ یہیں نہیں رکا تھا۔ بلکہ کئی ہاتھ آگے بڑھ گیا تھا۔ ڈی ایس پی امجد بخاری نے جو کمیٹی بنانے کا وعدہ کیا تھا اسے ایفا کر کے لوگوں کے دل جیت لیے تھے۔ کمیٹی نے دس روز تک پر اسرار پہاڑیوں کے چکر کاٹے تھے۔ جس دن کمیٹی کے ممبران نثار پور میں داخل ہوئے لوگوں کی خوشی اور جوش دیدنی تھا۔ لوگ ان کے آگے پیچھے جا رہے تھے۔ کوئی لسی لا رہا تھا کوئی چائے پیش کر رہا تھا کوئی کھانے کی دعوت دے رہا تھا۔ کمیٹی میں شریک دو علماء حضرات کو دیکھتے ہی خوف و دہشت اور حواس باختہ فضا میں بتدریج کمی آنا شروع ہو گئی تھی۔ کمیٹی کی اجتماعی سرگرمیاں تیزی سے جاری رہیں۔ دس دنوں بعد علاقے کے لوگوں کو یہ خوشخبری سننے کو ملی کہ انہیں پورے نثار پور کی سرسبز پہاڑیاں تمام جنات و بھوت پریت سے پاک ہو چکی ہیں۔ لوگوں کے مجمع میں مولوی عبدالخالق اور مولوی عبدالصمد نے خوشخبری سناتے ہوئے لوگوں کو متنبہ کیا کہ ہم نے جنات کو حکم الٰہی سے اس خطے سے بھگا دیا ہے۔ تاہم کچھ شریر جنات سے وعدہ لیا ہے چھ ماہ تک کوئی شخص پہاڑیوں کے قریب نہیں بھٹکے گا بصورت دیگر وہ پلٹ سکتے ہیں۔

لوگوں کا سکون لوٹ آیا تھا۔ نثار پور کی وادیاں روایتی انداز میں چہکنے ،مہکنے لگی تھیں لوگ صبح کو سیدھی چٹانوں کی چوٹی سے جست غبارے کی طرح نیچے گرتے پرندوں کا کھیل چکور کی نرالی اڑان دیکھنے کے لیے پھر سے کناروں پر کثرت سے ملتے تھے۔ کھیت، باغات، کھلیان، سبزہ زار میدان پھر سے کھل اٹھے تھے۔ سلسلہ کوہ کے جنگلات کی رونق بحال ہو گئی تھی۔ ماسوائے پر اسرار پہاڑی کے پرندوں کا رقص اور نسیم سحر کا لطف پھر سے لوٹ آیا تھا۔ پہاڑیوں پر جنات اور بھوت کی اجارہ داری ختم ہو گئی تھی۔

خوف کے بادل چھٹ گئے تھے۔ مگر اس سے ہٹ کر ڈی ایس پی امجد بخاری اپنے ضمیر کے ساتھ برسرپیکار تھا۔ نثار پور کے لوگ چین کی نیند سونے لگے تھے۔ جبکہ امجد بخاری کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ وہ دوا کبھی نیند کی گولیاں نگل لیتے تھے۔ مگر نیند آنکھوں کے پردوں سے دور رہتی تھی۔ بے چینی کے عالم میں ٹہلنا اور پھر بیڈ پر آ کر بیٹھ جاتا۔ ان کی راتوں کا معمول بنتا جا رہا تھا۔ کئی دن اور کئی راتیں سوچ، فیصلے اور ضمیر کی تکون میں الجھتے ہوئے بیت گئے تھے۔ نثار پور کے لوگوں سے انہوں نے بے لوث وعدہ کیا تھا۔ خوف کے مارے لوگ جن کی زندگیوں میں موت کا ڈر دراز سے دراز ہوتا جا رہا تھا ان سے صدق دل سے وعدہ کیا تھا مگر وہ نہیں جانتے تھے یہ وعدہ اتنا گراں ہوگا جسے نبھاتے نبھاتے ان کی نوکری اور زندگی داؤ پر لگ جائے گی۔ یا وہ ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا ہو جائے گا۔

یہ چوتھے روز کی بات تھی وہ آفس میں بیٹھے اسد محمود خان، صداقت علی خان اور رستم کی پراسرار اموات پر مرتب کی گئی رپورٹ پڑھ رہے تھے یہ رپورٹ انہوں نے نثار پور کے مقامی تھانے سے منگوائی تھی۔ فون کی گھنٹی پر ریسیور اٹھاتے ہوئے انہوں نے سلام کیا۔ دوسری طرف سے ہوم منسٹر عبدالباری تھے۔ حال احوال پوچھنے کے بعد پھر وہ بولے۔

"میرے علم میں بات آئی ہے کہ آپ نثار پور کوئی کمیٹی وغیرہ بنانے کا عہد کر کے آئے ہیں۔"

"جی سر! اصل میں نثار پور کے سیکڑوں اردگرد کے دیہات خوف کی زندگی جی رہے ہیں۔ نثار پور سے محض دو کلومیٹر مشرق میں دریا بہتا ہے۔ دریا کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر سلسلہ کوہ ہے جہاں جنات اور بھوت پریت نے عجیب طرح کا خوف مسلط کر رکھا ہے۔ وہ اب تک تین قیمتی جانیں لے چکے ہیں۔"

پھر ریسیور سے مختصر آواز ابھری۔

"نثار پور کے لوگ پہاڑی چشموں اور دریا سے پانی لاتے ہیں۔ جنگلوں میں جا کر لکڑیاں کاٹتے ہیں اور شکار کرتے ہیں، بہت لوگوں کا روزگار ہی لکڑیاں کاٹنا اور مچھلیاں پکڑنا ہے۔ مگر جنات و بھوت کے خوف......"

"آپ یہ بتائیے وہ ایریا آپ کا متعلقہ ایریا ہے؟" بات کاٹ کر تلخ لہجے میں پوچھا گیا تھا۔

"جی نہیں سر میں......" ہوم منسٹر نے ایک بار پھر ان کی بات تختی سے کاٹ دی تھی۔

"آپ قانون کے محافظ ہو قانون کو توڑ کر مسئلے کا حل تلاش کرنے لگے ہو۔" بات معقول تھی امجد بخاری چند سیکنڈ خاموش رہے دوسری طرف سے تلخ لہجے میں بات جاری تھی۔

"میں آپ کو اس کام سے روک سکتا ہوں۔ مگر روکوں گا نہیں۔"

"تھینک یو سر! یہ کام ہم ڈیوٹی سے ہٹ کر جذبہ خیر سگالی کے طور پر بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے یہ قدم اخلاقی طور سے اٹھایا ہے۔"

"وہ الگ بات ہے۔ آپ وہاں جا سکتے ہیں مگر تفتیشی کمیٹی کے ممبران میں منتخب کر کے آپ کے پاس بھیج دوں گا اور وہ جو رپورٹ تیار کریں وہی آپ کو نثار پور کے مجمع میں پیش کرنا ہوگی۔" ڈی ایس پی امجد بخاری کو یہ بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ یا دوسرے لفظوں میں ہوم منسٹر کا مدعا سمجھ سے بالاتر محسوس ہوا تھا۔

"سر میرا ارادہ تھا۔ چند علماء کو ساتھ لے کر جاؤں۔ علاقے کے 98 فی صد لوگوں کی رائے ہے پہاڑیوں میں جن و بھوت کے مسکن ہیں یا علم انہیں گولی سے نہیں روحانی طریقے سے ختم کر سکتے ہیں۔"

"مجھے اس سارے معاملے کی بہت اچھی طرح سے انفارمیشن ہے۔ اس لیے میں آپ کی منشاء کے عین مطابق کمیٹی تشکیل دوں گا۔ چار پانچ دنوں تک آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

"تھینک یو سر!"

"یہ بات یاد رہے کمیٹی آپ کے ماتحت نہیں ہوگی۔ آپ کو ساتھ لے کر چلے گی۔ کام اپنی مرضی سے کرے

گی۔ اللہ حافظ۔"

ہوم منسٹر کی کال نے ڈی ایس پی کوئٹہ امجد بخاری کو بے حد الجھا دیا تھا۔ یہ الجھن تب بہت گراں ہونے لگی جب تفتیشی کمیٹی کے ممبران پراسرار پہاڑیوں کی طرف جانے کی بجائے جنگلوں میں گھومتے رہے امجد بخاری کے احتجاج پر بھی انہوں نے کوئی پروا نہیں کی تھی۔ بس نو دنوں کے بعد امجد بخاری کے ہاتھ میں کلیئرنس کی رپورٹ تھمادی تھی۔ ساتھ ہی ہوم منسٹر کی کال نے اسے حکم دیا کہ مذکورہ رپورٹ نثار پور کے لوگوں کو سنا کر انہیں ہمیشہ کے لیے مطمئن کروا دیا جائے۔ امجد بخاری نے حکم کی تعمیل میں ایسا ہی کیا تھا۔ مگر خود ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ دس پندرہ دنوں تک اس جنگ میں مبتلا رہا۔ آخر سولہویں دن آفس میں اس کی انگلیاں کی بورڈ پر تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ وہ اپنا استعفیٰ ٹائپ کر رہا تھا۔ اس کے ضمیر نے اکیلے پہاڑوں پر جانے کا فیصلہ صادر کر دیا تھا۔



نئے اور انوکھے حادثات کا رونما ہونا زندگی کا وہ باب ہے جس کے بغیر زندگی ادھوری رہتی ہے۔ کبھی کوئی حادثہ موت کے قریب ترین لے جاتا ہے۔ کبھی موت سے دور زندگی کے پاس زندگی دائرے میں گھومتی ہے۔ وقت بڑھتا جاتا ہے اور آخر ایک دن سانسوں کا کشکول ٹوٹ جاتا ہے۔ سانسیں ساری بکھر جاتی ہیں اور زندگی تمام حالات سے چھٹکارا پا لیتی ہے۔ دھوپ، چھاؤں، خوشی، غم کا ہر احساس مٹ جاتا ہے۔ کبھی کوئی انوکھا حادثہ نہ موت دے پاتا ہے نہ زندگی۔ بلکہ کچھ نئے انوکھے تجربات حوالے کرتا ہے۔ ایک اتفاق شانی کو رات کی پراسرار روشنی اور ناقابل فہم آوازیں سناتا رہا۔ اس کے تعاقب میں ایک اور حادثہ ہوا اور وہ پاکستان سے نکل کر لمحوں میں اسرائیل کی بلند گولان پہاڑیوں میں جا پہنچا۔ کبھی زیر عتاب رہا اور کبھی شفیق جن کی جائے پناہ میں جس نے اسے سب دیا جو پہلے وہ نہیں جانتا تھا۔ شانی دامن میں کیا کچھ سمیٹ لایا تھا۔ فی الحال اسے خود معلوم نہیں۔ جیسے ہوا کا بگولا اسے اٹھا لے گیا تھا ویسا ہی ایک بگولا اسی جگہ پر چھوڑ گیا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی سامنے یعقوب کا گھر تھا۔ تھوڑا ہٹ کر نور الحق کا خوبصورت ولا، دوسری طرف چھوٹا سا سرسبز میدان۔ دائیں بائیں لہلہاتے درخت دور نثار پور کا حسین کوہ سلسلہ اور سامنے گلی میں وہ گھر جہاں اس نے روشنی کا ہالہ دیکھا زمین سے آسمان تک بلند دیکھا تھا۔ جہاں اس نے آواز سنی تھی جس کے تجسس کی پاداش میں وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ شانی گھر کی طرف چل پڑا۔

"ارے شانی، اوئے رک۔" اچانک اسے چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کا کلاس فیلو امجد بھاگ کر اس کے پاس پہنچا اور اس سے لپٹ گیا جواب سے بغیر وہ بولا۔

"شانی! کہاں چلا گیا تھا تو؟ یار تو کتنا بدل گیا ہے۔ میں دس منٹ تک تمہیں پہچان نہیں پایا۔ یار داڑھی بھی رکھ لی ہے۔" امجد حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے بولتا جا رہا تھا۔

"امجد! پھر ملتے ہیں پلیز مجھے گھر جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے یار میں غضنفر فراز وغیرہ کو بتاتا ہوں۔ رات کو میدان میں آنا۔" امجد ایک ہی سانس میں بول رہا تھا۔ شانی بنا کچھ کہے چل دیا تھا۔

بیگم کلثوم کنزہ کے ہمراہ لان میں بچھی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کال بیل کی آواز پر انہوں نے گیٹ کی طرف دیکھا یہاں سے نصف گیٹ نظر آ رہا تھا۔ زیریں حصہ پھولوں کی باڑھ کے عقب میں پوشیدہ تھا۔

"میں دیکھتی ہوں ممی۔" کنزہ کہتی ہوئی مین گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ شوہر کی وفات کے بعد بیگم کلثوم نے ملازمین کی تعداد کم کر دی تھی۔ باہر کے لیے مالی اور اندرونی حصے کے لیے ملازمہ تھی۔ عموماً گیٹ مالی ہی کھولتا تھا۔ مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید کسی پودے کو زندگی کی حرارت بخشنے کے لیے پانی دینے میں مگن تھا۔ منزہ کمرے میں تھی۔ بیگم کلثوم کا دھیان گیٹ کی طرف تھا۔

"ممی...... ممی!" اچانک کنزہ کی چیخ نے بیگم کلثوم پر بجلی گرادی تھی۔ وہ بدک کر اٹھیں اور گیٹ کی طرف بھاگ پڑیں۔ کنزہ کی آواز تھم گئی تھی۔ بیگم کلثوم نے باڑ کے اوپر

سے حواس باختہ نظروں سے گیٹ کی طرف دیکھا۔ انہیں حیرت کا شدت سے جھٹکا لگا کنزہ کسی مرد سے لپٹی ہوئی تھی۔ بیگم کلثوم کے لیے یہ منظر حیران کن تھا۔ کنزہ چیخی کیوں تھی۔ گھبراہٹ زدہ آواز میں اسے پکارا کیوں تھا اور اب یہ مرد کون ہے جس سے لپٹی وہ لرز رہی ہے۔ ایک منٹ میں سوچ کے گھوڑے سرپٹ بھاگتے ہوئے کہاں سے کہاں پہنچ گئے تھے۔ دل کی تیز دھڑکنوں میں وسوسوں کی سنسناہٹ شامل ہوگئی تھی۔ قدم غیر ارادی طور سے تیز ہوگئے تھے شاید چار میٹر کا فاصلہ باقی تھا۔ جب مرد نے چہرہ اوپر اٹھایا بیگم کلثوم کے قدم تھم گئے تھے زمین نے اسے پکڑ لیا تھا سوچیں اور بصارت نے کام چھوڑ دیا تھا۔

"ممی..... ممی..... شانی بھیا۔" کنزہ نے ممی کو شانے سے جھنجوڑا۔ بیگم کلثوم کی عجیب حالت تھی۔ کنزہ کے جھنجوڑنے پر اسے ہوش آیا۔ بیگم کلثوم کے سامنے تبدیل شدہ نقوش کے ساتھ شانی کھڑا تھا۔

"شا..... شانی میرا بیٹا میرا لخت جگر۔" وہ شانی سے لپٹ گئیں۔ کنزہ اندرونی حصے کی طرف اڑی جارہی تھی۔ بیگم کلثوم شانی کو دیوانہ وار چوم رہی تھیں۔ بالوں سے گالوں سے آنکھوں سے کبھی ہاتھوں سے ماں بیٹے کی آنکھوں سے ساون بادوں جھڑی رواں تھی۔

"میرا لعل میرا بیٹا کہاں تھا تو؟ ممی کی یاد نہیں آئی تمہیں۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔ یا اللہ تو نے میرا بیٹا لوٹا دیا۔" بیگم کلثوم کہے جارہی تھیں۔ شانی کو چوم رہی تھیں اور بول رہی تھی۔ شانی بھی ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔

"کیسی ہیں ممی آپ کیسی ہیں ممی؟" ان کے ملاپ کا منظر ابھی بدلا نہیں تھا۔ کنزہ اور منزہ بھاگ چلی آئیں۔

"شانی! میرے بھائی....." منزہ دور سے ہی چیخ پڑی تھی۔ ایک طرف سے مالی بھی نکل آیا تھا۔ پیچھے ملازمہ ہانپتی کانپتی لپک رہی تھی وہ شانی سے یوں لپٹے تھے۔ جیسے فٹ بال کا کھلاڑی فائنل میچ کا وننگ گول کرتا ہے اور پوری ٹیم اس کے اوپر گر پڑتی ہے۔

"صدیقہ جلدی سے شانی بابا کے کپڑے باتھ روم میں رکھو اور شیو کا سامان بھی دیکھو شیو کتنی بڑھ گئی ہے۔" اس کی ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی بیگم کلثوم نے ملازمہ سے کہا۔

"ممی! پاپا نظر نہیں آرہے؟" شانی کے سوال نے خوشیوں کے لمحات میں یک لخت غم بکھرا دیے تھے۔ منزہ یا کنزہ کے بولنے سے پیشتر بیگم کلثوم بولیں۔

"بیٹا! تم فریش ہوجاؤ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔" بیگم کلثوم نے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کردیا تھا۔

"بیگم صاحبہ! باہر گیٹ کے پاس پورا گاؤں جمع ہے۔ انہیں شانی کے آنے کی خبر مل گئی ہے۔" مالی نے اندر داخل ہوتے ہوئے اطلاع دی۔

"طالب بھائی! یہ روپے پکڑو اور میرے بیٹے کا صدقہ اچھا سا بکرا لادو۔ باقی گاؤں والوں کو لان میں لے آؤ۔ میں وہیں آتی ہوں۔" بیگم کلثوم نے پرس سے روپے نکالتے ہوئے مالی کو دیے۔

"منزہ تم بھائیوں کو خبر دے دو اپنے ماموں کو بھی بتا دینا روز فون کرکے پوچھتے ہیں۔ روبینہ آنٹی اور فرح کو بھی بتادو۔" بیگم کلثوم نے ہدایت جاری کرتے ہوئے کہا۔

شانی نے قد آور آئینے میں اپنا جائزہ لیا وہ خود کو پہچان ہی نہ پایا تھا۔ اسے اب امجد کی حیرانی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اسے جو حیرت ہو رہی تھی اس کے اندازے کے مطابق وہ ایک دو ماہ سے جنات کے پاس رہا تھا۔ مگر اس کی تبدیلی کچھ اور کہہ رہی تھی۔ جسم کا گوشت بہت سخت ہوگیا تھا۔ چہرہ کچھ پچک گیا تھا۔ بازوؤں کی مچھلیاں واضح نظر آرہی تھیں۔ جسم کا گوشت بہت سخت تھا۔ اس نے خود کو کسی باڈی بلڈر سے کم نہیں پایا تھا۔ جنات کے بچے اسے ستانے کے لیے میلوں بھگاتے تھے کئی فٹ لمبی چھلانگیں لگواتے تھے وہ ان سے بچنے کے لیے پھرتی سے اچھلتا کودتا تھا۔ سب تبدیلی کا عمل شاید وہیں سے شروع ہوا تھا۔ ایک خیال کے تحت اس نے دو تین بار کمرے کے اندر لمبی چھلانگ لگانے، باکسنگ کی طرح پھرتی سے ہاتھ چلانے کا تجربہ کیا تھا۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ وہ لمبی چھلانگیں لگا سکتا تھا۔ تیز بھاگ سکتا تھا۔ فلائنگ کک کے علاوہ ہوا میں اچھلنا، قلابازی کھاتے

ہوسے خود کو بچانا وہ ماہر لڑاکا باز کی طرح ہر داؤ پیچ کر سکتا تھا۔ اس خاصیت کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ جنات کی دنیا میں ایک دو ماہ نہیں پورا ڈیڑھ سال رہا تھا۔ اس دوران مقدر نے اس کے گلے میں یتیمی کا طوق ڈال دیا تھا۔ پاپا کی دائمی جدائی نے اسے بہت بڑا صدمہ پہنچایا تھا۔ گھر کے حالات دیکھ کر وہ مزید اداس ہو گیا تھا۔

اذان اور کامران بھائی اسے ملنے آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ دیگر عزیز رشتہ داروں کی طرح یہ رسم دنیا انہوں نے بھی خوب نبھائی تھی۔ بس روبینہ آنٹی دو دن رکی تھی۔ گاؤں والے بھی ٹولیوں میں ملنے آتے جاتے رہے۔ سب کا گمان تھا شانی پراسرار پہاڑیوں میں گم ہوا ہوگا مگر شانی نے اغواء کی من گھڑت کہانی سنا کر سب کو مایوس کیا تھا۔ کیسے اغواء برائے تاوان کے گروپ نے اسے اغواء کیا۔ وہاں سے بھاگ کر راہ بھٹک گیا کر وہ کا مسکن گھرا گھنا جنگل تھا۔ وہیں وہ ایک اور گروپ کے ہتھے چڑھ گیا جو اس سے مختلف مشقت لیتے رہے آخر میں ایک دن موقع ملتے ہی وہاں سے بھاگ نکلا۔ اصل بات سوائے ممی کے اس نے سب سے مخفی رکھی تھی۔ شانی کا دل اب پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ ایک دو دن کالج جا کے دیکھ لیا تھا دو دو لڑکوں کی پٹائی کر کے آیا تھا۔ ممی سے کہہ کر اس نے کالج جانا چھوڑ دیا تھا۔

"ممی میں زمینوں کی دیکھ بھال کروں گا۔ ڈیڈی کی جگہ مجھے سنبھالنا ہوگی ورنہ بے حس معاشرہ ہمیں نگل جائے گا۔ کامران اور اذان بھائی ہماری دنیا میں لوٹ کر آنے والے نہیں اس لیے یہ فریضہ مجھے انجام دینا ہے۔"

بیگم کلثوم کو پتہ تھا شانی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے شانی کو زمین کی دیکھ بھال کرنے کی اجازت دے دی۔



پاکستان میں مختلف درجہ بندیاں کی گئی ہیں۔ عوام، حکمران اور مذہبی حلقے۔ ان طبقوں میں مزید تقسیم کی گئی ہے۔ عوام میں غریب، متوسط، سرمایہ دار، بزنس مین، صنعت کار وغیرہ۔ حکمرانوں میں باضمیر، بے ضمیر، عیاش، مادہ پرست، ایماندار، خیانت پرست، مذہبی اور غیر مذہبی۔ مذہبی حلقوں میں جنونی مذہبی، عام مذہبی، مذہب پر مرنے والے اور مذہب کو خاموشی سے اپنانے والے۔ عوام پر مہنگائی، بیروزگاری، دہشت گردی، فرقہ پرستی، اور خوف کی ان دیکھی ایسی فضا قائم کر رہے ہیں کہ وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ سڑکوں پر نکلنے کی جرات نہ کر سکیں، ہاں مگر جب ہم چاہیں گے۔

بزنس مین، صنعت کاروں کو ان کے سرمایہ میں الجھا رہے ہیں۔ بے اصول اور با اصول سیاستدانوں میں تفریق شروع کر دی ہے۔ ایسے لوگوں کو حکومت کے تخت پر بٹھانا ہمارا مشن ہے جو صرف زر اور زمین کا سوچتے ہیں۔ حکمرانی کرنے کا جنون ہے مادی حاجات، مسرتیں، راحتیں اور سہولیات جن کا مشن ہے ملک میں سیکڑوں متنازعہ مسائل کھڑے ہونا شروع ہو گئے ہیں جس سے ملک دھیرے دھیرے انتشار، بدامنی اور دیوالیہ پن کی طرف گامزن ہے۔ اسمبلیاں اور عدالتیں کبھی نہ ختم ہونے والے مسائل پر الجھ کھڑے ہوئے ہیں۔ عدالتیں اور ادارے باہم ٹکرانا شروع ہو گئے ہیں جس سے ملک کا نظام تہہ و بالا کیا جا سکتا ہے۔ حکومتی کرسی پر بے رحم ظالم اور دولت سمیٹنے والے لوگوں کا قبضہ ہوتا جا رہا ہے۔

ہم نے کسی بھی اسلامی ذہن کے حامل لیڈر کو پاکستان میں پنپنے نہیں دیا۔ اگر کوئی مذہبی جماعت کا جھنڈا اٹھائے کھڑا بھی ہے تو مقصد ووٹ حاصل کرنا ہے تقریباً پوری سیاسی قیادت پر ہمارا کنٹرول ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے جو بھی آئے گا ذاتی مفاد کے لیے آئے گا عوامی مسائل حل کرنے اور ملک کو معاشی ترقی پر گامزن کرنے کا کسی کو خیال نہیں۔ ہم نے وہاں کا ماحول ایسا بنا دیا ہے جس کو اقتدار مل جاتا ہے وہی عوام کو لوٹنا شروع کر دیتا ہے۔ ہم انہیں فرضی ڈرامے کے ذریعے پہلے منتخب کروا کرتے ہیں جو بھی جیت کر اعلیٰ منصب پر فائز ہوتا ہے اس سے ہمیں

کوئی فرق نہیں پڑتا ہر پارٹی کا لیڈر ہمارے دائرے میں قید ہے۔ ہم نے پاکستان میں سوشلسٹ انارکسٹ کمیونسٹ پیدا کر دیئے ہیں۔ اب وہاں کبھی عدل و انصاف کا اسلامی قانون لاگو نہیں ہو سکے گا۔ مذہب میں فرقہ پرستی کو خوب ہوا دے رکھی ہے۔ جذباتی جنونی اوباش نوجوان کو مراعات یافتہ طبقے کے خلاف عنقریب کھڑا کر دیں گے۔ لوگوں کو مطبوعہ نصاب پر اندھا دھند یقین کرنے کی راہ پر ڈال دیا گیا وہ از خود انسانی طبقات و حالات کا ادراک نہیں کر سکتے بلکہ میڈیا کے مواد پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ اس لیے پوری میڈیا کو کنٹرول کرنے کا پروگرام بھی ہمارے مشن میں شامل ہے۔ حکومت کی رگ و پے میں بدعنوانیاں، دھوکہ فریب اور کرپشن ڈال رہے ہیں ملک میں دغا بازی، فریب کاری، آوارگی اور بے راہ روی کا عام چلن کیا جاتا ہے۔ یہ سب پاکستان میں ہونے والا ہے۔ ہم یہاں پس پردہ رہ کر اپنی حکمرانی مسلط کر رہے ہیں۔

یہ وہ رپورٹ تھی جو پاکستان کے بارے میں تیار کی گئی تھی۔ ساتھ ہی اس میں مشن کے چند اہم نکات کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس نیو ورلڈ آرڈر کے اہم عہدے داروں نے فائنل کیا تھا۔ سب کا متفقہ فیصلہ ہوا تھا دنیائے اسلام کے انتہائی اہم ملک پاکستان پر کنٹرول چاہے پس پردہ ہی حاصل کیا جائے بے انتہا ضروری ہے۔



کائنات کا گرینڈ آرکیٹکٹ حیرم آبیف ہے۔ حیرم آبیف انسانی یا جناتی انسان ہے یہودیوں کی تحریف شدہ داستانوں کے مطابق حیرم آبیف ہی کائنات کا سینئر ماسٹر ہے۔ حیرم آبیف کو مقدس ہیکل کے کلس پر لے جایا گیا تھا۔ جہاں اس پر تشدد کیا گیا تھا۔ وہیں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔

حیرم آبیف یہودیوں کا دیوتا اور مسیحا ہے۔ یہ بات ڈیوڈ نے تمام اسرائیلی لیڈر شپ کے ذہنوں میں بٹھا دی تھی اس کے پیش نظر جدید لیبارٹریز میں کلوننگ کے نئے انداز میں تجربات سے گزارنا شروع کر دیا تھا۔ ڈیوڈ کا خیال تھا۔ کلوننگ کے ذریعے بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ تو مزید تجربات سے مردہ انسانوں میں کلوننگ کے ذریعے جان ڈالی جا سکتی ہے۔ اگر یہ تجربہ کامیابی سے ہم کنار ہو جاتا ہے تو نہ صرف ہم دیوتا حیرم آبیف کو زندگی بخش سکتے ہیں بلکہ پوری دنیا کا جنیاتی برتھ پر کنٹرول حاصل کر سکتے ہیں۔

ڈیوڈ سیاسی، سائنسی، عسکری اور مذہبی تمام حلقوں میں یکساں مقبول ہو رہا تھا۔ اس کی شخصیت کی چھاپ اس طرح تمام شعبہ زندگی پر پڑ چکی تھی کہ ہر ہر کوئی احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ جبکہ ڈیوڈ اس سے کہیں زیادہ کا خواہاں تھا۔ ڈیوڈ چاہتا تھا۔ اسرائیلی قیادت تمام مقاصد کو مذہبی نگاہ سے دیکھے تاکہ جب نیو ورلڈ آرڈر کی شروعات ہو تو حکمرانی کا تاج انہی کے سر سجا ہو۔ ڈیوڈ کے تمام یہودی علماء سے روابط تھے اسرائیلی اسرائیل کے عظیم عالم لینڈا ڈیوڈ کا مدعا اور احباب خاص میں شامل تھا۔ ڈیوڈ نے لینڈا کے ساتھ پارلیمنٹرین کی نشست کا اہتمام کیا۔ لینڈا کو وہ بتا چکا تھا کہ اسے لیکچر میں کیا کہنا ہے۔ 1948ء قیام اسرائیل سے پہلے ہم یہودیوں کی ایک ہی دعا تھی۔

اے خدا یہ سال یروشلم میں ہو۔ 1948ء ہماری فتح کا سال ثابت ہوا۔ ہم یروشلم میں جمع ہوئے۔ یہ کامیابی تب دو چند ہوئی جب ہم نے فلسطین کے اہم مقامات پر قبضہ جما لیا۔ تب سے ہمارے لبوں پر ایک ہی دعا ہے۔ اے خدا ہمارا مسیحا جلد آ جائے۔ مذہبی پیشوا لینڈا نے حاضرین محفل پر نگاہ ڈالتے ہوئے لیکچر کا آغاز کیا۔ تقریباً 60 پارلیمنٹرین اس کے سامنے ہمہ تن گوش بیٹھے تھے۔ لینڈا بات جاری رکھتے ہوئے بولا ہم سمجھتے ہیں ہمارا مسیحا جلد آنے والا ہے۔ سو ہمیں اس کی تیاری ترجیحی بنیادوں پر کرنا ہوگی۔ کیونکہ وہی ہمارا بادشاہ ہے۔ وہی ہمارا لیڈر اور قائد ہے۔ یاد رکھیں ہمارا مسیحا تمام یہودیوں کو ارض فلسطین میں آباد کرے گا۔ ہم سارے عربوں کو اسرائیل سے نکال دیں گے۔ ساری دنیا پر فقط یہودیوں کی حکمرانی ہوگی۔ کرہ ارض پر ہمارے لیے کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا جب ہمارا مسیحا نمودار ہوگا تب ہر طرف امن و امان ہوگا۔ کوئی دہشت

گردی نہیں پھیلا سکے گا۔ تمام مخالف قوتوں کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ لینڈا کی باتیں مٹھاس بھری تھیں جن کی سماعت سے اسرائیلی قارئین کے کانوں میں رس گھل رہے تھے۔ چہروں پر غیر معمولی جوش اور مسرت کا عکس تھا۔ وہ چشم تصور میں خود کو کل کائنات کا حاکم بنتا دیکھ رہے تھے۔ ڈیوڈ فرنٹ نشست پر براجمان تھا۔ وہ یہ دیکھ کر کہ اسرائیلی قائدین لینڈا کے لیکچر میں پوری طرح محو ہیں خوشی محسوس کر رہا تھا۔ ہال میں لینڈا کی آواز گونج رہی تھی۔

ہماری مقدس کتاب ایزا خیل میں لکھا ہے۔ ''اے صیہون کی بیٹی خوشی سے چلاؤ۔ اے یروشلم کی بیٹی مسرت سے چیخوں دیکھو تمہارا بادشاہ آرہا ہے۔ وہ عادل ہے اور گدھے پر سوار ہے۔ پھر یا گدھی کے بچے پر۔ میں یوفریم سے گاڑی کو اور یروشلم سے گھوڑے کو علیحدہ کروں گا۔ جنگ کے پرتوڑ دیے جائیں گے اس کی حکمرانی سمندر اور دریا سے زمین تک ہوگی''۔

اس روشنی میں ہمیں ایسے اقدام اٹھانے ہیں جو ہمارے مسیحا کے مددگار ثابت ہوں میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اسرائیلی قیادت جو بھی سیاسی سائنسی، عسکری فیصلے صادر کرے وہ اس بات کو ملحوظ رکھے کہ جلد ہمارا مسیحا آنے والا ہے۔ اسی کی تابعداری میں ہم کرہ ارض پر حکومت کرنے والے ہیں ہمارے گائیڈ نے TOMBSTONE (قبۃ الصخراء) اور مسجد اقصیٰ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

ہم نے اپنا تیسرا ہیکل وہاں بنانا ہے لینڈا نے لحظہ بھر رک کر حاضرین محفل پر نظر ڈالی پھر سوالیہ انداز میں پوچھا کیا ہم نے اس کی تیاری میں کچھ کیا ہے؟

مقدس لینڈا تیسرے ہیکل کی تعمیر کا ہمارا منصوبہ بالکل تیار ہے۔ تعمیراتی سامان تک آچکا ہے۔ جسے ایک انتہائی خفیہ جگہ رکھا گیا ہے۔ ہم نے بہت سی دکانیں اس کے لیے مختص کر رکھی ہیں جو ہیکل کے لیے نادر اشیاء تیار کر رہی ہیں۔ خالص ریشم کے تار بنا رہے ہیں۔ جن سے آپ جیسے دوسرے تمام علماء یہود کے لباس تیار کیے جائیں گے۔

''مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔ میرے دل میں اطمینان پورے سکون کے ساتھ بیٹھ گیا ہے۔ یہودی قیادت اپنے مقصد سے غافل نہیں ہے۔ ہم یروشلم بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کو بم سے اڑا دیں گے جس سے مسلم دنیا بھڑک اٹھے گی۔ جو اسرائیل کے ساتھ مقدس جنگ کا آغاز ہوگا۔ یہی بات ہمارے مسیحا کو مجبور کرے گی وہ درمیان میں مداخلت کرے گا اور ہمیں کرہ ارض کا حکمران بنادے گا۔''

''مقدس گائیڈ ہم نے مسیح کے لیے مکمل تیاری کی شروعات کر رکھی ہے۔'' ڈیوڈ نے کھڑے ہو کر انتہائی احترام سے کہا۔

''اگر مجھے میرے معزز قائدین اجازت دیں تو میں آپ کے گوش گزار کرتا ہوں۔ تا کہ آپ ہمیں مزید گائیڈ کر سکیں کہ ہم ٹھیک سمت میں جا رہے ہیں۔''

''مسٹر ڈیوڈ! آپ جو بھی کہنا چاہتے ہیں اجازت ہے۔'' نائب صدر نے ڈیوڈ کی طرف دیکھ کر خوش دلی سے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

''ہمیں مقدس گائیڈ لینڈا پر مکمل اعتماد ہے۔ یہ ہمیں ہماری درست سمت کا تعین کر کے دیں گے۔''

''تھینک یو سر'' ڈیوڈ نے سر خم کر کے نائب صدر کا شکریہ ادا کیا پھر لینڈا کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''ہماری جدید ترین لیبارٹریز میں تا حال جو بھی تجربات ہوئے ہیں ان کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ مقدس مسیحا کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔''

''مثلاً......؟''

''جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ہمارا مسیحا حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ہوگا جو عام عقل سے ماورا ہوں گی ان بے پناہ صلاحیتوں میں مزید اضافے کے لیے ہم نے ایسی ایجادات کی ہیں جو دنیا کی نظروں میں آجائیں تو دنیا پاگل ہو جائے۔ ہم نے ایسی لیزر شعاعوں پر قابو پالیا ہے جو فلک بوس عمارات اور دیوہیکل جہازوں کو غائب کر دیتی ہیں۔''

''ہم نے سمندر کی تہہ اور زمین کی گہرائی میں موجود

پلیٹوں کو ہلا کر زلزلہ پیدا کرنے کی صلاحیت بھی حاصل کر لی ہے۔ اب ہماری تجربہ گاہیں ایک عظیم تجربہ سے گزر رہی ہیں۔" ڈیوڈ کے لہجے میں اسرار اللہ آیا تھا۔ قائدین کے چہروں پر جوش بکھورے لے رہا تھا۔ ڈیوڈ نے سلسلہ کلام آگے بڑھایا۔

"ہم انسان کے دو ٹکڑے کر رہے ہیں اور اسے پھر سے ملا کر زندہ کرنے کے تجربات کر رہے ہیں ذرا سوچیے مقدس گائیڈ کیا یہ انوکھی ایجادات ہمارے مسیحا کی معاون ثابت نہیں ہوں گی۔"

"اسرائیلی قائدین سو فیصد درست سمت میں جا رہے ہیں ہمارے مسیحا میں ایسی سیکڑوں صلاحیتیں کارفرما ہوں گی اس لیے یہ ہماری انوکھی ایجادات۔ میں دیکھ رہا ہوں کرہ ارض پر یہودیوں کی حکمرانی کو کوئی روک نہیں سکتا۔" مقدس گائیڈ لینڈا نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"مقدس لینڈا! ہم ریڈیائی لہروں کے ذریعے نیا ہتھیار بنا رہے ہیں خاص فریکوئنسی سے ریڈیائی لہروں کو چھوڑا جائے گا۔ یہ لہریں انسانی دماغ پر اثر انداز ہوں گی حتیٰ کہ انسانی دماغ کو ناکارہ کر دیں گے۔ ہم اس سے مخالفین کے بہترین عسکری معاشی اور سائنسی دماغوں کو مکمل طور پر مفلوج کر دیں گے۔" ڈیوڈ نے قابل فخر لہجے میں بتایا جو وہ اس بات کو جانتے تھے وہ محظوظ ہو رہے تھے اور جن کے علم میں یہ باتیں پہلی بار وارد ہو رہی تھیں وہ حیرت سے ڈیوڈ کو دیکھ رہے تھے۔

"بے شک یہ ہم کامیابیاں ہیں۔" مقدس گائیڈ لینڈا نے قابل تعریف الفاظ میں سراہا۔

"مگر ہمارا مسیحا بہت طاقتور ہے ان کی عظمت اور طاقت سے بڑھ کر اور کیا اعتراف ہو یہودیوں کے سب سے بڑے مخالف اور ہمارے مسیحا کے دشمن مسلمان اپنی کتاب میں کہتے ہیں۔ اس کا ایک قدم تین دن کے سفر کے برابر ہوگا۔ یعنی تقریباً بیاسی کلو میٹر فی سیکنڈ وہ اپنے گدھے پر سوار ہو کر سمندر میں اس طرح داخل ہو جائے گا جیسے آدمی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر پانی کی چھوٹی نالی میں گھس جاتا ہے۔ ہمارے مسیحا کی سواری کے دونوں کانوں کے درمیان کا فاصلہ چالیس گز ہوگا تو سواری کتنی بڑی ہوگی۔"

"ہمارا مسیحا مقدس ہے عظیم طاقتور ہے۔ وہی ہمیں دنیا کا حکمران بنائے گا۔" یہودی عالم لینڈا کی بات سن کر کئی پر عقیدت آوازیں ابھریں۔ ڈیوڈ کی آنکھوں میں انوکھی چمک تھی سا انتہائی گہری اور پر اسرار۔

"میں آپ لوگوں کو بتاؤں۔ مسیحا سورج کو روک دے گا۔ وقت کو تھام کر ایک دن کو ایک ہفتہ ایک ماہ کے برابر کر دے گا۔ ہم مسیحا کی ان صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ٹائم مشین کے نام سے ایک ایسا انتظام بنانے میں مگن ہیں۔ جس کے ذریعے انسان کو گزرے وقت میں پہنچا دیا جائے گا۔ میری تمام قائدین سے التماس ہے عظیم اسرائیل کو عسکری لحاظ سے ناقابل تسخیر بنا دیا جائے خصوصاً چند مقامات کی خاص حفاظت کرنی ہے۔ جس میں سرفہرست اصفہان میں آباد یہودی بستی ہے کیونکہ ہمارا مسیحا اصفہان میں واقع یہودیہ سے ہی نمودار ہوگا۔"

"ہم جب دنیا کے نقشے میں نو وارد تھے تب بھی جنگ کپور میں عربوں کے دانت کھٹے ہو گئے تھے۔ اس دور میں عسکری لحاظ سے ہم انتہائی طاقتور بن چکے ہیں۔" وزیر دفاع نے یہاں بولنا مناسب سمجھا وہ کھڑے ہو کر کہہ رہے تھے۔

"ہمارا ایک بحری بیڑا جس میں ابراہیم لنکن جہاز بھی شامل ہے اس کی لمبائی 1108 فٹ اور چوڑائی 257 فٹ ہے۔ اس میں 5500 افراد کی رہائش کے لیے کوارٹر بنائے گئے ہیں۔ جہاز میں ایسے اعلیٰ انتظام ہیں کہ یہ افراد تین ماہ تک باہر کی مدد کے بغیر باآسانی رہ سکتے ہیں ریڈیو، ٹی وی اسٹیشن، ڈاکخانہ، باربر شاپ، جہاز کا حصہ ہیں۔ اس میں دو نیوکلیئر ری ایکٹر شامل ہیں اس پر جنگی جہاز ہر وقت تیار کھڑے رہتے ہیں ایک منٹ میں چار طیارے حملہ کے لیے بیک وقت پرواز کر سکتے ہیں علاوہ ازیں HERON طیارہ جدید ترین ٹیکنالوجی کے تحت

تیار کیا گیا ہے اس کی بلند پرواز 9 ہزار میٹر ہے ابھی تک یہ 30 گھنٹے تک مسلسل 225 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ سکتا ہے۔ ہم اس طیارے کو مزید جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ کر رہے ہیں۔ میں آپ قائدین کو تین چیزوں کے بارے میں بتاتا ہوں۔ یہودی عالم لینڈا نے لحظہ بھر رک کر حاضرین محفل کو دیکھا تمام چہروں پر جوش و خروش ہنوز موجود تھا۔ وہ سب پورے انہماک سے لینڈا کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کی غیر معمولی دلچسپی ہی ان کے عزم و حوصلے کا ثبوت تھا۔ ہمیں تین مقامات کی حفاظت ہر صورت کرنا ہوگی۔"

"بیسان کے باغات، بحر طبریہ SEA OF GALIHLEE اور زغر کا چشمہ۔ یہ تین نام نہ صرف اپنے اذہان و قلوب میں بٹھا لیجئے بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی باور کروائے گا ان کی حفاظت جان سے بڑھ کر کرنی ہے۔ مقدس لینڈا یہ علاقے اسرائیل کا حصہ ہیں جبکہ اسرائیل کا چپہ چپہ ہمیں عزیز از جان ہے اور ہم بات سنئے! اسرائیل کو عظیم تر اسرائیل بنانے کا خواب ہمیشہ ملحوظ رکھئے۔ اٹھارویں صدی میں پیش کیے جانے والے یہودیوں کے گریٹ 24 پروٹوکولز کو ازبر کرنا ہم سب پر فرض ہے۔ یہ پروٹوکولز 1897ء میں پہلی صیہونی کانفرنس کے موقع پر بہل کے مقام پر جاری ہوئے جس کی صدارت جدید صیہونیت کے باوا آدم تھیوڈ ہرزل نے کی۔ ہمیں مذہبی جذبے سے یہود کی عالمی بادشاہت قائم ہونے سے پہلے اس کے لیے تمام راہیں ہموار کرلی ہیں۔"

پروٹوکول نمبر 6 میں لکھا ہے۔ "ہمیں ہر ممکن طریقے سے اپنی سپر گورنمنٹ کی اہمیت کو واضح کرنا ہوگا۔ تاکہ ہمارے دائرہ اطاعت میں آنے والی قومیں ہمیں از خود اپنا محافظ اور محسن سمجھ سکیں۔ ہم اگر صرف اس چھوٹی سی بات پر مکمل عمل پیرا ہوں تو تمام مقاصد ہماری مٹھی میں ہوں گے۔"

"ہم کسی صورت اس مشن سے پیچھے نہیں رہیں گے۔"

"گورن میں جواب سنکر نہ صرف یہودی عالم لینڈا کا چہرہ فرط مسرت سے کھل اٹھا تھا بلکہ ڈیوڈ بھی شادماں نظر آ رہا تھا۔

"یاد رکھئے جو قومیں اپنے اسلاف کے اقوال کو یاد رکھتی ہیں کامیابی و کامرانی انہی کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ اس کی چھوٹی سی مثال دیتا ہوں اس کے بعد آج کی نشست برخاست کرتے ہیں۔

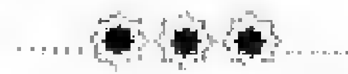
اسرائیل کے پہلے وزیراعظم ڈیوڈ بان گورین نے 1967ء کی عرب اسرائیل کی جنگ کے فوراً بعد فرانس کی سار بون یونیورسٹی میں ممتاز یہودیوں کے اجتماع میں ایک خدشے کا اظہار کیا تھا۔ آج وہ خدشہ ہمارے سامنے ٹھوس حقیقت بن کر کھڑا ہے۔ محترم وزیراعظم نے کہا تھا۔

بین الاقوامی صیہونی تحریک کو کسی طرح بھی پاکستان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ پاکستان درحقیقت ہمارا اصلی آئیڈیالوجی جواب ہے۔ پاکستان کا ذہنی و فکری سرمایہ اور جنگی و عسکری قوت و کیفیت آگے چل کر کسی بھی وقت ہمارے لیے باعث مصیبت بن سکتی ہے۔ ہمیں اچھی طرح سوچ لینا چاہئے بھارت سے دوستی ہمارے لیے انتہائی اہم اور مفید ہے۔ ہمیں اس تاریخی دشمنی سے فائدہ اٹھانا چاہئے جو ہندو مذہب پاکستان اور اس میں رہنے والے مسلمانوں کے خلاف رکھتا ہے۔ یہ تاریخی عداوت ہمارے لیے زبردست سرمایہ ہے۔ لیکن ہماری حکمت عملی ایسی ہونی چاہئے کہ ہم بین الاقوامی دائروں کے ذریعے ہی بھارت کے ساتھ اپنا ربط و ضبط رکھیں۔

شاید ہم نے ان کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ نتیجہ آج پاکستان کو دیکھئے۔ پہلا اسلامی ایٹمی ملک بن کر ہمارا منہ چڑا رہا ہے۔

یہ ایسی ناقابل تردید حقیقت تھی کہ کوئی بھی شخص لب کھولنے کی جرات نہ کر سکا۔ تاہم چند منٹوں بعد موساد کا سربراہ کھڑا ہوا۔ "ہم نے عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کو 7 جون 1981ء میں اس وقت تباہ کر دیا تھا جب وہاں

محافظوں کی شفٹ بدل رہی تھی۔ پہلی شفٹ کے ختم ہونے اور دوسری شفٹ کے ڈیوٹی سنبھالنے کے درمیانی وقت کا ہم نے سوفی صد درست سراغ لگا کر بھرپور حملہ سے سب کچھ تباہ و برباد کردیا تھا۔ اس کامیاب تجربے کو ہم پاکستان پر آزمانے کے لیے بالکل تیار تھے مگر بدقسمتی سے سعودی عرب کے اواکس طیاروں نے ہمارے 6 سکوئیڈرنوں کو اس وقت دیکھ لیا جب وہ انڈیا کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ سعودی فضائیہ نے اس کی اطلاع پاکستان کو فراہم کردی تھی اور پاکستان کی فوج نے مواصلاتی سیٹلائٹ کے ذریعے ہمارے طیاروں کی مانیٹرنگ شروع کردی تھی اور انڈیا سے ایسی بازپرس کی کہ بحالت مجبوری ہمیں اپنی منصوبہ بندی پر نظرثانی کرنا پڑی لیکن تاحال ہم اس مشن سے غافل نہیں ہیں۔ غافل رہنا بھی نہیں چاہیے جو چیتے کی آنکھ رکھتا ہے کامیاب وہی ہوتا ہے۔" یہودی عالم لینڈا نے مذہبی نشست کا اختتام کیا تو ڈیوڈ اپنا مقصد پا چکا تھا۔ جب اسرائیلی قائدین وہاں سے رخصت ہورہے تھے تب ان کے دل و دماغ ڈیوڈ کی سوچ میں رنگ چکے تھے۔



"تم سنگین غلطی کررہے ہو۔"

"کیا مطلب سنگین غلطی؟ دوستوں کے ساتھ انجوائمنٹ سنگین غلطی کے زمرے میں کیسے آسکتی ہے۔"

"گناہ کی طرف اٹھنے والے ہر عمل قدم کو انجوائمنٹ کی چادر میں چھپا کر تم بری الذمہ نہیں ہوسکتے۔"

"اوہ مائی گاڈ! تمہارا لیکچر کبھی ختم نہیں ہوگا۔ میں پچھتا رہا ہوں اس گھڑی کو جب تمہارے نام پر آمین کہا تھا۔"

"بھول رہے ہو۔ میں ازل سے تمہارے ساتھ ہوں۔ آمین کہنا ہی تمہارے حق میں اچھا تھا۔ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تمہیں غلط راستوں کا مسافر بنتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"میں کسی مقتل گاہ نہیں جارہا بس ہی ڈاکہ زنی کرنے کا ارادہ ہے۔"

"ہاں مگر طوائف کے پاس جارہے ہو گولان کی پہاڑیاں اور بوڑھے جن کی باتیں تم بھول رہے ہو۔"

"تم غلط بول رہے ہو میں کچھ نہیں بھولا میں نے وہاں بہت سا قیمتی سرمایہ پایا ہے۔"

شانی کو گولان کی پہاڑیوں میں جو کچھ ملا تھا وہ پراسرار تو تھا ہی بہت باکمال بھی تھا۔ وقت رخصت بوڑھے جن نے اسے تین حیرت ناک تحفے بخشے تھے۔

"یہ روشن نواز ہے۔ اسے ہمیشہ روشن رکھنا۔ اس کا حسن کبھی ماند نہ پڑنے دینا اس کا روشن دیا جب تک جلتا رہے گا تمہاری دنیا و آخرت سنوری رہے گی۔ یہ ہم نواز ہے یہ تمہیں آسمان کی وسعتوں سے لے کر زمین کی گہرائیوں تک پہنچائے گا۔ یہ تمہیں تم سے پہلے منزل تک پہنچائے گا مگر یہ از خود کچھ نہیں۔ تم نے خود اس سے کام لینا ہے۔ جب تم اس سے کام لوگے تب یہ تمہیں تمہارے پہنچنے سے پہلے منزل کا پتہ دے گا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"سمجھ جاؤ گے رفتہ رفتہ سب جان جاؤ گے۔"

"اگر آپ بتانا پسند کریں تو میں تھوڑی سی تفصیل جاننا چاہوں گا۔ کیونکہ میں بہت الجھ گیا ہوں۔"

"تم جس منزل کے لیے سفر کا ارادہ رکھتے ہو ہم نواز منزل کی آگاہی ابتدائے سفر میں فراہم کرسکتا ہے۔"

"میں پھر بھی نہیں سمجھا۔"

"تم ابھی سے کچھ ہی دن بعد پاکستانی سرزمین پر ہوگے ہم نواز کو حکم دو یہ تمہیں وہاں کے حالات کی مکمل رپورٹ لاکر دے گا۔"

"اوہ!" شانی کے ہونٹ حیرت سے سکڑ گئے تھے آنکھیں ناقابل یقین حیرت سے پھیل گئی تھی۔

"یہ کیسے ممکن ہے.....؟" الفاظ کا خروج بمشکل ہو پایا تھا۔

"آزمائش شرط ہے۔" بوڑھے جن نے فراخدلی سے کہا۔

شانی نے ہم نواز کو حکم دیا۔ "میرے گھر کے حالات پتہ کرو۔" محض پانچ منٹ بعد ہم نواز نے اسے وہ سب

بتایا جو اس نے گھر پہنچ کر دیکھا تھا۔

"اس کا مطلب ہے ہم نواز مجھے مستقبل کے حالات بتا سکتا ہے۔" شانی نے پراسرار لہجے میں پوچھا تھا۔

"مستقبل۔ اندھا کنواں ہے غیب ہے نظروں سے اوجھل اور غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ ہم نواز تمہیں مستقبل کا نہیں حال کا احوال بتائے گا۔ اس نے ابھی جو کچھ بتایا یہ حال ہے مستقبل نہیں کیونکہ تمہاری ممی اس وقت کنزہ کے ساتھ لان میں بیٹھی ہیں مگر پانچ منٹ بعد جب تم وہاں پہنچو گے کہاں ہوگی یہ ہم نواز جاننے سے قاصر ہے۔" شانی کو یہ انتہائی پراسرار اور عجیب وغریب اضافی صلاحیت مل گئی۔

"یہ عاصم نواز ہے اسم با مسمیٰ روکنے اور ٹوکنے والی اس کی بری عادت ہے مگر اس عادت کو برداشت کرنا جہاں روکے رک جانا۔ جہاں اجازت دے چلے جانا۔ یہ بہت ڈھیٹ اور ضدی ہے۔ اس کی ضد سے بچ کر رہنا۔ یہ تینوں ہمہ وقت تمہارے ساتھ رہیں گے تمہارے سوا کسی کو نظر نہیں آئیں گے ان سے میرے بتائے گئے طریقے سے کام لیتے رہنا مخالفت سے حتی المقدور پرہیز کرنا اور کبھی عاصم نواز کو مرنے نہ دینا۔ روشن اور ہم نواز تو ٹھیک ہے مگر عاصم نواز تمہیں اسے قبول کرنا ہوگا۔ کلاس میں ٹیچر نہ ہو تو بچے کلاس روم میں دھما چوکڑی مچا دیتے ہیں نظم وضبط برقرار رکھنے کے لیے ٹیچر کی موجودگی ضروری ہوتی ہے یہ تمہارا ٹیچر ہے ہاں البتہ ایک وقت آتا ہے جب اسے موت آجاتی ہے تب یہ خاموش ہوجاتا ہے روکنے یا ٹوکنے سے دور ہوجاتا ہے کوشش کرنا اسے مرنے نہ دینا۔"

شانی کے جسم میں جہاں کیمیائی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں وہاں رجحانات اور طبیعت میں طغیانی نے سر اٹھایا تھا۔ پڑھائی سے دل ویسے بھی اچاٹ کیا تھا۔ برداشت کی حد بلڈ پریشر کے مریض جیسی ہوگئی تھی۔ کالج کے آخری دن اس نے دو لڑکوں کی خوب پٹائی کی تھی۔ اس جھڑپ میں چیتے کی سی پھرتی سے لڑا تھا۔ ہرن کی طرح قلانچیں بھری تھیں۔ مدمقابل اس کے جسم کو چھونے سے قاصر رہے۔ جبکہ اس نے لاتوں گھونسوں اور فلائنگ ککس سے منٹوں میں انہیں چاروں شانے چت کردیا تھا۔ وہاں جمع ہونے والے مجمع پر سکتہ طاری تھا۔ خصوصاً اس کے دوست ولید، احمد اظہر وغیرہ اسے یوں لڑتا دیکھ حیرت سے دانتوں میں انگلیاں دبائے کھڑے رہ گئے تھے۔ جن لڑکوں کی شانی نے دھلائی کی تھی وہ کالج کے چھٹے ہوئے بدمعاش گروپ میں شامل تھے۔ جنہوں نے شریف لڑکوں کی زندگی اجیرن کردی تھی جب وہ درد سے کراہ رہے تھے تب کالج کے لڑکوں نے شانی کو کاندھوں پر اٹھالیا تھا اور خوب نعرہ بازی کی تھی۔ یوں شانی نے کالج بڑی شان سے چھوڑا تھا۔ شانی کے دوستوں نے اس میں لڑنے کی خاصیت بھانپ لی تھی۔ اس لیے جب شانی ان کے ساتھ ہو وہ بلا دریغ ہر مشکل جگہ گھس جاتے تھے۔ سینما یا سرکس کا ٹکٹ لینا ہو پارک کے ممنوعہ ایریا میں جانا ہو نو پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کرنا ہو۔ یا بازاروں میں بے پروائی سے گھومنا ہر وہ کام جس کا شوق رکھتے تھے مگر نظری خوف کے سبب کر نہیں سکتے تھے شانی کی پشت پناہی میں کر گزرتے تھے۔ کوئٹہ شہر میں ولید کا کزن شہزاد رہتا تھا۔ جس کی عیاشیاں بہت دراز تھیں ولید اس کے ساتھ ایک بار ڈیلی پالی کے کوٹھے پر جاچکا تھا اور وہاں کے روشن جلووں کا اسیر ہو کر آیا تھا۔ جب شانی نے پڑھائی چھوڑ کر اپنی گاڑی لے لی اور زمینوں کی دیکھ بھال کرنے لگا تو ولید نے دوستوں کے ساتھ مل کر روشن جلووں کا پھر سے نظارہ کرنے کا پروگرام ترتیب دیا۔ شانی نے بڑی فیاضی سے گاڑی پیش کردی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ولید تھا۔ ساتھ فراز براجمان تھا۔ عقبی سیٹ پر شانی کے ساتھ اظہر اور امجد تھے۔ عاصم نواز نے حسب عادت شانی کو روکنا شروع کردیا تھا۔

"شانی تم مسلمان ہو۔ مسلمان جانتا ہے کہ کوئی چیز شاید اسے بری لگے مگر اس کے حق میں بھی ہو اور عجب ہے کہ ایک ایک چیز اسے بھلی لگے اور وہ اس کے لیے مضر ہو اور خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ وہ نہیں جانتا اس لیے وہ اللہ تعالیٰ

کے احکام مانتا ہے۔ جسے تم انجوائے منٹ کہہ کر تفریح کا نام دے رہے ہو یہ تمہارے لیے ٹھیک راستہ نہیں ہے۔"

"اب بس بھی کرو پلیز۔" شانی نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ شاید اس کی آواز کچھ بلند ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا شانی تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"کچھ نہیں یار۔" شانی نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ پھر موضوع بدلنے کی خاطر ولید سے بولا۔

"یار ولید سی ڈی پلیئر تو آن کر کیا بور سفر گزر رہا ہے۔" ولید نے مسکرا کر آئینے میں اسے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر سی ڈی پلیئر آن کر دیا۔ گاڑی میں جدید میوزک کا شور گونجنے لگا۔ میوزک کے زیر اثر ولید نے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا تھا۔

"اوہ اوہو....." اظہر نے چہک کر نعرہ لگایا۔

"یہ ہوئی نا بات۔" شانی نے اس کا ساتھ دیا عاصم نواز خاموش ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا اب شانی کچھ نہیں سنتا۔ روشن نواز اور ہم نواز پہلے سے خاموش تماشائی تھے۔ تاہم روشن نواز عاصم سے نظریں چرا رہا تھا کیونکہ سیلیا نے روشن نواز سے دوستی گانٹھ لی تھی۔ سیلیا نے گرو جی کی ہدایت کے مطابق شانی کے لیے جو ڈگر منتخب کی تھی وہ روشن نواز کی طرف منتقل کر دی تھی جو گیم سیلیا کھیل رہا تھا شانی اس سے بے خبر تھا۔ تاہم سیلیا کو عاصم نواز سے ڈر تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا وہی اسے پہچان سکتا ہے اور نہ صرف پہچان سکتا ہے بلکہ اس کے خلاف طبل جنگ بھی بجا سکتا ہے۔

وہ لوگ کوئٹہ میں داخل ہو چکے تھے ولید نے گاڑی سیدھی ذکیہ بائی کے کوٹھے کے سامنے روکی تھی۔

ذکیہ بائی روایتی طوائف تھی کھلاگ اور جہاندیدہ وہ چند با اثر سیاسی شخصیات کے بل بوتے پر اپنا دھندہ استوار کیے بیٹھی تھی۔ اس کا خیال تھا میری روشن گاہ میں جو ایک بار آتا ہے وہ بار بار آتا ہے۔ اس کے زیر سایہ حسن کی دیویاں ایسی اداؤں سے مالا مال تھیں کہ جوان دلوں کی تو بات کیا ڈھلتی عمر اور بوڑھے لوگوں میں آگ لگا دیتی تھی۔ رات کے اندھیرے میں دن کے اجالے کی طرح چمکنے والا ذکیہ بائی کا کوٹھا کئی ایسے سفید پوش چہروں سے آشنا تھا جنہوں نے تہہ در تہہ جھوٹ کا ملمع چڑھا رکھا تھا۔ کئی کوٹ، ٹائیاں اور سرکاری وردیاں کوٹھے کی کھونٹی سے لٹکی اپنی بے حرمتی کا ماتم کرتی نظر آتی تھی۔

مہوش ذکیہ بائی کا انتہائی کارآمد ہتھیار تھا۔ مہوش کا سڈول جسم، ڈھولک اور طبلے کی تھاپ پر گھنگرو کے ساتھ جب تھرکتا تھا تب حاضرین محفل کے دلوں پر بجلی بن کر گرتا تھا۔ ترستی نگاہوں والے اسے آہیں بھر کے دیکھتے تھے اور بھری ہوئی جیبیں خالی کر کے جاتے تھے۔ ذکیہ بائی ڈھیٹ کاروباری عورت تھی۔ وہ جانتی تھی طوائفوں کی دنیا میں خوبصورت لڑکی کو جس قدر پردے میں رکھا جائے اس کی اتنی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا مہوش مہینے میں صرف ایک بار فن کا مظاہرہ کرتی تھی اور وہ خاص دن ہوتا تھا اس دن ذکیہ بائی کی تجوریاں نوٹوں سے بھر جایا کرتی تھی۔ اس دن کوٹھے پر خصوصی محافظوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔ وہ جسم فروشی کے غلیظ دھندے میں ملوث تھی مگر سیاسی سماجی تجارتی اور اعلیٰ سوسائٹی میں اثر و رسوخ رکھتی تھی۔ انسانی گوشت کے بھوکے کئی بڑے نام اسے اپنا باس سمجھتے تھے۔

ولید کی معیت میں جب وہ لوگ اندر داخل ہوئے تو ذکیہ بائی نے خالص کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا۔

"آیئے آیئے زہے نصیب۔ آج ہمارے بالا خانے کی رونقیں دوبالا ہو گئی ہیں ہم خوش قسمت ہیں کہ اتنے خوبصورت نوجوانوں نے رونق بخشی ہے۔" ولید کے علاوہ سبھی اس رنگین دنیا سے ناآشنا تھے۔ ذکیہ بائی پہلی نظر میں پہچان چکی تھی۔ شانی کو یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا۔ وہ حیران تھا جب ولید نے ذکیہ بائی کے ساتھ بے باک جملوں کا تبادلہ کیا۔ ذکیہ بائی چالیس سال سے اوپر کی تھی۔ ہاں میک اپ کی بھرمار سے عمر رفتہ کو روک لگانے کی کوشش ضرور کی تھی۔

"آپ لوگ خوش قسمت ہو بابو۔ آج ہمارے کوٹھے کی جل پری مہوش کا شو ہے۔ تم لوگوں کو قسمت نے کیا مناسب وقت سونپا ہے۔" شانی، اظہر، امجد اور فراز وہاں کی

رونقیں دیکھ کر حیران تھے۔

"ولید بابو! آپ دوستوں کو لے کر ہال میں جاؤ سازندے پہنچ چکے ہیں ہماری جل پری بھی جلوہ افروز ہونے والی ہے۔" ہال کافی بڑا تھا مناسب ڈیکوریٹ سامان۔ برقی قمقموں اور قیمتی فرنیچر سے اس کی خوبصورتی میں گراں قدر اضافہ کیا گیا تھا۔ تین طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے ایک طرف قیمتی صوفے اور شاندار کرسیاں بچھی ہوئی تھیں وسبز قالین کے ساتھ چمکدار پردے جن پر عطر کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا ہال کا وسطی حصہ خالی تھا۔ جہاں مہوش نے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا تھا۔ سازندے واقعی ہال میں موجود تھے۔ ڈھولک اور طبلے کی تھاپیں کس رہے تھے۔ شانی نے تیکھی نظروں سے حاضرین محفل کو دیکھا۔ یوں تو وہاں ہر عمر کا فرد موجود تھا۔ تاہم عمر رسیدہ افراد کی بہتات تھی۔ ہال کے باہر تین طویل القامت اور کسرتی جسم کے مالک افراد کھڑے تھے شانی نے ہم نواز سے پوچھا۔

"کیا ان کی یہاں ضرورت ہے؟"

"جتنی ضرورت ان کی یہاں ہے شاید ہی کہیں ہو۔" ہم نواز کے جواب پر شانی حیران ہو گیا تھا۔ روشن ناز خوشی سے اچھل رہا تھا۔ جبکہ عاصم نواز نالاں سا خاموش بیٹھا تھا۔

"یہاں شوقین مزاج کے لوگ آتے ہیں اور جو بھی آتا ہے اپنی فطرت، مزاج اور خواہش کے مطابق شوق کو پورا ہوتے دیکھنا چاہتا ہے۔ جو ممکن نہیں ہوتا تب ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس پر ستم بہت سے لوگ بہک جاتے ہیں تب یہی محافظ ان کو کنٹرول کرتے ہیں کئی بار افراد کو اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ اب ذکیہ بائی یا اس کی کم سن دیویاں تو یہ کام کرنے سے رہیں۔"

شانی کے علم میں کہاں تھا کہ ہم نواز نے جو کہا اس کی عملی تصدیق ابھی سے ہو جائے گی۔ ڈھولک کی تھاپ بانسری کی لے اور گھنگھروؤں کی چھن چھن پر لچکتی شاخ کی طرح مہوش کا جسم یوں تھرک رہا تھا جیسے جسم میں برقی رو دوڑ رہی ہو۔ ابتداء کلاسیکل میوزک سے ہوئی ابھی دس منٹ گزرے تھے مگر مہوش کے قدم نوٹوں سے بھر گئے تھے۔ ذکیہ بائی دو خوش شکل نوجوانوں کو لے کر داخل ہوئی آنے والے نوجوان رنگ ڈھنگ سے کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ لگتے تھے عجیب و غریب ہیئر اسٹائل اور داڑھی کے انوکھے ڈیزائن ان کے فیشن ایبل ہونے کا ثبوت تھا۔ ذکیہ بائی کی خواہش تھی کہ یہ مہمان پاس صوفوں پر جا کر بیٹھیں۔ مگر وہ خواہ مخواہ بلا کسی وجہ کے شانی کے پاس رک گئے۔

"اے اٹھو یہاں سے ہمیں یہاں بیٹھنا ہے۔" شانی کو ان کا غیر مہذب لہجہ اچھا نہیں لگا۔ ولید امجد اور فراز کے دل کی دھڑکن رفتار پکڑ چکی تھی۔ وہ شانی کی طبیعت سے خوب واقف تھے۔ شانی جب سے اغواء کاروں کے چنگل سے آزاد ہو کر آیا تھا اس کے صبر کا پیمانہ بہت جلد لبریز ہو جاتا تھا۔ شانی نے غصیلی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"ساجد بابو! یہ جگہ آپ لوگوں کے لیے مناسب نہیں آپ آیئے سامنے صوفے پر بیٹھیے۔" ذکیہ بائی نے فوراً مداخلت کی۔

"ہم وہاں نہیں یہاں بیٹھیں گے۔ اے مسٹر تم نے سنا نہیں۔" نوجوان نے اس بار کرخت لہجے میں شانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ذکیہ بائی پریشان نظروں سے حاضرین محفل کو دیکھ رہی تھی جن کے چہروں کی تیوریاں ناپسندیدگی کا مظاہرہ کر رہی تھیں یہ مداخلت ان پر گراں گزر رہی تھی۔ کیونکہ مہوش کے قدم رک چکے تھے۔

"ولید بابو! آپ دوستوں کو لے کر صوفوں پر چلے جائیں یہاں ساجد بابو کو بیٹھنے دیں۔"

ولید کو ذکیہ بائی کا مشورہ معقول لگا تھا۔ مگر اس کے عمل سے پہلے ہی شانی کرخت لہجے میں بولا۔

"ہم جہاں بیٹھے ہیں وہیں رہیں گے آپ انہیں جو جگہ مناسب لگتی ہے وہاں لے جائیں۔"

"ساجد! کم آن یار۔ ہم یہاں انجوائے کرنے آئے ہیں لڑنے نہیں آؤ وہاں بیٹھتے ہیں۔" ساجد کے ساتھ کھڑے دوست نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنا چاہا مگر ساجد شانی کو گھورتے ہوئے بولا۔

"نہیں شہریار! اب تو مجھے ہر صورت یہیں بیٹھنا ہے۔" کہتے ہوئے ساجد نے بوٹ کی ٹھوکر شانی کو رسید کرنا چاہی مگر یہ گستاخی اسے مہنگی پڑی تھی۔ کیونکہ شانی نے اس کا پاؤں پکڑ کر نیچے کی طرف جھٹکا دیا تھا۔ جھٹکا اچانک اور خلاف توقع تھا۔ ساجد اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر پشت کے بل گر پڑا۔ شانی پھرتی سے کھڑا ہو چکا تھا۔ ہال میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ذکیہ بائی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھی۔ مہوش نے متوحش نظروں سے ایک لمحہ یہ منظر دیکھا اور پھر اندرونی حصے کی طرف بھاگ پڑی۔

"کیا کر رہے ہو بدتمیز لوگ۔"

"یار کیوں نشے میں بھنگ ڈال رہے ہو۔"

"انہیں مار جاؤ کر باہر نکال دو۔" ہال میں مختلف اظہار خیال کا سلسلہ جاری تھا۔ مگر اس سے ساجد اور شانی کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ شہریار نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس نے شانی کا گریبان پکڑنا چاہا تھا مگر شانی کی گھومتی ہوئی لات نے اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا تھا۔ ساجد بھی کھڑا ہو چکا تھا اور شانی کو گھونسہ مارنے کی جسارت کی تھی۔ جواباً جبڑا پکڑے کراہ رہا تھا۔ کیونکہ بروقت جھک کر شانی نے نہ صرف اس کا وار خالی جانے دیا تھا بلکہ پھرتی سے جواباً مکا بھی جڑ دیا تھا۔ حالات ذکیہ بائی کے کنٹرول سے باہر ہو چکے تھے۔ اس نے محافظوں کو بلا لیا تھا۔ شانی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

"پکڑو اس حرام زادے کو اور اتنا مارو کہ پھر یہ ذکیہ بائی کے کوٹھے پر بدنظمی کا تصور نہ کر سکے۔" ولید اور دوسرے دوست آنے والے محافظوں کے تیور اور جسامت دیکھ کر لرزہ براندام تھے۔

"شانی! چلو یار نکلو یہاں سے۔" وحید نے شانی کو کندھے سے پکڑنا چاہا تھا مگر شانی اس کی بات ان سنی کرتا ہوا۔ اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ کیونکہ ایک محافظ اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ شانی کے جگہ چھوڑنے پر حملہ آور آگے کو جھکا تو شانی نے نہ صرف اس کی کمر پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا بلکہ ساتھ ہی ایک ٹانگ پیچھے کی طرف ہوا میں معلق کر دی۔

اس عمل سے دوسرا محافظ جو تیزی سے اسے دبوچنے کے لیے لپکا تھا اس کے بوٹ سے یوں ٹکرایا جیسے کسی کا چہرہ تیزی میں اچانک کھلنے والے دروازے سے ٹکراتا ہے۔ یہ ٹکراؤ بوٹ کی ایڑھی اور محافظ کی ناک کا ہوا تھا۔ نتیجتاً ناک سے بہنے والے خون کی صورت میں نکلا تھا۔ اس کے بعد وہ رکا نہیں صرف محافظوں کو گرانے پر مجبور کر دیا بلکہ ساجد اور شہریار کی خوب ٹھکائی کی تھی۔ ہال چونکہ خالی ہو چکا تھا اس لیے اسے ہاتھ پاؤں چلانے کا پورا موقع ملا تھا۔ اس کے دوست ہراساں نظروں سے کبھی شانی کو دیکھتے تو کبھی ہال میں ادھر ادھر کراہتے پانچ افراد کو وہ شانی کی دیدہ دلیری کے قائل تو تھے مگر اس قدر مہارت اور جرأت مندی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ذکیہ بائی کا جیسے نام و نشان بھی نہیں تھا۔ چند منٹوں میں ہال کا نقشہ بدل گیا تھا۔ شانی نے ہم راز کو حکم دیا۔

"باہر کے حالات کا جائزہ لے کر بتاؤ۔" ہم نواز نے ایک منٹ میں اسے اطلاع دی۔

"سرفراز روڈ سے پولیس کی وین کوٹھے کی طرف آ رہی ہے۔ جبکہ پچھلی گلی سے بہت سے لوگ ہاکیاں اور ڈنڈے لیے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔" اب وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

"ولید یہیں رکنا ہوگا۔ جلدی کرو اظہر پولیس آنے والی ہے۔" شانی نے دوستوں سے تیز لہجے میں کہتے ہوئے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔



نیو ورلڈ آرڈر کی پالیسی کے تحت جو اقدامات اٹھائے جا رہے تھے اس کے باوصف دنیا کے حالات بتدریج تبدیلی کی طرف گامزن تھے۔ حالات بد سے بدترین ہوتے چلے جا رہے تھے۔ چھوٹی قوموں کو اپنا وجود برقرار رکھنا محال لگنے لگا تھا۔ بڑے ملک چھوٹے ملکوں کو نگلنے کے درپے تھے۔ تیسری دنیا کے ممالک کو ایسے مسائل سونپے گئے ہیں کہ ان کی عوام کو موت زندگی سے زیادہ آسان لگتی ہے۔ اقوام متحدہ کا ادارہ انسان کے منشور میں لکھتا ہے تمام

انسان قانون کے سامنے یکساں ہیں۔ انہیں کسی امتیاز کے بغیر بلا تفریق تمام حقوق مساوی ملنے چاہیے۔ اس کے باوجود ہر روز بیالیس ہزار انسان غذائی قلت اور افلاس اور بیماریوں کے سبب دم توڑ رہے ہیں۔ جبکہ یورپ اپنا فاضل غلہ ضائع کر دیتا ہے۔ ڈنمارک، ہالینڈ جیسے ملکوں میں ڈیری مصنوعات زیادہ بڑھ جائیں تو وہ سفاکی سے انہیں سمندر برد کر دیتے ہیں۔ یہ مصنوعات غریب ممالک یا قحط زدہ علاقوں میں بطور امداد یا سستے داموں فروخت کی جا سکتی ہیں۔ دنیا میں فی ایکڑ پیداوار کا تناسب پہلے سے چار گنا زیادہ بڑھ گیا ہے۔ ایک سال میں تین فصلیں حاصل کی جا رہی ہیں۔ مگر جب غریب ملک کی بات آتی ہے تو وسائل کی کمی کا بہانہ بنا دیا جاتا ہے۔ دنیا کی چھ ارب آبادی میں ایک چوتھائی آبادی کو روزگار میسر ہے اور یہ افراد ان ممالک کے باشندے ہیں جو ان کے ناپسندیدہ ممالک شمار کیے جاتے ہیں۔ اس کار خیر میں عالمی مالیاتی اداروں کا بھرپور کردار رہا ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر نے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف (انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ) کا خوب استعمال کر رہے ہیں حالات و واقعات ایسے پیدا کیے گئے ہیں کہ عالمی معیشت کا انحصار انہی دو اداروں کے کاندھوں پر اٹھ آیا ہے۔ ماہرین انہیں عالمی معیشت کی نبض کہنے لگے ہیں۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف نے اقوام عالم کو مٹھی میں جکڑ لیا ہے اور غریب ممالک کو مشروط قرضے فراہم کرتے ہیں۔ ساتھ ہی من مرضی کی ترپ دیتے ہیں۔ ان پر دباؤ ڈال کر وسائل پر اپنی اجارہ داری قائم کرتے ہیں۔ مقروض ممالک ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے کے لیے مجبور ہوتے ہیں عوام پر ٹیکس نافذ کروا کر مہنگائی کا تحفہ دیتے ہیں۔ سیاسی، سماجی، تعلیمی، تجارتی اور مالی نظام پر کنٹرول حاصل کرتے ہیں اس کے باوجود وہ قوم کے محسن کہے جاتے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو ممالک کی معیشت مکمل طور پر انہی اداروں کی گرفت میں ہے۔ ان میں ہر ملک اوسطاً 40 بلین ڈالرز کا مقروض ہے اس پر ستم یہ سود کی رقم اصل زر سے بڑھ گئی ہے۔ مغرب کی نام نہاد انسانی حقوق کی تنظیمیں جنہوں نے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے اپنے آقاؤں کو یہ بھی باور نہ کروا سکی کہ 1945ء سے اب تک سو سے زائد خوفناک جنگیں دنیا کا مقدر بنی ہیں آٹھ کروڑ 90 لاکھ، 63 ہزار افراد ان جنگوں کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ مالی خسارہ الگ، دنیا کے 68 ممالک تا حال کشیدگی اور سرحدی جھڑپوں میں پھنسے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں لیکن پھر بھی خفیہ ہاتھ انہیں جنگ و جدل میں جھونکے رکھتے ہیں۔ جب تھامس جیسے لوگ اپنے بڑوں کو ایسے کارناموں کی رپورٹ پیش کرتے ہیں تو ان کے کاندھوں پر شاباشی کی تھپکی دی جاتی ہے۔ اس تھپکی کی مرہون منت وہ جوش و خروش سے سرگرم ہو جاتے ہیں۔

"جوزف! میرے پاس وقت کم رہ گیا ہے مجھے آئندہ مہینے فائنل رزلٹ چاہیے۔"

"باس ہم مشن کی آخری سیڑھی پر قدم جمائے ہوئے ہیں۔ ہمیں آپ کی طرف سے فائنل کال کا انتظار تھا۔" جوزف کی اطمینان بھری آواز ماؤتھ پیس میں ابھری۔

"گڈ! میں نے اس علاقے کی مکمل رپورٹ منگوائی ہے۔ ہماری این جی اوز اور ان کے فنڈ سے قائم شدہ اسپتال بالکل ٹھیک کام کر رہے ہیں تم لوگ جیسے ہی ڈن کرو گے میں انہیں بھی کاشن دے دوں گا۔ یہ ہمارا ابتدائی قدم ہے۔ جو بطور ایک نمونہ ہم کرنے جا رہے ہیں۔" تھامس کو جوزف کی بات سے دلی تقویت میسر ہوئی تھی۔

"کامیابی کی صورت میں اس کی پاکستان بھر میں بتدریج کوشش کی جائے گی۔"

"او کے باس! مشن کی تکمیل کے بعد ہمارے لیے کیا حکم ہوگا؟"

"تمہیں اور بوتھم کو فی الحال وہیں رکنا ہے باقی عملے کو بھیج دینا۔ ہمارے اور موساد کے کچھ مشنز کے ایجنٹ پاکستان کا وزٹ کرنے والے ہیں چونکہ تم لوگوں کو وہاں بنیادی سہولیات زندگی میسر ہیں اور ٹھکانہ بھی محفوظ ہے

اس لیے انہیں وہیں ٹھہرا لیا جائے گا تم دونوں کو بھی ان کے ساتھ مل کر کام کرنا ہوگا۔"

"معاف کیجئے ہم کسی سے کم نہیں کیا۔ ہمارے ساتھ موساد کو کیوں ملایا جاتا ہے۔"

"تمہاری بات میں وزن ہے۔ جوزف! اور سچ کہوں تو میں خود بھی ایسا سوچتا ہوں۔ مگر یہ ہمارے بڑوں کا حکم ہے۔ جس کی حکم کی بجا آوری ضروری ہے۔"

"وہ لوگ کب پہنچیں گے؟"

"بیس پچیس دن لگیں گے تب تک تم لوگ اپنا کام مکمل کر لو۔"

"ٹھیک ہے باس! صداقت خان کے بیٹوں کا کیا ہوا؟"

"وہی جو ان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ دہکتی ہوئی آگ میں زندہ ڈال دیا تھا۔" تھامس نے انتہائی سفاکانہ لہجے میں بتایا۔

"تم ان کی فکر مت کرو۔ ان کی راکھ بھی ہوا کہیں اڑا لے گئی ہوگی۔"

"ہاں ان کی طویل عرصہ گمشدگی پر پاکستانی ایجنسیاں کیوں چوکنی نہیں ہوں گی... یا انہیں تلاش نہیں کیا جائے گا۔" جوزف نے بوتھم اور مارک کی طرف سے کیے جانے والے خدشے کا اظہار کیا تھا۔

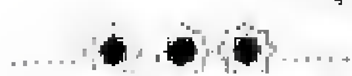
"اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جوزف۔ ان کی تلاش کا دورانیہ زیادہ طویل نہیں ہوگا اور نہ ہی ان کے کھوجنے والوں میں اتنا دم ہوگا کہ دنیا دو غیر معروف نوجوانوں کی گمشدگی پر اٹھ کھڑی ہو۔"

"ہاں مجھے اور بوتھم کو یہاں رکنا ہی ہے کیا ہمارے ساتھ ثریا نہیں رک سکتی۔ یہاں کے بور ماحول میں دن کاٹنا جیران بن جاتا ہے۔"

"نئے گروپ میں دو لڑکیاں شامل رہیں گی۔ دن تم کسی نہ کسی طرح کاٹ لینا۔ راتیں وہ بور نہیں ہونے دے گی۔"

"او کے وش یو گڈ لک باس۔"

تھامس کی نگرانی میں جو بیس لوگوں کی کمیٹی بنائی تھی اس میں کامیابی کے ایسے جھنڈے گاڑے تھے کہ ان پر داد تحسین کے پھول نچھاور کیے گئے تھے۔ اور تھامس کے سینے پر کاسی کے کئی تمغے سجے تھے۔ تھامس ان افراد میں شامل تھا جن کی نفرت مسلمانوں کے خلاف شدید ترین تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ زمین پر ایک بھی مسلمان زندہ نہ رہے وہ اسلام کو دہشت گردوں کا مذہب سمجھتا تھا۔ جس میں غیر مسلموں کو قتل کرنے کا درس دیا جاتا ہے۔ تھامس کی اس نفرت کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے اسے پاکستان پر کنٹرول کرنے والی تنظیم کا ڈائریکٹر منتخب کیا گیا تھا مگر یہ بات انتہائی خفیہ رکھی گئی تھی۔ ورنہ اس نے جب بھی پاکستان کا دورہ کیا تھا تو امریکی ایلچی کی حیثیت سے کیا تھا اور پاکستان میں جا کر کئی مراعات کا اعلان بڑی فراخدلی سے کیا تھا۔ تھامس نے پاکستان کے لیے کئی پیکج متعارف کروائے تھے جس سے بظاہر پاکستان کی معیشت کو استحکام ملے گا۔ ترقی کی نئی راہیں کھلیں گی۔ ملک خوشحال ہوگا اور بیروزگاری کا خاتمہ ہوگا۔ مگر ان پیکجز کے اندرونی مقاصد صرف وہی جانتا تھا۔

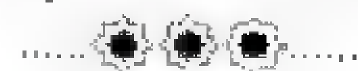


پاکستان پر اپنائی جانے والی تھامس کی پالیسیاں نہایت کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ پاکستان زرعی ملک ہونے کے باوجود گندم اور چینی درآمد کرنے پر مجبور ہے۔ لاکھوں ٹن گندم درآمد کی جاتی ہے۔ گندم، چاول، گھی اور دیگر ضروریات زندگی کی اشیاء کی قیمتوں میں اس قدر اضافہ ہوا۔ عوام بلبلا اٹھے تھے۔ تمام دواؤں پر آئی ایف ایف اور عالمی بینک سے دباؤ ڈلوا کر بھاری ٹیکس لگائے گئے تھے۔ اوپر سے عوام کو دہشت گردی، افراتفری، فرقہ پرستی، قوم پرستی، بدعنوانی کی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا۔ نوجوانوں کے دلوں میں اسلام میں عدم دلچسپی مغرب کی تقلید، نت نئے فیشن، گلی گلی انٹرنیٹ کیفے، موبائل فون، کیبل، ڈش، انٹرٹینمنٹ جیسی مہلک بیماری سرایت کر گئی تھی۔ نوجوان نسل کو بداخلاقی، بدچلنی، لاابالی کی طرف جانا

اس کے خاص مشن میں تھا۔ اس کے گرد منفی اشیاء اور سرگرمیوں کا ایسا جال بن دیا گیا تھا جس میں الجھ کر اپنی صلاحیتیں ضائع کرنے لگے تھے۔ تھامس جب بطور امریکی منسٹر پاکستان کا وزٹ کرتا تھا اور کئی پالیسیوں کا اعلان کرتا تھا۔ تھامس نے پاکستانی معاملات میں بہت مدت دخل اندازی کی تھی۔ نجکاری کو فروغ دیا تھا۔ بیرونی سرمایہ کاروں کے نام پر قومی اداروں کی فروخت جاری تھی۔ ایک بینک ایک فاؤنڈیشن کو فروخت کیا گیا تھا۔ بینک کے 52% شیئر صرف 22 ارب روپے میں فروخت ہوئے تھے۔ بنا سوچے سمجھے کہ بینک پلازہ اس سے زیادہ مالیت کا ہے۔ مذکورہ بینک کے ساتھ ساتھ دیگر بڑے بینک کی نجکاری پی آئی اے، ریلوے، واپڈا کو خود کفیل بنائے جانے کے نام پر۔ ان اقدام سے اشیاء صرف کی قیمتوں میں اضافہ ہوا، غربت بڑھی اور بے روزگاری عام ہوئی۔ نج کاری کے سلسلے میں غیر ملکی کمپنیوں کو فائدہ پہنچا جس سے ملکی سرمایہ کار اور صنعت کار شدید مشکلات کا شکار ہوئے۔

تھامس کا ایمان تھا جس ملک سے من چاہے نتائج حاصل کرنے ہوں اس ملک پر باتوں کے دھنی لوگوں کو صاحب اقتدار بنادو۔ جو صرف لن ترانیاں جانتے ہوں۔ جو عوام کے مسائل لمبی چوڑی تقریروں اور بلند بانگ وعدوں میں حل کریں۔ عملی قدم اٹھانے کا ان میں فقدان ہو۔ تھامس نے اس مفروضے کو پاکستان پر خوب آزمایا تھا۔

جس گروپ کو اب پاکستان روانہ کر رہا تھا اس نے وہاں اہم شہروں میں دہشت گردی کے واقعات کرنے تھے۔ ایسے ہولناک اور خطرناک واقعات کہ ہر واقعہ پچھلے واقعہ کی بازگشت مٹا دے گا۔ اس سے تھامس کو کئی قسم کے فائدے ملیں گے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ تھامس کی پالیسیاں اصل میں وہ پالیسیاں تھیں جو ڈیوڈ نے اسرائیلی سرزمین پر ہونے والی پہلی میٹنگ میں واضح کی تھیں۔ تھامس نے ڈیوڈ کی کئی باتوں کو عملی جامہ پہنایا تھا۔



جب نیو ورلڈ آرڈر نے دنیا کو کشیدگی، ہنگامہ آرائی، خوف و ہراس اور سب سے بڑھ کر نام نہاد دہشت گردی کی فضاء سونپی تو ساتھ ہی باور کروایا اب ڈیٹا انفارمیشن کا نظام کسی بھی ملک کے لئے ناگزیر بن چکا ہے۔ اسے خوبصورت نام کے ساتھ متعارف کروایا گیا۔ ملکی سلامتی اور حفاظتی تبدیلی کے لیے ملک کے اصل باشندوں کے کمپیوٹرائزڈ کوائف کا اکٹھے کیے جانا ضروری ہیں۔ اس کے لیے باقاعدہ ایک نظام وضع کیا گیا تھا۔ جن کا دائرہ کار دھیرے دھیرے پوری دنیا میں پھیلنا شروع ہو چکا تھا۔ ابتداء میں یہ کام صرف نام و ایڈریس اور تصویروں تک محدود تھا۔ مگر نیو ورلڈ آرڈر کے بڑوں نے اسے ادھورا قرار دیا۔ چنانچہ کسی نہ کسی عنوان کے تحت نام بمعہ والدین، مذہب، فنگر پرنٹ، آئی پرنٹ، تصویر، ایڈریس، خاندانی تفصیل اور بچوں کی تفصیل کو یکجا کیا جانے لگا۔ اس مد میں ہر ملک کو اربوں روپے کا مالی خسارہ بھی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ کہا جاتا ہے ایسا ملکی سلامتی کے لیے بے حد اہم ہے آج سے پندرہ سال قبل ملکی سلامتی کو کوئی خطرات لاحق نہیں تھے۔ تاہم کام بنا کمپیوٹر کے سرانجام پاتے تھے۔ حتیٰ کہ پاکستان میں شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بھی ہاتھ سے لکھے جاتے تھے۔ مگر اب ملکی سلامتی خطرے میں کیوں پڑ گئی ہے۔ ایسے حالات کس نے پیدا کیے ہیں۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مد مقابل کس نے کھڑا کیا۔ بندوق اٹھانے والے ہاتھ بھی مسلمانوں کے سر گولی کھانے والا سینہ بھی مسلمان کا۔ یہ سب کس نے کیا اور اس سے کون فائدہ اٹھا رہا ہے؟

ان سوالوں کا جواب تلاشنے کے لیے شاید آج کے پرآشوب دور میں کسی کے پاس وقت نہیں رہا۔

ڈیوڈ کو بیلجیم کے دارالحکومت برسلز بلوا کر ماسٹر کمپیوٹر کے بارے میں بریفنگ دی گئی تھی۔ اس ماسٹر کمپیوٹر میں روئے زمین پر بسنے والے ہر فرد کی پوری ڈیٹیل کو محفوظ کیا جا رہا تھا۔ گویا دنیا کا ہر فرد دھیرے دھیرے خفیہ آنکھ کی نگرانی میں جا رہا تھا۔ بظاہر یہ کام تلاشی کرنے کے لیے کافی تھا مگر ڈیوڈ کا شاطرانہ دماغ اس سے کہیں آگے تیز چلتا

تھا۔ ڈیوڈ نے اپنی فطرت کے عین مطابق اسے وسیع کرنے اور اس سے دیگر کام لینے کا انوکھا منصوبہ بنا کر بڑوں کو ایک بار پھر ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ کیا مجھے بتایا جا سکتا ہے ماسٹر کمپیوٹر میں انٹری کی جانے والی افراد کی ڈیٹیل کے کیا ذرائع ہیں؟

"مسٹر ڈیوڈ! ہمیں مختلف ذرائع سے ایک فرد کی مختلف ڈیٹیل موصول ہوتی ہیں جنہیں ہم ایک پروفائل میں محفوظ کر کے ماسٹر کمپیوٹر میں فیڈ کر دیتے ہیں ملکی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ سے ہمیں نام بمعہ والدین، تصویر، مذہب، فنگر پرنٹ اور ایڈریس موصول ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں معلومات و اطلاعات فراہم کرنے کے لیے بہت سی ڈیٹا کمپنیاں سامنے لائی گئی ہیں اکثر یہ سروے کے توسط سے کاروباری حضرات اور خریدار ڈیٹیل فراہم کرتے ہیں اس سے نام و پتے کے ساتھ پرسنل فون نمبر اور ای میل ایڈریس جمع ہو جاتے ہیں۔ رعایتی کارڈ بظاہر کسی بڑے شاپنگ سنٹر میں ڈسکاؤنٹ دلانے کی خاطر جاری کیا جاتا ہے۔ مگر اس سے ہمیں ہر انفارمیشن مل جاتی ہے۔ خصوصاً افراد کی پسند ناپسند، رحجانات کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس نے کون سی شاپنگ کی ہے۔ کون سا برانڈ پسند اور کون سا ناپسند ہے۔ بینک کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس، نیشنل انشورنس کارڈ سب کو کمپیوٹرائزڈ بنا دیا گیا ہے اس کے ساتھ ساتھ این جی اوز کے علاقائی سروے میں افراد کی تعلیم، مذہبی رحجانات اور مصروفیات کا علم ہوتا ہے۔"

ان تمام معلومات کو سپر کمپیوٹر میں فیڈ کیا جاتا ہے۔ سپر کمپیوٹر سے من چاہے نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم ڈیوڈ نے اگلا اسٹیپ سوچ کر نیو ورلڈ آرڈر کے بڑوں کو منزل مقصود کے قریب پہنچا دیا تھا۔

جب ڈیوڈ نے بولنا شروع کیا تو اسے بریفنگ دینے اور بریفنگ سننے والے اس کی باتوں کے سحر میں کھو گئے تھے۔ اس وقت نیو ورلڈ آرڈر کی زیر نگرانی تقریباً 48 گلوبل پوزیشننگ سیٹلائٹ مدار میں موجود ہیں۔

"ابتداء میں ہم ان سیٹلائٹ کو ٹیکنیکل جنگوں ہتھیاروں اور بحری جہازوں میں استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ یہ موصول شدہ سگنلز پر عمل کرنے اور سگنلز فراہم کرنے والے آلے کی جانب صحیح معلومات پہنچانے کی بہترین صلاحیت سے مالا مال ہیں۔ ہم اس میں بہتری لائے انہیں موبائل اور لیپ ٹاپ میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مگر میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں ان سے مزید کام لینا چاہیے۔"

"وہ کام کیا ہو سکتے ہیں ڈیوڈ؟"

"ایسے آلات بنائے جائیں جو ان سیٹلائٹ کے ذریعے کرہ ارض کے ہر فرد پر سورس سگنلز پیدا کریں اس کے لیے ہم برقی ٹیگ یا مائکرو چپ سے کام لے سکتے ہیں۔"

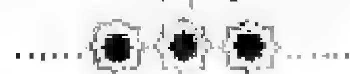
"برقی ٹیگ کا مائکرو چپ سے کون سے طریقے سے استعمال کیا جائے کہ دنیا کا ہر شخص سورس سگنلز کے زیر سایہ ہو۔ بالفاظ دیگر دن رات کے چوبیس گھنٹے ہماری نگرانی میں رہیں۔"

"کسی بھی شخص کے مقام کا پتہ لگانے اور اس کے اصل محل وقوع کے بارے میں جاننے کے لیے ہم ایسی مائکرو چپ ایجاد کریں گے جس کے سگنلز زمین کے سب سے نچلے مدار پر موجود ہمارا سیٹلائٹ پکڑ سکے۔ اس مائکرو چپ کو ہم بینک کے اسمارٹ کارڈ، کریڈٹ کارڈ، فون کارڈ، موبائل سم اور ممکنہ طور پر نیشنل آئی ڈی کارڈ میں فٹ کر سکتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں دنیا میں بڑی تیزی سے پھیل رہی ہیں۔ جب ہم مائکرو چپ یا برقی ٹیگ کو اپنی مرضی کے مطابق فٹ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ تب تمام ملکوں سے ہمارے کمپنیاں معاہدے طے کریں گی۔ اس سے نہ صرف یہ ان ممالک میں پھیل جائیں گی بلکہ یہ ممالک ہمارے احسان مند بھی رہیں گے۔ کیونکہ ہم انہیں یقین دلائیں گے اس قدم سے 90 فی صد جرائم کی روک تھام اور مجرموں کو پکڑنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ مائکرو چپ کو ہم پیوند کاری کے ذریعے بھی استعمال کر سکیں گے۔ یہ سراغ رسانی کے لیے بھی بہت مفید ثابت ہو گی۔"

"آپ کی سوچ شاندار اور آئیڈیا جاندار ہے اور بہت حد تک ممکن بھی۔"

"میری سوچ اس سے بھی آگے بھاگ رہی ہے۔" ڈیوڈ نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "دنیا میں اس وقت کاغذی کرنسی کا راج ہے۔ جس پر ہمارا مکمل عبور ناممکن ہے۔ مگر ہم الیکٹرونک منی کا نظام متعارف کرائیں گے۔ تمام بینک بیلنس ایک کارڈ میں جمع ہوگا متعلقہ شخص کو خفیہ پاسورڈ دیا جائے گا۔ کارڈ سے وہ رقم نکال سکے گا اور جمع کرا سکے گا۔ تمام بلز ادا کر سکے گا۔ شاپنگ کرسکے گا حتیٰ کہ ٹیکسی کا کرایہ بھی ادا کرے گا۔ دوسرے لفظوں میں نظام زندگی ایک کارڈ میں سمٹ آئے گا۔ کمپیوٹر کے کی بورڈ پر حساب کتاب ہوگا۔ کاغذی کرنسی کا بھار اٹھانے کی زحمت نہیں ہوگی۔ جس سے ڈاکو اور لٹیروں کا خطرہ ٹل جائے گا۔ ہاں یہ اور بات ہے جب ہم چاہیں گے تب کسی بھی شخص کا اکاؤنٹ خالی یا منجمد کر دیں گے۔ اس طرح دنیا کی ساری دولت ہماری مٹھی میں ہوگی۔"

ڈیوڈ نے حسب معمول اور حسب عادت نیو ورلڈ کے لیے نئی پالیسیوں کو سامنے لا کر عمدگی سے اپنی ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ برقی ٹیگ اور مائکرو چپ کے حوالے سے کچھ باتیں اس نے مخفی رکھی تھیں۔ جن کا برملا اظہار اسرائیل کے عسکری ماہرین کے سامنے کیا تھا۔ ان ماہرین میں موساد کا ڈائریکٹر بھی شامل تھا۔ جس نے ڈیوڈ کی مخفی معلومات کا عملی مظاہرہ 5 جنوری 1996ء کو کیا تھا۔ جب غزہ میں فلسطینی جہادی تنظیم حماس کے ماہر بم یحییٰ عیاش کے ہاتھ میں موبائل فون دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ اس دھماکے میں یحییٰ عیاش نے جام شہادت نوش کیا تھا۔



ساجد ایم این اے کا بیٹا تھا۔ جو چاہا تھا زندگی میں پایا تھا۔ سارے کام اپنے رنگ ڈھنگ سے کیے تھے۔ کسی کی مداخلت اس کے لیے انتہائی ناگوار تھی۔ شانی نے اس کی زندگی کو پنج کر زمین پر دے مارا تھا۔ اس کی خواہشوں کے منہ زور گھوڑے کو نکیل ڈالی تھی۔ اس کی حکم عدولی تو کی ہی تھی اوپر سے ہاتھ اٹھانے کی گستاخی بھی کر بیٹھا تھا۔ اب ساجد پورے غیظ و غضب کے ساتھ اس کا متلاشی تھا۔

کوٹھے پر جب تک پولیس پہنچتی یا ذکیہ بائی کو محافظوں کی مزید کمک ملتی ہم نواز کی بروقت اطلاع کے سبب شانی دوستوں کے ہمراہ ذکیہ بائی کے کوٹھے سے نکل گیا تھا۔ ولید کا خیال تھا انہیں رات شہر میں ہی کہیں بسر کرنی چاہیے کیونکہ ذکیہ بائی اور ساجد کا اثر و رسوخ شہر کے خارجی راستے بلاک کرنے کی وجہ بن سکتا ہے۔ اظہر اور امجد کے سامنے سوال یہ تھا کہ رات کس کے پاس گزاری جائے۔ شانی کے دونوں بڑے بھائی کوئٹہ میں تھے مگر وہاں جانے کا کوئی معقول بہانہ نہیں تھا۔ شانی ہم نواز سے کام لے سکتا تھا اس لیے واپس نثار پور جانا بہتر سمجھا۔

ولید کا خیال درست ثابت ہوا راستے میں دو بار ہم نواز نے شانی کو پولیس چیکنگ کی اطلاع دی تھی۔ تاہم یہ چیکنگ شہر کے اندرونی حصوں میں تھی۔ شاید ذکیہ بائی بھی ان کے اصل علاقے سے لاعلم تھی۔ وہ نثار پور با آسانی پہنچ چکے تھے۔

اس ساری شرارت کا ماسٹر مائنڈ سیلیا تھا۔ جس نے اپنی چالبازی سے شانی کو خوب زچ کر رکھا تھا اور عاصم نواز کے سامنے فخریہ سینہ تانے کہہ رہا تھا۔

"تمہاری ساری احتیاطی تدابیر اور روک تھام دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ عاصم نواز میں اسے یوں ہی رسوا و ذلیل کرتا رہوں گا۔ شانی ہر آنے والے دن میں تباہی کی طرف گامزن رہے گا۔ تو اسے دیکھ دیکھ کر جلے گا۔ کڑھے گا مگر بے بس رہے گا۔ آخر خود ہی تڑپ کر جان دے دے گا۔"

"عاصم نواز میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں تم شانی کو میرے عتاب سے بچا نہیں پاؤ گے۔"

"سیلیا! اس میدان کے ہمیشہ تم فاتح نہیں رہو گے۔ آج تمہارا دن تھا۔ کل میرا دن ہوگا۔ میں تمہیں ایسی کاری ضرب لگاؤں گا کہ تیرا فخر سے پھیلا ہوا سینہ پچک جائے گا۔" عاصم نواز کی بات سن کر سیلیا نے بلند قہقہہ لگایا اور تمسخرانہ لہجے میں بولا۔

"عاصم نواز خواب اچھے دیکھ لیتے ہو مگر یاد رکھو یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوں گے۔"

سیلیا کا چیلنج قبول کرنے کے بعد عاصم نواز نے شانی پر دباؤ بڑھا دیا تھا۔ مگر لگتا یہی تھا کہ سیلیا اسے زیر کر لے گا۔ سیلیا نے روشن نواز سے تعلقات بنا رکھے تھے۔ روشن نواز کی آشیرباد سے شانی کے منفی کاموں کی فہرست طویل ہو رہی تھی۔ روشن نواز نے ایسی خواہشیں پال رکھی تھیں جو سیلیا کو فتح دلانے میں معاون ثابت ہو رہی تھیں۔ پڑھائی چھوڑنے کے بعد شانی کا کام فقط کھیتوں کی دیکھ بھال تھا۔ وہ بھی خال خال ہی ایسا کچھ کرنا پڑتا تھا۔ ورنہ سارا کام مزدور ہی کرتے تھے۔ راوی نے اس کے حصے میں فراغت کے طویل لمحات لکھ چھوڑے تھے۔ شانی دوستوں کے ساتھ مل کر انہیں خوب انجوائے کر رہا تھا۔ نازک اندام مہوش کی اداؤں کی چھری ایسی تھی کہ ان کے دل ٹوٹے ٹوٹے ہو گئے تھے۔ تمام دوستوں نے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ مہوش کا فن ایک بار پھر اس کے تمام جلوؤں کے ہمراہ دیکھنا ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے سیلیا نے روشن نواز کو ایسا آئیڈیا دیا کہ شانی اینڈ گروپ کی خواہش بار آور ثابت ہوئی تھی۔

نوید نے کزن شہزاد کی معرفت مہوش کا فن ایک رات کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے میں خریدا۔ ذکیہ بائی مہوش اپنے سازندوں کے ہمراہ شہزاد کے ساتھ رات کے اندھیرے میں شانی کے فارم ہاؤس میں ایسی پہنچیں کہ انہیں راستوں کے اسرار سمجھ نہیں آئے۔ شانی اور اس کے دوستوں کو سامنے دیکھ کر ذکیہ بائی اور مہوش کے چہروں کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ متغیر نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ان کے دلوں میں شک کے ناگ نے پھن اٹھایا تھا۔ مبادہ انہیں یہاں مجرا کرنے نہیں انتقامی کارروائی کے لیے لایا گیا ہے۔

"فکر مت کرو ذکیہ بائی ہمیں صرف تمہاری جل پری کا حسن فن دیکھنا ہے۔ اس رات ایک امیر زادے نے معاملہ خواہ مخواہ بگاڑ دیا تھا۔" شانی تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

"ارے وہی تو ہم کب چاہتے تھے......" ذکیہ بائی نے کمال اداکاری دکھائی تھی۔ وہ لمحوں میں سنبھل گئی تھی اس نے بات کرتے ہوئے یوں ماتھے پر ہاتھ رکھا جیسے شانی کا نام اچانک بھول گئی ہو۔

"شانی...... شانی۔" نے مسکراتے ہوئے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے اپنا نام بتایا۔

"شانی بابو! میں خود شرمندہ ہوں۔ اس رات آپ لوگوں کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ مگر ہماری مہوش آج سارے گلے شکوے دور کر دے گی۔" ذکیہ بائی نے لہجے کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا ورنہ اس کی نگاہوں میں اپنا قیمتی فرنیچر گھوم رہا تھا جو لڑائی کی نذر ہو چکا تھا۔ اندر سے وہ شانی سے خوفزدہ تھی۔ وہ شانی کے ہاتھوں اپنے محافظوں ساجد اور شہریار کی پٹائی دیکھ چکی تھی۔ ولید نے آگے بڑھ کر ذو معنی لہجے میں کہا۔

"ذکیہ بائی تمہاری مہوش آج ہمارے سارے گلے شکوے دور کر دے گی نا؟" ولید کی بات پر فراز اور اظہر نے شرارتی نگاہوں سے مہوش کو دیکھا۔ جس کے خوبصورت چہرے پر گھبراہٹ واضح دیکھی جا سکتی تھی۔

"جی ولید بابو! مہوش فنی لحاظ سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔"

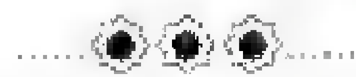
فارم ہاؤس کی وہ رات حقیقی معنوں میں سیلیا کی فتح اور عاصم نواز کی شکست ثابت ہوئی تھی۔ کیونکہ وہاں نہ صرف مجرا ہوا تھا بلکہ کڑوے مشروب کا بھی دور چلا تھا۔ جام و مینا کا انتظام بھی شہزاد نے ہی کیا تھا۔

سیلیا کو اس کامیابی پر گرو کی طرف سے خوب داد ملی تھی۔ گرو نے اسے خوبصورت پلانز کی سند عطا کی تھی۔ گرو نے خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہاری عظیم پلاننگ نے شانی کو اندھیرے کے سفر میں ڈال دیا ہے۔ جہاں نہ منزل کا نشان ملتا ہے نہ بندہ وہاں تک پہنچ پاتا ہے۔ سیلیا تم اسی طرح اپنا کام کرتے رہے تو شانی کبھی حسن کا انسان نہیں بن سکے

لگا۔ اس کا اندر کبھی روشن نہیں ہوگا اور یہی ہماری کامیابی ہے۔"

گرو نے سیلیا کے جوش و خروش میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ سیلیا روشن نواز کو اپنی سوچ کی راہوں پر ڈھال لیتا تھا۔ روشن نواز عاصم نواز کو مجبور کرتا تھا اور عاصم نواز سوائے چیخنے چلانے کے کچھ نہ کر پاتا۔ یوں سیلیا کامیابی کے جھنڈے گاڑھتا رہا اور عاصم نواز دھیرے دھیرے اپنی موت کی طرف بڑھتا رہا۔

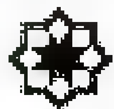


نثار پور کے اسپتال میں دو مریض آئے تھے جنہیں مضر صحت پانی پینے سے انفکشن ہوا تھا۔ ان میں شہاب الدین کا سات سالہ لڑکا ندیم اور بچپن سال کا حمید خان شامل تھے۔ ڈاکٹرز کے استفسار پر بتایا گیا تھا۔ انہوں نے وہی پانی پیا جو وہ برسہا برس سے پیتے چلے آرہے ہیں۔ جو مضر صحت نہیں بلکہ شفایاب پانی ہے۔ یہ پانی پہاڑوں سے کئی قسم کی جڑی بوٹیوں سے ٹکرا کر چشموں کی شکل میں بہتا تھا۔ ارد گرد کے تمام دیہات انہی چشموں سے سیراب ہوتے ہیں۔ اور تمام لوگ ازل سے یہی پانی پیتے ہیں۔ بچپن سالہ حمید خان نے بتایا میں نے اپنے آباؤ اجداد کو بھی یہی پانی پیتے دیکھا تھا اور خود بھی بچپن سے بڑھاپے تک پیتا چلا آرہا ہوں۔ اب پتہ نہیں کیا ہوا؟ ڈاکٹر کے لیبارٹری ٹیسٹ کہہ رہے تھے چشموں کا قدرتی پانی پہلے صاف و شفاف تھا مگر جو پانی تم لوگوں نے پیا ہے وہ ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹرز نے دونوں مریضوں کے لیے منرل واٹر تجویز کیا تھا نثار پور میں تو کیا وہاں کے سیکڑوں دیہات میں کوئی ایسا اسٹور نہیں تھا جہاں سے منرل واٹر دستیاب ہو۔ وہاں ایسے پانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا جو خرید کر پیا جائے۔ مگر ڈاکٹر کے اصرار پر بحالت مجبوری ندیم کے والدین اور حمید خان کے بیٹوں نے قریبی شہر سے ضلعے کا منرل واٹر منگوالیا تھا۔ کئی لوگوں نے صاف شفاف پانی کی اس بوتل کو حیرانی سے دیکھا تھا۔ جسے خوبصورت سیل کے ساتھ بند کیا گیا تھا اور جس پر باقاعدہ پانی مینوفیکچر تک اور ایکسپائری ڈیٹ لگی ہوئی تھی۔ اوپر سے ڈاکٹروں نے اس پانی کی بے شمار خاصیت کا ڈھنڈورا بکس کھول رکھا تھا۔ جس علاقے میں ایسے پانی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا وہاں کے بیشتر اسٹورز پر ضلعے کا منرل واٹر نظر آنے لگا تھا۔ مراعات یافتہ طبقے جن کے دلوں میں وہموں نے مسکن بنا لیے تھے۔ انہوں نے منرل واٹر کو زندگی کا وطیرہ بنا لیا تھا۔ تاہم سیکڑوں نہیں ہزاروں خاندان ایسے تھے جو منرل واٹر کے بجائے چشموں کا پانی پیتے تھے اور حسب سابق ہشاش بشاش جی رہے تھے۔

جوزف اور اس کے گروپ نے قدرتی پانی کے ان ذخائر پر شب و روز محنت کی تھی۔ کئی ٹیسٹ کیے تھے۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا وہ پانی میں مضر صحت کیمیکل ملا دیتے یا جراثیم چھوڑ دیتے جو ہر شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔ جو بھی پانی پیتا وہ اسپتال میں لیٹ جاتا یا پھر تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا اور ایسا بھی نہیں تھا۔ پانی کسی کی موت کا سبب بنتا بلکہ انہوں نے نظام قدرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پانی کو بڑی خوبصورتی سے کامیابی سے ہم کنار کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی مشین کے تمام پرزہ جات ایک جیسے بنائے ہیں۔ ان کی اندرونی و بیرونی فٹنگ کا سسٹم بھی یکساں ہے مگر جب اس مشین کو متحرک کیا تو اپنی قدرت سے اس کا نظام جدا جدا کر دیا۔ کسی کو سست بنا دیا اور کسی کو چست۔ کوئی تیز دماغ تو کوئی کند ذہن۔ کسی کی طبیعت میں باغیانہ پن ہے اور کوئی نرم مزاج کا بندہ ہے۔ اگر یہ نظام بھی یکساں ہوتا تو دنیا کے سارے انسان ایک جیسا سوچتے اور ایک جیسا کام کرتے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)



نو نظر

طاہر قریشی

بیٹوں کو بڑھاپے کی لاٹھی قرار دیا جاتا ہے' وہ بھی باپ کے بڑھاپے کا سہارا تھا لیکن وقت نے اسے بوڑھے باپ کی ڈھال بن جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

ایک نور اقعادہ بار میں کھیلے جانے والے ڈرامے کی روداد

لوگ کہتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ہر چیز بدل جاتی ہے لیکن ایسا نہیں ہے میری پوری زندگی وڈ ویل میں گزری ہے اور جو بار آج بھی اسی شکل میں ہے جیسا میں اسے ہمیشہ سے دیکھتا چلا آیا ہوں۔

یہ بار جو نے آج سے تیس برس قبل کھولا تھا۔ آج بھی اس میں وہی اسٹیل کی ریلنگ، وہی کاؤنٹر اور وہی گھومنے والے اسٹول موجود تھے۔ دیواروں کے ساتھ لکڑی کی بنی ہوئی کمبی میزیں بھی موجود تھیں۔ لیکن ان کی حالت شکستہ ہو چکی تھی۔ سات سال قبل جو نے تمام فرنیچر کے کشن تبدیل کیے تھے لیکن اس نے وہی سرخ رنگ کے نئے کشن لگائے تھے لہٰذا کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ البتہ جو بار کی ایک چیز تبدیل ہو چکی تھی وہ وہاں کے گاہک تھے۔ چند ایک مستقل اور پرانے گاہک اب بھی یہاں آتے تھے ان کا معمول گھڑی کی سوئیوں کی مانند تھا۔ وہ ٹھیک وقت پر یہاں آ جاتے تھے البتہ وقت نے بھی انہیں تبدیل کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر لیسٹر اپنی بیوی کے انتقال کے بعد ٹوٹ گیا تھا۔ بوڑھا کمبی ریلوے میں کنڈکٹر تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ روزانہ یہاں سے گزرنے والی ٹرین کو تکتا رہتا تھا پھر لیسٹر کے ساتھ اپنا غم غلط کرنے کے لیے بار میں آ جاتا تھا۔

جو خود بھی ریٹائر ہو چکا تھا پچھلے تین سال سے بار میری نگرانی میں تھا۔ میں نے اس کا انتظام اس وقت سنبھالا تھا جب میری عمر اکیس برس کی تھی جو پہاڑیوں میں ہرن کا شکار کھیلتا رہتا تھا لیکن ہر روز صبح سویرے وہ کافی کا ایک کپ پینے کے لیے بار ضرور آتا تھا۔ وہ ساتھ ہی حالات پر ایک نگاہ بھی ڈال لیتا تھا۔

اس روز صبح سویرے بار میں، میرے اور لیسٹر کے علاوہ کوئی موجود نہ تھا لیسٹر اپنی مخصوص میز پر بیٹھا ہوا تھا میں تولیے سے کاؤنٹر صاف کر رہا تھا کہ ایک کار بار کے سامنے آ کر رکی۔ کھڑکی سے کار صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ایک پرانی فورڈ تھی۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ جیسے اسے کئی بار جہنم کے درمیان چلایا گیا ہے۔ اس کا انجن کان پھاڑ دینے والا شور مچا رہا تھا۔ جیسے ہی انجن بند ہوا تو کچھ سکون ملا۔

میں کاؤنٹر صاف کرنا بھول گیا اور حیرت کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ فورڈ سے چھلانگ لگا کر باہر آنے والی شخصیت ایک بوڑھی عورت تھی۔ اس کا قد پستہ اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ اس نے خاکی رنگ کی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ اس کے بکھرے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے اس نے گول شیشوں والی دھوپ کی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ چیونگم چبا رہی تھی۔ اس کے کاندھے پر ایک بڑا سا چمڑے کا بیگ لٹکا ہوا تھا۔

”ذرا اس بوڑھی گھوڑی کو تو دیکھنا۔“ میں نے لیسٹر کو متوجہ کیا لیکن اس نے نگاہ نہیں اٹھائی۔

بار کا دروازہ کھلا اور وہ عورت کھٹ کھٹ کرتی ہوئی

اندر آ گئی۔ اس کے بوٹ مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ وہ کاؤنٹر کے سامنے پڑے ہوئے اسٹولوں میں سے ایک پر ڈھیر ہوگئی۔ وہ کچھ دیر تک چیونگم چباتی رہی ایک مرتبہ چبانے کے دوران ہی میں اس کے منہ سے ''کافی'' کا لفظ ادا ہوا۔

''یس میڈم۔'' میں نے کہا اور کافی بنانے کے لیے پلٹ گیا۔

''کیا یہ بار شکاگو کے جوزف جیمز لاری کی ملکیت ہے؟'' عورت نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا چیونگم چبانے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں بھی تھکی اور بلند ہو رہی تھیں۔ چشمے کی آڑ سے سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔

وہ عورت اطمینان سے ہنستے ہوئے بولی۔

''یہ تم نے بہت اچھی خبر سنائی ہے نوجوان۔ میں شکاگو کے ہر مغربی قصبے میں اس بار کو ڈھونڈتی آئی ہوں میں جو لاری اور اس کے بار کو تلاش کرتی پھر رہی ہوں جو نام کے بار تقریباً ہر قصبے میں موجود ہیں لیکن مجھے یقین تھا کہ میں جو لاری کا بار جلد یا بدیر تلاش کر ہی لوں گی۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ مجھ میں قوت ارادی موجود ہے وہ کب تک یہاں آئے گا؟''

''کیا تم اس سے واقف ہو؟''

''اوہ ہاں...... میں...... ہاں۔'' اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے اداس ہوگئی۔

''ہم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں ہماری ملاقات شکاگو میں ہوئی تھی۔''

''کیا میں اسے ٹیلیفون پر تمہاری موجودگی کی اطلاع کردوں؟ اسے بتادوں کہ تم اس کا انتظار کر رہی ہو؟''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس عورت نے چیونگم چباتے ہوئے کہا اس کے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی اس نے اپنی گود میں پڑا ہوا چنڈ بیگ کھولا اور اس میں سے اعشاریہ تین آٹھ کا لمبی نال والا ریوالور نکالتے ہوئے بولی۔

''میں اسے سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ریوالور کا گھوڑا چڑھا دیا اور ریوالور کی نال میری طرف کرتے ہوئے بولی۔

''ہم دونوں مل کر اسے سرپرائز دیں گے۔''

میں ایسے موقعوں پر زیادہ باتیں نہیں کرتا اس لیے میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

''جو کتنے بجے تک یہاں آجائے گا۔'' اس عورت نے پوچھا۔

''بہت جلد۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اسے شوٹ کرنے کے ارادے سے آئی ہو۔'' وہ ایسے بن گئی جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ الٹا اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''کتنی جلد؟''

''وہ بار کر ویل سے سوا دس بجے آنے والی ٹرین کی وسل سنائی دی۔''

''میرے اندازے کے مطابق اسے جلد ہی آجانا چاہیے۔''

''میں اس کا انتظار کروں گی۔ وہ ادھر کون بیٹھا ہوا ہے؟''

''وہ لیسٹر ہے۔''

''لیسٹر۔'' اس عورت نے لیسٹر کو آواز دی۔

لیسٹر نے گردن گھما کر اس عورت کی طرف دیکھا' اس عورت نے ہنستے ہوئے ریوالور لیسٹر کی طرف لہرایا۔ لیسٹر کے چہرے کے تاثرات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک ہی تاثر ملتا تھا۔ وہ کسی بلڈ ہاؤنڈ کی طرح منہ لٹکائے عورت کو دیکھتا رہا۔

"لیسٹر" عورت نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم اپنی کرسی ہی پر بیٹھے رہنا۔ اگر تم کسی بھی وجہ سے اپنی کرسی سے اٹھے تو میں تمہیں وہیں شوٹ کر دوں گی۔"

لیسٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ گردن سیدھی کرتے ہوئے اپنے نصف بھرے ہوئے گلاس کو تکنے لگا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" عورت نے مجھ سے پوچھا۔

"ولیس۔"

"ولیس! لیسٹر کا گلاس خالی نہ ہونے دینا اور تم بھی کوئی ایسی حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا کہ مجھے تمہیں بھی شوٹ کرنا پڑے۔ اگر اس دوران میں کوئی گاہک آ جاتا ہے تو اس کے ساتھ اپنا برتاؤ کرنا جیسے سب کچھ نارمل ہو۔ اس ریوالور میں چھ گولیاں ہیں اور میں ہر فائر سے ایک آدمی کو زمین بوس کر سکتی ہوں لیکن میں ایسا نہیں چاہتی۔ میں صرف جوارڈی سے نمٹنا چاہتی ہوں لیکن اگر تم نے مجھے مجبور کیا تو میں اس جگہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی۔ سمجھ گئے؟"

"بالکل میں سمجھ گیا۔" میں نے لیسٹر کا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔ پھر میں اس عورت کے پاس پہنچ گیا۔ "کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟"

"پوچھو۔"

"تم جو کو کیوں قتل کرنا چاہتی ہو؟"

وہ چیونگم چباتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"اس نے میری زندگی تباہ کر دی ہے میرے خیال سے کسی شخص کو قتل کرنے کے لیے اتنی وجہ کافی ہے تمہارا کیا خیال ہے؟"

"جو کو قتل کرنے کے لیے ایسی کوئی وجہ مناسب نہیں ہے۔"

"واقعی؟"

"اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"وہ مارتھا کے ساتھ فرار ہو گیا تھا۔"

"مارتھا؟ وہ تو اس کی بیوی تھی۔"

"وہ مر چکی ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گڈ۔" وہ آگے جھکتے ہوئے بولی۔ "مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی جو نے مجھ سے شادی نہ کر کے غلطی کی تھی میں اب بھی زندہ ہوں اگر وہ مجھ سے چپکا رہتا تو ہم آج خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہوتے لیکن اس میں اتنی سمجھ کہاں ہے جانتے ہو اس کی زندگی کا واحد مقصد کیا تھا؟ وہ مغرب کی سمت اپنا ایک بار کھولنا چاہتا تھا۔ مارتھا نے اس کے اس خیال کو بہت عمدہ بتایا تھا۔ میں نے مارتھا سے کہا تھا تم اس سے شادی کر لو پھر تم دونوں مغرب کی سمت رفع ہو جانا اور اپنی زندگی برباد کرتے رہنا۔ اگر جو ایسے ہی احمقانہ رومانی خیالات رکھتا ہے تو میں اس کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ دریا میں اور بھی بہت سی مچھلیاں ہیں میں نے یہ بات آج سے بیس برس پہلے کہی تھی۔"

"اگر تم نے یہ کہا تھا۔" میں خاموش ہو گیا میں کسی مسلح عورت سے یہ بحث نہیں کر سکتا تھا۔

"کیا؟"

"کچھ نہیں۔"

اس نے چیونگم منہ میں ایک طرف کرتے ہوئے کافی کا گھونٹ بھرا اور بولی۔

"تم کیا کہنا چاہتے تھے؟"

"صرف تم کہہ رہی ہو نا کہ تم نے انہیں شادی کی اجازت دے دی تھی تو پھر تمہارا انہیں الزام دینا مناسب نہیں ہوتا۔"

اس عورت نے کافی کا کپ نیچے رکھا اور ایک

اچٹتی نگاہ لیسٹر پر ڈالی وہ اب بھی اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور ریوالور کو گھور رہا تھا۔ ”جب میں نے کہا تھا کہ دریا میں اور بہت مچھلیاں ہیں تو اس وقت میرے پاس بہت وقت تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں کسی اچھے شخص کا انتخاب کرلوں گی لیکن میرا اندازہ غلط تھا۔ وقت بہت تیزی سے گزر گیا اور میں بہت پیچھے رہ گئی۔“

وہ تیزی سے چیونگم چبانے لگی۔ اس کی نگاہ مجھ پر جمی ہوئی تھی لیکن اس کا ذہن کہیں دور ماضی کی یادوں میں الجھا ہوا تھا۔ ”میں انتظار کرتی رہی مجھے یقین تھا کہ میرا مطلوبہ شخص اپنے موڑ پر مل جائے گا اگلے سال مل جائے اور اس طرح میری زندگی کی شام ڈھل جائے گی جس شخص کے انتظار میں تھی وہ جو ہی تھا لیکن میں اسے کھو چکی تھی اسی وقت میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں جو کو شوٹ کر دوں گی۔“

”یہ......!“ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”کیا؟“

”یہ پاگل پن ہے۔“

”یہ انصاف ہے۔“

”تم دونوں اب بھی یکجا ہو سکتے ہو۔ مارتھا کی موت کے بعد سے وہ تنہا ہے ہو سکتا ہے......!“

”نہیں، اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ بچوں کے لحاظ سے بھی اور......!“

اچانک لیسٹر اپنی جگہ سے اٹھا اور پاگلوں کی طرح دروازے کی طرف دوڑا۔ عورت نے اپنا اسٹول گھمایا ایک لمحے کے لیے لیسٹر کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ گولی لیسٹر کے کان کو اڑاتی چلی گئی تھی۔ لیسٹر نے ایک چیخ ماری اور پلٹ کر اپنی کرسی کی طرف دوڑ پڑا۔ اس نے ایک ہاتھ کان پر رکھا ہوا تھا۔

”تم دعا مانگو کہ کسی نے فائر کی آواز نہ سنی ہو۔“ وہ ہم دونوں سے مخاطب ہوئی۔

مجھے اندازہ تھا کہ فائر کی آواز کسی نے نہیں سنی ہوگی۔ ہم گاؤں کے آخری سرے پر تھے۔ ہم سے قریب ترین عمارت ایک گیس اسٹیشن کی تھی جو ایک بلاک کے فاصلے پر تھی اس کے علاوہ آس پاس شکار بھی کھیلا جاتا تھا اس لیے لوگ اکا دکا فائر کی آواز پر دھیان نہیں دیتے تھے۔

میں بہرحال نروس ہو چکا تھا۔ ہم پانچ منٹ تک گونگوں کی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ صرف اس عورت کے چیونگم چبانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ خاموشی کو اس عورت کے قہقہے نے توڑا تھا وہ اس طرح خوش تھی جیسے کسی انعامی مقابلے میں اس کا پہلا انعام نکل آیا ہو۔ اس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم خوش قسمت ہیں۔“

”لیکن جو اور لیسٹر کے بارے میں تم یہ بات نہیں کہہ سکتی ہو۔“ میں نے جواب دیا۔

لیسٹر کچھ نہ بولا وہ ایک ہاتھ سے اپنا کان دبائے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ سے گلاس تھامے خاموشی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”اسے دوڑنا نہیں چاہیے تھا۔“ عورت بولی۔ ”غلطی اس کی اپنی تھی وہ دوڑ پڑا تھا تم تو نہیں دوڑو گے؟“

”نہیں میڈم۔“

”اس لیے کہ اگر تم نے بھی بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمہیں بھی بلا جھجک شوٹ کر دوں گی۔ آج میں ہر شخص کو شوٹ کر سکتی ہوں۔ ہر شخص کو آج میرا دن ہے ویلیس، آج کے دن ایلسی تھامسن جو کا قرض اتار دینا چاہتی ہے۔“

مجھے پہلی بار پتا چلا کہ اس عورت کا نام ایلسی تھامسن ہے۔

”میں نہیں بھاگوں گا میڈم لیکن میں تمہیں جو کو بھی شوٹ نہیں کرنے دوں گا۔“ میں لیسٹر کا گلاس

بھرنے کے لیے بڑھ گیا۔

"تم مجھے نہیں روک سکتے کوئی بھی نہیں روک سکتا کوئی میرے راستے میں حائل نہیں ہو سکتا جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ میری قوت ارادی قوی ہے۔" وہ پراسرار انداز میں قہقہے لگانے لگی۔ "آج میں مرنے والی ہوں اس لیے دنیا کی پوری طاقت مجھ میں سما گئی ہے سمجھے؟ جو کو ختم کرنے کے بعد میں اپنی کار میں فوراً یہاں سے روانہ ہو جاؤں گی میں اس پرانی فورڈ کی رفتار ستر، اسی میل تک لے جاؤں گی پھر میں کسی بڑے تناور درخت سے......"

میں نے ایک بے جان قہقہہ بلند کیا اور اس کی جانب پلٹ گیا۔

"کیا میں تمہیں بے وقوف بنا رہی ہوں؟" ایلسی نے کہا۔

"نہیں میڈم۔ البتہ تم نے کسی درخت سے کار ٹکرانے کی جو بات کی ہے وہ بہت عجیب سی لگتی ہے عجیب ہی نہیں بلکہ ناقابل فہم بھی جانتی ہو میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟"

"نہیں۔"

"یہی وجہ ہے کہ تم جو کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو۔ اس کی کار بھی پانچویں میل پر بید مجنوں کے ایک درخت سے ٹکرا گئی تھی اس واقعہ کو تین سال ہو چکے ہیں مارتھا اس کے ساتھ تھی وہ حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی جو کی حالت بھی نازک تھی۔ ڈاکٹرز نے اپنی پوری کوشش کر ڈالی تھی۔ وہ اسے بچانے میں تو کامیاب ہو گیا تھا لیکن جو مفلوج ہو کر رہ گیا تھا اس کی ایک آنکھ بھی حادثے میں ضائع ہو گئی تھی۔ وہ اس کی بائیں آنکھ تھی اس لیے وہ اپنی آنکھ ڈھکے رہتا ہے بعض اوقات جب وہ جذبات میں ہوتا ہے تو ہمیں اپنی آنکھ دکھا دیتا ہے۔"

"تم خاموش ہو جاؤ۔"

"وہ اپنی ایک ٹانگ بھی گنوا بیٹھا ہے۔"

"میں یہ سب کچھ نہیں سننا چاہتی۔"

"اچھا میڈم میں معافی چاہتا ہوں میں تو صرف...... میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ درخت سے ٹکرانے والا ہر شخص ہلاک نہیں ہوتا۔"

"لیکن میں ہلاک ہو جاؤں گی۔"

"تم یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتی ہو ہو سکتا ہے کہ تمہارا انجام بھی جو کی طرح ہو اور تم بھی ایک آنکھ پر کپڑا ڈھکے، مصنوعی ٹانگ کی مدد سے ادھر ادھر اچھلتی پھرو اور تمہارے چہرے کا وہ حشر ہو کہ تمہارے بہترین دوست بھی تمہیں پہچاننے سے انکار کر دیں۔"

"شٹ اپ ویلس۔" ایلسی نے پستول کی نال میرے چہرے پر گاڑ دی۔

میں نے مدہم لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ اگر تم واقعی مرنا چاہتی ہو تو ادھر شاہراہ پر ایک میل کے بعد کنکریٹ کا برج ہے اس برج کے نیچے بھی ایک سڑک ہے۔ برج کے پلر سڑک کے کنارے ہیں کسی درخت کے مقابلے میں کنکریٹ کا پلر زیادہ مناسب رہے گا۔"

"اپنا منہ بند رکھو اور میرے لیے کافی گرم کرو۔"

میں کافی گرم کرنے پلٹا تو میرے کانوں میں کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ باہر لکڑی کے تختوں پر کوئی چل رہا تھا۔ قدموں کی چاپ آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی۔ میں پلٹ کر ایلسی کو دیکھنے لگا۔ اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر دانت نکال دیے۔ وہ تیزی سے گم چبانے میں مصروف ہو گئی۔ اس کی نگاہ اپنے گلاس پر جمی ہوئی تھی۔ قدموں کی غیر متناسب آواز بڑھتی جا رہی تھی۔

میں نے کھڑکی سے اس کی جھلک دیکھ لی تھی۔

اس کے کھچڑی نما بال اور دائیں آنکھ پر ڈھکا ہوا سبز کپڑا صاف دکھائی دے رہے تھے۔ پھر وہ بھی میری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ لہرا دیا تھا۔

میں نے اچٹتی نگاہ لیسٹر پر ڈالی۔ وہ ایک ہاتھ میں پیپر نیپکن لیے اپنا گال دبائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی نگاہ اپنے گلاس پر جمی ہوئی تھی۔

ایلسی نے پستول کی نال میرے سینے سے لگاتے ہوئے سرگوشی کی۔ "حرکت نہ کرنا۔"

بار کا دروازہ کھلا۔

ایلسی نے اپنا اسٹول دروازے کی جانب گھما دیا۔

"بچو جو۔" میں چیخا۔

لیکن اس نے بچنے کی کوئی کوشش نہیں کی وہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا تھا۔ ایلسی اسٹول پر سے چھلانگ لگا کر پوزیشن لے رہی تھی۔ دوسرے لمحے ایلسی نے اس پر لگاتار فائر کرنا شروع کر دیے پہلی دو گولیاں اس کے سینے پر لگی تھیں۔ تیسری گولی اس کا حلق چھیدتی گزر گئی تھی۔ اگلی گولی نے اس کا کاندھا زخمی کر دیا تھا وہ گھوم گیا تھا۔ آخری گولی اس کی پیٹھ میں لگی تھی۔

یہ سب کچھ صرف چند سیکنڈ میں ہو گیا۔ میں نے ایلسی پر چھلانگ لگائی۔ ابھی میں ہوا ہی میں تھا کہ وہ ایڑیوں کے بل گھوم گئی۔ اور ریوالور کی نال پوری قوت سے میرے چہرے پر دے ماری میں فرش چاٹنے لگا۔

میں اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ لاش کو پھلانگ کر باہر چلی گئی۔ جب میں دروازے تک پہنچا تو وہ اپنی کار اسٹارٹ کر چکی تھی۔ دوسرے لمحے سڑک پر بریک کی چرچراہٹ گونجی اور اس کی کار فراٹے بھرتی نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔

میں واپس اندر آ گیا۔

لیسٹر ابھی تک وہیں بیٹھا ہوا تھا البتہ اس نے اپنی کرسی کا رخ موڑ لیا تھا۔ وہ خاموشی سے لاش کو گھور رہا تھا۔ میں بھی کاؤنٹر کے پیچھے اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگانے کے بعد خاموشی سے لاش کو گھورنے لگا۔

ہمیں اس طرح بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ کچھ دیر بعد پولیس کار کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ اس کے پیچھے ہی ایک ایمبولینس کار کا سائرن بھی سنائی دیا۔ دونوں گاڑیاں تیز رفتاری سے شاہراہ کے برج کی سمت جا رہی تھیں۔

"میرے خیال میں ایلسی نے میرا مشورہ مان لیا تھا۔" میں نے کہا۔

لیسٹر نے کوئی جواب نہیں دیا وہ خاموشی سے لاش کو گھورے جا رہا تھا۔

بار کا دروازہ ایک بار پھر کھلا۔

"میرے خدا۔" دراز قد نو وارد نے پہلے میری اور پھر لیسٹر کی طرف دیکھا۔ پھر وہ لاش پر جھک گیا اور اسے سیدھا کرتے ہوئے بولا۔

"چیلی، بے چارہ چیلی۔" اس نے بوڑھے ریلوے کنڈیکٹر کی لاش کو چھپایا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہ سوالیہ انداز میں میری جانب اٹھی ہوئی تھی۔

"وہ کوئی پاگل عورت تھی۔" میں سر ہلاتے ہوئے بڑبڑایا۔

"وہ تمہیں قتل کرنے کے ارادے سے یہاں آئی تھی ڈیڈی۔"



سرِ دو جہاں

قمر الاسلام عثمانی

یہ سچ ہے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے دس جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور ہمیشہ انسان کو جھوٹ بول کر شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن زندگی میں بعض مقام ایسے بھی آتے ہیں جب انسان کو جھوٹ بول کر مسرت ہوتی ہے اور اس کا ضمیر اسے جھوٹ پر ملامت نہیں کرتا۔

ایک سیلزمین اور خطرناک قاتل کی ملاقات کا احوال

وہ تا حد نظر پھیلی ہوئی بے آب و گیاہ تپتی ہوئی زمین کو گھور رہا تھا۔ وہ کبھی چہرے سے پسینہ پونچھنے لگا یا ہاتھ میں دبی ہوئی بوتل سے ٹھنڈے سوڈے کا ایک گھونٹ بھر لیتا۔ اس کے پیچھے گیراج کا مالک جو مکینک بھی تھا گرد سے اٹی ہوئی اس کی سیاہ سیڈان کے نیچے لیٹا ہوا نقص کا جائزہ لے رہا تھا۔

مکینک فرش سے اٹھ کھڑا ہوا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"بے کار ہے جناب، نئے بیرنگ کے بغیر کار نہیں چلے گی۔"

"تمہارے پاس نہیں ہے؟"

"ہے مگر یہاں نہیں، پارودیل میں ہے کل ہی آسکے گا آپ کی کار کل ہی ٹھیک ہو سکے گی۔"

"میرا مقصد حل نہ ہو سکے گا۔" وہ بولا۔

"مجھے ہر حال میں کل وفرلی پہنچنا ہے یہ بہت ضروری ہے۔"

"وفرلی رنج یہاں سے دو سو میل ہے۔" مکینک بولا اور مسافر کی بوتل اٹھا کر سوڈے کا ایک طویل گھونٹ لیا۔ بوتل خالی ہو گئی۔

"مسئلہ یہ ہے کہ مجھے کل ہر حال میں وہاں پہنچنا ہے۔ کیا بس مل جائے گی؟"

"بس۔" مکینک کو یہ خیال بہت عجیب لگا۔ وہ ران پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"جناب یہ نیشنل ہائی وے نہیں ہے ملک کے اس بد ترین ریگستان میں ایک یہی ٹوٹا پھوٹا راستہ ہے جسے سڑک بھی کہا جا سکتا ہے۔"

"کوئی کار کرائے پر مل جائے گی۔"

"بھلا ایک اجنبی کو کون اپنی کار کرائے پر دے تم خود سوچو یہ ممکن ہے؟"

"میری اپنی کار یہاں ضمانت کے طور پر رہے گی۔" مسافر بہت ضبط کے ساتھ بولا۔

مکینک اپنا ناک کھجانے لگا۔

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ مسافر کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس نے سونے کی کوئی کان دریافت کر لی ہو۔ "دیکھو وہ میرا ٹرک کھڑا ہے۔" اس نے ایک سمت اشارہ کیا۔

"میں اسے دیکھ چکا ہوں۔" مسافر مردہ دلی سے بولا۔ ٹرک کم و بیش بیس سال پرانا تھا جو زنگ خوردہ اور ناکارہ ہو چکا تھا۔ اس وقت ٹرک پر خالی پیٹیاں لدی ہوئی تھیں۔

"تم چاہو تو اس ٹرک کے بارے میں بات ہو سکتی ہے۔ مگر ٹرک جلد ہی واپس کرنا ہوگا کیا خیال ہے؟!"

"کیا کرایہ ہوگا؟"

"ذرا سوچئے وہ وفرلی رنج یہاں سے دو سو میل دور ہے۔ دونوں طرف کا فاصلہ چار سو میل ہوا پھر تم راستے میں ادھر اُدھر بھی گھماؤ گے، بہر حال۔" مکینک دوبارہ

ناک کھجانے لگا۔

''کل پانچ سو میل تو ہوں گے ای او دو سو ڈالر لوں گا۔''

''یہ تو کھلی ڈکیتی ہے۔'' مسافر نے احتجاج کیا۔

''میں تو صرف اتنا جانتا ہوں جناب کہ آپ یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے میرا ٹرک ہی ایک وسیلہ ہے اہمیت کے لحاظ سے دو سو ڈالر زیادہ نہیں ہیں لیکن اس کا کار کی مرمت کے معاوضے سے کوئی تعلق نہیں۔''

''شکریہ۔'' مسافر تلخی سے بولا۔ ''مجھے ڈر تھا کہ تم کہیں میری کار بھی ٹرک کے کرائے میں نہ کاٹ لو۔''

وہ اس وقت بے بس تھا اسے اگلے دن تک ہر حال میں ڈفرلی پہنچنا تھا کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی۔ اس نے پچاس ڈالر کے دو نوٹ نکالے اور مکینک کی طرف بڑھا دیے۔

''بقیہ واپسی پر۔''

مکینک نے جلدی سے نوٹ لے لیے۔

''ضرور ضرور اب تم اپنا نام بتا دو میں ٹرک بہر حال ایک اجنبی کو دے رہا ہوں۔''

''میرا نام ایڈورڈ ہے اور نیویارک کا رہنے والا ہوں کیا اتنا کافی ہے۔''

''بالکل، بالکل شاید ٹرک کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تم ٹرک تو چلا لیتے ہو گے؟''

''کئی بار اتفاق ہوا ہے۔'' ایڈورڈ بولا پھر ٹرک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس طرف سے کوئی مسافر نہیں گزرتا؟''

''کیوں نہیں دن بھر میں بیس تیس مسافر گزرتے ہیں۔''

''اور پولیس یہاں گشتی دستہ تو ہوگا یہ علاقہ مجھے بہت خطرناک معلوم ہوتا ہے۔''

''یہ بات تو ہے یہاں کاؤنٹی پولیس اور ایک شیرف ہے وہ اس راستے پر پابندی سے گزرتے ہیں مگر وہ سب کے سب بکر کے پیچھے لگے ہوئے ہیں تم نے رستے میں کوئی پرانی سبز سیڈان تو نہیں دیکھی جس کی ونڈ شیلڈ پر گولیوں کے سوراخ ہوں۔''

''نہیں۔'' ایڈورڈ نے مختصر جواب دیا۔

''اس علاقہ میں ایک قاتل موجود ہے اس کا نام بکر ہے۔ وہ ہر وقت اپنی گاڑی میں رہتا ہے کبھی باہر نہیں نکلتا وہ جو چاہتا ہے حاصل کر لیتا ہے یہاں سے اسی میل کے فاصلے پر اس نے ایک شخص کو پکڑ لیا اور لوہے کے پائپ سے اس کا بھیجا نکال دیا صرف پانچ ڈالر کے لیے۔''

مکینک بات کر رہا تھا اور ایڈورڈ کی نگاہ گیراج کے ساتھ کھڑے ہوئے پرانے، شکستہ از کار رفتہ اور کسی حد تک خطرناک ٹرک پر جمی ہوئی تھی۔ ٹرک کی مجموعی مالیت پچاس ڈالر سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی مگر اسے اس کا کرایہ ہی صرف دو سو ڈالر ادا کرنا تھا۔ مجبوری تھی اور کوئی چارہ نہیں تھا یہاں طلب اور رسد کا مسئلہ آ پڑا تھا۔

''مسٹر ایڈورڈ تمہیں پیٹرول کی ضرورت پیش آئے گی بہتر ہے ٹنکی یہیں بھر لو۔'' مکینک نے بڑے خلوص سے کہا۔

ایڈورڈ نے ٹنکی بھروالی یہاں بھی ادائیگی طلب اور رسد کی بنیاد پر ہوئی ایڈورڈ یہ سوچتے ہوئے ٹرک پر سوار ہوا کہ دیکھو اس کی غیر موجودگی میں مکینک کار کے کیا انجر پنجر ڈھیلے کرتا ہے۔ اس نے ٹرک اسٹارٹ کیا تو پورا ٹرک ہی کانپنے لگا۔ اس قدر شور ہوا جیسے وہ کسی طوفان کی زد پر آ گیا ہے۔

ٹرک بری طرح جھٹکے کھا رہا تھا اور اس پر فندی ہوئی چینیاں ہل رہی تھیں۔ ہانپتے کانپتے ٹرک کو کسی نہ کسی طرح پینتیس کی رفتار پر لے آیا۔ بہر حال وہ ٹرک گیراج پر یونہی کھڑا رہنے سے تو بہتر تھا اور وہ خود موجودہ صورت حال میں اس ٹرک کو غنیمت سمجھ رہا تھا۔ اس آگ برساتے ہوئے ریگزار میں رک کر جھلسنے کے بجائے لڑھکتے ہوئے کسی قریب ترین قصبے میں پہنچ جانا بہت بہتر تھا۔

اسی عالم میں اس نے چالیس میل کا فاصلہ طے کیا۔ دونوں طرف جہاں تک نگاہ جاتی تھی کیکٹس ہی

کیکلٹس تھے۔

نوے میل کا سفر طے کرنے کے بعد وہ ٹرک کی کھڑکھڑاہٹ اور انجن کے بے ہنگم شور کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ جب انجن ایک جھٹکا لے کر اچانک خاموش ہوا اور کچھ دور تک ڈگمگا کر چلنے کے بعد رکا تو اسے بہت برا معلوم ہوا اب ہر طرف بلا کی خاموشی تھی جو اعصاب شکن تھی۔

وہ ٹرک سے اتر آیا اور آگے چل کر بونٹ اٹھا کر انجن کا جائزہ لینے لگا۔ اسے انجن زنگ خوردہ دھات کا ڈھیر نظر آیا۔ وہ گاڑیوں کے انجن سے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا اس لیے کچھ کرنے کی کوشش میں ہاتھ جلا بیٹھا۔ وہ گاڑیوں کے اسرار و رموز کے بارے میں جان بھی کیسے سکتا تھا وہ تو بس دوا سپلائی کرنے والا سیلز مین تھا انجن میں کوئی ایک خرابی ہو سکتی تھی یا بہت سی خرابیاں ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا وہ انجن کے بارے میں سرے سے کچھ بھی نہیں جانتا تھا اور کسی طور خرابی کو درست نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے ڈھیلی ڈھالی قمیص کے بٹن کھولے اور جلتے سورج کی تپش سے بچنے کے لیے ٹرک میں گھس گیا جلد ہی اندھیرا پھیل جائے گا اور ریگستان کی سرد ہوا چلنا شروع ہو جائے گا اور پھر رات کے کسی پہر ریگستان یخ ہو جائے گا۔ سال کے اس حصے میں یوں بھی ریگستان رات ہوتے ہی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے سرد اور ویران ریگستان اس نے اتنی تنہائی اور ویرانی کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے انتہائی بے بسی کے عالم میں مختلف پرزوں پر ہاتھ مارنا شروع کیا مگر کچھ نہ ہوا انجن اسٹارٹ نہیں ہو سکا۔

کچھ کرنا چاہیے یوں بیٹھے رہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ اس نے وحشت کے عالم میں سوچا اور ہڑبڑا کر ٹرک سے نکل آیا۔

دس منٹ تک الٹے سیدھے ہاتھ مارنے کے بعد وہ اتنا کر سکا کہ اپنے دونوں ہاتھ اور کپڑے تیل اور گریس سے کالے کر لیے اور اتنا ہی غلیظ و بدوضع نظر آنے لگا جتنا ٹرک تھا۔ اچانک اسے دور سے آتی ہوئی کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ دعا مانگنے لگا کہ وہ گاڑی ادھر سے ہی گزرے وہاں سے نکلنے کی اب یہی ایک صورت رہ گئی تھی۔ وہ ایک چھوٹی گندی سی کوپے تھی۔ اس کی رفتار پچپن تھی مگر قریب سے گزرتے ہوئے پتھر ہوئی وہ اس کے چہرے پر گرم ریت کی بوچھاڑ کرتی ہوئی ہوا ہو گئی۔ ایڈورڈ اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے آدمی کی ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا۔ اس آدمی کے چہرے پر رحم، مروت اور انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

ایڈورڈ ایک بار پھر اپنے ٹرک سے الجھنے لگا اور اس کا حلیہ مزید خراب ہو گیا۔ وہاں سے گزرنے والی دوسری گاڑی ایک تیز رفتار پک اپ تھی جو تیز رفتاری سے گزرتی چلی گئی۔ پھر ایک سیڈان آئی اس کی رفتار بھی تیز تھی۔ اس میں ایک مرد اور عورت بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ درمیانی عمر کے تھے چہرے مہرے سے وہ دونوں سنجیدہ اور ذمہ دار نظر آتے تھے۔ سیڈان کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ ایڈورڈ مدد کے لیے بے تابانہ ہاتھ ہلانے لگا۔ یک بیک سیڈان کی رفتار بے حد تیز ہوئی اور اسے ریت میں نہلاتی ہوئی نکلتی چلی گئی۔ ایڈورڈ نے عورت کے چہرے پر خوف اور مرد کو سر ہلاتے دیکھا تھا۔ ایڈورڈ نے اچانک قہقہہ مارنا شروع کر دیا۔ اس یقین کے لیے وہاں اس ویرانے میں اس ریگزار میں کوئی زندگی تو تھی۔ کوئی زندہ تو تھا۔

مزید دو کاریں وہاں سے گزریں جن کی رفتار کسی طرح سو سے کم نہیں تھی۔ ان کے ڈرائیوروں اور مسافروں کو بھی نہ دیکھ سکا۔

اس نے ایک پیٹی کو الٹا کیا اور سڑک کے کنارے جم کر بیٹھ گیا۔

سورج مغرب میں جھک گیا تھا اور گرمی کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ ایک چھپکلی چمکدار آنکھوں سے اسے گھورتی ہوئی بھاگتی چلی گئی۔

”دوست کیا میں تم سے کسی بہتر سلوک کی توقع کر سکتا ہوں۔“ ایڈورڈ نے چھپکلی سے پوچھا۔

اگر وہ کسی طرح ڈفرلی رینج پہنچ بھی گیا تو بہت دیر ہو جائے گی۔ ڈفرلی مغرب کے ساحلی علاقے میں کئی شہروں، سرکاری اسپتالوں اور نجی نورسیز کو دوائیں سپلائی کیا کرتا تھا۔ وہ اپنے غصے اور تیز مزاجی کی بنا پر مشہور تھا۔ وہ معمولی بات پر سیلز مین تبدیل کر دیا کرتا تھا۔ ایڈورڈ سے پہلے وہ کسی بھی سیلز مین سے اتنی دریا دلی اور انسانیت سے پیش نہیں آیا تھا۔ ڈفرلی نے ایڈورڈ کو اپنے علاقے میں دواؤں کی سپلائی کے بہت بڑے آرڈر پر بات چیت کے لیے بلایا تھا۔ اس کا مطلب تھا ایک شاندار بونس اور باقاعدہ کمیشن۔

وہ خیالات میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ اس نے آدھے میل کے فاصلے سے آتی ہوئی گاڑی کی آواز بھی نہیں سنی۔ گاڑی اس کے قریب سے اس طرح گزر گئی جیسے ایکسپریس ٹرین چھوٹے اسٹیشن سے گزرتی ہے۔ وہ فکر میں ڈوبا ہوا ٹنکی پر جھک گیا اور حیرت سے سوچنے لگا کہ کیا دنیا میں کوئی بھی معقول آدمی باقی نہیں رہا۔ گزرنے والوں نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ ٹرک بے کار ہو چکا ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے بلا شبہ وہ جانتے ہوں گے کہ یہ آب و گیاہ ریگستان میں اس طرح پھنس جانا اور وہ بھی رات کے وقت کس قدر خطرناک بات ہوتی ہے مگر ان میں سے کسی نے اس طرف دھیان دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اب اسے سکوت اذیت ناک محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے ایک عجیب سے خوف کا احساس ہوا۔ اس سکوت کو توڑنے کے لیے اس نے زوردار آواز لگائی مگر اس کی آواز صحیح معنوں میں صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ پھر ریگستانی ہوا آہستہ آہستہ ریت اڑانے لگی ریت کے اڑنے اور پھیلنے سے خفیف سی دلچسپ آوازیں گونجنے لگیں جیسے دور کوئی چشمہ سبک روی سے بہہ رہا ہو۔

اس کے بائیں طرف پہاڑوں کا سلسلہ تھا اور یہ پہاڑ عبور بھی کیے جا سکتے تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ پہاڑ تک ہی چلا جائے۔ شاید دوسری طرف کچھ ہو پھر اسے خیال آیا کہ پہاڑ دھوکا بھی تو دیتے ہیں۔ میلوں دور ہوتے ہیں مگر قریب نظر آتے ہیں۔ چلتے رہو مگر فاصلے نہیں سمٹتے۔ وہ ریگستان میں کئی بار ایسے دھوکے کھا چکا تھا۔

مجنونانہ انداز میں ہاتھ ہلانے کے باوجود ایک کار اس کے قریب سے گزر گئی۔ ڈرائیور نے شاید چیخ کر کچھ کہا بھی تھا جو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ایک خرگوش اس کے قریب سے اچھلتا ہوا تیزی سے نکل گیا۔ ایڈورڈ نے بڑی حسرت سے سوچا کاش یہ خرگوش ذرا سی دیر اس کے قریب ٹھہر جاتا۔ یوں تیزی سے بھاگتا ہوا نہ چلا جاتا۔

ایڈورڈ لحہ بہ لحہ بڑھتی ہوئی خنکی سے گھبرا کر اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے غور کرنے لگا کہ کیا وجہ ہے لوگ اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں؟ کیا لوگوں میں دردمندی نہیں رہی کیا بے حسی بہت بڑھ گئی ہے؟ پھر یک بیک وہ سب کچھ سمجھ گیا۔ تیل اور گریس میں ہاتھ، پیر، چہرہ اور لباس سیاہ کر لینے کے بعد وہ بے حد مشتبہ نظر آ رہا تھا اس کے قریب کھڑے ہوئے بدوضع اور بے ہنگم ٹرک نے اسے مزید مشتبہ بنا دیا تھا پھر اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا خیال اس کے ذہن میں آیا جس نے اسے دہلا کر رکھ دیا کیا نام تھا اس شخص کو جو قاتل تھا اور مفرور تھا؟ جو اپنی گاڑی میں بند ریگستان میں گھوم رہا تھا اور جس کے پیچھے علاقے کی پولیس ماری ماری پھر رہی تھی۔ وہی شخص جس کی جانب مکینک نے اشارہ کیا تھا۔ ہاں، یاد آیا۔ ہیرا جلوز کی کوئی شناخت نہیں تھی اس کا چہرہ کسی نے نہیں دیکھا تھا وہ سبز سیڈان میں سوار تھا جس کی ونڈ شیلڈ میں کئی سوراخ تھے تو کیا وہ گاڑی تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ ایڈورڈ نے ٹرک کی طرف دیکھا اور اسے جھرجھری آ گئی۔ اب بات سمجھ میں آئی کہ لوگ کیوں اسے چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ وہ یقیناً اسے ہیرا جلوز سمجھ رہے تھے اس نے بہت تاسف کے ساتھ سوچا کہ وہ اب شاید کبھی ریگستان سے نہ نکل سکے۔ کیونکہ وہ مسافروں اور ڈرائیوروں کے رحم و کرم پر تھا۔ جو اسے کسی طرح بھی لے جانے پر آمادہ نہیں تھے۔

اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور ایک بار پھر ٹرک کی طرف متوجہ ہوگیا۔ آدھے گھنٹے کی تحت محنت کے بعد پتا چلا کہ اس نے معاملے کو اور بگاڑ دیا تھا۔

پھر اسے قریب آتی ہوئی ایک اور گاڑی کی آواز سنائی دی اگرچہ ابھی پورا اندھیرا نہیں چھایا تھا مگر اس کے باوجود گاڑی کی ہیڈلائٹس روشن تھیں اور رفتار بہت تیز تھی ایڈورڈ بھاگ کر سڑک کے درمیان آ گیا اور خود کو آخری کوشش کی خاطر راہ میں ڈال دیا۔ زندگی کے تحفظ اور بقا کی خاطر اس نے یہ خطرہ مول لیا تھا مگر گاڑی لہرا کر کترائی اور نکلتی چلی گئی جب گاڑی لحہ بہ لحہ دور ہوتی گئی تو اس کی آخری امید بھی دم توڑ گئی۔

اس سوچ سے بھی محروم رہ جانا ایڈورڈ کو بہت شاق گزرا تھا۔ وہ ٹرک کی طرف پلٹ آیا اور رات بستر پر گزارنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ ٹرک میں سوٹ کیس موجود تھا اور وہ اپنے کپڑوں کو اوڑھنے بچھانے کے لیے استعمال کرسکتا تھا۔ اسے سنگین اور جان لیوا حقیقت کا ادراک ہوچکا تھا کہ جو لوگ اسے آج دن سے وقت اور سرشام لے جانے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے کل کیوں لے جائیں گے۔ پھر اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا جیسے پیاسے کو سراب دکھائی دے جائے ممکن ہے اس دوران میں مفرور قاتل پکڑ کر گرفتار کرلیا جائے اور اس سڑک پر گشتی پولیس کی باقاعدہ آمد و رفت شروع ہوجائے اس صورت میں اس کے بچ رہنے کا امکان نکل آتا تھا۔

وہ ٹرک کے قریب پہنچا تھا کہ اس کی سماعت سے کسی گاڑی کے آنے کی آواز ٹکرائی مگر یہ آواز مخالف سمت سے آرہی تھی اس نے ایک جھٹکے سے پلٹ کر اس سمت دیکھا وہی گاڑی جو ذرا پہلے ادھر سے گزری تھی واپس آرہی تھی۔ گاڑی کی رفتار آہستہ تھی گاڑی قریب آئی تو اس نے دیکھا کہ اسٹیئرنگ کے سامنے ایک جسیم آدمی بیٹھا ہوا تھا اس نے گاڑی کا جائزہ لیا اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ گاڑی کا رنگ سبز تھا وہ بہت گندی سیڈان تھی۔ اس کی ونڈ شیلڈ کا ایک کونا ٹوٹا ہوا تھا یہ آدمی اور گاڑی بلاشبہ وہی تھے جس کے بارے میں مکینک نے بتایا تھا مفرور قاتل گجو۔ جس نے پانچ ہزار ڈالر کے لیے قتل کردیا تھا اور جو پولیس کو مطلوب تھا۔

اس لمحے ایڈورڈ نے خود کو دنیا کا بدترین آدمی تصور کیا۔ قسمت اس کے ساتھ بھیانک کھیل رہی تھی۔ اسے اس آدمی کو یقین دلانا ہوگا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے اگر اس قاتل نے اس کے پاس محفوظ آٹھ سو ڈالر دیکھ لیے تو وہ قاتل کو یہ رقم حاصل کرنے سے کس طرح روک سکے گا۔

سیڈان رک گئی اور وہ آدمی گاڑی سے باہر آ گیا۔ وہ تیل میں چیڑی ہوئی پرانی چھجے والی ٹوپی پہنے ہوئے تھا اس کے جسم پر نیلے رنگ کی سوتی قمیص تھی جو گلے تک بند تھی پتلون خاکی اور سستی تھی کوٹ بے حد پرانا تھا اور قریب قریب پھٹ چکا تھا۔ وہ قامت میں پانچ فٹ گیارہ انچ کے قریب رہا ہوگا۔ بھاری اور مضبوط جسم اور چوڑے شانے ایڈورڈ نے واضح طور پر اس کے عضلات اور پٹھوں کی مضبوطی کا اندازہ کرلیا تھا۔

مختصر مگر پُراثر

امام ابن رہب دوسری صدی ہجری کے مشہور عالم اور فقیہ ہیں فرماتے ہیں میں نے غیبت سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جس دن کسی کی غیبت کرتا اگلے دن اپنے نفس کو سزا دینے کے لیے روزہ رکھ لیتا لیکن بات نہیں بنی اور روزہ رکھنا ایک عادت سی ہوگئی اور سزا میں تنگی کی بجائے اس میں لطف محسوس ہونے لگا۔ ظاہر ہے جس چیز میں لطف محسوس ہو وہ سزا کیسے ہوسکتی ہے۔ اس لیے میں نے غیبت کے عوض ایک درہم صدقہ دینا شروع کردیا اور یہ سزا نفس کو شاق گزری اور یوں غیبت کے روگ سے نجات مل گئی۔

اقبال احمد...... قصور

"کیا احوال ہیں دوست؟" وہ آدمی بولا۔ "میں تمہیں بڑی مصیبت میں دیکھ رہا ہوں۔"

"تمہارا خیال صحیح ہے مجھے اس سڑک نے پریشان کر رکھا ہے۔" ایڈورڈ نے کہا۔

اس شخص نے پلک جھپکائے بغیر اپنی نگاہ ایڈورڈ کے چہرے سے ہٹا کر ٹرک پر جمادی۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"یہ تو کاٹھ کباڑ معلوم ہوتا ہے جو چند میل سے زیادہ نہیں چل سکتا تم وہی مسافر تو نہیں جس کی کار کا بیرنگ جل گیا ہے اور اب کار گیراج میں کھڑی ہوئی ہے؟"

اب کوئی حیلہ بہانہ بے کار تھا۔ وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا۔

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ریگستان میں ایسی صورت حال پیش آجائے تو میں بے بس ہو کر رہ جاتا ہوں اس وقت مجھے مدد کی سخت ضرورت ہے۔"

"میں دیکھتا ہوں۔" اس شخص نے کہا اور ٹرک کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ٹرک پر جھکتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

"میرا نام بگلر ہے۔"

"مجھے ایڈورڈ کہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "تم سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"بڑی دلچسپ بات سامنے آئی ہے میرے ڈیڈی کا نام بھی ایڈورڈ تھا اب میں ایک اور ایڈورڈ سے مل رہا ہوں۔" وہ کام میں جت گیا پھر کچھ ہی منٹ بعد سر اٹھا کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

"یہ کار ہے اب اس میں دم نہیں رہا۔"

"کیا تم، کیا تم مجھے قریبی قصبے تک پہنچا سکو گے میرے پاس کچھ رقم ہے جو میں معاوضے کے طور پر ادا کردوں گا۔"

"ضرور لیکن ذاتی وجوہ کی بنا پر میں یہ کام کل کر سکوں گا۔ کل کا انتظار کرنا زیادہ بہتر ہے کم از کم میرے حق میں تو بہت ہی بہتر ہے۔"

"جو تم مناسب سمجھو میں تو بس یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

"میں ان اطراف میں خاصا مشہور ہوں لوگوں نے مجھے بڑا آدمی بنا دیا ہے تمہارا کیا خیال ہے مسٹر ایڈورڈ؟"

"مسٹر بگلر تم دو آدمیوں کے ایک آدمی ہو۔"

بگلر ہنسنے لگا اس نے ٹرک سے چار پیٹیاں اتاریں اور اپنی گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈال دیں پھر وہ ایڈورڈ کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"ہم ان پہاڑیوں کا رخ کریں گے اور رات کو وہیں کیمپ کریں گے وہاں جھاڑیوں میں چھپنے میں آسانی ہوگی۔ میں قانون سے بھاگا ہوا اور پولیس کو مطلوب ہوں۔ تم نے سنا ہی ہوگا۔"

اس بات سے انکار کرنا احمقانہ بات ہوتی۔

"ہاں سنا تو ہے لیکن جو کچھ تم نے کیا اس سے مجھے غرض نہیں ہے میں تو مدد کا طالب ہوں۔"

بگلر اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا اور کار میں داخل ہوگیا۔ ریگستان میں سڑکوں کے بغیر پہاڑیوں تک پچیس منٹ کی مسافت تھی لیکن سبز سیڈان نے وہ فاصلہ بخوبی طے کرلیا۔ پہاڑیوں تک پہنچنے اور بگلر کے گاڑی سے نکلنے تک ان کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی بگلر نے گاڑی سے نکل کر اطراف کا جائزہ لیا پھر ساتھ لائی ہوئی پیٹیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ایڈورڈ نے بڑی حیرت سے بگلر کو ہاتھوں سے پیٹیوں کے ٹکڑے کرتے اور ڈھلوان کی دوسری طرف آگ جلاتے دیکھا جہاں وہ سڑک سے اٹھتے ہوئے شعلوں کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ پھر بگلر گاڑی سے فرائی پان، کیتلی، کافی، خشک گوشت کے پارچے، لوبیا، مٹر اور نجانے کیا کیا لے آیا کھانا تیار ہوا انہوں نے براہ راست فرائی پان سے کھایا اور خوب ڈٹ کر کھایا۔ اس کے بعد کافی کے دو بڑے بڑے مگ چڑھائے گئے۔ کافی حیرت انگیز طور پر ذائقے دار تھی ایڈورڈ نے سوچا مجھے ان تمام چیزوں کا معاوضہ ادا کرنا ہی ہوگا پھر کیوں نہ جی بھر کے لطف اٹھایا

جائے۔ اس نے کافی کا آخری قطرہ حلق میں اتارا اور گاڑی کے پہیے سے ٹک گیا۔ ہگو وہیں ریت پر ڈھیر ہو گیا۔ لپکتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں وہ کسی دیو کی مانند نظر آ رہا تھا۔ جبکہ دوسری جانب سے جدھر تاریکی تھی وہ عفریت دکھائی دے رہا تھا۔

"لگتا ہے کافی طویل سفر کیا ہے؟" ایڈورڈ نے پوچھا۔

"اس وقت میری عمر چھیالیس سال ہے میں چودہ سال کی عمر سے بھاگ رہا ہوں اور کہیں نہیں رکا ہوں اب تو عادت ہے۔"

"اس طویل عرصہ میں تم کہیں نہیں رکے۔" ایڈورڈ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں میں مستقل حالت سفر میں ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"لیکن جب بھی رکنا پڑا اصلاحی اسکول یا جیل کی وجہ سے رکنا پڑا۔ سفر کے دوران میں گزر بسر کے لیے میں نے کوچیلا کے علاقہ میں باغات سے پھل چننے کا کام کیا۔ کیا تم اس علاقہ سے واقف ہو بہت خوب صورت جگہ ہے۔ وہ بھی ریگستان ہی ہے مگر ریگستان کا ایسا حصہ جہاں پانی پہنچا دیا گیا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے ریگستان پسند رہا ہے۔ یہ پرسکون ہوتا ہے اور شہر کی مانند کاٹ کھانے کو نہیں دوڑتا۔ یہاں اجنبیت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ماسوائے صحرائی جانوروں کے کوئی ذی روح نہیں ملتا لیکن وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں جس طرح میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔"

"کبھی تم نے کہیں آباد ہونے کے بارے میں نہیں سوچا۔"

"ہر شخص اس کے بارے میں سوچتا ہے لیکن میرے ساتھ معاملہ ہی کچھ اور ہے۔" وہ کھٹی پر جھک گیا اور لکڑی سے آگ کریدنے لگا۔ "لوگوں نے مجھے نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اس لیے میں انہیں پسند نہیں کرتا اور ان کے درمیان رہنا مجھے گوارا نہیں۔ میری بس ایک ہی خواہش ہے کہ مجھے کچھ کاٹھ کباڑ مل جائے اور میں اپنے لیے ایک چوبی مکان تیار کر لوں۔ خود اپنے ہاتھوں سے جس طرح میں چاہتا ہوں میں چاہتا ہوں کوچیلا کے علاقہ میں اپنے لیے زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا خریدوں میں چاہتا ہوں کہ بس اپنے طور پر محنت کروں اور روزی حاصل کروں ہو سکتا ہے کہ میں ماہی گیری کروں یا مرغیاں ہی پال لوں کوچیلا گرم اور صحیح معنوں میں بہترین علاقہ ہے۔ ریگستان میرا گھر ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی میرے لیے بہترین جگہ ہے ہو سکتا ہے میں موسم بہار میں بوائی کے موقع پر کوئی کام کر لوں یا آخر میں فصل کی کٹائی میں شریک ہو جاؤں۔ بس ان کے درمیان اور کچھ نہیں میں بہت زیادہ محنتی آدمی ہرگز نہیں ہوں مسٹر۔"

"ہو سکتا ہے تمہارا خواب کبھی پورا ہو جائے۔"

"ناممکن مجھے تو بالکل امید نہیں ہے۔"

"کیوں کیا اس لیے کہ تم موجودہ مصیبت میں گرفتار ہو۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے میں اس طرف سے ایک بار نکل جاؤں تو وہ میری گرد کو بھی نہ پا سکیں گے مسئلہ صرف رقم کا ہے میں جو کچھ سوچتا ہوں اس کے لیے خاصی رقم چاہیے۔"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے ایک آدمی کو قتل کر کے کچھ رقم حاصل کی ہے کیا مزید کسی شکار کے چکر میں ہو؟"

"میں نہیں تو وہ واقعہ جس طرح ہوا میں اس کی وضاحت کر سکتا ہوں مگر اس سے فائدہ...... پھر اس کے علاوہ میں بری طرح تھک چکا ہوں تم چاہو تو گاڑی میں سو جاؤ میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

وہ چیت لیٹ گیا ٹوپی کو موڑ کر سر کے نیچے رکھ لیا اور بالوں سے بھرا ہوا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ ایک منٹ یا اس سے بھی کم عرصے میں وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ ایڈورڈ

گاڑی میں واپس آ گیا۔ وہ نشست پر بیٹھا تو اچانک ہی اس کا ہاتھ لوہے کے پائپ سے ٹکرایا اس کے ساتھ ہی اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ لوہے کے پائپ پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی اور طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں چکرانے لگے اسے بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ بلز اتنا احمق تو نہ ہوگا کہ کسی کو اپنے بارے میں اتنی تفصیل سے بتائے اور یونہی چلا جانے دے۔ کیا وہ اپنے بارے میں اطلاعات دوسروں تک پہنچنے دے گا یا نہیں اس نے ضرور کچھ سوچ رکھا ہوگا۔

ایڈورڈ کی پیشانی بھیگنے لگی اگر بلز سے یہیں پیچھا چھوٹ جائے تو سب سے اچھا ہے مگر کس طرح اس نے مڑ کر گہری نیند سوئے ہوئے بلز کی طرف دیکھا جو بے خبر سو رہا تھا مگر جانے کیوں ایڈورڈ کو اس کے قریب جانے سے خوف آ رہا تھا۔ خطرے کے وقت عموماً چھٹی حس بیدار ہو جاتی ہے۔ اگر وہ قریب پہنچنے سے پہلے ہی بیدار ہو گیا تو؟ ایڈورڈ نے اس تصور کے خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ نہیں، کچھ اور ہی سوچنا ہوگا بلز سے پیچھا چھڑانے کے لیے کوئی دوسری تدابیر اختیار کرنا ہوگی۔ اس نے ڈیش بورڈ کو ٹٹولا خوش قسمتی سے چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ وہ اسٹیئرنگ کے عقب میں ذرا جھکا چابی گھمائی اور فوراً ہی اسٹارٹر کو محسوس کرلیا لیکن پھر ہچکچا کر رہ گیا اگر وہ تیز رفتاری سے نہ نکل سکا تو بلز اسے مار ڈالے گا ممکن ہے کہ گاڑی اسٹارٹ ہی نہ ہو ممکن ہے جھٹکا لے کر رہ جائے۔ اکثر گاڑیاں مخصوص ہاتھوں کی مخصوص جنبش سے مانوس ہو کر اسٹارٹ ہوتی ہیں کچھ بھی ہو سکتا تھا کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا؟ سارا کھیل بگڑ جائے گا نہیں نہیں انتظار کرنا ہی بہتر ہے دیکھنا چاہیے کہ بلز کیا کرتا ہے ایڈورڈ نے سوچا۔

ایڈورڈ اسٹیئرنگ سے ہٹا اور نشست پر دراز ہو گیا جب بلز جیسے آدمی سے نمٹنے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے تو جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کا منتظر رہنا چاہیے۔

ایڈورڈ کی آنکھ کھلی تو سورج طلوع ہو رہا تھا آگ کا سرخ گولہ تپتا رہا تھا کہ بہت جلد ریگستان تپنا شروع ہو جائے گا بلز پہلے ہی اٹھ چکا تھا اور نئے سرے سے آگ جلا کر رات ہی کے انداز میں کھانے پینے کا بندوبست کر رہا تھا۔ ایڈورڈ کو عمدہ کافی کی خوش بو دور ہی سے محسوس ہوئی اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی البتہ آنکھیں کھلی رکھیں۔ رات بھر سونے کے بعد وہ گزشتہ روز کے مقابلے میں تازگی محسوس کر رہا تھا اور بہتر طور پر سوچ سکتا تھا۔ وہ ابھی تک ڈفرنی کی تند خوئی کی طرف سے متفکر تھا اگر وہ کسی طرح ڈفرنی تک پہنچ جائے اور اسے بتائے کہ کس طرح اس کا ایک ایسے خطرناک آدمی سے پالا پڑ گیا تھا جو پولیس کو مطلوب ہے اور جسے وہ علاقے کے شیرف کو سونپ کر آیا ہے تو وہ یقیناً اس کی تاخیر کو معاف کردے گا۔ یہ سب کچھ اس نے سوچا پھر وہ جھکا اور لوہے کے پائپ پر دوبارہ اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔

”لگتا ہے آج دن بہت گرم ہوگا۔“ بلز دور سے پکار کر بولا۔

”ہمیں فوراً چل پڑنا چاہیے۔ بس آ جاؤ اور جلدی سے کھا پی لو۔“

ایڈورڈ انگلیوں سے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے گاڑی سے نکل آیا اور ریت پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ”کہاں چلنا ہے؟“

”میرا خیال ہے تمہیں جانسن بورکس تک تو پہنچا ہی دوں گا۔ وہ خاصا بڑا قصبہ ہے تم جہاں جانا چاہو گے آسانی سے سواری مل جائے گی یا اپنی کار تک جانا چاہو گے۔“

”کیا تمہارے لیے یہ خطرناک بات نہیں ہوگی؟“ ایڈورڈ نے پوچھا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا وہ صبح سے میری تلاش شروع نہیں کردیتے اگر کچھ ہوا بھی تو کیا زیادہ سے زیادہ جیل چلا جاؤں گا یہ کوئی ایسی بات نہیں میں پہلے بھی جیل جا چکا ہوں۔“

ایڈورڈ نے جو کچھ سوچا تھا اس سے زیادہ آسان اور بہتر صورت نکل رہی تھی قصبے میں پہنچنے کے بعد وہ چیخ چیخ

کرلوگوں کو بگز کے بارے میں بتادے گا اور گاڑی سے کود کر باہر آجائے گا۔ کوئی جھگڑا نہیں ہوگا نہ اس دیو قامت آدمی کے ہاتھوں مارے جانے کا خطرہ ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے تیزی سے کھانا شروع کردیا۔ وہ سوچ رہا تھا جتنی جلدی یہاں سے نکل جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

انہوں نے تمام چیزیں گاڑی میں رکھیں اور گاڑی چل پڑی ان کا گزر ایک بار پھر ادھر سے ہوا جہاں وہ پرانا اور بے کار ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ خاصے فاصلے تک وہ دونوں خاموش رہے پھر بگز اچانک بول اٹھا۔

"مجھے کم از کم تین سو ڈالر کی سخت ضرورت ہے جتنی جلد جمع کرسکوں بہتر ہے تاکہ کوچیلا میں اپنے قیام کا بندوبست کرسکوں تمہارا کیا خیال ہے ایڈ کیا تین سو ڈالر حاصل کرنا مشکل بات ہے؟"

ایڈورڈ ٹھٹکا کیا اور مڑ کر بولا۔

"میں اس سلسلے میں ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اور پھر اس کے خیالات کی رو بھٹک گئی۔ تو واقعی کچھ ہونے والا تھا۔ بگز بڑی خوب صورتی سے معاملے کی طرف آرہا تھا اس نے اپنے ساتھ رکھے ہوئے لوہے کے پائپ کو ٹٹولا اگر بگز نے کوئی حرکت کی تو بے شک وہ لوہے کا پائپ استعمال کرے گا مگر کیا ہی اچھا ہو جو وہ یونہی باتیں کرتے ہوئے قصبے میں داخل ہوجائیں۔

وہ قصبے کے نواح میں پہنچے تو ایڈورڈ کی پریشانی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ایڈورڈ کا کوٹ اس کی گود میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے اس خیال سے بٹوے کو ٹٹولا کہ ایسا تو نہیں کہ بگز نے اس کی رقم نکال لی ہو مگر رقم محفوظ تھی۔

"تم سوچ رہے ہو کہ شاید میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہوں، کیوں؟" بگز نے اچانک پوچھا۔

ایڈورڈ گڑبڑا گیا۔

"نن.....نہیں تو۔" وہ جلدی سے بولا بگز ہنسنے لگا۔

وہ قصبے میں پہنچ رہے تھے ایڈورڈ نے بگز کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرے بارے میں تمہارے کیا ارادے ہیں مسٹر بگز؟"

"کیوں، میرا ارادہ تمہیں یہاں اتارنے کا ہے تاکہ کوئی بس مل جائے یا کرائے پر کار لے سکو اور اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاؤ۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں کتنی رقم ساتھ لے کر جا رہا ہوں؟"

"مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی یہ میرے سوچنے کی بات ہے دیکھو ایڈ لوگوں نے میرے بارے میں بڑی غلط باتیں اڑا رکھی ہیں۔ میں ویسا نہیں ہوں جیسا کہ لوگ کہتے ہیں اور ہوتا بھی تو تمہیں ہرگز نہیں لوٹتا۔"

"وہ کیوں؟"

بگز کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور اس کا منہ لٹک گیا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم یہ سوال ضرور کرو گے ایڈ لیکن میں بتاؤں گا تو بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔" اس نے گاڑی ایک طرف کھڑی کردی۔

"لو اب اتر جاؤ۔"

لوہے کے پائپ پر ایڈورڈ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"بگز تم میرا کوٹ لے لو۔ میں تمہارا کوٹ پہن لوں گا۔"

"میرا کوٹ ایک دم چیتھڑا ہے۔" وہ آہستہ سے بولا اس بھاری بھرکم شخص کی آواز کانپ رہی تھی۔

"تمہیں میرے لیے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"سنو بگز کتنی پولیس تمہارے پیچھے ہے اور یہاں قصبے کے لوگوں کو بھی معلوم ہے کہ تم پولیس کو مطلوب ہو تم نے میری مدد کی ہے اس لیے میں تمہاری مدد کروں گا بس اسٹاپ کہاں ہے؟"

"تم جہاں بھی کھڑے ہوکر ہاتھ دکھا دو گے بس رک جائے گی۔" بگز نے کہا۔

"ٹھیک ہے ہم یہاں بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں جیسے

ہی کوئی بس دکھائی دے تو تم فوراً میرا کوٹ پہن لینا پھر اتر کر بس کو روکنا اور کوچیلا روانہ ہو جانا بات سمجھ میں آ گئی؟"

"مگر...... مگر مسٹر ایڈ۔" وہ آہستہ سے اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔

"کوٹ میں خاصی رقم موجود ہے۔"

"نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"میں تمہاری گاڑی خرید رہا ہوں مجھے اس کی ضرورت ہے۔" بلکو اپنا بڑا سا سر ادھر اُدھر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں جناب میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو ورنہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔" ایڈورڈ قدرے سختی سے بولا۔

"میں تم سے پھر درخواست کر رہا ہوں تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں کہہ رہا ہوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا آخر کیوں؟" بلکو نے کہا دور سے ایک بس آتی دکھائی دے رہی تھی۔

"تم مجھ سے کیا کہنے جا رہے تھے بلکو یہی نا کہ تم میرے دوست ہو اگر میں تمہارا دوست ہوں تو تم میرے دوست ہو۔ میں تم سے جو کہہ رہا ہوں تمہیں وہی کرنا پڑے گا ورنہ تم میری دوستی ٹھکرا دو گے اور میں تمہاری دوستی سے محروم ہو جاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو۔"

"تم نے کیا کہا...... دوست ہاں میں یہی کہنا چاہ رہا تھا۔"

بلکو کی آواز بھرا گئی۔

"مگر میرے دوست اس پھٹے پرانے کوٹ میں پچاس ڈالر سے زیادہ رقم نہیں ہے کیا یہ ایک دوست کے ساتھ دھوکا نہیں ہوگا؟"

"نہیں یہ دھوکا نہیں ہے بس جلدی سے اترو بس روکو اور سوار ہو جاؤ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کوئی تمہارے پیچھے نہیں جائے گا اس قصے کو ہمیشہ کے لیے ختم سمجھو جاؤ کوچیلا میں اپنا من پسند چوبی مکان تیار کرواور سکون سے رہو مکان تعمیر کرنے کی خواہش میں بھی رکھتا ہوں۔ میں نہ سہی میرا دوست سہی۔ وہی مکان بنائے دوست کی خوشی میری خوشی ہے خدا حافظ بلکو۔"

دونوں کے ہاتھ اور چہروں پر رنگ آ کر گزر گیا۔ بلکو مڑ کر بس کی طرف ہو لیا۔ ایڈورڈ بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆

"جی ہاں جناب۔" ایڈورڈ شیرف سے کہہ رہا تھا۔ "بلکو نے مجھے اغوا کر لیا تھا۔ اسے غافل پا کر میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔ جی ہاں میں اس کی گاڑی لے کر بھاگا ہوں اور اس کا کوٹ بھی لیتا آیا ہوں۔"

"اور بلکو ہے کہاں؟" شیرف نے پوچھا۔

"وہ پہاڑوں کی طرف گیا تھا۔"

"پہاڑوں کی طرف۔" شیرف کے چہرے پر مسرت پھیل گئی۔

"تمہارا مطلب ہے واقعی پہاڑوں کی طرف اگر ایسا ہے تو اسے مردہ ہی سمجھو وہ بے آب و گیاہ اور بنجر پہاڑ ہیں وہاں ایک دو دن سے زیادہ کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ شکریہ مسٹر ایڈورڈ تم نے بڑے کام کی بات بتائی ہماری مدتوں کی دوڑ دھوپ ختم ہو گئی۔" شیرف جوش کے عالم میں ایڈورڈ کی پیٹھ تھپکنے لگا۔

ایڈورڈ اپنے جھوٹ پر حیران تھا مگر اس سے کہیں زیادہ حیرانی اس بات پر تھی کہ اسے یہ جھوٹ بول کر بے پناہ مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔

قسط نمبر 16

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر' ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا مسخر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رعنائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

میں ان کے سامنے یہ فون نہیں سن سکتا تھا۔ اس لیے اٹھ کر ذرا فاصلے پر چلا گیا اور دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"یہ کیسے ہوا؟ کچھ پتہ چلا؟"

"ہونا کیا تھا۔ زلفی یہاں سے گھر گیا، پروین کو چھوڑا اور سیدھا وقاص کے ڈیرے پر چلا گیا۔ وہ کہیں جانے کے لیے اپنی لینڈ کروزر پر سوار ہو رہا تھا۔ زلفی نے جاتے ہی فائر کھول دیا۔ پورا برسٹ اس کے بدن میں اتار دیا۔ ساتھ میں دو گارڈ بھی پھڑک گئے ہیں۔" اس نے بتایا تو میں نے خود پر قابو پا کر پوچھا۔

"پھر وقاص بچا تو نہیں ہوگا۔"

"وہ نہیں رہا اس دنیا میں۔" چھاکے نے مزید بتایا تو میں نے پوچھا۔

"اور زلفی کہاں ہے؟"

"اس بارے میں کوئی پتہ نہیں، وہ ڈیرے پر گیا، اس نے فائرنگ کی، جب تک کسی کی سمجھ میں آیا، وہ وہاں سے بھاگ گیا، پورے علاقے کے لوگ ہائی الرٹ ہیں مگر پھر بھی زلفی کا کچھ پتہ نہیں چلا۔"

"خیر اس کی خبر رکھنا، اگر رابطہ کرے تو کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے بتانا، میں ابھی مصروف ہوں، بعد میں بات کرتے ہیں۔" میں نے اسے سمجھایا اور فون بند کر دیا۔

جان اور کرسٹینا بظاہر جسپال کی بات سن رہے تھے، لیکن ان کی ساری توجہ میری طرف تھی۔ میں جیسے ہی ان کے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھا تو جان نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہم دراصل ایک عالمی انسانی حقوق کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم لوگ امن، تعلیم اور انسانی وسائل کے لیے کام کرتے ہیں۔ ہمارا مرکزی دفتر برطانیہ میں ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں ہماری شاخیں ہیں۔ یہاں پاکستان میں بھی شاخ ہے۔ ہم اسی سلسلے میں آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں، تاکہ آپ کو ہم اپنے بارے میں بتا سکیں۔"

"بہت سارے اداروں کو آپ نے دعوت دی ہے ان میں ایک ادارہ ہمارا بھی ہے۔ آپ تعلیمی میدان میں یہاں کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہماری خدمات حاضر ہیں۔" کرسٹینا نے بتایا تو میں نے کہا۔

"آپ کو میں نے دعوت نہیں دی۔" میں نے دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سوہنی بی بی کی طرف سے خط تھا۔ ہم اس کی تفصیلات کے لیے آئے ہیں۔" کرسٹینا نے کہا تو ایک لمحے کے لیے میں سوچ میں پڑ گیا۔ پھر چند لمحے بعد میں نے ان سے کہا۔

"آپ پلیز ہمیں کچھ وقت دیں، تانی بی بی ہی آپ سے بات کریں گی۔" یہ کہتے ہوئے میں اٹھا تو جسپال بھی میرے ساتھ اٹھ آیا۔ میں حویلی کے اندر گیا اور جسپال سے پوچھا۔

"یہ کیا ڈرامہ ہے؟" جسمیندر کا تعارف اور یہ لوگ دوسری بات کر رہے ہیں۔"

"میں اس سے بات کرتا ہوں۔" اس نے سیل سے جسمیندر کو کال ملائی، لمحوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔ جسپال نے ان دونوں کے بارے میں بتایا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"بظاہر ان کا یہی کام ہے۔ لیکن اصل میں ان کے جو کام ہیں، ان کی تفصیلات میں تمہیں بعد میں بتادوں گا، یہ یاد رکھو کہ میں نے انہیں تمہارے پاس بھیجا ہے، میں نے ہی انہیں معلومات دی ہیں۔ لیکن وہ لوگ مجھ سے براہ راست واقف نہیں ہیں، میں ان کے بارے میں سب جانتا ہوں۔"

"کچھ تو بتاؤ، ان کے بارے میں، ایسے ان سے کوئی کیا بات کرے۔"

"انہوں نے وہی کچھ بتانا ہے جو وہ بظاہر کرتے ہیں۔ اس نے پس منظر میں تفصیل یہ ہے کہ بلاشبہ ان کا تعلق عالمی انسانی حقوق کی تنظیم سے ہے لیکن ان کا ٹارگٹ وہ لوگ ہیں جو کسی نہ کسی حوالے سے اپنے علاقے میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ جو بالآخر سیاست کی دنیا میں داخل ہو کر اسمبلی تک پہنچ سکتے ہیں۔ اٹھارہ کروڑ عوام کے ذہن بدلنے کی بجائے وہ چند ایسے لوگوں پر بے بہا نوازشات کرتے ہیں۔ اور پھر ان سے اپنے مقاصد حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی سیاسی پارٹی کوئی بھی ہو، وہ ہر طرف سے اپنا فائدہ لینے میں کامیاب ہیں۔"

"ان کا اصل مقصد کیا ہے؟" جسپال نے پوچھا تو اس نے کہا۔

"اب تم بچوں والی بات کر رہے ہو، یار عالمی طاقتوں کی ایجنڈا کیا ہے؟ وہ مختلف روپ میں اپنے کھونٹے گاڑتے ہیں، یہ بھی انہی کا ایک پنجہ ہے۔"

"اب بتاؤ، ان کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟" جسپال نے پوچھا۔

"ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرو اور انہیں پھر آنے کا کہہ دو۔ اس دوران تمہیں روہی سے بھی معلومات مل جائیں گی۔ اگر تم لوگ ان سے مدد لینا چاہو تو یہ بہت زیادہ مدد دے سکتے ہیں۔" جسمیندر نے مشورہ دیا تو میں سمجھ گیا کہ ضرور اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے، یہ ابھی صرف تعارف چاہتا ہے۔ میں نے جسپال کے ذمے لگایا کہ وہ ان کے ساتھ جو بات چیت کرے۔ جسپال چلا گیا تو میں نے رندھاوے کا نمبر ملایا۔ اس نے فوراً ہی کال رسیو کر لی تو میں نے پوچھا۔

"تمہارے کسی بندے نے آنا تھا، آیا کیوں نہیں، میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"آنا تو تھا، لیکن وہ پیرزادہ وقاص قتل ہو گیا ہے نا، اس لیے تھوڑی سی ہلچل ہے۔ میں خود آتا ہوں اسے اپنے ساتھ لے کر۔"

"اور وہ دو پنچھی جو ادھر آنا چاہ رہے تھے؟" میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

"وہ آئیں گے، یہاں میں طے ہے۔ شاہنواز انہیں لے کر آئے گا، میں اسی کے لیے تو سارا بندوبست کرنا چاہ رہا تھا، خیر ملتے ہیں یار بعد میں اور تفصیل طے کرتے ہیں۔" اس نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور حویلی کے اندر چلا گیا۔

میں نے نیٹ آن کیا اور روہی کی طرف سے کسی متوقع ہدایات کے لیے میل دیکھی۔ وہاں میرے لیے بہت کچھ تھا۔ جان اور کرسٹینا کے بارے میں تفصیل درج تھی۔ وہاں ان لوگوں کے بارے میں بھی فہرست تھی جو اس تنظیم کے پروردہ تھے اور اس وقت سیاست میں طاقتور تھے۔ انہیں بہت اچھا ریسپانس دینے کو کہا گیا تھا۔ تفصیلات پڑھنے میں مجھے کچھ وقت لگ گیا۔ لیکن بنیادی معلومات مل گئیں۔ میں نے نیٹ بند کیا اور واپس لان میں آ گیا جہاں میز پر ڈھیر سارے لوازمات سجے ہوئے تھے۔

سونیا، سارا اور جسپال سے وہ باتیں کر رہے تھے۔ سونیا ان سے کہہ رہی تھی۔

"آپ کی خدمات بہت اچھی ہیں۔ اور لوگ بھی ہمارے رابطے میں ہیں۔ بہت جلد ہم آپ سے رابطہ کرتے ہیں۔"

"ہم انتظار کریں گے اور آپ ہماری بہترین خدمات سے استفادہ کریں گے، اس کی ہم پوری توقع رکھیں گے۔" جان نے مسکراتے ہوئے کہا تبھی کرسٹینا اٹھتے ہوئے بولی۔

"تو پھر ہمیں اجازت دیں۔"

"نہیں آپ ہمارے ساتھ لنچ لیں گے، اس وقت تک آپ آرام کر سکتے ہیں، چاہیں تو گپ شپ کریں۔" جسپال نے کہا تو جان کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ میں اپنے گھر میں نیم کے درخت تلے پڑا، رندھاوے کا انتظار کر رہا تھا کہ ایسے میں تانی آگئی۔ وہ میرے سامنے والی چارپائی پر بیٹھی پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ وقاص کا قتل ہمارے لیے کوئی مشکل پیدا کر سکتا ہے؟"

"میرے خیال میں تو آسانی ہی ہوئی ہے، تم نے ایسے کیوں سوچا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ظاہر ہے اس کی آخری رسومات پر شاہنواز کے ساتھ، ملک سجاد اور شاہ زیب بھی آئیں گے، انہیں یہاں آنے کا جواز مل گیا ہے۔"

"میں انہیں ویسے بھی یہاں آنے سے نہیں روک سکتا، ہاں اگر یہاں آکر وہ کوئی ایسی ویسی بات کرتے ہیں تو پھر میرا خیال ہے انہیں معاف نہ کیا جائے۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

"تمہارے خیال میں کیا اب وہ میلہ لگانے کی ضد کریں گے، ظاہر ہے انہوں نے نہیں گھیرنے کے لیے یہ سارا اہتمام کر رہے تھے۔"

"وہ نہیں، اب ہم چاہیں گے کہ میلہ لگے، وہ بھی ہماری مرضی کے مطابق، باقی جو حالات ہوں گے، اس کے مطابق دیکھ لیں گے۔" میں کہہ چکا تو ایک دم سے میرے ذہن میں خیال آیا، میں نے تانی کے چہرے پر دیکھا اور پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تانی، تم کہیں بور تو نہیں ہو گئی ہو، یہاں کی زندگی سے اکتا گئی ہو؟"

"میں اکتائی نہیں، بلکہ اتنے سارے لوگوں کے درمیان رہنے کا مجھے مزہ آرہا ہے، بس ایک شکایت ہے مجھے۔" اس نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ کیا شکایت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم مجھے وقت نہیں دیتے۔ میں جانتی ہوں کہ اب تمہارا اپنا کوئی وقت نہیں ہے لیکن پھر بھی، میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، ہر دم ہر پل۔"

"اوکے، میں کوشش کروں گا کہ تم میرے ساتھ رہا کرو، اب خوش؟" میں نے کہا تو وہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔ پھر کراچی میں گزرنے والے وقت کی بابت بتاتی رہی۔ اسی دوران رندھاوے کی کال آگئی کہ وہ آگیا ہے۔ میں نے اسے اندر آجانے کو کہا تو وہ اندر صحن ہی میں آگیا۔ رندھاوا اب ڈی ایس پی بن چکا تھا۔ ایک بہت بڑا معرکہ اس نے سر کیا تھا۔ را کے ایجنٹ پکڑنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن شاہنواز کا بچ جانا، گویا سانپ کو زخمی کر دینے کے مترادف تھا۔ اس وقت وہ سادہ لباس میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا، خوبرو نوجوان تھا۔ انہیں دیکھتے ہی تانی اٹھ گئی۔ علیک سلیک کے بعد رندھاوے نے اس نوجوان کا تعارف کرایا

"یہ شعیب ہے، اور سیدھا سیدھا بتا دوں کہ یہ اپنے ملک کی خفیہ ایجنسی کا آفیسر ہے۔ اس کی ڈیوٹی تمہارے ساتھ لگائی جا رہی ہے، تمہارے ساتھ مطلب اس علاقے میں، ظاہر ہے اسے یہاں رہنے کا کوئی جواز چاہیے ہوگا۔" رندھاوا کہہ چکا تو میں نے براہ راست شعیب کی طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہوا ہے، کہاں دیکھا ہے، یہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ لمحہ بھر

سوچتے رہنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔
"کیسا جواز چاہیے تمہیں؟"
"حویلی میں کوئی ایسی جاب، جس سے میں آزادانہ اِدھر اُدھر آجاسکوں۔"
"ہوگیا۔ تم ابھی سے وہاں جاب پر ہو۔ اور میرا نہیں خیال کہ تمہیں مزید کوئی بات سمجھانا ہوگی۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
"میں سمجھتا ہوں، آپ بے فکر رہیں۔"
"وقاص کی نماز جنازہ مغرب کے بعد ہے۔ آؤ گے؟" رندھاوے نے پوچھا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"کیوں نہیں، ضرور آؤں گا۔"
"ٹھیک ہے میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا تو تانی نے کچن کے دروازے پر کھڑی نے کہا۔
"چائے بن گئی ہے، پی کے جائیں۔"
اس پر رندھاوا ایک دم سے چونکا اور بولا۔
"مجھے تو خیال ہی نہیں تھا۔ یہ بھی یہاں پر ہیں۔"
"تعارف ہے اس سے؟"
"ہاں، ان کے بارے میں سنا ہے۔" اس نے کہا اور چار پائی پر بیٹھ گیا تو میں نے اس سے پوچھا۔
"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ شعیب کی ڈیوٹی کیوں لگائی گئی ہے اِدھر؟"
"یہی بتادے گا۔" اس نے شعیب کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ دھیمے سے لہجے میں بولا۔
"شاہ دین یہاں کا ایم این اے تھا اور شاہنواز ایم پی اے۔ یہ دونوں بیرونی قوتوں کے لیے کام کرتے تھے، خاص طور پر 'را' کے لیے۔ ان کے بڑے بڑے پراجیکٹ تھے، جنہیں آپ کی مدد سے ختم کیا گیا۔ میں یہاں پر اس لیے ہوں کہ یہ دوبارہ کم از کم اپنے علاقے میں کوئی ایسا کام نہ کریں اور انہیں کبھی بھی اسمبلی کا رکن منتخب نہ ہونے دیا جائے۔"
"ٹھیک ہے، لیکن ان کے پراجیکٹ کیا تھے؟" میں نے پوچھا۔ ایسے میں تانی چائے کے کپ ایک ٹرے میں رکھے آگئی۔ سب نے کپ لیے تو وہ ایک طرف بیٹھ گئی۔
"میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔ میں نے اسے خصوصی طور پر اسٹڈی کیا ہے۔ فی الحال اتنا جان لیں کہ یہ اعلیٰ سطح کی معلومات دیتے تھے۔ اپنے دشمنوں کو ختم کرتے تھے، لوگوں کا ٹارگٹ قتل، خوف و ہراس، خاص طور پر تعلیم دشمنی۔" اس نے اختصار سے بتایا تو میں نے پوچھا۔
"وقاص کی یاری شاہنواز سے تھی لیکن وہ شاہ دین کے خلاف تھا، اب شاہ زیب......"
"میں بتاتا ہوں۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا، پھر لمحہ بھر سانس لے کر بولا۔
"وقاص خود ایم پی اے بننا چاہتا تھا، اس لیے ایک لمبی سازش کر رہا تھا۔ اب شاہ دین نہیں رہا تو شاہنواز ایم این اے اور وقاص ایم پی اے بننا چاہتا تھا۔ اب وقاص کی جگہ شاہ زیب لے گا۔ وہ اب سکون سے نہیں بیٹھیں گے۔ ان کی کوشش ہوگی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اسمبلی تک رسائی لیں اور ایسا ہم نے ہونے نہیں دینا۔"
"مستقبل کی بات تو ایسے ہی سمجھ میں آتی ہے۔ یورپی یونین کے لوگ بھی اس علاقے میں دلچسپی رکھتے ہیں، کیا وہ بھی ایسے ہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"طریقہ واردات مختلف ہے اور ظاہر ہے، جو آدمی کروڑوں اربوں روپے لگا کر رکن بنتا ہے، اس کی اپنی دلچسپی تو ہے تا کہ اس سے دوگنا مال کمائے۔ وہ کئی گنا مال لگاتے ہیں اور اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ جمال صاحب، تاریخ شاہد ہے کہ جب تک کوئی قوم مضبوط ہے اسے کوئی شکست نہیں دے سکا، کھوکھلی قوم کو اپنی انگلیوں پر نچایا جاسکتا ہے۔ اور یہ لوگ قوم کو کھوکھلا کرنے کا جرم کر رہے ہیں۔ ان کی اپنی زندگی تو شاید اچھی بن جائے لیکن آنے والی نسلوں کو تاریکی میں دھکیل رہے ہیں۔"
"فکر نہ کرو شعیب، کم از کم یہ لوگ اب ہماری انگلیوں پر ناچیں گے۔" میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا تو وہ لمبی سانس لے کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے، میں اب چلتا ہوں، وقاص کے ہاں ہی ملاقات ہوگی۔" رندھاوے نے اٹھتے ہوئے کہا تو شعیب بھی اٹھ گیا۔

"میں آتا ہوں حویلی۔"

وہ دونوں چلے گئے۔ تانی نے میری طرف دیکھ کے کہا

"لگتا ہے، بہت ساری تو تیں یہاں جمع ہو رہی ہیں، تم نے محسوس کیا؟"

"ہاں ایسا ہوتا ہی ہے تانی، جب بھی کہیں اچھائی ہونے لگتی ہے تبھی وہیں شیطانی تو تیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔" میں نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے اٹھ گئی۔



وقاص کی نماز جنازہ دیر گئے تھا پورا علاقہ ہی اُمڈ آیا ہے۔ ایک بڑے میدان میں اس کا اہتمام تھا۔ میں چھاکے کے ساتھ جان بوجھ کر دیر سے پہنچا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسے مواقع پر میرا دشمنوں سے آمنا سامنا ہو۔ ہم نے کار ایسی جگہ لگائی، جہاں سے آسانی کے ساتھ نکلا جا سکے۔ میں پچھلی صفوں میں ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم خاموشی سے نکلے اور نور نگر کی طرف چل پڑے۔

خلاف توقع چھاکا بہت خاموش تھا۔ جیسے ہی ہم گاؤں کے قریب آئے تو اس نے کہا۔

"ڈیرے پر چلو، بھیدے کے پاس۔"

"خیر ہے؟" میں نے پوچھا اور کار کا رخ اس جانب موڑ دیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد ہم ڈیرے پر جا پہنچے۔ میں کار سے نکل کر صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھنے لگا تھا کہ چھاکے نے کہا۔

"اندر چلو۔"

میں اندر کی جانب بڑھ گیا۔ میں کمرے میں گیا تو سامنے زلفی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ذرا سی بھی حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ جلد یا بدیر وہ مجھ ہی سے رابطہ کرے گا۔ میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا کہ پیچھے کھڑے چھاکے نے کہا۔

"یہ صبح کا یہیں ہے۔ اب اس کا کیا کرنا ہے، یہ تم بتاؤ۔"

"کرنا کیا ہے، ادھر رہے گا تو کسی نہ کسی کی نظر چڑھ جائے گا۔ ظاہر ہے ہمارے پاس ہونے کی وجہ سے وقاص کا قتل ہمارے کھاتے پڑ جائے گا۔" میں نے کہا تو چھاکا بولا۔

"تو پھر کہاں رکھیں، اب پولیس کے حوالے تو کریں گے نہیں۔"

"ایسا کرو، صبح سویرے تک ٹھہرو، میں یہاں سے اسے نکال لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔" میں نے زلفی کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے دور کہیں مت بھیجنا، میں یہیں کہیں رہنا چاہتا ہوں۔ میں اب پروین سے بھی زیادہ دور نہیں رہ سکتا۔"

"وہ بھی تیرے پاس ہی رہے گی۔ بہت جلد وہ تجھ سے آن ملے گی۔" میں نے اسے حوصلہ دیا اور واپسی کے لیے نکل آیا۔ صحن میں آ کر میں نے کہا۔

"چھاکے اب یہ کام تمہارا ہے، اسے گاڑی میں ڈالو اور کرنل سرفراز کے فارم ہاؤس چھوڑ آؤ۔ کسی کو بھی پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ زلفی ہے کہاں، کسی اپنے کو بھی نہیں۔ آگے جب بھی وقت ملے پروین کو بھی اس کے پاس چھوڑ دینا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے میری بات سمجھتے ہوئے کہا تو میں نے فون پر کرنل سرفراز کے نمبر پش کئے۔ رابطہ ہو جانے پر میں نے اشارے کنائے میں بات بتائی۔ انہوں نے زلفی کو بھیج دینے کے لیے کہا تو میں نے اسی وقت چھاکے کو روانہ کر دیا۔ خود بائیک لے کر اپنے گھر آ گیا۔

رات کا پہلا پہر ختم ہو چکا تھا۔ میں اور سوہنی چھت پر تھے۔ وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر کھڑی مجھے دیکھے چلے جا رہی تھی۔ اس نے جان، کرشینا اور شعیب کے بارے

تفصیلی بات کر کے سمجھ لی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اب سوہنی مجھ سے ذرا فاصلے پر رہتی ہے۔ میں سمجھ نہیں سکا تھا کہ اس میں شدت نہیں رہی یا اس نے خود پر قابو پا لیا ہے، یا یہ اس کی ناراضگی کا اظہار ہے۔ مجھے اس پر بہت پیار آ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے قریب کرتے ہوئے یہی باتیں پوچھیں تو وہ بولی۔

"جمال! میں نے تمہیں اس دنیا میں جانے سے روکا تھا، لیکن میں غلط تھی۔ شاید کسی مقصد کو حاصل کر لینا اتنا مشکل نہیں ہوتا، جتنا اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"یہ احساس کیسے ہوا؟" میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

"بہت کچھ سوچا میں نے، اپنا حق نہیں حاصل کر سکتی تھی، اب کر تو لیا، لیکن اگر طاقت نہیں ہوگی تو میں اسے کیسے سنبھال سکتی ہوں۔ اور اس وقت جو لوگ ہماری دشمن ہیں ان کا بس چلے تو یہ سب اگلے ہی لمحے ہمیں ختم کر دیں۔ یہ جو گلشن ہم نے بنا لیا ہے اور جس کی ابھی تعمیر تو بھی نہیں ہو سکی، اس کی حفاظت کیسے ہوگی، ظاہر ہے ہمیں طاقت چاہیے ہوگی۔" اس نے اپنا سر میرے کاندھے پر رکھتے ہوئے جذب سے کہا تو مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ میں ان چند لمحوں میں ہر شے بھول جانا چاہتا تھا۔ سوہنی کا قرب پا کر اب مجھے بھی سرشاری محسوس ہوتی تھی۔

"چھوڑو ان باتوں کو، مجھے یہ بتاؤ، پہلے تم میرے قریب رہنے کی کوشش کرتی تھی، اب تم مجھ سے دور رہتی ہو، اس کی وجہ کیا ہے؟" میرے یوں پوچھنے پر وہ مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

"جمال! جب ذمے داری کا احساس نہیں ہوتا تو سوچیں کچھ دوسری طرح کی ہوتی ہیں۔ ہمارے مقصد بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، لیکن اب ذمے داری زیادہ ہے تو سوچیں بھی مختلف ہو گئی ہیں۔ یہ بات نہیں کہ مجھے تم سے محبت نہیں رہی، اب تو سمجھو مجھے تم سے محبت ہی نہیں عشق ہو گیا ہے۔ تم جہاں بھی رہو، مجھے یقین ہے کہ تم میرے ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔"

"میں اس یقین کی وجہ معلوم کر سکتا ہوں۔" میں اس کی باتوں سے سرشار ہوتا ہوا بولا تو وہ خمار آلود لہجے میں بولی۔

"یہ تو میں بھی نہیں جانتی، بس اماں نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ جس سے محبت کی جاتی ہے، اس پر اعتماد کرنا پڑتا ہے، اعتماد کے بغیر محبت کا ہے کی۔ محبت تو میرے اندر ہے نا اور اس کی آبیاری میں نے ہی کرنی ہے۔ جتنے یقین کے ساتھ کروں گی، اسی قدر پرسکون ہو جاؤں گی۔"

"جانتی ہو یہ محبت اور عشق ہوتے کیا ہیں؟" میں نے پوچھا تو وہ لذت آمیز لہجے میں بولی۔

"محبت صرف خوبیوں سے کی جاتی ہے، اور عشق خوبیوں، خامیوں سے ماورا ہوتا ہے، اس میں صرف ذات سامنے ہوتی ہے۔ اور تم میرے سامنے ہو، ہر وقت، ہر لمحے۔ میں تو اتنا ہی جانتی ہوں۔"

"تمہیں ایسی باتیں سکھاتا کون ہے؟" میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی اچانک میرا سیل فون بج اٹھا۔ سارا سکون ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ میں نے فون نکالا تو وہ اجنبی نمبر تھے۔ میں نے کال ریسیو کی۔

"جمال! تمہیں برا تو لگے گا لیکن میں بتا دوں کہ میں چوہدری شاہنواز بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے نفرت میں بھیگی ہوئی آواز میں کہا گیا تو میں سکون سے بولا۔

"اچھا کیا بتا دیا کہ تم شاہنواز بات کر رہے ہو۔ بولو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"صرف تمہاری موت چاہتا ہوں۔ خواہش ہے کہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے ماروں۔" اس نے اسی نفرت سے کہا۔

"میں نے تمہیں منع تو نہیں کیا اور پھر خواہشوں کا کیا ہے، وہ تو بے چاری ایک پل بھی کرتی ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ تڑپ کر بولا۔

"میں چاہتا تو ابھی تم بات بھی نہ کر رہے ہوتے، جب تم وقاص کے ہاں سے واپس جا رہے تھے تو میرے آدمیوں کی نگاہ میں تھے، ایک گولی، تیری بولتی بند کر سکتی تھی۔ لیکن

نہیں میں نے تجھے اپنے ہاتھوں سے مارنا ہے۔“

”کہاں آؤں، تیرے ڈیرے پر یا تیرے گھر پر، پھر دیکھتے ہیں کون مرتا ہے اور کون جیتا ہے، زندگی موت تو میرے رب کے ہاتھ میں ہے، جس نے جب اور جیسے جانا ہے وہ مقرر ہے۔ بولو؟“ میں نے غصے میں کہا۔

”کہا نا ایک گولی تجھے اگلے جہاں پہنچا سکتی ہے لیکن ایسے تھوڑی ماروں گا، سارا علاقہ تجھ سے عبرت پکڑے گا، اور ہاں، وہ طواًلف کی بیٹی سوہنی سے کہہ دینا، میلے پر اس نے ناچنا ہے۔ تیرے سامنے نچاؤں گا اُسے۔“ اس نے انتہائی نفرت سے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، سوہنی نے فون مجھ سے لے لیا۔ فون سے چھن کر آنے والی آواز اس نے سن لی تھی۔

”سن اوئے ہجڑے، اتنا بڑا بول مت بول، میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں تیری بیٹی نچا دوں گی۔ پر نہیں، میں عورت کی عزت کرتی ہوں۔ ہاں یہ ضرور کہوں گی کہ تجھے نچا دوں۔ اب میلہ بھی کتنی دور ہے۔ فقط چند دن، ہمت ہے تو مقابلے پر آ جانا۔ تیرے پیروں میں گھنگھرو میں خود باندھوں گی۔“ اس نے کہا اور فون مجھے دے دیا۔ میں نے فون کان سے لگایا تو وہ گالیاں بک رہا تھا۔ میں نے فون بند کر دیا۔

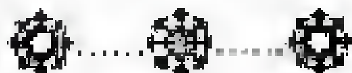
ہم دونوں میں چند لمحے خاموشی رہی، میں نے اس کے چہرے پر دیکھا، جہاں مایوسی اور حسرت پھیل چکی تھی۔ شاید طواًلف کی بیٹی ہونا اس کے لیے بہت بڑا طعنہ بن چکا تھا۔ تبھی میں نے اسے اپنے گلے لگایا تو پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں نے اسے رونے دیا، کافی دیر بعد اس کا جی ہلکا ہوا تو آنسو پونچھ کر میرا ہاتھ پکڑا اور نیچے کی طرف چل دی۔

میں سونا نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے چھاکے کی فکر تھی۔ وہ زلفی کو لے کر کرنل سرفراز کے پاس گیا تھا۔ وہ جب تک وہاں بحفاظت پہنچ نہ جاتا، میں سو ہی نہیں سکتا تھا۔ آدھی رات گذر چکی تھی، لیکن اس کا فون نہیں آیا تھا اور نہ ہی میری کال جا رہی تھی۔ اس کا فون بند جا رہا تھا۔ میں ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ مجھ سے لیٹا نہیں گیا۔ میں باہر والے کمرے سے نکل کر چھت پر جانے کے لیے صحن میں آ گیا۔ پچھلی رات کا چاند ابھر آیا تھا۔ تبھی میری نگاہ اماں والے کمرے پر پڑی، جس میں دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ کیا اماں جاگ رہی ہے؟ یہ سوچ کر میں اس کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ دروازے ہی سے میری نگاہ اندر پڑی، اماں کونے والی چارپائی پر سو رہی تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی جائے نماز بچھائے سوہنی بیٹھی دعا مانگ رہی تھی۔ میں صرف اس کی بڑبڑاہٹ ہی سن سکا جو آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ وہ روتے ہوئے انتہائی جذب سے دعا مانگ رہی تھی۔ میں نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا، دبے قدموں واپس صحن میں آ گیا۔ میرے لیے خوشگوار حیرت کی بات یہی تھی کہ وہی سوہنی ہے، جو میلے والے دن مجھے ملی تھی۔ اس گھر میں آئی تو نیم برہنہ تھی اور آج...... اس میں کوئی شک نہیں کہ رب تعالیٰ، جسے چاہے اور جب چاہے ہدایت سے نواز دے۔ مجھے سمجھ آ گئی تھی کہ وہ پر سکون انداز میں، اتنے یقین کے ساتھ باتیں کیسے کر سکتی ہے۔ میرے اندر خوشگوار ٹھنڈک کے ساتھ ایک نیا عزم بھی ابھر آیا۔ مجھے اس وقت سوہنی پر بے تحاشا پیار آیا تھا۔ میں اسی کے بارے سوچتا ہوا صحن میں پڑی چارپائی پر لیٹ گیا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کب سو گیا۔

سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے پہلا خیال چھاکے کا آیا۔ میں نے جلدی سے فون لیا اور اسے کال ملا دی۔ اگلے چند لمحوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔

”میں واپس گاؤں آ رہا ہوں۔ پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔ سب کچھ حفاظت سے ہو گیا ہے۔“

”اچھا چل سیدھا ادھر ہی آنا، ناشتہ اکٹھے ہی کریں گے۔“ میں نے کہا اور فون بند کر کے فریش ہونے چل دیا۔



ابھی دوپہر نہیں ہوئی تھی۔ میں باہر والے کمرے میں بیٹھا ہوا مسئلے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رات جو شاہنواز نے دھمکی دی تھی، میں اسے نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ انہوں نے علاقے میں خوف و ہراس پھیلا کر اپنے طاقت ور ہونے کا جو تاثر پھیلایا ہوا تھا اسے وہ ہر حال میں دوبارہ قائم کرنا چاہتے تھے اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ ہمارا وجود ختم کر دیتے۔ پہلے میں انہوں نے شر پھیلانا ہی تھا۔ پہلے صرف اپنا تاثر بحال کرنا مقصد ہوسکتا تھا لیکن اب وہ وقاص کا انتقام بھی ہم ہی سے لینا چاہتے تھے۔ ملک سجاد یونہی ان کا ساتھ دے یہاں نہیں آگیا تھا۔ وہ بھی زخمی سانپ تھا۔ شاہ زیب کی تو ایک طرح سے سلطنت چھن گئی تھی۔ اس کا بس چلتا تو اب تک ہمیں ختم کر چکا ہوتا۔ ایک طرف دشمنوں کا یہ اتحاد تھا، لازمی بات تھی کہ انہوں نے بلاسوچے یہ چڑھائی نہیں کی تھی۔ وہ طاقتیں ان کے ساتھ تھیں جن کا نیٹ ورک ہم نے ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ دوسری طرف جان اور کرسٹینا کا یہاں آجانا اس بات کی نشان دہی کر رہا تھا کہ یہاں ایسا کچھ ہے، جس سے انہیں فائدہ مل سکتا ہے۔ انہیں وہ مہرے دکھائی دے رہے تھے، جو ان کے کسی کھیل میں کام آسکتے تھے۔ چاہے کسی رنگ ہی میں سہی، ان کا مقصد خیر خواہی نہیں تھا۔ تیسری طرف شعیب کی آمد ہمارے لیے جیسی بھی ہوتی، لیکن اس کی پہلی ترجیح اس کی اپنی ایجنسی تھی۔ اسے اپنے مقاصد عزیز تھے۔ ہم اگر ان کے مطابق چلیں گے تو وہ ہمارے دوست ہیں، اگر ان کے مطابق نہیں ہیں تو انہیں دشمن بنتے ذرا بھی وقت نہیں لگنا تھا۔ مختلف قوتیں ہمارے گرد گھیرا ڈال رہی تھیں۔ میں اسی بارے میں سوچ میں تھا کہ رندھاوے کا فون آگیا۔

”ایک خبر ہے جمال، اسے ذرا غور سے سننا۔“ اس نے متانت بھری آواز میں کہا۔

”بولو، کیسی خبر ہے؟“ میں نے سکون سے کہا۔

”اب مجھے نہیں پتہ کہ یہ خبر تمہارے لیے کیسی ہے۔ خیر تمہارے دوست جسپال کے بارے میں چھان بین کی اطلاع ہے کہ وہ جرائم میں ملوث ہے۔ اس بارے میں چھان بین......“ اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”جرائم والی بات درست نہیں۔ کہیں نہ کہیں سے غلط فیڈ ہوا ہے، کیا اس کا پتہ کر سکتے ہو؟“

”وہ تو معلوم ہو جائے گا لیکن پھر بھی اسے یا تو واپس جانا ہوگا یا پھر ویزہ بڑھانا پڑے گا۔ اطلاع کے مطابق اس کا ویزہ ختم ہونے والا ہے، پہلی صورت میں ممکن ہے کوئی بات نہ ہو لیکن دوسری صورت میں کوئی نہ کوئی ایجنسی تمہیں تنگ کرے گی۔ تم اپنے دشمنوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تو ایک دم سے مجھے خیال آیا تو میں پوچھا۔

”یار بات سن، یہ کہیں شعیب تو اس مقصد کے لیے یہاں نہیں آیا، مجھے ابھی بتا دے اگر بعد میں پتہ چلا تو......“ میں نے کہا تو وہ تیزی سے میری بات قطع کرتے ہوئے بولا۔

”جمال اگر تمہیں مجھ پر یقین ہے، ذرا سا بھی اعتماد ہے تو اسے دشمن مت سمجھنا وہ تمھی میں سے ہی ہوں۔ میں اس کا ضامن ہوں۔ میں اسے خود تم تک لایا ہوں۔ کیوں لایا ہوں، یہ میں تمہیں بعد میں تسلی اور تفصیل سے بتاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے میں کرتا ہوں جسپال سے بات۔ پھر بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

مجھے ایک دم سے پریشانی ہونے لگی تھی۔ میں جسپال کے ہونے سے بڑا حوصلہ محسوس کر رہا تھا۔ ظاہر ہے اگر وہ جائے گا نہیں تو اسے چھپ کر رہنا ہوگا اور وہ غیر قانونی ہو جائے گا، پریشانی بڑھتی چلی جائے گی۔ ویزہ ختم ہو جانے والی بات تو ہو سکتی تھی لیکن جرائم والی بات کہاں سے آئی، اس بارے میں معلوم کرنا بہت ضروری تھا۔

جسپال حویلی میں تھا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھا لیپ ٹاپ میں محو تھا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے لیپ ٹاپ پرے رکھ دیا اور میرے چہرے

پر دیکھ کر بولا۔

"خیر ہے، بڑے سنجیدہ دکھائی دے رہے ہو، کہیں تائی نے شادی کی فرمائش تو نہیں کر دی؟"

میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے رندھاوے کی اطلاع بارے کے میں بتا دیا تو وہ بھی ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔ پھر دھیرے سے بولا۔

"میری آج ہی جسمیندر سے بات ہوئی ہے۔ اس نے بھی مجھے بتایا ہے۔ دراصل 'را' والوں نے میری اس وقت سے نگرانی شروع کر دی تھی، جب میں بھارت میں تھا۔ میں کینیڈا گیا اور وہاں سے فوراً ہی یہاں آ گیا۔ میں اس دوران ان کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہوں۔ ایک تو کیس ختم کر دینے سے میں فوراً ہی ان کی نظروں میں نہیں آیا تھا، دوسرا میں یہاں رہا، کیس تھا لاہور ہی سے سندھ چلا گیا تھا۔ میں جب یہاں آیا تو ان کی نگاہوں میں آ گیا کہ وہی جسپال ہوں۔" اس نے تفصیل بتائی تو میں نے پوچھا۔

"کیا اس نے یہ بات بتائی ہے کہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟"

"صرف شک ہے، اور وہ بھی 'را' نے پیدا کیا، یہاں شاہنواز جیسے ان کے کارندے تو ہیں ہی۔"

"تو پھر کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جیسے تم کہو، ویسے میں آج ہی اسلام آباد نکلنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ویزہ بڑھ جائے گا۔ یہ مسئلہ تو بھگتا لیں۔ پھر دیکھا جائے گا، ویسے بھی ویزہ ختم ہونے میں چار دن باقی ہیں ابھی۔"

"یہ جسمیندر کیا چیز ہے، اس کی اتنی رسائی ہے کہ ہر معاملے کی خبر دے دیتا ہے، ایسا کیسے؟" میں نے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"یار لوگ روہی جیسے ویرانے میں بیٹھ کر نیٹ ورک چلا رہے ہیں، وہ تو پھر کینیڈا میں ہے۔ دولت اور طاقت کے ساتھ اگر عقل بھی استعمال کر لی جائے تو ممکن ہے۔ وہ میدان کا آدمی نہیں ہے لیکن پس پردہ وہ اپنا کھیل اس طرح کھیل رہا ہے کہ ہر جگہ اس نے اپنے مہرے جمائے ہوئے ہیں۔ میں جانتا ہوں ہوں وہ خود کسی کے کھیل کا مہرہ ہے۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"دیکھو جسپال! اگر آرام سے ویزہ بڑھ جائے تو ٹھیک ورنہ غیر قانونی کام مت کرنا۔ اب تم نظروں میں ہو، ممکن ہے تم پر 'را' کا ٹھپہ لگا دیں۔ بہت احتیاط کرنا، ورنہ یہاں سے نکلنا بہت مشکل ہو جائے گا۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔ تبھی میں نے کہا۔

"ویسے میرا تو خیال ہے تم چپ چاپ نکل جاؤ کینیڈا، میں دیکھ لوں گا سب۔ کیونکہ تمہیں بھارت بھی جانا ہے تمہیں وہاں مشکل نہ ہو جائے۔"

"کیا میں روہی سے رابطہ کر کے پوچھ لوں؟" اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا تو میں نے کہا۔

"نہیں تم نکل جاؤ۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو اس نے کاندھے ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ وہ کچھ دیر بیٹھا سوچتا رہا پھر بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میرے کاغذات لاہور میں ہیں، میں آج ہی نکل جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور میرے سینے سے لگ گیا۔

❁.........❁.........❁

شام ہو رہی تھی۔ جسپال چلا گیا تھا۔ چھاکا اس کے ساتھ گیا تھا۔ انہیں گاؤں سے نکلے کافی وقت ہو گیا تھا۔ میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ رات جس میں ہم نے اپنا ماضی دیکھا تھا، اس نے جسپال میں ایک الوہی پیدا کر دیا تھا۔ وہ میدان جس نے سوہنی کو ملایا اور پھر جسپال کو۔ میں چند لمحے بیٹھا سوچتا رہا اور پھر بائیک لے کر نکل گیا۔ میں اس میدان میں کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ شاید تنہائی میں جسپال کی یاد کروں تو مجھے سکون مل جائے۔

میں مسافر شاہ کے تھڑے تک جا پہنچا۔ جب میں نے بائیک کھڑی کی، اس وقت مجھے درخت تلے ایک بوڑھا آدمی بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے لمبے سفید بال تھے، اسی طرح سفید ریش، چمکتا ہوا چہرہ۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو لیکن کہاں مجھے یہ

سمجھ نہیں آئی۔ وہ کوئی مسافر ہو سکتا تھا جو ستانے کے لیے یہاں بیٹھا ہو، مگر یہ وقت نہیں تھا ستانے کا۔ اس وقت تو مسافر اپنی منزل کی طرف رواں ہوتے ہیں کہ کسی ٹھکانے پر پہنچ جائیں۔ یہ ویرانہ تو کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ پر مجھے کیا، مجھے تو کہیں تنہائی میں بیٹھنا تھا، شاید یہ بھی ایسے ہی سکون اور تنہائی کے لیے یہاں بیٹھا ہو۔ یہی سوچ کر میں نے بزرگ خیال کرتے ہوئے اسے دور ہی سے سلام کیا، تو وہ مسکراتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔

"آجاؤ آجاؤ، میں تیرے ہی انتظار میں ہوں۔"

اس کے یوں کہنے پر میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ میرے لیے اب یہ انہونے واقعات نہیں رہے تھے۔ میں اس کے قریب چلا گیا اور دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کیوں پریشان ہو تم، ہر کوئی سدا ساتھ تو نہیں رہتا اور پھر جو ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔" اس درویش نے بڑے مگر پرسکون لہجے میں کہا۔

"پریشانی تو ہوتی ہے، جب دشمن تو حملہ کر چڑھ آئیں۔" میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"خوف اور پریشانی دو مختلف چیزیں ہیں نوجوان اور پھر تم کیا سمجھتے ہو، جہاں جہاں بھی حق اپنا ظہور کرتا ہے، وہیں پر باطل آ موجود ہوتا ہے۔ حق اور باطل کی یہ کشمکش تو ظہور آدم سے ہو گئی تھی، یہ کوئی نئی اور انوکھی بات تو نہیں ہے، کیا تم نہیں جانتے ابلیس کب بنا؟"

"میرے خیال میں تو وہ آدم سے پہلے کا تھا۔" میں نے اپنے علم کے مطابق بتایا تو وہ بولے

"بیشک اس کا وجود پہلے ہی سے ہوگا، لیکن اس وقت وہ عزازیل تھا، بحث اس سے نہیں کہ وہ کیا کرتا تھا اور کتنا مقرب تھا، جیسے ہی ظہور آدم ہوا اور اس نے رب تعالیٰ کی نافرمانی کی تو ابلیس بن گیا۔ یعنی ابلیس اور ابلیسیت کا ظہور اس وقت ہوا جب آدم کا وجود اس کائنات میں سامنے آیا۔"

"جی تب سے شیطان پوری قوت سے انسان کو بھٹکا رہا ہے اور......" میں نے کہنا چاہا تو میری بات کاٹ کر بولا۔

"تجھے کس نے کہا کہ شیطان کوئی قوت رکھتا ہے، شیطان کی اپنی کوئی قوت نہیں ہے نوجوان۔ یہ سمجھ لو۔"

"تو پھر وہ کیسے بھٹکا رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم مجھے ایک بات بتاؤ، یہ نیکی اور برائی، خیر اور شر، انسانیت اور شیطانیت، ان سب کا ظہور کہاں سے ہو رہا ہے، وہ کون سی جگہ ہے جہاں سے ان کا ظہور ہوتا ہے اور ہم سمجھ سکتے ہیں یہ خیر ہے یا شر، انسانیت ہے یا شیطانیت؟" اس نے میرے چہرے پر دیکھ کر پوچھا تو ایک دم سے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، میں سر ہلاتے ہوئے اتنا ہی کہہ سکا۔

"میرے خیال میں یہ انسان کا وجود ہی ہے، جس سے یہ سب ظاہر ہو رہا ہے۔"

"مطلب انسان کا وجود انسانیت کو ظاہر کر رہا ہے اور وہیں سے شیطانیت بھی سامنے آ رہی ہے۔ تو ایسا کیوں ہے؟ شیطان کا کوئی ہرکارہ یا خود شیطان بھی سامنے آیا ہو؟ تو پھر شیطانیت انسان کے وجود سے ظہور کیوں ہوتی ہے؟"

"یہ آپ ہی بتائیں۔" میں نے سمجھنا چاہا تو وہ بولے

"رب تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم پر پیدا کر دیا۔ اب اسفل السافلین کیسے ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود انسان ہی شیطان کو طاقت دے رہا ہے۔ شیطان کی اپنی کوئی طاقت نہیں ہے۔ انسان اسے اپنے وجود میں راہ دیتا ہے تو ہی شیطان کو اپنے ظہور کا موقع ملتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ابلیس کو رب تعالیٰ نے مہلت دی ہے تو انسان کو کتنی بڑی قوت سے نوازا ہے کہ وہ اس پر قابو پا سکتا ہے۔ انسان کے پاس تو طاقت ہے، انسان اس وقت شیطان سے ڈرتا ہے، جب اسے اپنی طاقت کا ادراک نہیں ہوتا۔"

"انسان کو اپنی طاقت کا ادراک کیسے ہو؟" میں نے

پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے
"جب تم اپنے آپ سے غافل ہو جاؤ گے تبھی شیطانیت کے آلۂ کار ہو گے، تبھی وہ تمہارے وجود سے راہ پائے گا۔ تم شیطان کو اپنے وجود سے نکال باہر پھینکنے اور اسے روک دینے کی طاقت رکھتے ہو، قوت سے تا تو ہی ایسا کر سکتے ہو۔ ہمارے اندر جو ربّ تعالیٰ نے انسان اور انسانیت رکھ دی ہے اسے کوئی نہیں چھین سکتا اور نہ کوئی نکال سکتا ہے۔ اصل میں یہ ہماری غفلت ہے جس نے ہمیں ہی اپنے آپ سے اوجھل کر رکھا ہے۔ جس کی نگاہ اپنے آپ پر ہوتی ہے، جو اپنے آپ کو سمجھتا ہے، شیطان تو اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا، کیونکہ وہیں پر شیطان نے قابو میں آ جانا ہے، یہ شیطان کو بھی معلوم ہے۔"
"اپنے آپ پر نگاہ کیسے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے
"عجیب بات ہے نوجوان! تم اپنے گھر کی حفاظت نہیں کرتے، اس پر نگاہ نہیں رکھتے ہو۔ تمہارا وجود جس میں سب کچھ ہے، جو تمہاری اصل ہے، جو احسن التقویم پر ہے، اتنی گراں مایہ ہستی کو نہیں دیکھو گے؟" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکے اور پھر بولے "یہ نگاہ ہی تعین کرتی ہے کہ یہ نیکی ہے یا برائی۔ دیکھو، دنیا میں عورت کا وجود ہے، جب ہم عورت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہماری نگاہ ہی اس کے رشتے اور مقام کا تعین کرتی ہے، جیسے نگاہ اٹھتی ہے تو سامنے والی عورت کے ماں ہونے کا تعین کون کرتا ہے ماں کے لیے ہمارے جذبات اور احساسات کیا ہوں گے؟ پھر نگاہ اٹھتی ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، بیوی ہے، ہماری نگاہ سارے رشتوں اور ان کے مقامات کا تعین کرتی ہے۔ ہمارے اندر کی نگاہ کا کوئی تو معیار ہوگا؟ اسی طرح یہ تعین کرتا کہ کیا نیکی ہے اور کیا برائی، جب انسان سے ظہور ہوتی ہے تو انسان ہی اس کا تعین کرتا ہے، اسی معیار سے جو اسے ربّ تعالیٰ نے دے دیا ہے۔"
"تو پھر انسان کیوں شیطانیت سے مات کھا رہا ہے، جب شیطان کے پاس طاقت ہی نہیں ہے، انسان تو برائی کی طرف زیادہ مائل ہوتا؟" میں نے الجھتے ہوئے پوچھا۔
"جب انسان کی نگاہ اپنی اچھائی والی قوت پر ہوگی، اسے ادراک ہوگا کہ نیکی کی طاقت کتنی عظیم ہے تو شر اس کی نگاہ سے اوجھل ہوگا۔ اس کا تو وجود ہی نہ رہا لیکن جب وہ شر کو نگاہ میں رکھے گا تو گویا وہ شیطانیت کو اپنے وجود میں راہ دے رہا ہے۔ شیطان بھی تو اپنا آپ انسان کے وجود سے ظاہر کرتا ہے۔ تو انسان حق کو اپنے وجود سے ظاہر کیوں نہیں کر سکتا، حق کا تعین اس کی نگاہ ہی کرے گی۔" انہوں نے نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔
"بزرگو! یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ کیسے؟" میں نے پھر وہی سوال کر دیا
"میں پوچھتا ہوں کہ شیطان کی فتوحات کیا ہیں؟ یہی کہ وہ انسان سے برائی کروا دیتا ہے؟ اگر انسان ہی اسے مہلت نہ دے؟ اس کے قدموں کی پیروی نہ کرے۔ انسان اپنی قوت ہی شیطان کو استعمال نہ کرنے دے، وہ برائی پر غلبہ پا لے گا، گویا شیطان پر غلبہ پا لیا۔ اچھائی کا نہ ہونا ہی برائی ہے۔ حق نہ ہونا ہی باطل ہے، خیر کا نہ ہونا ہی شر ہے۔ اور یہ حقیقت ازل سے ہے کہ جب حق آ جاتا ہے تو باطل وہاں نہیں رہتا۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان اچھائی کی لذت کو محسوس نہیں کرتا۔ خیر کی لذت سے نا آشنائی اسے غافل رکھتی ہے۔ جو شے انسان اپنے اندر محسوس کرے گا۔ جس پر اس کی نگاہ ہوگی اسی کی لذت پائے گا۔ جس کے اندر جو شے پڑی ہے، وہ اسی کی لذت محسوس کرے گا۔ انسان جب شیطان کو راستہ دیتا ہے، بے غیرتی اور شر پیدا کر سکتا ہے تو وہ اچھائی، کیوں نہیں کر سکتا جبکہ یہ قوت تو اسے ربّ تعالیٰ نے دے دی ہوئی ہے کہ وہ اچھائی کرے۔"
"ہم اپنے وجود کے اندر ہی سے شیطان اور شیطانیت پر غلبہ پا سکتے ہیں، یہ انسان کی اپنی دسترس میں ہے۔ انسانی وجود کا عمل اور کردار ہی یہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے اندر کیا ہے انسانیت یا شیطانیت" میں نے سمجھتے ہوئے کہا۔
"شر پیدا کرنے میں وہ لذت نہیں ہے جو برائی کو

روشنی میں ہے۔ یہ زیادہ سرور آگئیں ہے۔ آدم کے ساتھ ہی کو شیطان کو سرنگوں کروادیا، یہ کس نے برقرار رکھنا ہے؟ وہی، جو انسان ہوگا۔ مقام شبیری کی ابتدا تو یہی ہے کہ شیطانیت کو اپنے سامنے سرنگوں کرلیا جائے اور یہی مقصد انسانیت ہے۔ صرف نیکی کی طاقت کو اپنے اندر بڑھا لیا جائے جو رب تعالیٰ کا عطیہ ہے۔" انہوں نے کہا تو میں نے کچھ پوچھنے کے لیے لب وا کئے ہی تھے کہ وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے بولے۔ "جاؤ اپنے اندر پریشانی اور خوف کو مت جگہ دو، یہی شیطانی ہتھکنڈے ہیں، وہ خوف کی فضا پیدا کرتا ہے اور انسان کو اپنے آپ سے غافل کردیتا ہے۔ تو شیطان اور شیطانیت کے مقابلے میں نکل۔ صرف اپنے اندر کی اچھائی پر نگاہ رکھو اور انہیں اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دے۔ جیسے یہ میل، اس میں شر کی قوت کو ختم کردے۔ اس کی قوت ہی نہیں رہے گی تو اس رہے گا۔ نیکی والی قوت رکھ، وہ شر کو تمہارے سامنے جھکنے پر مجبور کردے گی۔ پھر آنا، باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ جاؤ اب۔" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے جانے کو کہا تو میں اسی لمحے اٹھ گیا۔ میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ بائیک اٹھائی اور وہاں سے نکل آیا۔ واپسی پر میں خود میں ایک نئی طاقت محسوس کررہا تھا۔



رات کا اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ لیکن ہمارے گھر میں اجالا تھا۔ اماں نے گھر میں رات کے کھانے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ سارا، اس کا بیٹا مراد، تائی اور سوہنی کے ساتھ چھاکا بھی موجود تھا۔ اماں نے صحن میں ہی دسترخوان لگا دیا۔ ہم بڑے سکون سے کھانا کھا رہے تھے کہ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے فون سننے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سوہنی نے روکتے ہوئے کہا۔

"جمال کھانا تو کھالو، پھر دیکھ لینا۔"

میں ہاتھ روک لیا۔ مگر فون مسلسل بجنے لگا تو اماں نے کہا۔

"جمال دیکھ لو نا۔"

میں نے فون اٹھا کر اسکرین دیکھی تو وہ حویلی سے تھا۔ میں کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے سیکورٹی گارڈز کا انچارج تھا۔ میری آواز سنتے ہی بولا۔

"سر آپ فائرنگ کی آواز سن رہے ہوں گے، حویلی پر حملہ ہوا ہے، پتہ نہیں کون لوگ ہیں۔"

"انہیں کچھ دیر روک کر رکھو، میں ابھی آیا۔" میں نے کہا اور انتہائی تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"حویلی پر حملہ ہوگیا ہے، جلدی نکلو۔"

جب تک میں ہتھیار اٹھا کر نکلا، چھاکے کے ساتھ تائی جا کر کار میں بیٹھ چکی تھی۔ اس نے سوہنی اور سارا کو سختی سے منع کردیا کہ کچھ بھی ہو باہر نہیں نکلنا۔ چھاکا کسی کو فون کررہا تھا۔ اسی دوران اس نے تیزی سے کہا۔

"تم نکلو، میں آرہا ہوں۔"

میں کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور کار بھگا دی۔ گاؤں سے نکل کر جیسے ہی میں سڑک پر آیا تو تائی نے کہا۔

"جمال، بہت دھیان سے، ہوسکتا ہے دشمن ہمارے لیے گھات لگائے بیٹھا ہو۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا اور کار ایک کچے راستے پر ڈال دی جو حویلی کے پچھلی طرف سے شہر جا نکلتا تھا۔ بچپن سے حویلی کا ایک ایک راستہ میں نے سوچا ہوا تھا۔ اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ میں نے کار ایک کچھ فاصلے پر روکی اور نکل کر تقریباً بھاگتے ہوئے آگے بڑھا۔ تائی میرے ساتھ تھی۔ وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر تھی۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہم حویلی کی چار دیواری تک جا پہنچے۔ چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اندر داخل ہوا۔ کافی دور سے فائرنگ کی آواز آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ حملہ اتنا بھرپور نہیں تھا یا پھر دشمن کچھ اور ہی چاہتا تھا۔ میں حویلی کے بغلی دروازے سے اندر داخل ہوا تو سامنے چار پانچ گن بردار ملازمین کو یرغمال بنائے کھڑے تھے۔

وہ حویلی میں جس حد تک آ چکے تھے، وہ تو ایک حقیقت تھی لیکن میں فائر کرنے سے پہلے پوری طرح جانچ لینا چاہتا تھا کہ وہ کس حد تک رسائی کر چکے ہیں۔ اچانک مجھے شعیب کا خیال آیا۔ میں نے اسے کال ملائی تو اس نے فوراً کال وصول کر لی

''کہاں ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اس وقت حویلی کی دوسری منزل پر ہوں۔'' اس نے تیزی سے بتایا

''صورت حال کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نچلی منزل تک وہ آ گئے ہیں، دوسری کی طرف وہ بڑھنا چاہتے ہیں لیکن ان کی طرف سے خاموشی چھا گئی ہے، کوئی فائرنگ نہیں ہو رہی ہے۔ نیچے کیا صورت حال ہے، میں نہیں جانتا۔''

''میں نیچے ہوں، انہیں اوپر نہیں آنے دینا، کوشش کرنا کہ ان میں کچھ سے لوگ زندہ پکڑے جائیں، فکر نہیں کرنا۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ میں نے مدھم سی روشنی میں تانی کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر غصہ تھا، اس نے سب سن لیا تھا۔ ہم نگاہوں ہی نگاہوں میں پلان ترتیب دے کر خاموشی سے مخالف سمتوں کی جانب بڑھ گئے۔

وہ پانچوں میرے سامنے تھے۔ تین ایک طرف تھے اور دو ایک جانب، انہوں نے ملازمین پر گنیں تانی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک طرف سے فائر ہوا، اسکے ساتھ ہی ایک زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھتے میں نے تین والی قطار میں سے ایک کو نشانہ بنایا اور فائر کر دیا۔ جب تک وہ فائر کی سمت کا اندازہ کرتے یا بھاگ کر جاتے، دو مزید فائر ہوئے، وہ بھی زمین پر تھے۔ ایک آخری بچا تھا وہ باہر کی جانب بھاگا، اس کے دونوں طرف سے فائر آ گئے۔ ان کے گرتے ہی ملازمین اٹھ گئے۔ میں نے دور ہی سے پوچھا۔

''اندر کتنے لوگ ہیں؟''

''کوئی بھی نہیں ہے۔'' ایک ملازم بولا تو میں نے سامنے آ کر کہا۔

''سب لوگ ایک کمرے میں چلے جاؤ۔ ایک اوپر جا کر شعیب سے کہے کہ نیچے آ جائے اور انہیں دیکھے، جو زندہ ہے اسے سنبھالے۔'' میں نے تیزی سے کہا، کہنے کے دوران تانی میرے پاس آ گئی۔ اب ہمیں باہر کی جانب دیکھنا تھا۔ میں اور تانی باہر کی جانب نکلے ہی تھے کہ باہر سے زوردار فائرنگ ہونا شروع ہو گئی۔ ایک دو منٹ بھرپور فائرنگ جاری رہی پھر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ میں محتاط انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ تبھی چھاکے کا فون آ گیا

''کدھر ہو، میدان صاف ہے۔''

''میں گیٹ پر آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ پھر سوہنی کا نمبر ملا کر اسے محتاط ہو جانے کا کہا، وہ مجھ سے تفصیل پوچھنا چاہتی تھی لیکن وقت نہیں تھا۔ میں گیٹ کے پاس پہنچا تو وہاں چھاکا کئی سارے لوگوں کے ساتھ تھا، اس نے کچھ لوگوں کو زمین پر لٹایا ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہی کہا۔

''چھاکے ان سب کو سنبھالو، میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور سامنے کھڑی بائیک پر بیٹھا تو تانی میرے پیچھے آ بیٹھی۔ جانے کیوں مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ اس حملے کا مقصد مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ جو میں سمجھ رہا تھا وہ بہت بھیانک تھا۔ میں ہوا کی رفتار سے اپنے گاؤں کی طرف جا نکلا۔

میں گلی میں پہنچا تو دھک سے رہ گیا۔ وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ گلی میں تین گاڑیاں اور دو موٹر سائیکل کھڑے تھے۔ دو آدمی گیٹ میں گولیاں مار رہے تھے۔ فائرنگ کی آواز سے پورا ماحول خوف سے بھرا ہوا تھا۔

''تانی تم یہیں ٹھہرو، میں اوپر کی گلی سے جاتا ہوں، جیسے ہی موٹر سائیکل کی لائیٹ نظر آئے تم......'' یہ کہتے ہوئے میں نے اسے دستی بم دے دیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بائیک سے نیچے اتر گئی۔ میں اسی وقت واپس مڑا اور برق رفتاری سے بڑھا۔ بلاشبہ وہ سوہنی کو

اغوا کرنے کے چکر میں تھے۔ انہوں نے بہت سوچ کر پلان کیا تھا۔ یہ پلان ہمارے درمیان کے کسی بندے کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ میں گلی کی نکڑ پر پہنچا اور بریک لگا کر جیسے ہی دستی بم کی پن نکالی، گلی میں ایک زبردست دھماکا ہوا، اسی لمحے روشنی ہوئی، میں نے بھی بم پھینک دیا۔ اچانک ہی کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ ان میں سے کئی میری طرف بھاگے۔ میرے ہاتھ میں آٹومیٹک پسٹل تھا۔ میں نے تاک کر ان کا نشانہ لینا شروع کر دیا۔ گلی کی دوسری نکڑ پر بھی ایسی ہی فائرنگ تھی۔ اس وقت میں حیران رہ گیا جب میرے گھر کی چھت پر سے فائرنگ ہونے لگی۔ اچانک ہی ایک زوردار دھماکا ہوا، یہ چھت سے پھینکا گیا دستی بم تھا۔ چھت پر بنا کمرا اسلحے سے بھرا ہوا تھا۔ گلی میں چیخیں، کراہیں اور آہ و زاری تھی۔ میں چند منٹ وہیں کھڑا رہا، پھر اسی طرح اوپر سے گھوم کر وہاں چلا گیا جہاں تائی تھی۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا وہ دیوار کی جڑ کے ساتھ بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی۔ میں چونک گیا۔ تائی کا اس طرح پڑے ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے بھاگ کر اسے اٹھایا تو وہ بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اس کا بازو خون سے لت پت تھا، اس نے کاندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا، جہاں سے خون ابل رہا تھا۔ میرا دماغ اچانک پھر گیا۔ میں نے اس کا پسٹل اٹھایا اور فائر کرنے ہی والا تھا کہ مجھے ایک دم سے خیال آیا۔ یہ میری بے وقوفی تھی۔ مجھے تائی کو بچانا چاہیے تھا۔ میں نے لمحے میں خود پر قابو پایا اور فون نکال کر چھاکے کا نمبر پش کیا۔

''میں گاڑی آرہا ہوں۔''

''جلدی پہنچ، تائی کو فائر لگا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے فون جیب میں ڈالا اور پسٹل تان لیے۔ سامنے سے فائرنگ ختم ہو چکی تھی۔ شاید وہ لوگ دبک گئے تھے یا پھر بھاگ گئے تھے، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اچانک چھت پر سے پھر فائرنگ ہوئی مگر نیچے سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ میں سوہنی کو فون کر کے پوچھوں۔ میں نے جلدی سے کال ملائی تو لمحوں میں رابطہ ہو گیا

''میں چھت پر ہوں، میرے ساتھ سارا ہے، اماں اور مراد نیچے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں گلی ہی میں ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ میں نے جان بوجھ کر تائی کے بارے میں اسے نہیں بتایا۔ چھاکا پہنچ گیا تو اس کی کار کی ہیڈلائیٹس سے گلی میں روشنی ہوئی۔ اس کے ساتھ کافی لوگ تھے جو یکے بعد دیگرے اپنی اپنی گاڑیوں میں وہاں پہنچ گئے۔ گلی روشن ہو گئی تھی۔ مجھے کوئی بندہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ اگر کوئی تھا تو وہ چھپا ہوا ہو سکتا تھا۔ چھاکے نے تائی کو کار میں ڈالا اور مجھے وہیں رکنے کا کہہ کر نکل گیا۔ کچھ اس کے ساتھ چلے گئے اور باقی وہیں ٹھہر گئے۔

''جو کوئی بھی ہے اسلحہ پھینک کر باہر آ جائے، ورنہ دیکھتے ہی گولی مار دوں گا۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا تو چند لمحے تک کوئی حرکت نہ ہوئی پھر ایک کار کی سائیڈ سے ایک آدمی نکلا۔ اس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ زخمی تھا۔ وہ قریب آیا تو اسے لوگوں نے اسے سنبھال لیا۔ اگلے چند منٹ تک کوئی دکھائی نہ دیا تو میں آگے بڑھا۔ میرے ساتھ دو نوجوان تھے۔ اچانک ایک کار کے پیچھے سے ایک بندے نے فائر کرنا چاہا، وہ فائر تو نہ کر سکا، اس سے پہلے ہی تین فائر اسے لگ گئے۔ وہ ڈکارتا ہوا زمین پر تڑپنے لگا۔ میرے سامنے کئی بے حس و حرکت لوگ پڑے ہوئے تھے، جن کا مجھے افسوس تھا۔ وہ ان لوگوں کی حفاظت کر رہے تھے، جو انسان کہلانے کے حق دار ہی نہیں تھے۔ پوری گلی میں پھر لیا۔ کوئی خطرہ نہ رہا تو میں نے سوہنی کو فون کر کے باہر آ جانے کو کہا۔ اگلے چند منٹ میں وہ چاروں باہر آ گئے، باہر کا منظر بڑا بھیانک تھا۔ وہ فوراً ہی حویلی کے لیے نکل گئے۔ میں اس زخمی کے پاس گیا اور اس سے پوچھا۔

''کس نے بھیجا ہے تم لوگوں کو؟''

''شاہ زیب نے، ہم اس کے ساتھ ہی آئے تھے۔''

اس نے کراہتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

"اس کا فون نمبر بول، میں اس سے پوچھ لوں کہ وہ تیرا علاج کروائے گا یا میں کروں۔"

"میں مر جاؤں گا، مجھے بچالو، جو کہو گے کروں گا۔" اس نے منت بھرے انداز میں کہا تو میں نے اپنا سوال دہرا دیا تو اس نے نمبر بتا دیا۔ میں نے شاہ زیب کا نمبر ملایا۔ چند لمحے بعد رابطہ ہو گیا۔ اس نے ہیلو کہا تو میں نے آواز پہچانتے ہوئے کہا۔

"تجھے پتہ تو چل ہی گیا ہوگا کہ تیرے سارے بندے مارے گئے ہیں، یا میرے قبضے میں ہیں۔ اب یہ مت کہنا کہ تم نے تو بندے بھیجے ہی نہیں تھے۔"

"یہ تو شروعات ہیں پیارے، میلے تک دیکھ تیرے ساتھ ہوتا کیا ہے۔ تو اس قابل ہی نہیں رہے گا کہ میلے میں جا سکے، ورنہ وہیں تجھے ختم کروں گا۔ میں جانتا تھا کہ تو ایسے ہی کسی حملے کی تیاری میں ہوگا، مگر کب تک؟ کب تک ایسے حملوں سے بچتا رہے گا۔" اس نے نفرت سے کہا۔

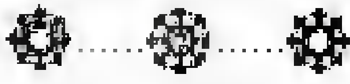
"جب تک میرے رب سائیں نے چاہا، مجھے کوئی نہیں مار سکتا۔ باقی رہی بات حملوں کی تو یہ مجھے بھی کرنا آتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ میں خود آتا ہوں، اور تو چوہے کی طرح چھپ جاتا ہے۔ اب تم نے پہل کر لی ہے، انتظار کرو میں تم تک کب پہنچتا ہوں۔" میں نے اس کی دھمکی کا جواب دیتے ہوئے کہا تو وہ غصے میں بولا۔

"اگر مرد ہے تو ابھی آجا۔"

"کسی میدان میں آؤں؟ یا اس بل میں جہاں تم چھپے بیٹھے ہو۔ ابھی تم اپنے بندے سمیٹ کر لے جاؤ۔ یقین کرو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" میں نے انتہائی طنز سے کہا تو ایک دم سے فون بند ہو گیا۔ میں نے زخمی بندے کی جانب دیکھا، اسے اسپتال پہنچانے کا کہہ کر حویلی کی جانب چل دیا۔

میں راستے میں چھاکے سے پوچھا، وہ اسپتال پہنچ چکا تھا۔ تائی کے کاندھے، ران اور پنڈلی میں گولیاں لگی تھیں۔ اس وقت وہ بے ہوش تھی۔ ابتدائی طبی امداد دے دی گئی تھی اور وہ اسے ضلعی اسپتال لے کر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

حویلی میں رندھاوا پہنچ چکا تھا۔ اس نے لاشیں قبضے میں لے لیں اور زخمیوں کو اسپتال پہنچا دیا۔ اس وقت میں جسپال کی کمی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔



صبح کا سورج طلوع ہوا تو پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیل چکا تھا۔ عام تاثر یہی تھا کہ اب نجانے کیا ہوگا؟ دوسری طرف افواہوں نے سر اٹھا لیا تھا۔ ہر کوئی اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ ظلم اور احسان، جب بھی اور جہاں بھی کیا گیا تھا، اس کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ میں حویلی میں تھا، جبکہ اماں اور سارا ضلعی اسپتال چلے گئے تھے۔ تائی ابھی تک ہوش میں نہیں آئی تھی، ڈاکٹرز نے یہی کہا تھا کہ اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی کچھ حتمی بتا سکتے ہیں۔ اس کے لیے میں اپنے دل میں بہت درد محسوس کر رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اڑ کر اس کے پاس جا پہنچوں۔ فطری سی بات ہے کہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتا تو مطمئن ہو جاتا۔ لیکن اس وقت میں یہاں رہنا بہت ضروری تھا۔ چھاکا اس وقت تائی کے پاس تھا اور جسپال چلا گیا تھا۔ رات گئے اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا، جب وہ فلائٹ کے لیے ڈیپارچر لاؤنج میں تھا۔ میں نے اسے یہاں کے بارے میں بالکل نہیں بتایا تھا۔ اس کے بعد میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔

نور نگر اور علاقے بھر سے بہت سارے لوگ ہماری حفاظت کے لیے آگئے تھے۔ جو حویلی کے ارد گرد اور گاؤں میں موجود تھے۔ میں نے شعیب کے ذمے لگا دیا کہ انہیں سنبھالے، خواہ مخواہ کوئی ہنگامہ کھڑا نہ کر دیں۔ ان میں کوئی سازشی بھی ہو سکتے ہیں۔ رندھاوے سے میری بات ہو چکی تھی۔ ان کے آٹھ آدمی مارے گئے تھے۔ دو شدید زخمی تھے جن کی حالت نازک تھی اور ایک خطرے سے باہر تھا۔ صرف ایک آدمی صحیح سلامت تھا۔ یہ وہی تھا جس نے اپنا آپ میرے حوالے کیا تھا۔

وہ بیان دے چکا تھا کہ وہ شاہ زیب کے لیے کام کرتا ہے اسی نے یہ حملہ کروایا ہے۔ جبکہ شاہ زیب نے اس واقعہ کا سرے سے انکار کر دیا تھا اور الزام لگایا کہ یہ مجھے پھنسانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ میں نے میلے کے سارے منتظمین کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے وہ میرے پاس آ گئے۔ میں نے ایک کمرے میں انہیں احترام سے بٹھایا۔ چائے آ جانے تک ان کے ساتھ رات والے واقعے پر بات کرتا رہا۔ تبھی ان میں سے ایک نے کہا۔

"جی بیٹا! ہمیں کیوں بلایا کوئی خاص بات؟"

"خاص ہی نہیں، بہت اہم بھی ہے۔ کیا آپ سب نہیں سمجھتے کہ اس موقع پر مجھے آپ سے بات کر لینا چاہیے۔" میں نے صاف لفظوں میں کہا، کیونکہ اب میں ان سے کھل کر بات کر لینا چاہتا تھا۔

"کیسی بات بیٹا؟" اسی نے پوچھا تو میں نے کہا۔

"آپ سب میرے لیے بہت محترم ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کسی دوسرے کی باتوں میں آ کر مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کریں۔" میں نے کہا تو دوسرے نے پوچھا۔

"تم کھل کر بات کیوں نہیں کرتے ہو۔"

"تو پھر مجھے آپ سب جواب دیں کہ میلے کے بارے میں مجھ سے گارنٹی لینے کا مطلب کیا تھا، کس کے کہنے پر آپ نے مجھے کہا؟ یہ سازش بے نقاب ہو چکی ہے کہ میلے میں کس نے شر ڈالنا ہے۔ میں جانتا ہوں، آپ سے صرف تصدیق چاہتا ہوں۔" میں نے کافی حد تک سخت لہجے میں کہا تو ان ایک دم سے ان کے چہرے بدل گئے۔

"یہ تم الزام لگا رہے ہو ہم پر۔"

"میں الزام نہیں حقیقت بیان کر رہا ہوں، آپ میری بات سے انکار کریں، میں ثبوت دے دوں گا۔" میں نے پورے اعتماد سے کہا تو ان میں سے ایک بولا۔

"کہاں ہے ثبوت؟"

"یہ ایسے تھوڑی دے دوں گا، میں پورے علاقے کے معززین کو جمع کر کے دوں گا تا کہ وہ آپ سب لوگوں کے بارے میں جان سکیں کہ آپ کس کے آلہ کار ہیں، ذرا سا ثبوت تو اس وقت بھی دے سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر سیل فون نکالا اور رات شاہ زیب سے ہوئی بات کی ریکارڈ کال چلا دی۔

"یہ تیری اور اس کی دشمنی ہے، اس کا میلے سے کیا تعلق؟" ایک نے تیزی سے کہا تو دوسرے نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے جمال، ہم واقعی اس کی باتوں میں آ گئے تھے۔ اس نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ میلہ کروائیں اور اس میں وہ تمہیں اپنا ٹارگٹ بنائے۔ اب اگر ہم ہٹ دھرمی کریں گے تو مزید ذلیل ہوں گے۔ میں تو یہ سوچ کر کانپ جاتا ہوں کہ تم لوگوں کی لڑائی میں کتنے بے گناہ مارے جا سکتے ہیں، تمہیں میں باز آیا۔" اس کے یوں کہنے پر باقی خاموش ہو گئے۔ میں چند لمحے ان کی طرف سے کسی بات کا انتظار کرتا رہا، پھر بولا۔

"اب یہ فیصلہ آپ لوگوں نے کرنا ہے۔ بلاشبہ اس میلے میں لڑائی ہوگی اور لازمی بات ہے کہ بے گناہ بھی مارے جا سکتے ہیں۔ میں تیار ہوں۔ اور اب آپ نے میلہ کروانا ہے۔ جا کر ہیں بتا دیں، دیکھتے ہیں کہ میلے میں پہنچتا کون ہے۔" میں نے سختی اور سخت لہجے میں کہا تو وہ خاموش ہو گئے۔ انہوں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اسی خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔

شام تک تانی کو ہوش آ گیا۔ ڈاکٹرز نے مثبت ردعمل کا اظہار کیا تو مجھے کافی سکون ملا۔ چھاکے نے مجھے پوری تفصیل بتا دی تو اطمینان ہوا۔ اماں اور سوہنی کی وجہ سے وہ بہت مطمئن تھی۔ رات گئے جسپال کا کینیڈا سے فون آ گیا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ اس کا یہی کہنا تھا کہ اسے مجھے کی سازش ہی اسی لیے کی گئی تھی کہ وہ حملہ کریں۔ میں نے

بڑی مشکل سے اسے مطمئن کیا۔ اس کی فون کال سن کر میں خود سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ اب مجھے خود بڑھ کر ان پر حملہ کر دینا چاہیے یا صرف اپنا دفاع ہی کروں؟ اس وقت میری طاقت بکھر گئی تھی۔ اور مجھے پورا یقین تھا کہ اس بارے میرے دشمنوں کو ضرور خبر ہو گی۔ ایک سوال میں اب تک نظر انداز کرتا چلا جا رہا تھا کہ وہ کون تھا جسے یہ معلوم تھا کہ کل رات ہم سب حویلی میں نہیں رہے تھے؟ میں اگر پوچھ گچھ کرتا تو یہ بات ان سب کو الرٹ کر سکتی تھی، جو بہر حال میرے لیے نقصان دہ تھی۔ نجانے کیوں میرا شک شعیب کی طرف جاتا تھا۔ لیکن دل نہیں مان رہا تھا۔ دوسری جانب ان کے ہاں میرا ایسا کوئی بندہ نہیں تھا جو ان کے بارے مجھے کوئی معلومات دے سکے۔ میں ایک طرح سے حصار میں آ گیا تھا، جیسے کوئی کسی کو باندھ کے رکھ دے۔ یہی کیفیت مجھے بے چین کر رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ سازشی ایسا ہی کرتے ہیں، دشمن کو زیر کرنے سے پہلے اس کی طاقت کو توڑتے ہیں۔

میں حویلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا مسلسل یہی سوچتا چلا جا رہا تھا کہ دروازے میں شعیب نمودار ہوا۔ وہ یوں کھڑا تھا جیسے اندر آنے کی اجازت چاہ رہا ہو۔

"آؤ شعیب! آتی رات ہو گئی ہے تم ابھی تک سوئے نہیں۔" میں نے پوچھا تو وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"سر! کیا یہ ایسے حالات ہیں کہ مجھے سو جانا چاہیے؟"

"حالات تو ایسے نہیں ہیں لیکن......" میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ اب میں اسے کیا کہتا۔ میرے خاموش ہو جانے پر اس نے کہا۔

"سر اگر آپ اجازت دیں تو میں شاہنواز کے ڈیرے پر کوئی تھوڑی بہت ہلچل مچا دوں؟"

"کیا مطلب؟" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب، انہیں بتا دیا جائے کہ ہم کمزور نہیں ہیں۔" اس نے بے خوفی سے کہا تو میں نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"شعیب جو تم کہہ رہے ہو، وہ سمجھ بھی رہے ہو اور کیا یہ تمہاری آفیشل ڈیوٹی ہو گی یا تم یہاں کہ حالات دیکھ کر تم ایسا چاہ رہے ہو؟" میرے پوچھنے پر اس نے چند لمحے سوچا اور بولا۔

"سر! ہمیں موقع ہی نہیں ملا کہ میں آپ کو تفصیل سے اپنی یہاں موجودگی کے بارے میں بتا سکوں۔ پہلے میں آپ کو وہ بتاتا ہوں، پھر میرا خیال ہے میں آپ کو اپنی بات سمجھا سکوں گا۔"

"بولو۔" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"سر! یہ جو شاہنواز ہے نا، میرے باپ کا قاتل ہے۔" یہ اس نے بہت مشکل سے کہا تھا، پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا

"میں اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ یہاں حالات بہت مشکل ہو گئے تھے تو میری ماں واپس اپنے میکے چکوال چلی گئی۔ میں وہیں پلا بڑھا۔ میرے اندر اسی طرح آج بھی انتقام بھرا ہوا ہے، اسی کی وجہ سے میں پھر لی ہوا۔ میں یہاں کے حالات کے بارے میں جانتا تھا۔ شاید آپ نے مجھے نہیں دیکھا، جس وقت شاہنواز کے ڈیرے پر ایکشن ہوا، میں آپ کے ساتھ تھا، میں آپ کے کور پر تھا۔"

"اوہ تو وہ تم تھے؟" میں نے بے ساختہ کہا اور اس کے چہرے پر دیکھا تو مجھے یاد آ گیا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہوا ہے۔ "جی وہ بولا۔

"جی میں ہی تھا۔ وہاں پہلا فائر میں نے کیا تھا۔ مجھے یہ امید تھی کہ میں شاہنواز کو وہیں ختم کر لوں گا، مگر ایسا نہ ہو سکا، وہ پکڑا گیا، کوئی ثبوت اس لیے نہیں ملا کہ وہ سیاسی بیک گراؤنڈ رکھتا ہے۔ یہاں سے اطلاعات آتی رہیں کہ وہ علاقے پر وہی دبدبہ چاہتا ہے، خفیہ طاقتیں اس کی مدد کو آن پہنچی ہیں۔ اسی لیے ہمارا نیٹ ورک حرکت میں آ گیا۔ میں نے اپنے آفیسر کے ساتھ مل کر ایک پورا پلان ترتیب دیا ہے۔ اس میں میرا اپنا ذاتی انتقام بھی شامل ہے، جو مجھے یہاں لے کر آیا ہے۔ میرا کسی پر احسان نہیں ہے، بلکہ میں آپ کا احسان مند ہوں

کہ آپ کے سہارے میں کامیابی حاصل کر پاؤں گا۔ اس لیے یہاں آپ کے علم میں لائے بغیر میں کچھ نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، لیکن اس سے بھی پہلے ایک اہم سوال یہ ہے کہ یہاں سے کس نے اُدھر اطلاع دی ہوگی کہ ہم سب......" میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

"وہ میں نے پکڑ لیا ہے اور اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ ایک معمولی سیکورٹی گارڈ تھا یہاں، میں اسی پر ہی کھیل کھیلنے جا رہا ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو؟"

"بہت بڑا کام کیا ہے تو نے؟" میں ایک دم سے خوش ہو گیا تو وہ تیزی سے بولا۔

"یہ حملہ بغیر کسی پلان کے عجلت میں تھا۔ انہیں شام کے وقت خبر ملی اور انہوں نے چڑھائی کر دی۔ اگر حملہ کسی پلان کے تحت ہوتا تو اب تک وہ حویلی پر قبضہ کر چکے ہوتے یا سوہنی بی بی اغوا ہو چکی ہوتی۔"

"تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن یہ سب تمہیں کیسے پتہ چلا؟" میں نے پوچھا۔

"اگر ان کے دو آدمی یہاں ہیں تو ہمارے بھی بندے وہاں پر ہیں۔ اور وہ آفیشل ڈیوٹی پر ہیں۔ میں نے بہرحال سیکورٹی کا ایک نیا پلان بنا لیا ہے، وہ میں آپ کو بتاتا ہوں پہلے میں......"

"خیر اب تم کیا کھیل کھیلنے جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

"اس وقت شاہنواز اپنے گھر ہے، شاہ زیب اور ملک سجاد اس کے ڈیرے پر ہیں۔ میں اسی مخبر کے ذریعے انہیں پیغام دوں کہ آپ یہاں سے نکل کر جا رہے ہیں، تائی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے۔ حویلی خالی ہے، ملازمین ڈر کی وجہ سے بھاگ گئے ہوئے ہیں۔ پھر وہ جو ردعمل کریں گے، میں اسی کے مطابق اپنا کام کروں گا۔"

"مجھے صرف یہ کرنا ہے کہ عجلت میں گاڑی لے کر نکل جاؤں؟" میں نے محتاط انداز میں پوچھا تو اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جی سر، تاکہ جو باہر مخبر بیٹھا ہے وہ بھی انہیں اس اطلاع کی تصدیق کر دے۔"

"اوکے میں نکلتا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اسی وقت اٹھ گیا۔ میں یہ رسک لینا چاہتا تھا۔ مجھے یہ یقین تو تھا کہ شاہنواز کے ڈیرے پر ایکشن کے وقت وہ میرے ساتھ تھا۔ باقی جو اس نے کہانی سنائی تھی، مجھے اس پر سو فیصد یقین نہیں تھا، وہ ایجنٹ ہی کیا جو سیدھی بات کرے۔ میں اس پر پوری طرح اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے فون کر کے چھاکے کو اس ساری بات سے آگاہ کیا تو وہ بولا۔

"جمال، یہ کر گزرو، اس سے رمضانے کی پوزیشن کا بھی پتہ چل جائے گا کہ کہیں وہ ہمیں ڈبل کراس تو نہیں کر رہا؟ اور اس نے شعیب کو ہمارے سر پر لا بٹھایا ہے، ہمارے بارے میں جاننے کے لیے، اب یہ ضروری ہے۔"

"تو پھر میں نکل رہا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ بولا۔

"میں تمہیں دوبارہ کال کر کے بتاتا ہوں، تب نکلنا، میں یہاں بھی یہ ڈرامہ کرتا ہوں کہ تائی کی طبیعت بہت خراب ہے، ممکن ہے ان کا یہاں بھی کوئی مخبر ہو؟"

"اوکے۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

رات کے آخری پہر حویلی کے پورچ میں اچھا خاصا ہنگامہ کیا گیا، صرف یہ جتانے کے لیے کہ میں وہاں سے جا رہا ہوں۔ میں اکیلا ہی وہاں سے نکلا تھا۔ گیٹ پر رک کر میں نے سیکورٹی ہیڈ کو ہدایت دی کہ وہ الرٹ رہے اور نکلتا چلا گیا۔ شہر جانے والی سڑک سے ذرا پہلے چھاکے کی طرف سے بھیجے ہوئے چند بندے کھڑے تھے۔ میں انہیں پہچانتا تھا۔ وہ سب میرے ساتھ آ بیٹھے۔ میں نے گاڑی شہر کی طرف بھگا دی۔ کافی آگے جا کر میں گاڑی کچے میں اتاری، وہاں جیدہ میرے لیے بائیک لے کر کھڑا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر گاڑی کھڑی کر دی۔

"او بھئی دوستو، تم میں سے صرف ایک میرے ساتھ جائے، باقی جیدے کے ساتھ ڈیرے پر چلے جائیں۔ یا

شہر کا ایک چکر لگا آؤں، میں آتا ہوں۔"

"نہیں جی، ہم جانتے ہیں کہ آپ کسی مہم پر ہو، ہم آپ کے ساتھ ہی جائیں گے۔"

"نہیں یار، جہاں میں جا رہا ہوں وہاں خاموشی چاہیے، صرف ایک بندہ جو بائیک اچھی طرح چلا لے بس۔" میرے یوں کہنے پر ایک لڑکا نیچے آ گیا۔ اس نے بائیک سنبھالی، میں نے پسٹل نیفے میں اڑسا، گن کے ساتھ فاضل میگزین لگائے اور ہم وہاں سے چل دیے۔

ہمارا رخ شاہنواز کے ڈیرے کی طرف تھا۔ جہاں ہم کھڑے تھے، وہاں سے اس ڈیرے کا فاصلہ کم از کم بیس منٹ کا تھا۔ ہمارا سفر کھیتوں کے درمیان بچی سڑکوں سے ہوتا تھا۔ ہم تقریباً پچیس منٹ میں ڈیرے کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت آخر شب کے چاند نے اپنا سر نکالا تھا۔

"تم یہیں ٹھہرو، بائیک کے پاس اور ہر طرف سے محتاط رہنا۔" میں نے کہا اور گن اسے تھما کر قریبی درخت پر چڑھتا چلا گیا۔ میں نے ڈیرے کی طرف دیکھا۔ وہاں اچھی خاصی ہلچل تھی۔ پھر ایک دم سے گیٹ کھلا اور تین گاڑیاں تیزی سے نکل کر چلتی چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد ہی سکون چھا گیا۔ ان میں کون کدھر گیا تھا، میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ میں نے چھاکے کو فون کر کے بتایا

"میری گاڑی ان کے پاس......"

"تم کہاں ہو، وہ بتا رہے ہیں کہ تم اکیلے کہیں نکل گئے ہو۔"

"میں شاہنواز کے ڈیرے کے باہر ہوں۔" میں نے بتایا تو اس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

"تم وہاں؟"

"ہاں، میں وہاں ہوں، لیکن میری بات سنو، اپنے ان دوستوں سے کہو کہ وہ کہیں بھی چھپ کر سکون سے بیٹھ جائیں، سڑک پر نہ رہیں۔ ممکن ہے میرے چکر میں......"

"میں سمجھ گیا، لیکن تم وہاں سے نکلو، ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔" اس نے غصے کو دباتے ہوئے کہا تو میں نے فون بند کر کے "خاموشی" پر لگا دیا۔

میں تیزی سے سوچ رہا تھا کہ ان گاڑیوں میں کون گیا ہے۔ اگر ان میں شاہ زیب یا ملک سجاد ہیں تو میں ان کے پیچھے جاؤں، وہ اگر نہیں ہیں تو ڈیرے میں ہی کوشش کروں۔ میں بے چین تھا کہ مجھے ان کے بارے میں پتہ چلے۔ میں درخت سے نیچے اتر آیا اور ٹہلنے لگا۔ اچانک مجھے شعیب کا فون آ گیا تو میں نے فون ریسیو کیا تو وہ بولا۔

"کہاں ہو آپ؟"

"میں سڑک پر ایک جگہ کھڑا ہوں، کیوں؟ اور مجھے کب تک باہر رہنا ہوگا؟"

"آپ کہیں ادھر اُدھر ہو جائیں۔ ڈیرے سے پتہ چلا ہے کہ شاہ زیب کافی سارے لوگوں کو لے کر نکلا ہے آپ کے لیے۔ مخبر نے میرے مطابق ہی اطلاع دی ہے۔"

"تم کہاں ہو؟"

"میں شاہنواز کے گھر کے باہر ہوں۔ ڈیرے پر جانے کے لیے وہ کسی وقت بھی نکل سکتا ہے۔ شاہ زیب نے اسے صورت حال بتا کر وہیں بلوایا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے ڈیرے پر ملک سجاد ہی ہے؟"

"ممکن ہے ہو یا وہ شاہ زیب کے ساتھ نکل گیا ہو، میں پتہ نہیں کہہ سکتا۔"

"پتہ کرو، ڈیرے کے اندر کی صورت حال کا پتہ کرو، اگر ملک وہاں نہیں ہے تو شاہنواز نے وہاں کیا کرنے جانا ہے۔" میں نے کہا ہی تھا کہ وہ تیزی سے بولا۔

"وہ نکل آیا ہے، بعد میں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں جھنجلا کر رہ گیا۔

میرا ڈیرے پر آنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ میں اکیلے اندھا دھند ڈیرے میں گھس بھی جاتا اور وہاں کوئی نہیں ہوتا تو پھر بھی مایوسی ہوتا تھی اور پھر یہ ایک بہت بڑا رسک تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا، اگر وہ یہاں نہیں ہیں تو ان تین گاڑیوں میں سے کسی ایک میں تو ہوں گے وہ میرے شکار پر نکلے ہیں تو کیوں نا میں ان کا شکار کروں؟ یہ سوچتے ہی

میں بائیک کی طرف بڑھا۔ لڑکا میرے انتظار میں تھا۔ میں نے اس سے گن پکڑی تو وہ بائیک پر جا بیٹھا۔ میرے بیٹھنے تک اس نے بائیک اسٹارٹ کی۔ میں نے اسے راستہ بتایا۔ اگلے چند لمحوں میں ہم وہاں سے نکل پڑے۔

واپس پکی سڑک پر آتے ہمیں اتنا ہی وقت لگا۔ میں راستے میں اسے سمجھاتا ہوا آیا کہ کس صورت حال میں کیا کیا جاتا ہے۔ وہاں پہنچ کر اس لڑکے نے کہا۔

"بھائی جی۔ میں رابطہ کروں گاڑی والوں سے؟"

"ہاں، انہیں بتاؤ کہ ہم کہاں پر ہیں۔"

وہ لڑکا ان سے رابطہ کرنے لگا۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک ڈیرے پہ ہمارے انتظار میں تھے۔ اس نے اپنی پوزیشن بتا کر فوراً آجانے کو کہا۔

ہم وہیں کھڑے انتظار کرتے ہوئے اس سمت دیکھ رہے تھے، جدھر سے ہماری گاڑی نے آنا تھا۔ انہی لمحات میں جب کہ ہماری گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ مخالف سمت سے تین گاڑیاں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ میرا دوران خون ایک دم ہی سے تیز ہو گیا۔ میں دیکھ رہا تھا۔ تینوں گاڑیاں تیزی سے قریب آ رہی تھیں۔ میں نے لڑکے کو بائیک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا اور اس نے بائیک سٹارٹ کر لیا۔ میں نے گن سیدھی کر لی۔ وہ تینوں گاڑیاں سڑک کے درمیان یوں رک گئیں کہ انہوں نے راستہ روک لیا۔ ہماری گاڑی ان سے کچھ فاصلے پر رکی ہی تھی کہ کئی سارے لوگوں نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ تیز روشنی میں ان سب کی نقل و حرکت دکھائی دے رہی تھی۔ درمیان والی گاڑی میں سے پسٹل لیے شاہ زیب نکلا۔ میں نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی، اس کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اسی لمحے لڑکے نے جگہ بدل لی۔ میں نے دیکھا شاہ زیب لڑکھڑاتا ہوا سڑک پر گر گیا تھا۔ وہاں موجود سبھی لوگ اچانک افتاد پر چونک گئے۔ وہ تو سامنے کی گاڑی کو نشانہ بنانے والے تھے، لیکن ایک سائیڈ سے حملہ ہو جائے گا۔ یہ کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں نے فائرنگ نہیں روکی۔ ہماری گاڑی کی طرف سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ پتہ نہیں وہ لوگ کتنے تھے۔ لیکن جو میری رینج میں آ جاتا وہ بچتا نہیں تھا۔ لمحوں میں سڑک پہ لاشیں بکھر گئیں۔ اچانک آگے والی گاڑی دھماکے سے پھٹ گئی۔ شاید ٹنکی میں کوئی بلٹ جا گھسی تھی۔ اسی وقت پچھلی گاڑی مڑی اور پھر وہ بھاگتی چلی گئی۔ کچھ دیر ہی میں سکون ہو گیا۔ میں اپنی گاڑی تک گیا، وہاں سے ٹارچ لی اور دور ہی سے دیکھنے لگا کہ شاہ زیب ہے بھی یا اسے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ وہ ایک طرف پڑا تھا۔ میں نے دو لڑکوں کو اپنے کور پر لیا اور اس کی جانب بڑھا۔ باقی لوگوں کو پھیلا دیا تھا کہ اگر کوئی دبکا پڑا ہے تو اسے پکڑ لیا جائے۔

میں شاہ زیب کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ بہت مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ اس کے سینے پر گولی لگی تھی۔ میں نے اسے جھنجوڑا تو اس نے آنکھیں کھولیں، میری طرف دیکھ کر اس کے چہرے پر نفرت پھیل گئی۔

"اب بھی اگر تم کہو کہ دوبارہ اس علاقے میں نہیں آؤ گے تو میں تمہیں بچانے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا تو اس نے مجھ پر تھوک دینا چاہا تو میں نے اپنے پسٹل کی نال اس کے منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"دھمکی نہیں کل صبح تمہیں کوئی پہچان بھی نہ پائے کہ تم شاہ زیب ہو۔ گھٹیا باپ کی گھٹیا اولاد، کوئی گھٹیا حرکت مت کرنا۔"

میری بات سن کر اس کے وجود میں یک بارگی جنبش ہوئی اور پھر وہ ساکت ہو گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان میں ملک سجاد بھی تھا یا نہیں، میں نے ایک نگاہ سڑک پہ پڑے لوگوں پر ڈالی اور فوراً ہی وہاں سے نکل جانے کے لیے اپنی گاڑی کی جانب بڑھا۔

اس وقت میں پکی سڑک سے اتر کر حویلی جانے والی سڑک پر تھا، اس وقت میں ان سب لوگوں کو اتار چکا تھا، جب چھاکے کی کال آئی۔ اس نے انتہائی پرجوش لہجے میں کہا۔

"تم نے شاہ زیب کو پار کر دیا۔"

"تم تو مجھے روک رہے تھے۔ وہ میرا شکار کرنے نکلا

تھا۔ خیر، آ کر تفصیل پوچھ لینا۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ حویلی پہنچا تو وہ چھپ چکی تھی۔ میں نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔

میں فریش ہو کر بیٹھا چائے پی رہا تھا، جب شعیب آیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سرمستی بھری مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ اس نے دور ہی سے انتہائی جذباتی ہوتے ہوئے میری طرف دیکھا تھا۔ میرے قریب آتے ہی بولا۔

"میں نے اپنا انتقام لے لیا۔ کر دیا شاہنواز کا کام۔ وہ نہیں رہا اس دنیا میں۔"

میں نے اٹھ کر اسے گلے لگایا اور اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔

"مبارک ہو۔" پھر اسے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے لیکن ان حیوانوں، سانپوں اور موذی جانوروں کو مار دینے کا حکم ہے جو انسانوں کے لیے ضرر رساں ہو جائیں۔ خیر کیسے ہوا سب؟"

میں بیٹھ گیا تو وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں اس کے گھر کے سامنے اس کی تاک میں تھا۔ میرے ساتھ دو مزید لوگ تھے۔ گیٹ کھلا اور اس کی گاڑی باہر نکلی تو اس کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ جیسے ہی وہ باہر نکلا ہم تین طرف کھڑے تھے اس پر برسٹ مارے، اس کے گارڈز کو موقع ہی نہیں ملا کہ ہم پر فائر ہی کر سکیں۔"

"تمہیں کیسے یقین ہے کہ وہ ختم ہو گیا، کوئی خبر، کوئی اطلاع؟" میں نے پوچھا۔

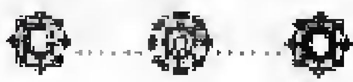
"سارے علاقے میں یہ اطلاع پھیل چکی ہے، بلکہ شاہ زیب کے مرنے کی بھی، ملک سجاد تو یہ سنتے ہی واپس بھاگ گیا ہے۔ ڈیرہ سنسان پڑا ہوا ہے، کوئی اشتہاری وہاں نہیں ہے۔ اس کا بیٹا ہی ہے، جو لندن سے آ رہا ہے، وہ دیکھیں کیا کرتا ہے۔ شاہ زیب والی تو نسل ہی ختم ہو گئی۔" اس نے دبے دبے جوش سے بتایا

"لیکن شاہ دین کی تو ہے، اس کی بیٹی سوہنی بی بی۔" میں نے اسے یاد دلایا تو وہ خاموش ہو گیا۔ تبھی میں نے کہا۔

"خیر، تم اب الرٹ رہنا اور پورے علاقے کی خبر رکھنا۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور اٹھ گیا۔

میں کافی حد تک پرسکون ہو گیا تھا۔ کم از کم اب یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ صرف قانونی کارروائیاں تھیں۔



سورج کافی اونچا چڑھ آیا تھا، میں جب کار میں سوار مسافر شاہ کے تھڑے کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ درویش مجھے وہاں ضرور ملے گا، جس نے میرے اندر ایک نیا حوصلہ بھر دیا تھا۔ ایک ذرا سی بات سے میرے اندر ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ میلہ جو میرے لیے چیلنج بن رہا تھا اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں وہاں پہنچا تو اسی درویش کو وہیں برگد کے درخت تلے پایا۔ اس دن وہ دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ میں جب کار سے اتر رہا تھا، اس نے نگاہ بھر کر میری طرف دیکھا، پھر جب تک میں اس کے قریب جا کر بیٹھ نہیں گیا، وہ مٹی کے پیالوں میں چائے "پھینٹتا" رہا۔ میں سکون سے بیٹھ گیا تو اس نے ایک پیالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لے پی لے، آج ہماری چائے پی کر بھی دیکھ۔" درویش نے کہا تو میں نے وہ پیالہ لیا اور چائے کا سپ لیا۔ گڑ والی چائے بہت مزیدار تھی۔ وہ اس وقت تک خاموش رہا، جب تک میرا اور اس کا پیالہ خالی نہیں ہو گیا۔ اس نے اپنے لب صاف کیے اور بولا۔

"مٹی کے اس پیالے میں چائے ہم نے خود ڈالی اور خود ہی مزے سے پی لی، سواد تو چائے کا ہی تھا نا کہ ہم نے اس میں ڈالی ہی چائے تھی۔ اب اگر ہم اس میں دودھ ڈال لیتے، تو مزہ دودھ ہی کا آنا تھا، پانی ڈال لیتے تو پانی کا، یا پھر بھنگ ڈال لیتے تو بھنگ نے اپنا رنگ دکھانا تھا۔"

"جی، ظاہر جو چیز بھی اس میں ڈالی جائے گی، مزہ تو

اسی کا آنا ہے نا۔" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا تو مسکراتے ہوئے بولا۔

"تیرا اور میرا وجود مٹی کا ہے، اس میں جو ڈالنا ہے وہ ہم نے ہی نے ڈالنا ہے۔ اس وجود میں نیکی ہوگی تو نیکی کی لذت سے آشنا ہوگا، اگر برائی ہے تو اس کا سواد ہی پائے گا۔ جو بھی، جس میں ہوگی، وہی اسے محسوس کر پائے گا۔ اب وہ اپنے اندر جھانکے گا تو ہی اسے پتہ چلے گا نا۔" انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جی بالکل، یہ ایک فطری سی بات ہے؟" میں نے کہا۔

"اور ہاں، یہ فطرت ہے کیا؟ کبھی سوچا ہے اس کے بارے میں؟" انہوں نے پوچھا تو میں نے عاجزی سے کہہ دیا

"جی نہیں، میں نے کبھی نہیں سوچا۔"

"تو پھر غور کر، یہ سارا نظام جو تیری نگاہ میں ہے، یہ کشش کے تحت ایک دوسرے سے بندھا ہوا ہے نا تو یہ تجسس بھی ابھارتا ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ تجسس آخر کہاں ابھرتا ہے، کسی درخت میں تو نہیں ابھرتا، تجسس کا ظہور وہیں ہوگا نا جہاں یہ پڑا ہوگا۔ یہ کسی قوت ہی کے تحت ابھرتا ہے، اور جس میں سے ابھرتا ہے، وہاں تجسس کے ابھرنے کا مقصد تو ہوگا۔ یہ باہر کی کائنات اپنی طرف متوجہ کر کے انسان کے اندر تجسس پیدا کر دیتی ہے تو کیوں؟ اس کا بڑا سیدھا اور سادہ سا جواب ہے کہ انسان اس فطرت کو سمجھے، وہ اسے تب سمجھ سکے گا جب وہ اپنے آپ کو سمجھے گا۔ اب دیکھو، چھوٹی سے بات ہے، کیا تم مرخ رنگ کی وضاحت کر سکتے ہو؟ کیا آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہی درست ہے، دن کے وقت جو چیز جس طرح دکھائی دیتی ہے اور وہ رات کو کسی اور طرح دکھائی دیتی ہے۔ یہ سب اسی وقت پتہ چلے گا جب وہ اس جہانِ رنگ و بو میں اترے گا اور انسان کے سوا کوئی دوسرا نہیں اترتا۔"

"کیونکہ بابا جی اسے یہ صلاحیتیں عطا کر دی گئی ہیں نا اور وہ اسی بل بوتے پر سمجھ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اسے صلاحیتیں کیوں دی گئیں؟" یہ کہہ کر انہوں نے لمحہ بھر رک کر کہا۔

"رب تعالیٰ کی عنایت سے، اس مادی دنیا میں، اسی خاک سے انسان خود کو بناتا بھی ہے، اور خود کو توڑ بھی لیتا ہے، وہ اپنے بارے میں اور اس کائنات کو بھی جاننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ ایسے منصب پر فائز ہے کہ رب تعالیٰ نے اسے اپنا نائب مقرر کر دیا۔ اس ارض کا خلیفہ بنا دیا، کیونکہ یہی وہ ہستی ہے جو خود اپنی معرفت اپنے آپ سے خود حاصل کرتی ہے، اس کا ادراک اس عزازیل کو تھا، اس نے انکار تو آدم کی ہستی کا کیا اور نافرمانی رب تعالیٰ کی ہوئی۔"

"میں یہ بات تو سمجھ گیا ہوں بابا جی کہ انسان کے وجود ہی سے سب کچھ ظاہر ہو رہا ہے، یہاں تک کہ شیطانیت بھی۔" میں نے کہا تو وہ بولے

"بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، خاک پڑی ہوئی تھی لیکن اس میں زندگی نہیں تھی، رب تعالیٰ نے ارادہ فرمایا اور اس خاک میں زندگی پیدا ہوگئی۔ کن میں ہر شے رکھ دی گئی جس کا ظہور ہو رہا ہے، یہ انسان ہی ہے جو اس کن کا ظہور اس زمین پر کرتا چلا جا رہا ہے، یہ رب تعالیٰ کی دی ہوئی خلافت کے باعث ہی تو ہے۔ سورج کا چمکنا کون دیکھ رہا ہے، اور چاندنی کو چاندنی کا نام کون دے رہا ہے لیکن یہ سب پچھا اسی وقت کر پاتا ہے جب یہ اپنے دیکھتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی شیطانیت ہی ہے کہ وہ فقط اسی کائنات میں غرق ہو جائے اور اسے اس معیار پر نہ دیکھے جو عین انسانیت ہے۔ یعنی انسانیت کا معیار اسے اس وقت ملے گا جب وہ خود کو بہ حیثیت انسان دیکھے گا اور اسی نگاہ سے اس کائنات کو پرکھے گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ نیکی عین فطرت ہے اور برائی شیطانیت کیوں ہے کہ وہ اسے نیکی سے غافل کر دیتی ہے۔" میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولے

"خود اپنے آپ پر نگاہ رکھنا ہی نیکی ہے اور یہی عین فطرت ہے۔ فطرت کا سیدھا راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔"

"تو یہ ساری کشمکش کیوں؟ رب تعالیٰ چاہتے تو سیدھے سیدھے انسان کو اسی کام پر لگا دیتے۔" میں نے محض ان سے سیکھنے کی غرض سے ایک نئی بات کہہ دی تو وہ ذرا سا مسکرائے اور بولے۔

"تمہیں پھر ایک چھوٹی سی کہانی سننی پڑے گی اور وہ کہانی تجھے پھر کسی وقت سنائیں گے۔ اس وقت تو صرف ایک بات سمجھ لے کہ نیکی عین فطرت ہے اور انسان کی یہ کشمکش برائی پر غالب آنا ہے، یہاں تک کہ شیطانیت کو مطیع کر لینا ہی اس کا مقصد ہے۔ اچھائی کو سرفرازی اور برائی کو سرنگوں کرنا ہی انسانیت ہے۔ یہی کشمکش انسان کا کردار بناتی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وجود میں کیا ہے۔ نیکی کی خوشبو، منافقت کی سڑاند یا برائی کا اندھیرا۔"

"تو اس کا مطلب جو......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے۔

"مطلب جو بھی ہے، اس مٹی کے پیالے میں جو کچھ ڈالنا ہے تو نے ڈالنا ہے اور اس میں سے باہر وہی کچھ آنا ہے جو تو نے ڈالا ہے۔ ذائقہ بھی تو نے چکھنا ہے، تیری ہی صوابدید ہے کہ تو کیا چاہتا ہے۔ اب تو جا اور میلے کی تیاری کر اور اپنے ساتھی کو گھر لے آ۔ وہ بے چاری بھی تو میلہ دیکھے نا۔" یہ کہہ کر انہوں نے پاس پڑی ہوئی لکڑیاں اٹھائیں، انہیں سلگتی ہوئی لکڑیوں پر رکھ دیا اور اٹھ کر ایک طرف چل دیا۔ میں سمجھ گیا اب مزید باتیں نہیں ہوں گی۔ میں نے اٹھ کر اس کھلے میدان کو دیکھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ میں کار میں بیٹھا اور واپس اپنے گھر آ گیا۔

مجھے گھر آئے کچھ وقت گزرا تھا کہ چھاکے کا فون آ گیا۔

"یار تانی ضد کر رہی ہے کہ وہ اسپتال میں نہیں رہنا چاہتی، واپس آنا چاہتی ہے۔ کیا کروں؟"

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے بات کی ہے، ان کا تو یہی کہنا ہے کہ اب بس پٹی بدلنا ہے، اس کی دیکھ بھال ہو جائے تو آپ لوگ جا سکتے ہو۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"اسے لے آؤ۔ یہاں وہ جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اسی وقت میں نے میلے کے منتظم کو فون کیا اور پوچھا۔

"کب دے رہے ہیں میلے کی تاریخ؟"

"وہی، جس تاریخ پر ہر سال میلہ ہوتا ہے۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"ٹھیک ہے، پھر تو چند دن رہ گئے ہیں۔ علاقے میں کروا اعلان، اس بار جتنے بھی انعام ہوں گے میری طرف سے ہوں گے۔"

"جی ٹھیک ہے۔" اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔



جسپال کی فلائیٹ چندی گڑھ کے بین الاقوامی ائر پورٹ پر اتری تو اس کے حواس پوری طرح جاگ گئے۔ دن کے دس بج چکے تھے۔ اسے احساس تھا کہ ائر پورٹ سے نکلتے ہوئے اسے گیارہ بج جائیں گے۔ اس وقت اگرچہ اس کے "کیس" نہیں تھے لیکن پگڑی باندھی ہوئی تھی اور سکھوں کی نئی نسل کی طرح اس نے بس نشانی ہی کے طور پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی اور مونچھیں رکھی ہوئی تھیں، یوں جیسے چند دن کا شیو بڑھا ہوا ہو۔ سامان کے نام پر اس کے پاس ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔ امیگریشن سے فراغت کے بعد وہ باہر آیا تو ایک نوجوان سکھ اس کی جانب بڑھا۔

"جسپال سنگھ ڈھلوں جی، آپ کے سواگت کے لیے جی، میں کرمیت سنگھ۔ ست سری اکال۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر اسے خوش آمدید کہا۔ جسپال نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور اسی طرح ہاتھ جوڑ کر جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ست سری اکال جی۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا تو کرمیت نے جلدی سے ایک فون سیٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

"لو جی کر لیں بات۔"

جسپال نے فون پکڑا اور جسمیندر کے نمبر پش کیے۔

دوسری بیل پر اس نے فون ریسیو کر لیا۔
"ٹھیک ہے جسپال، اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ اپنا ہی لڑکا ہے۔"
تصدیق ہو جانے کے بعد اس نے اپنا سامان اس کے حوالے کر دیا۔ کچھ دیر بعد ایک فور وہیل جیپ میں وہ ائیرپورٹ سے نکل رہے تھے۔
جسپال نے بہ مشکل ایک ہفتہ کینیڈا میں گزارا تھا۔ جاتے ہی اس کی ملاقات جسمیندر سے ہوئی۔ وہ دو دن اس کے ساتھ رہا تھا۔ ان میں بہت ساری باتیں ہوئیں۔ بہت سارے منصوبے ان دونوں کے درمیان زیرِ بحث آئے۔ وہ اوگی پنڈ ہی جانا چاہتا تھا کہ دو دن پہلے اچانک جسمیندر اس سے ملا۔
"جسپال اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اوگی پنڈ جانے سے پہلے تم چندی گڑھ جاؤ تو کیا تم چلے جاؤ گے؟"
"معاملہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔
"یہ تمہیں وہاں جا کر تفصیل سے معلوم ہو جائے گا۔ یہ مہم اگر کامیاب ہو گئی تو سمجھو تم نے خالصتان تحریک کی بہت بڑی خدمت کر دی اور میرے ساتھ تمہیں اس کا کتنا فائدہ ہوگا، یہ وقت بتائے گا۔"
"کل کس نے دیکھا ہے میری جان، تم آج کی بات کرو۔ آج ہی سب کچھ ہے۔ فائدہ تیرا ہو یا میرا، ایک ہی بات ہے۔ ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں۔" جسپال ایک دم سے مان گیا۔ اسی وقت ان میں سب طے ہو گیا۔ ہفتے کے اختتام پر وہ بھارت آ گیا۔
ان کے سفر کا اختتام سیکٹر آٹھ کے علاقے میں گولف روڈ کی طرف سے اندر کی جانب ایک دو منزلہ سفید بنگلے کے سامنے ہوا۔ یہ چندی گڑھ کا وہ علاقہ تھا، جس کے مغرب کی جانب سکھنا جھیل تھی۔ فضا میں اس علاقے کا مخصوص احساس پوری طرح موجود تھا۔ یہاں زیادہ تر نئی طرز کے گھر اور عمارتیں تھیں۔ دیکھ بھال کی وجہ سے وہ علاقہ صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس بلڈنگ کے ارد گرد اچھا خاصا سبزہ تھا۔ بڑا سا گیٹ پار کرنے کے بعد وہ پورچ میں پہنچے۔ سامنے بڑا سارا داخلی دروازہ تھا۔
دروازہ کرمیت نے چابی سے کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ تبھی اس کی نگاہ ڈرائنگ روم میں موجود ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ صوفے پر ٹیڑھے میڑھے سے انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔ انتہائی مختصر سا شارٹس، ایک ڈھیلی نمائی شرٹ سے آدھا ادھورا بدن ڈھکا ہوا تھا۔ الجھے ہوئے لمبے بال، اجڑا ہوا میک اپ سے بے نیاز چہرہ، جیسے کئی دنوں سے دھویا ہی نہ گیا ہو۔ اگرچہ گورے بدن میں گلابی پن تھا، لیکن اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ اس کی بڑی بڑی مخمور نگاہیں جسپال پر ٹکی ہوئی تھیں۔ پہلی نگاہ میں جسپال کو اس کا چہرہ اجنبی نہیں لگا، بلکہ یوں محسوس ہوا جیسے اس لڑکی کو پہلے اس نے کہیں دیکھا ہوا ہو۔ جسپال کی نگاہ اس لڑکی سے ہٹ کر میز پر پڑی تو اس لڑکی کے مدہوش ہونے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ مہنگے برانڈ کی شراب کی آدھی سے زیادہ خالی بوتل کے ساتھ گلاس رکھا ہوا تھا۔ جسپال کی طرف دیکھ کر وہ لڑکی ذرا سا مسکرائی، پھر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔
"میرے اس اجڑے ہوئے گھر میں خوش آمدید۔ مجھے پتہ ہے تمہیں شاید یہ سب اچھا نہ لگا ہو، لیکن مجبوری ہے۔ میں ایسی ہی ہوں، میں تنہا ہوں، تنہا اگروال، اپنے گھر میں بھی گم ہی ہوں، سمجھو۔"
جسپال نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اگلے لمحے اس کا ٹھنڈا ہاتھ چھوڑ کر سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس دوران کرمیت اس کا سامان رکھ کر واپس آ گیا۔
"بائی جی، کیا پینا پسند کریں گے، ٹھنڈا، چائے کافی، کچھ بھی جو بولیں تو......" اس نے آتے ہی پوچھا اور بوتل کی جانب بھی اشارہ کر دیا۔ جسے نظر انداز کرتے ہوئے اس نے کہا۔
"چائے پلا دو۔"
"جی ٹھیک ہے بھائی جی۔" یہ کہہ کر وہ جلدی سے پلٹ گیا۔ جسپال یہ سوچے چلا جا رہا تھا کہ اس لڑکی کا چہرہ اور نام اسے جانا پہچانا کیوں لگ رہا ہے۔ وہ یہی سوچ

رہا تھا کہ نیہا بولی۔

”تم اسی طرح شرمیلے ہو یا اداکاری کررہے ہو؟“

”مجھے کیسا ہونا چاہیے تھا؟“ جسپال نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ ایک دم سے قہقہہ لگا کر بولی۔

”تجھے دیکھ کر تو لگتا ہے کہ جیسے تم میری مدد نہیں کر پاؤ گے لیکن دل نے کہا کہ نہیں تم ضرور میری مدد کرو گے۔“

”میں نہیں جانتا کہ تم کیا چاہتی ہو، اپنا مسئلہ بتاؤ، شاید تمہاری مدد کر سکوں، کیونکہ میں یہاں آیا ہی اسی لیے ہوں۔“ اس نے صاف انداز میں کہا۔

”اتنی جلدی بھی کیا ہے، ابھی آئے ہو، کھانا کھاؤ، آرام کرو، پھر.....“ اس نے خمار بھرے لہجے میں کہنا چاہا تو جسپال نے کہا۔

”اب ہم کون سا کہیں مصروف ہیں، تم بتاؤ، میں سن رہا ہوں۔“

”نہیں، میری بات چند لفظوں میں تجھے سمجھ نہیں آئے گی، ایک کہانی ہے، جو تمہیں سنانا ہوں ممکن ہے وہ تجھے انتہائی بور لگے، اس میں تمہارے لیے کوئی دلچسپی نہ ہو، لیکن وہ کہانی سن کر ہی تم میری بات کو سمجھ پاؤ گے۔ تم بھی تھکے ہو اور میں بھی تھکی۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی، پھر چونک کر بولی۔

”اگر تمہیں برا نہ لگے تو؟“

”نہیں مجھے برا نہیں لگے گا۔“ جسپال نے سکون سے کہا تو وہ مسکرا دی۔ پھر ایک بیڈ روم کی طرف اشارہ کرکے بولی۔

”جاؤ، جا کر ایزی ہو جاؤ، پھر خوب آرام کرو۔ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔“ اس نے کہا اور بوتل کھول کر ایک چھوٹا پیگ بنایا اور گلاس تھام کر بیٹھ گئی۔ جسپال اٹھا اور بیڈ روم میں چلا گیا۔

جسپال کی آنکھ کھلی تو شام ڈھل رہی تھی۔ وہ بے خبر سویا تھا۔ وہ اچھی طرح فریش ہوا، اس نے جین کے ساتھ سفید شرٹ پہنی اور ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اتری ہوئی رات کے اندھیرے کو شہر کی روشنیاں دور کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ فضا میں نمی پھیلی ہوئی تھی، جس کا احساس اسے گہری سانس لینے سے ہوا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا، پھر اپنے پیچھے آہٹ پا کر مڑا تو سامنے نیہا کھڑی تھی۔ وہ کافی حد تک فریش لگ رہی تھی، اس کے سلجھے ہوئے گیسو، تر و تازہ چہرہ اور ڈھنگ کی شرٹ کے ساتھ ڈریس پتلون بتا رہی تھی کہ وہ اس وقت ہوش میں ہے۔

”تمہیں تو یہاں سے کوئی منظر دکھائی نہیں دے رہا ہوگا نا!؟“ اس نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

”بالکل، یہاں اس کھڑکی سے کئی دفعہ باہر جھانک کر دیکھا ہے، لیکن سوائے اندھیرے کے باہر کچھ نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

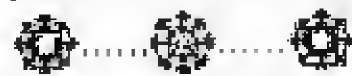
”کیسا لگتا ہے جب کئی سارے منظر آنکھوں میں ٹھہر جاتے ہیں، یوں جیسے پلکوں کے ساتھ چپک کر رہ گئے ہوں، ان سے جان بھی چھڑانا چاہو تو نہیں چھڑائی جا سکتی۔“ وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولی اور پلٹ کر صوفے پر جا بیٹھی۔ اس نے نیہا کی بات کا جواب نہ دیا تو وہ بولی۔

”کھانا کھاؤ گے یا کہیں باہر چلنا پسند کرو گے؟؟“

”ابھی تو کھانے کو میرا دل نہیں چاہ رہا ہے، جب بھوک لگی تو بتا دوں گا، ویسے اگر تم پسند کرو تو ہم باتیں کر لیں۔“ جسپال نے کہا تو وہ مسکرا دی، پھر اپنے بیڈ روم کی طرف اشارہ کرکے اس طرف بڑھ گئی۔ وہ دونوں بیڈ پر بیٹھ گئے۔ نیہا اگر وال جیسے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پھر کہتی چلی گئی۔

”یہ تین برس پہلے کی بات ہے جسپال، جب میں ایک نجی اسپتال میں نرس کے طور پر کام کرتی تھی۔ میری فیملی میں میرا باپ، میری ماں اور ایک بہن تھی۔ ہمارے ہاں انتہائی غربت تھی۔ ہمارے گھر کا ہر فرد کام کرتا تھا، پھر کہیں جا کر روٹی پوری ہوتی تھی۔ باپ ایک کپڑے والی دوکان پر کام کرتا تھا، بہن ایک اسکول میں پڑھاتی تھی، ماں سارا دن گھر میں لکڑی کے کھلونوں پر رنگ کرتی رہتی تھی۔ اس وقت ہم جگتا پورہ کی بستی میں رہتے تھے، آج وہاں کچھ ڈیولپمنٹ ہوئی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک

طویل سانس لی، چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔
”میری یہ کہانی اس رات شروع ہوئی جب میں چار سے بارہ بجے کی ڈیوٹی ختم کر کے اسپتال سے واپس گھر کی طرف آ رہی تھی۔“
یہ کہہ کر اس نے پھر ایک طویل لیکن سرد سانس لی۔



اس رات ائرپورٹ کی طرف جانے والے راستے پر چھ مہنگی کاروں کا قافلہ بڑی تیزی سے جا رہا تھا۔ ایک سب سے آگے، دو اس کے پیچھے، پھر ایک کار جس میں سندیپ اگروال بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے دو کاریں تھیں۔ سندیپ سنگھ اگروال، جسے چندی گڑھ کے انڈرورلڈ والے سندو کے نام سے جانتے تھے، اپنی کار میں پچھلی نشست پر بڑے کروفر سے بیٹھا ہوا تھا۔ باقی کاروں میں اس کے باڈی گارڈز تھے۔ اس وقت وہ تھائی لینڈ جانے کے لیے ائرپورٹ کی طرف جا رہا تھا۔

فلائیٹ میں تھوڑا سا ہی وقت رہتا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے بغیر جہاز پرواز نہیں کر سکتا۔ وہ لمبے قد کا جوان تھا، رنگ صاف، کلین شیو، موٹے نین نقش اور کسرت کے باعث کافی مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ کچھ وقت میں وہ ائرپورٹ پہنچ جانے والے تھے کہ اچانک اگلی دو کاریں دھماکے سے اُڑ گئیں۔ تیسری کار تیز رفتاری کے باعث سنبھل نہ سکی اور ان میں جا لگی۔ وہ چوتھی کار میں تھا۔ اس کی کار میں بھی پچھلی کاریں آ لگیں۔ شدید جھٹکے میں وہ اپنا پسٹل نکالنا نہیں بھولا۔ حملہ آوروں کو پوری طرح معلوم تھا کہ کس کار میں ہے اس لیے ایک برسٹ اس کی کار کو لگا۔ اس کی کار بلٹ پروف تھی۔ اسے گولی تو نہ لگی لیکن وہ اگلے ہی لمحے دوسری طرف سے نکل گیا۔ دو یا تین لمحوں کے اس وقفے میں وہ فٹ پاتھ پر تھا مگر اس کی کار میں ایک راکٹ لانچر آ لگا۔ ایک دھماکا ہوا اور وہ سڑک کے کنارے جا پڑا۔ ایک شعلہ بلند ہوا جو اونچے الاؤ میں بدل گیا۔ اس کے ہاتھ سے پسٹل نکل کر نجانے

کدھر گم ہو گیا تھا۔ اچانک شدید فائرنگ شروع ہو گئی۔ کسی کو کچھ احساس نہیں تھا کہ کون کسے نشانہ بنا رہا ہے۔ وہ زخمی ہو چکا تھا۔ اسے قطعاً پتہ نہیں تھا کہ اس کا جسم کہاں کہاں سے پھٹا ہے۔ سندو کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا سارا بدن خون میں بھیگ رہا ہے اور جلن سارے بدن میں پھیل گئی ہے۔

وہ فٹ پاتھ سے بھی آگے سڑک کنارے پڑا تھا اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھ سکتا۔ وہ سر نہوڑے پڑا تھا کہ ایک گولی نجانے کدھر سے آئی اور اس کی ران میں گھس گئی۔ اسے لگا جیسے کسی نے آگ اس کے بدن میں پیوست کر دی ہو۔ یہی وہ لمحہ تھا، جب اسے احساس ہوا کہ وہ لمحہ بہ لمحہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے، وہ اگر یہاں سے اِدھر اُدھر نہ ہوا تو یہ لوگ اسے مار دیں گے۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس قدر بڑا حملہ ہو گا۔ سڑک پر آگ اور خون کا ہنگامہ برپا تھا۔ موت ناچ رہی تھی۔ اس نے اپنی پوری قوت صرف کی اور رینگتے ہوئے سڑک سے نشیب کی جانب بڑھ گیا۔ اور پھر لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتا گیا۔ اس کے پورے بدن میں جلن ہو رہی تھی۔ وہ ہمت کر کے اٹھا اور وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اس سنسان علاقے میں اُگی گھاس پھوس کی جھاڑیوں میں جا چھپا۔

وہ کچھ دیر وہیں پڑا رہا۔ فائرنگ کی آواز ختم ہو گئی تھی۔ لوگوں کا شور بھی ختم ہو گیا تھا لیکن اس کا بدن کمزور پڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر ایسے ہی پڑا رہا تو کچھ دیر بعد وہ بے ہوش ہو جائے گا اور پھر موت اسے ابدی نیند سلا دے گی۔ وہ گھسٹتا ہوا اس سنسان علاقے میں ایک پگڈنڈی نما راستے پر آ گیا۔ جس سے کچھ فاصلے پر وہ ایک بستی نما کالونی کی روشنیاں دیکھ رہا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ اس بستی تک پہنچ جائے تو زندگی اس کا ساتھ دے سکتی ہے، ورنہ وہ اسی راستے پر پڑا رہا تو زندگی اس کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ زندگی میں کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ شدید خواہش ہونے کے باوجود بندے کی دسترس میں کچھ نہیں رہتا۔

نیہا اس وقت سیکٹر اے تھیں کے بس اسٹاپ سے اتری۔ بس اسٹاپ سے کچھ فاصلے پر لگتا تھا جیسے بہت بڑا حادثہ ہو گیا ہو۔ وہاں بہت سارے لوگ جمع تھے اور ٹوٹی پھوٹی کاریں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک نگاہ انہیں دیکھا اور اپنے گھر کی جانب تیز تیز قدموں سے چل پڑی۔ وہ روزانہ ہی ادھر سے گزرتی تھی۔ اگرچہ جگلا پورہ کو جانے والا راستہ ذرا آگے تھا، لیکن جس راستے پر یہ جا رہی تھی، یہ راستہ کسی حد تک سنسان ہونے کے ساتھ شارٹ کٹ تھا، دوسرا اس کا دیکھا بھالا تھا اور بس اسٹاپ کے سامنے تھا۔ وہ بڑھتی جا رہی تھی کہ اچانک اس کی نگاہ ایک شخص پر پڑی جو اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اس میں ذرا بھی حرکت نہیں تھی۔ وہ ٹھٹک گئی۔ اس کے من میں خوف اتر آیا۔ وہ اس سے پہلو بچا کر نکل جانا چاہتی تھی کہ اس شخص نے حرکت کی اور پکارا۔

"پلیز! مجھے بچا لو......"

اس کے بڑھتے ہوئے قدم جم کر رہ گئے۔ سگنل کی روشنی میں اس نے دیکھا، وہ شخص خون میں لت پت پڑا تھا۔ تکلیف کی شدت کے باعث اس کا چہرہ مسخ ہو رہا تھا۔ ایک نرس ہونے کے ناتے وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ شدید زخمی ہے اور اسے ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ وہ چند لمحے کھڑی سوچتی رہی۔ اسے لگا یہ کوئی زخمی ہے اور اس حادثے سے اس کا تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ بڑے حوصلے اور ہمت کے ساتھ اس کے پاس بیٹھ گئی اور دھیرے سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

"کچھ بھی...... جو تمہاری...... سمجھ میں آئے...... مجھے بچا لو پلیز۔"

"میں تمہیں کسی اسپتال لے جاؤں؟" نیہا نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولا۔

"نہیں، میرے دشمن...... مجھے تلاش...... کر رہے ہوں گے۔ کسی ایسی جگہ...... جہاں میں...... کم از کم یہ رات...... گزار لوں اور...... مجھے کوئی...... گئی ہے وہ...... نکل جائے۔"

اس شخص کے یوں کہنے پر نیہا کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ کچھ دیر پہلے سڑک پر ہونے والا حادثہ بہر حال نہیں تھا۔ جو اس نے سوچا تھا ویسا نہیں تھا۔ گولی لگنا کچھ اور ہی بتا رہا تھا۔ نیہا کا گھر کچھ ہی فاصلے پر تھا، ایک دم سے اسے خیال آیا تو اس نے پوچھا۔

"دیکھو میں تمہاری کیسے مدد کر سکتی ہوں، پولیس اگر مجھ تک......" نیہا نے کہنا چاہا۔

"صرف ایک رات...... مجھے کچھ وقت کے لیے...... چھپا لو۔" وہ کراہتے ہوئے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"دیکھو، میرا گھر یہاں سے کچھ فاصلے پر ہے۔ اگر تم میرے ساتھ وہاں تک جا سکو تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔" اس نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"مجھے سہارا دو۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو نیہا نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ خون سے اس کے کپڑے لت پت ہو چکے تھے۔ سندو سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ ران میں لگی ہوئی گولی نے اس کے پورے بدن میں ٹیسیں بھر دی تھیں۔ وہ چند قدم چلنے کے بعد کراہتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑا۔

"اگر تم میرے گھر تک پہنچ گئے تو میں تمہاری گولی بھی نکال دوں گی۔ میں نرس ہوں۔" اس نے بتایا تو سندو کو لگا جیسے اس کی زندگی بچ جائے گی۔ وہ پوری قوت سے اٹھا اور اس کے سہارے چلنے لگا۔

اس بستی نما کالونی میں چھوٹے بڑے کئی گھر تھے لیکن سارے ہی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ رات کے تقریباً دو بجنے والے تھے۔ ٹیڑھی میڑھی گلیاں اور راستے سنسان ہو گئے ہوئے تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ انہیں راستے میں کوئی نہیں ملا۔ وہ اسے لے اپنے گھر میں آ گئی۔

"اے یہ کون ہے، کہاں سے اٹھا لائی ہے تو اسے؟" اماں نے دروازہ کھول کر خون سے لت پت ایک اجنبی

کے ساتھ اسے دیکھ کر نیند میں بھری آواز سے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، سندو نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنے بھی بڑے نوٹ اس کے ہاتھ میں آئے اس کی ماں کی طرف بڑھا دیے۔ ماں نے حیران نظروں سے وہ نوٹ پکڑے اور خاموش ہو گئی۔ اس کا باپ ٹھرا پی کر مدہوش پڑا تھا۔

"اماں جلدی سے پانی گرم کر دے۔" نیہا نے کہا اور اسے اندر والے کمرے میں لے جا کر زمین پر لٹا دیا۔ اس نے ایمرجنسی کے لیے اپنے گھر میں کچھ میڈیسن رکھی ہوئی تھیں۔ وہ سب اٹھا لائی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ سندو کے سارے کپڑے اتار دیے۔ صرف ایک جانگیہ اس کے بدن پر رہ گیا۔ نیہا جب اس کے کپڑے اتار رہی تھی تو سندو کے گلے میں بھاری سونے کی چین تھی وہ اتاری، بریسلیٹ الگ کیا، سونے کی چین والی گھڑی، انگوٹھیاں الگ کیں۔ اس نے اتنا دھن کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے وہ سنبھالا اور اپنی ماں کو خبر نہ ہونے دی۔

وہ ماہر سرجن تو نہیں تھی لیکن سندو کی ران سن کی اور پھر چیر کر اس نے گولی نکال لی۔ خون بہنے لگا تھا، جسے اس نے مشکل سے روک لیا۔ اس کے بدن پر کافی سارے چھوٹے چھوٹے زخم تھے، صرف ایک بڑا زخم تھا۔ اس نے سب پر مرہم پٹی کر دی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس وقت سندو کو میڈیسن کی ضرورت تھی۔ اسے معلوم تھا کہ گولی والی جگہ پر سوجن ہو سکتی ہے اور ممکن ہے زہر کا اثر ہو جائے لیکن اتنی رات گئے وہ کہاں سے لاتی۔ سندو انجکشن کے زیر اثر پڑا تھا، جس کا اثر کچھ دیر بعد ختم ہو جاتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا اور کمرے سے باہر صحن میں آ گئی، جہاں اس کی ماں پڑی ہوئی تھی۔

"ماں اسے یہیں پڑے رہنے دینا، میں اس کے لیے میڈیسن لے کر آتی ہوں۔" نیہا نے کہا تو اس کی ماں نے پوچھا۔

"ارے اتنی رات گئے کہاں جاؤ گی، پہلے ہی میرا دل ڈر رہا ہے۔ صبح دیکھ لینا۔"

"نہیں اماں اسے ضرورت ہے، میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے وہی نوٹ اپنی ماں سے لیے اور گھر سے باہر نکل گئی۔ کافی آگے ایک چوراہے پر اسے ایک رکشہ دکھائی دیا۔ رکشے والا ڈرائیونگ سیٹ پر پڑا اونگھ رہا تھا۔ وہ اس میں جا بیٹھی۔ قریبی اسپتال کے باہر دو دکانوں سے اس نے دوائیاں لیں اور اسی رکشے پر واپس آ گئی۔ تب تک صبح کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

اس کا باپ صبح ہی اٹھ کر اپنے کام پر نکل گیا۔ ماں نے اسے سمجھا دیا تھا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ بہن بھی کام پر نکل گئی۔ ماں باہر ہی بیٹھی رہی تاکہ کوئی آنے والا اندر نہ آ سکے۔ دوپہر سے پہلے اسے ہوش آیا تو نیہا نے پوچھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

"میرے مسیحا کو معلوم ہوگا۔" اس نے آہستگی سے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"دیکھو تمہیں بہت اچھے ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے، میں نے کوئی علاج نہیں کر دیا، زہر پھیل سکتا ہے اور ایسے چھوٹے گھر میں تم چھپ نہیں سکتے۔"

"مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے، تم یہی کہنا چاہتی ہو نا۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں، میں یہی کہنا چاہتی ہوں۔ تمہیں علاج کی زیادہ ضرورت ہے۔" اس نے سندو کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں لیکن تمہیں تھوڑی اور زحمت دوں گا۔ مجھے کپڑے اور ایک ٹیکسی لا دو۔"

"بابو کے ڈھیلے کپڑے چلیں گے، دھوتی کرتا؟"

"چلیں گے۔" وہ مسکراتا ہوا بولا۔

"کپڑے پہن لو، تو ٹیکسی بھی آ جائے گی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے باپ کے کپڑے لا دیے اور انہیں پہننے میں اس کی مدد کی۔ وہ پہن چکا تو بولا۔

"نیہا تم نے میری بہت مدد کی، میری زندگی بچائی۔

میں......"

"پلیز ان باتوں کو چھوڑو۔ اماں گئی ہے رکشہ لینے، آگے جا کر ٹیکسی خود لے لینا۔" اس نے تیزی سے کہا۔

سندرو نے یہ سنا تو خاموش رہا، پھر عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"نیہا تجھے ڈر نہیں لگا؟"

"ڈر کیسا؟"

"یہی اتنے سنسان راستے سے تم آتی ہو، میں خون میں لت پت کوئی چور، غنڈہ......" اس نے پوچھا تو نیہا انتہائی تلخی سے بولی۔

"کاہے کا ڈر، پیسہ ہمارے پاس نہیں، جو کوئی چھین لے گا، عزت ہے نہیں، جو لوٹ لے گا اور میرا یہ ماحول ایسا ہی ہے، جس میں زندگی سسکتی ہے، ہم ساری عمر زندگی سے لڑتے ہیں۔" نیہا نے کہا اور چونکتے ہوئے بولی۔

"ہاں یہ لو، تیرا زیور اور تیرے پیسے اس کپڑے میں ہیں۔"

"یہ نوٹ مجھے دے دو، باقی تم رکھ لو، شکریہ تمہارا۔" سندرو نے کہا تو تیزی سے بولی۔

"نہیں، ہم بیچیں گے تو خواہ مخواہ پکڑے جائیں گے۔ چوری کا سمجھ کر۔ سب لے جاؤ۔" اس نے پوٹلی تھماتے ہوئے کہا۔ اتنے میں باہر رکشے کی آواز آئی۔ نیہا نے اسے سہارا دیا اور رکشے میں بٹھا دیا۔ کچھ دیر بعد رکشہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

اگلی شام جب وہ اسپتال گئی تو اسے اخباروں سے زیادہ لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ رات والا شخص کون تھا۔ ایسا ہوتا ہے، جرائم کی دنیا میں کسی مجرم کے خوف کا تاثر زیادہ ہوتا ہے اور بذات خود وہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ حقیقت میں کوئی بات بہت کم ہوتی ہے لیکن جب لوگوں کی زبان پہ چڑھتی ہے تو کہانیاں اور افسانے بن کر پھیل جاتے ہیں، حتیٰ کہ وہ ایسی افواہوں کا روپ دھارتے ہیں، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔

یہ واقعہ گزرے، دو ماہ سے زیادہ کا وقت ہو گیا۔ اس کی ماں کو جب بھی وہ "زیور" یاد آتا تو نیہا کو کوسنے دینے لگ جاتی۔ اس کے خیال میں ان کی زندگی بدل جاتی اور شاید یہاں سے بھی نکل جاتے۔ نیہا کی وہی زندگی تھی۔ روزانہ جب وہ ان راہوں سے گزرتی تو اسے وہ اجنبی یاد آ جاتا۔ اسے کئی طرح کے خیال آتے لیکن وہ انہیں جھٹک دیتی۔ غربت اور قسمت کا ساتھ شاید نہیں بنتا۔

ایسے ہی ایک رات جب وہ اسپتال سے نکل کر بس اسٹاپ کی جانب بڑھی تو ایک سیاہ مہنگی کار اس کے پاس آ رکی۔ اس کے ساتھ ہی پچھلی نشست کا دروازہ کھلا اور سندیپ اگروال نے اسے آہستگی سے پکارا

"نیہا آؤ، میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"

وہ ایک ہی نگاہ میں اسے پہچان گئی تھی۔ وہ ایک لفظ کہے بنا اس کے ساتھ جا بیٹھی۔ وہ حیران ضرور تھی کہ سندرو نے اسے یاد رکھا۔ پہلی بار وہ کسی قیمتی گاڑی میں بیٹھی تھی۔

"تم نے تو یہ سوچا ہوگا کہ شاید میں تجھے بھول گیا ہوں، اب واپس پلٹ کر نہیں آؤں گا۔" سندرو نے کہا۔

"شاید ایسا ہی تھا، یا شاید یقین تھا کہ تم ایک دن پلٹ کر آؤ گے، میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔" نیہا نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ اس پر سندرو کافی دیر تک خاموش رہا پھر پوچھا۔

"نیہا کیا تم اپنے گھر والوں کو بتا سکتی ہو کہ آج تم گھر نہیں آ رہی ہو۔ میں تجھے آج اپنا مہمان بنانا چاہتا ہوں۔"

"میں اگر تمہارے ساتھ نہ جانا چاہوں تو؟" اس نے لرزتے ہوئے کہا، اس کے ذہن میں سندرو کے بارے میں سنی ہوئی باتیں پھیل گئی تھیں۔

"میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا، میں صرف درخواست کر سکتا ہوں تم سے، اسی لیے میں خود آیا ہوں، تمہیں لینے کے لیے۔" اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ چاہتا تو اسے اپنے بندے بھیج کر اٹھوا بھی سکتا تھا۔ نیہا کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر ایک طویل سانس

سے بولی۔
"ٹھیک ہے میں کہہ دیتی ہوں۔"
اس نے اپنی بہن کو فون کر کے بتا دیا کہ اسے دہری ڈیوٹی کرنا ہوگی، اس لیے وہ کل دوپہر ہی کو آسکے گی۔ سندو اسے اپنے ساتھ لے گیا۔
وہ ایک عالی شان گھر تھا۔ پورچ میں کافی ساری گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے ساتھ سہمی ہوئی اندر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ وہاں دو عورتیں کھڑی تھیں۔ سندو نے نیہا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"اسے لے جاؤ اور فریش کر کے لاؤ۔"
وہ عورتیں ایسی تھیں، جیسے پرانے وقتوں میں بادشاہوں کی مشاطہ ہوا کرتی تھیں۔ وہ اسے ایک بڑے باتھ روم میں لے گئیں۔ پھر نیہا ایک گھنٹے بعد جب وہ بدن پر تولیہ لپیٹے وارڈ روب کے سامنے آئی تو ایک مشاطہ نے کہا۔
"یہ سارے ڈریس آپ کے لیے ہیں، جو بھی پسند کریں، ہم وہی نکال دیتی ہیں۔"
نیہا نے ہلکے کاسنی رنگ کا ایک ڈریس پسند کیا۔ کچھ دیر بعد وہ جب آئینے کے سامنے آئی تو خود کو بھی نہ پہچان پائی۔ ہلکے سے میک اپ کے ساتھ اس کا حسن اپنا آپ منوا رہا تھا۔
بجلی روشنی میں بنگلے کے عقبی لان میں سندو کے سامنے والی کرسی پر نیہا بیٹھی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک میز تھی جس پر شراب کی بوتل کے ساتھ لوازمات دھرے ہوئے تھے۔ سندو نے دو چھوٹے پیگ بنائے اور ایک اس کی طرف بڑھا کر بولا۔
"نیہا تمہارے نام، جس نے مجھے ایک نئی زندگی دی۔"
نیہا نے وہ جام پکڑا اور اپنے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔
"اتنا عرصہ کہاں رہے؟"
"تمہیں شاید یہ بہت عرصہ لگا ہو، لیکن میرے لیے بہت مشکل وقت تھا۔ ایک ماہ تک تو میں چھپ کر اپنا علاج کرواتا رہا۔ دراصل میں جنہیں اپنا دوست سمجھتا تھا، وہی میرے بدترین دشمن نکلے۔" سندو نے گہرے دکھ سے کہا اور اٹھ گیا۔ نیہا بھی اس کے ساتھ اٹھ گئی۔ وہ دونوں چلتے ہوئے لان کے سرے پر چلے گئے، جہاں کافی حد تک اندھیرا تھا۔
"کیوں وہ کیوں دشمن ہو گئے؟" اس نے پوچھا
"تم شاید یہ بات نہ سمجھ سکو، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔
"انسان ایک دوسرے کا دوست یا دشمن سوچ ہی کی وجہ سے بنتا ہے۔ کچھ نظریات ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ یا تو محبت چلتی ہے یا پھر منافقت۔ جس نظریے کی بنیاد، جیسے رویئے پر رکھی جائے گی، فطری طور پر انسانی سوچ میں وہی رویہ ان نظریات کے ساتھ پروان چڑھے گا" یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہوا چند لمحے بعد اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔
"خیر تم ان باتوں کو چھوڑو، میں تمہیں اپنے بارے میں بتاتا ہوں، تم یہ پیگ ختم کرو۔" سندو نے کہا اور ہونٹوں سے لگا کر گلاس خالی کر دیا۔ ایسا ہی نیہا نے کیا۔
"تم اپنے بارے میں یہی بتاؤ گے نا کہ تم ایک مجرم ہو۔" نیہا نے کہا۔
"میں مجرم ہوں یا نہیں..... بحث اس سے نہیں لیکن تم چاہے ایک غریب نرس ہو، لیکن میری مسیحا ہو۔ میرا کوئی پتہ نہیں، میں کب اور کس وقت مارا جاؤں، لیکن میری محسن، میں تمہیں تو غربت سے نکال جاؤں۔" اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا اور میز کے پاس جا کر بوتل سے دو پیگ بنا دیئے۔ پھر دونوں پیگ لے کر واپس نیہا کے پاس آگیا
"کیا کرو گے میرے لیے۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"دو راستے ہیں، ان میں سے ایک تم نے چننا ہے، جو تم چاہو، یا پھر تم بتا دینا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا، کون سے راستے؟" نیہا نے پوچھا۔

"جتنی دولت چاہو، مجھ سے لے لو اور اپنی دنیا جس طرح چاہو بنالو اور دوسرا یہ کہ میرے ساتھ رہو۔" اس نے کہا اور نیہا کی آنکھوں میں دیکھا۔

"تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"تم چاہتیں تو اس رات مجھے مار سکتی تھیں۔ اس رات اگر میرے بہت سارے دشمن بن گئے تھے تو ایک اچھا انسان بھی مل گیا تمہاری صورت میں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر کہوں گا کہ عقیدت ہے تم سے۔ میری صرف ایک خواہش ہے کہ تم ایک پرسکون اور خوشیوں بھری زندگی گزارو، تمہارے یہ لفظ مجھے نہیں بھول رہے کہ کاہے کا ڈر، پیسہ ہمارے پاس نہیں، جو کوئی چھین لے گا، عزت ہے نہیں جو لوٹ لے گا اور میرا یہ ماحول ایسا ہی ہے، جس میں زندگی سسکتی ہے، ہم ساری عمر زندگی سے لڑتے ہیں۔"

"سندو، جیسے تم کہو۔" نیہا نے اچانک کہا اور اس کے گلے لگ کر شدت سے رونے لگی۔ وہ اسے تھپکتا رہا۔ کافی دیر بعد اس نے نیہا کو الگ کیا اور بولا۔

"اب نہیں رونا۔ واہگرو سب ٹھیک کردے گا۔ آؤ کھانا کھاتے ہیں، پھر ساری رات پڑی ہے باتوں کے لیے۔"

اگلے دن نیہا کی آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ خواب کی سی کیفیت میں ہے۔ اگلے چند دنوں میں اس کی زندگی ہی بدل گئی۔ اس نے ایک بڑی رقم دے کر اپنے والدین کو سمجھا دیا کہ وہ اب جو نوکری کر رہی ہے، اس میں وقت کا کوئی تعین نہیں۔ والدین بھی سمجھ گئے کہ چڑیا اب گھونسلے سے اڑ گئی ہے۔

نیہا کو سندو کے ساتھ رہتے ہوئے ایک سال سے بھی زیادہ ہوگیا۔ اس دوران نیہا نے وہ کن ملکوں میں گئی اور کیا کچھ دیکھتی رہی۔ سندو بنیادی طور پر بہت اچھا انسان تھا۔ حالات اور خاص طور پر بھارت میں سکھوں کے ساتھ جو ہو رہا تھا اس کے رد عمل میں سندو جیسے کئی لوگ پیدا ہو چکے تھے۔ بظاہر اس کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا، لیکن اصل میں وہ جرائم کی دنیا میں بہت آگے تک نکل چکا تھا۔ اس کی اصل طاقت ببر خالصہ یا سکھ لبریشن فرنٹ جیسی ایک سکھ تنظیم تھی، جو سامنے نہیں تھی لیکن سکھوں کے اتحاد کے لیے پوری طرح کام کر رہی تھی۔ وہ ایک کاروباری نیٹ ورک تھا، جس کے سائے میں وہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے چلے جا رہے تھے۔ مختلف ملکوں اور حکومتی ایوانوں میں رسائی کے باعث وہ بہت مضبوط اور طاقت ور تھے۔

نیہا کے ذہن میں بھی کبھی نہیں تھا کہ وہ فلمی ہیروئن بنے گی۔ ایک دن ایسے ہی مذاق میں بات چلی۔ ان کے ایک مشترکہ فلم پروڈیوسر دوست نے کہا کہ نیہا تو فلمی ہیروئن لگتی ہے، کیوں نا اسے لے کر فلم بنائی جائے۔ اسی دن طے ہوگیا کہ وہ بھارت کی پنجابی فلم میں ہیروئن ہوگی۔ اس دن سے پہلے اس کا نام کچھ اور تھا، نیہا اگروال اسی دن رکھا گیا تھا۔

نیہا کی پہلی فلم ہی ہٹ ہوگئی۔ اگلے دو برس میں وہ بھارتی پنجابی فلموں کی مقبول اور مصروف ہیروئن بن گئی۔ اسی دوران سندو اور اس کا ساتھ ویسے ہی رہا۔ سندو نے اپنی تنظیم کے لیے اس سے بہت سارا کام لیا۔ ایک عام لڑکی شاید وہ سب نہ کر سکتی، جو نیہا نے کیا۔ سندو اور نیہا نے شادی تو نہیں کی لیکن ایک انجانا اٹوٹ رشتہ ان میں موجود تھا۔ سندو کا جو بھی مقصد تھا، وہی اب نیہا کا تھا۔ ان کے لیے دولت کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ یوں زندگی کے سفر پر اپنا مقصد لیے چلتے چلے جا رہے تھے۔

مختلف سکھ تنظیموں کے پانچ لڑکے سندو کی سرپرستی میں پنجاب کے ایک گوردوارے میں مذہبی تعلیم کے ساتھ تربیت حاصل کر رہے تھے۔ ان کا تعلق بیرون ملک سے تھا۔ ایک سکھ گیانی ان کی تمام تر دیکھ بھال کر رہا تھا۔ سکھ پنتھ میں پانچ پیاروں کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی نسبت سے ان پانچ لڑکوں کو ایک بڑے مقصد کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ یہاں سے بنیادی مذہبی تعلیم لینے کے بعد انہیں

کینیڈا لے جایا جاتا تھا۔ وہاں انہیں جدید علوم کی تربیت دی جاتی تھی۔ وہ پانچوں لڑکے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی جان وار دینے کا حلف دے چکے تھے۔ چند دن بعد انھوں نے کینیڈا چلے جانا تھا۔ سندو ان کی روانگی کے انتظامات میں لگا ہوا تھا کہ اچانک سندو سمیت وہ پانچوں لڑکے غائب ہو گئے۔ نیہا اور سندو کے ساتھیوں نے جب ان کی تلاش شروع کی تو انہیں بھی قتل کی دھمکیاں ملنے لگیں۔ چند ہی دنوں میں اس کے بہت سارے ساتھی مارے گئے، خطرہ کچھ زیادہ ہی بڑھا تو نیہا سمیت اس کی گینگ کے سارے لوگ زیر زمین چلے گئے۔

"وہ کون لوگ تھے، جنھوں نے سندو کا سب کچھ تباہ کیا، کچھ پتہ چلا۔" جسپال نے پوچھا تو نیہا بیڈ پر پھیلتے ہوئے بولی۔

"پہلے پہل تو بالکل ہی پتہ نہ چلا کہ وہ کون لوگ تھے، لیکن پھر آہستہ آہستہ معلوم ہو گیا کہ بھارتی خفیہ ایجنسی را کے لوگ تھے۔ ان کی مدد سنگھ پریوار کے مقامی لوگوں نے کی۔"

"ان لڑکوں کی ایسی کیا تربیت ہو رہی تھی کہ را والوں کو اتنا بڑا آپریشن کرنا پڑا۔" جسپال نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"ان پانچ لڑکوں کو اس لیے تیار کیا جا رہا تھا کہ بھارت میں ان سیاست دانوں کو ختم کرنا ہے، جو کسی نہ کسی صورت میں سکھ نسل کو ختم کرنے کے در پے ہیں۔ اس کے علاوہ آئندہ آنے والے الیکشن میں سکھوں کی تمام حریت پسند تنظیمیں اپنا امیدوار کھڑا کرنے والی تھیں۔ یہ طے ہو گیا تھا۔ چونکہ پنجاب میں مسلمان بھی ہیں، ان سے سیاسی سطح پر بات ہو رہی تھی اور یہ سب سندو کی سرپرستی میں ہو رہا تھا۔" نیہا نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

"وہ حملہ، جس میں تم اس سے ملی تھی، وہ کس نے کیا تھا، اس بارے بھی تمہیں پتہ چلا؟" جسپال نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بنیادی طور پر وہ بھی 'را' ہی کا تھا، لیکن سندو کے بندے توڑ کر، وہ اس سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

"اب تم کیا چاہتی ہو؟" جسپال نے پوچھا۔

"سندو اور ان پانچ لڑکوں کی واپسی۔" اس نے سکون سے کہا۔

"دیکھو، زندگی اور موت تو رب کے ہاتھ میں ہے، کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں اور پتہ ہے وہ کہاں ہیں؟"

"مجھے ان کے زندہ ہونے کا پورا یقین ہے، کیونکہ وہ "را" والوں کی کسی فائل میں نہیں۔ "را" والوں نے انہیں پکڑا ضرور ہے لیکن اب وہ کہاں ہیں اس بارے میں کسی کو معلوم نہیں۔ را کے کرتا دھرتا کو بھی نہیں۔" اس نے پورے یقین سے کہا تو جسپال خاموش ہو گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔

"نیہا اب میں سمجھا ہوں کہ تمہارا چہرہ جانا پہچانا کیوں لگا۔ تمہیں فلموں میں دیکھا ہوگا۔ اب فلمی مصروفیت......" جسپال نے پوچھا تو وہ بات قطع کرتے ہوئے بولی۔

"بالکل بھی نہیں، میں ان کے لیے گم ہو چکی ہوں۔ ابھی کچھ فلمیں ادھوری ہیں، لیکن کوئی بات نہیں، وہ ہو جائیں گی اگر سندو مل گیا تو۔" وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولی۔

"فکر نہ کرو، رب بھلی کرے گا، آؤ اب کھانا کھاتے ہیں۔ پھر سوچتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔" جسپال نے کہا تو وہ اٹھ گئی۔



میلے والا میدان سج گیا تھا۔ پچھلے برس میلہ نہیں ہوا تھا، سو اس بار پورے علاقے کے لوگوں میں جوش و خروش عروج پر تھا۔ سب کچھ ویسے ہی ہو رہا تھا، جیسے ہر برس ہوتا تھا۔ چھاکا اور اس کے ساتھی پوری طرح اس میلے کی نگرانی کر رہے تھے۔ علاقے سے بہت سارے منہ زوروں نے اپنے طور پر بھی ذمہ داری لے لی تھی کہ وہ میلے میں کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہونے دیں گے۔ پہلے دن کی شام جب میں وہاں گیا تو میلہ بھرپور تھا۔ میں نے ایک چکر لگایا اور واپس

برگد کے درخت کے پاس آ گیا جہاں پر وہ درویش ملے تھے۔ اس وقت وہ درخت کے پاس نہیں تھے، بلکہ آگ اسی طرح جل رہی تھی اور پرانی سی کیتلی میں چائے اُبل رہی تھی۔ ان کی گدڑی اور دوسری چیزیں ویسے ہی پڑی ہوئی تھیں۔ میں ایک جانب ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے یوں لگا جیسے وہ اچانک درخت کے پیچھے ہی سے نمودار ہوئے ہوں۔ وہ آ کر اپنی گدڑی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''ہاں بھئی نوجوان، تیرا میلہ تو بہت زوروں کا لگا ہے۔ بڑے لوگ آئے ہیں یہاں پر۔''

''میرا میلہ کیا ہے بابا جی، آپ خود ہی رونق لگا کر بیٹھے ہیں۔ ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔'' میں نے عاجزی سے کہا۔

''عاجزی اچھی شے ہے نوجوان، پر بندے کی اپنی انا بھی تو ہونی چاہئے۔ جس طرح بندگی میں خلوص اور ریاکاری ہوتی ہے۔ اس میں ذرا سا اِدھر اُدھر ہو جانے سے بندگی میں عروج آ جاتا ہے یا پھر بندگی ہی سے خارج ہو جاتا ہے، اسی طرح بندگی میں عاجزی بڑی ضروری ہے کیونکہ یہ بندے کی شان ہے اور کبریائی ربّ تعالیٰ کی شان۔ ہم اگر اتنا ہی کہہ دیتے ہیں کہ تو خدا ہے تو میں اس میں کہاں ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو تو خارج کر دیا اگر یہ کہا جائے کہ تُو میرا خدا ہے تو اس میں میرا ہونا ہوا اور عاجزی یہ ہے کہ کہا جائے میں تیرا بندہ ہوں۔ اس میں ''میں'' کا وجود ہوا۔ ربّ تعالیٰ پر یقین کے ساتھ اس پر کامل بھروسہ ہی عاجزی ہے۔ یہ بندہ ہی کرتا ہے۔''

''یہ زندگی اور اس میں بندگی ایک وجود کے ساتھ ہی ہے نا، یہ تو میں نے بات سمجھ لی ہے۔'' میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اور اس وجود میں میں کیا کچھ ہے؟ یہ فطری سی بات ہے کہ ہم اسے عقل کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ عقل بھی تو اسی وجود میں پڑی ہے۔ عقل سے سوچنا بھی تو فطری ہے۔ ایک وہ شے جو اس راستے پر ڈالتی ہے جہاں ہم اشیاء کو دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ یہ فطرت ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے تو تجسس بڑھتا ہے، تجسس ایک راستے پر ڈالتا ہے اور عقل اس کی راہنمائی کرتی ہے، یہاں تک کہ عقل ایک منزل پر آ کر ٹھٹک جاتی ہے کیونکہ عقل سے جہاں حیرت ابھرتی ہے وہاں عقل ایک تماشہ بھی کر لیتی ہے۔''

''وہ تماشے کیا بابا جی؟'' میں نے تجسس سے پوچھا تو وہ ہلکا سا مسکرائے اور بولے

''عقل ہر وقت ایک نیا بُت گھڑنے میں مصروف رہتی ہے۔ یہ ہمارے اردگرد جو بت نئے بت وجود میں آتے ہیں یہ عقل ہی تو گھڑ رہی ہے، اب کسی بت کا ظاہری وجود ہے اور کسی کا ظاہری وجود نہیں۔ عقل بت خانہ سجائے بیٹھی ہے، یہاں تک کہ کوئی ابراہیمؑ آ جاتے ہیں اور وہ بت خانہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اب دیکھو عقل کی منزل کہاں پر ظاہر ہوتی ہے؟ اور عشق اپنی تمام تر جولانیاں کہاں دکھاتا ہے؟ یہاں تک کہ اس حلقہ آفاق میں جو گرما گرمی ہے، یہ کس کے دم سے ہے؟ اسی انسانی وجود سے۔''

''بابا جی جہاں تک میں سمجھ چکا ہوں کہ انسان اپنے ہی خیالات سے بت گری کرتا ہے اور اسی میں ہی بت خانہ ختم ہو جاتا ہے۔'' میں نے بات سمجھتے ہوئے اسے دہرایا۔

''یہ نہیں سمجھو گے کہ عقل کے بت کون سے ہیں، عورت کی خواہش، لالچ، تکبر، حکومت، حسد، یہ سب عقل میں بتوں کی طرح نصب ہو جائیں تو وجود بت خانہ بن جاتا ہے اور بت خانوں میں کیا ہوتا ہے، کیا تم نہیں جانتے ہو؟'' انہوں نے دھیمے انداز میں کہا تو میں سر ہلا کر رہ گیا اور پھر جواب دیتے ہوئے کہا۔

''وہاں تو پھر بت پرستی ہوگی۔''

''ایک دوسری طرح کے بت بھی ہوتے ہیں، وہ نظریات ہیں۔ اپنے طور پر نظریہ گھڑ لیا اور پھر اس پر ڈٹ گئے۔ اب اس سے کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا، یہ ایک الگ سی بحث ہوگی، مگر یہ دیکھو تمام فلسفے اور نظریات بھی تو اسی صورت میں سے ہوتے ہیں، جو انسانی وجود میں ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''ابھی تم نے پوچھا کہ زندگی کے یہ تماشے؟'' یہ کہہ کر

انہوں نے میری طرف دیکھا اور بولے۔ "زندگی کیا ہے؟ پہلے تو یہ سمجھنا ہوگا، زندگی کو تسخیر کرنے کے عمل کو ہی زندگی کہتے ہیں۔"

"زندگی کو تسخیر کیا کیسے جاتا ہے بابا جی؟" میں نے پوچھا تو ہولے سے ہنس دیئے، پھر میری طرف پرشوق نگاہوں سے دیکھ کر بولے

"اپنے آپ کو تسخیر لو۔ زندگی خود بخود تسخیر ہو جائے گی۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے ہو کہ تم خود زندگی کے مظہر ہو، خود زندگی ہو، جو رب تعالیٰ نے تمہیں تفویض کر دی ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کتنی دیر تک وہ اسی کیفیت میں رہے۔ اس دوران میں نے میدان کی جانب دیکھا۔ میلہ اپنے بھرپور انداز میں سجا ہوا تھا۔ وہ میدان جہاں سارا سال اندھیرا چھایا رہتا تھا، اس رات برقی قمقموں سے یوں روشن تھا جیسے دن چڑھا ہو۔ وہ درویش آنکھیں بند کیے پڑے رہے۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی انہوں نے توجہ نہ کی تو میں اٹھا اور واپسی کے لیے چل دیا۔

میں گھر آیا تو اماں کے پاس سوہنی موجود تھی۔ میں ہاتھ منہ دھو کر کھانے کے لیے بیٹھا تو اماں نے کہا۔

"حویلی میں جا کر کھاؤ، تانی کئی بار تمہارا پوچھ چکی ہے۔ آج نجانے کیوں وہ بہت اداس لگ رہی ہے۔ اس کی دل جوئی کرو جا کر۔"

میں چند لمحے اماں کی طرف دیکھتا رہا، پھر سوہنی کی طرف دیکھا، جس کا آدھے سے زیادہ چہرہ آنچل میں چھپا ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی، اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔ میں اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔

تانی اب کافی حد تک ٹھیک ہو گئی تھی۔ وہ اب اپنے سہارے اٹھ بیٹھ جاتی تھی۔ جب سے تانی واپس نور نگر آئی تھی، میں نے اس کی بھرپور نگہداشت کی تھی۔ تانی اسی میں خوش تھی کہ میں اس کے پاس ہوں اور میلے کے انتظامات کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔

تانی ایک کمرے میں مدھم روشنی کیے پڑی تھی۔ میں نے جا کر کمرہ روشن کر دیا تو میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ تانی نے تیزی سے یوں اپنے آنسو پونچھے، جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس نے ایک سیاہ ٹراؤزر پر سفید کرتا پہنا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس بیڈ پر ہی بیٹھ گیا تو وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اسے منع نہیں کیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کس حد تک ٹھیک ہے۔ وہ سکون سے بیٹھ گئی تو میں نے دھیمے سے پوچھا۔

"تانی کیا بات ہے، کیوں رو رہی ہو۔"

میرے یوں پوچھنے پر اس نے میری طرف حیرانگی سے دیکھا اور بولی۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں رو رہی ہوں، یہ تو ایسے ہی آنکھوں میں چبھن ہو رہی ہے۔"

"اچھا تم ایسا کرو، اٹھو، میں تمہیں ایک اچھا سا سوٹ دیتا ہوں، وہ پہنو، ہم میلے میں گھوم کر آتے ہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"سوٹ میں نکال کر پہن لیتی ہوں لیکن میلے میں نہیں جا پاؤں گی، یہ جو فائر لگا ہے اس کا زخم ابھی ٹھیک نہیں ہوا۔ بے احتیاطی کی تو....." اس نے کہا تو میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

"چلو، اٹھو تو سہی، ایک لڑکی دکھائی دو، پھر کھانا کھاتے ہیں اور چین لگاتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ میں کمرے سے باہر آ گیا۔ سارا اپنے بیٹے مراد کے ساتھ اپنے کمرے میں تھی۔ میں نے وہاں موجود ملازم سے کہا کہ وہ ہمارا کھانا چھت پر لگا دے۔

میں ڈرائینگ روم میں ہی تھا کہ تانی آف وائٹ کلر کے سوٹ پہنے وہاں آ گئی۔

"آؤ اوپر چلتے ہیں چھت پر۔ وہیں کھانا کھائیں گے۔"

"مجھ سے شاید سیڑھیاں....." اس نے کہا ہی تھا کہ میں نے اسے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ اس کا چہرہ میرے چہرے کے قریب تھا۔ میں نے دیکھا اس

کے ہونٹوں پر ایک دم سے مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے اپنے بازو میری میری گردن کے گرد حمائل کر دیے۔ میں اسے بازوؤں میں بھر کر سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ وہ مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ملازم نے چارپائی نکال کر بستر لگا دیا تھا۔ چھت پر لا کر میں نے اسے بستر پر بٹھا دیا اور خود سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر میلے کی روداد سنانے لگا۔ وہ سنتی رہی۔ کھانا بھی کھا لیا۔ اس دوران اس کا موڈ خاصا خوشگوار ہو گیا۔ چائے کے مگ دے کر جب ملازم چلا گیا تو میں نے تانی سے پوچھا۔

"سچ بتانا تانی، کیوں افسردہ تھیں تم۔ کسی نے کچھ کہا یا کسی کی کوئی بات بری لگی یا۔"

"نہیں نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے، ایسا سوچنا بھی مت مجھے یہاں سے پیار ہی اتنا ملا ہے کہ میں ساری زندگی کا پیار جمع کر لوں تو بھی اس کے برابر نہیں ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے جمال۔"

"تو پھر تم اداس کیوں ہو؟" میں نے پوچھا تو ایک دم سے مضطرب ہو گئی، اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، پھر بالوں میں انگلیاں پھیر کر زور سے آنکھیں بند کیں اور ایک طویل سانس لے کر بولی۔

"جمال، مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم لوگ مجھ سے نفرت نہ کرو، مجھے خود سے الگ نہ سمجھو۔ پلیز۔"

"یار ایسی کیا بات ہو گئی ہے۔" میں نے اس کا جذباتی پن دیکھ کر پوچھا پھر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا سر سہلایا۔

"جمال، میں مسلمان نہیں بلکہ سکھنی ہوں۔"

اس نے ڈرتے ہوئے کہا تو اس انکشاف پر میں ایک دم چونکا تو ضرور لیکن خود پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر، اس میں اداسی کی وجہ؟"

"جمال، میری ساری زندگی نفرتوں میں گزری ہے، کچھ اپنوں سے، کچھ بیگانوں سے۔ روہی میں مجھے عزت ملی، احترام ملا، مجھے اعتماد ملا۔ اپنے ہونے کا احساس ہوا لیکن محبت نہیں ملی۔ میں جب سے نور نگر آئی ہوں، میں نے اتنا پیار پایا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔ خاص طور پر اماں سے۔ میں سمجھتی ہوں اماں کی ایک ایسی ذات ہے جس نے سب کو پرو کر رکھ دیا ہے۔ آج ہم یہاں ہیں تو یقین جانو اماں کی وجہ سے۔" اس نے بے حد جذباتی لہجے میں کہا۔

"یہ تم کیسے کہہ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں جانتی ہوں کہ سوہنی تم سے بے حد محبت کرتی ہے، اتنی محبت کہ تم بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے ہو۔ اس کی محبت کے سامنے تو مجھے اپنی محبت بہت کم لگتی ہے۔ باپ سے نفرت اپنی جگہ، لیکن پھر بھی وہ تم سے محبت کرتی چلی جا رہی ہے۔ عورت سب کچھ برداشت کر لیتی ہے، لیکن محبت میں شراکت برداشت نہیں کرتی۔ سوہنی یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ میں تم سے شدید محبت کرتی ہوں اور اسی وجہ سے یہاں ہوں، اس نے نہ صرف برداشت کیا، بلکہ تم سے محبت ہونے کے ناتے مجھے پیار اور احترام دیا، ایسا کیوں ہوا، صرف اماں کی وجہ سے۔"

"اماں کی وجہ سے، میں سمجھا نہیں؟" میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

"سوہنی طوائف کی بیٹی تھی، اس نے اس ماحول میں آنکھ کھولی، بچپن سے جوانی تک تربیت حاصل کی مگر کہاں گئی وہ تربیت، وہ ماحول، اماں کے پاس آئی، اس کے پاس رہی اور آج وہ کیا ہے، شاید تم اور میں نہیں سوچ سکتے۔ مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں سکھنی ہوں، لیکن اسے دیکھ کر مجھے لگا کہ پرستش کے لیے کوئی اور طاقت ہے۔"

"مطلب کیسے، تم کھل کر بتاؤ۔" مجھے خود تجسس ہونے لگا تھا۔ وہ مجھے ایک نئی سوہنی سے متعارف کروا رہی تھی۔

"اماں تو عبادت کرتی ہے، لیکن سوہنی دوہری عبادت کر رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"دوہری عبادت۔ کیا مطلب؟"

"مثلاً، اماں نماز پڑھتی ہے، سوہنی بھی پڑھتی ہے۔ جتنا اماں جاگتی ہے، اتنا وہ بھی جاگتی ہے، لیکن سوہنی

اماں کی خدمت کرتی ہے۔ وضو سے لے کر جائے نماز بچھا دینے تک کے چھوٹے چھوٹے کام۔ سونی کے اندر کی طوائف نجانے کب کی مر چکی ہے۔ وہاں تو ایک عبادت گزار بندی موجود ہے۔" اس نے بڑے جذباتی لہجے میں بتایا تو میں چند لمحے خاموش رہا پھر تانی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تانی، میری اماں ہے ہی ایسی۔ سچ پوچھو تو مجھے خود نہیں معلوم کہ میری اماں کیا ہے، بس مجھے تو اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ میری ماں ہے اور میری ساری طاقت اس کی دعا ہے۔ خیر تمہارے بارے میں کبھی تجسس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ کیا تم اپنے بارے میں مجھے بتاؤ گی۔"

"کیوں نہیں، میں تو بتانا چاہتی تھی لیکن نفرت......"

اس نے کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا تو وہ کہتی چلی گئی

"میرا باپ انڈیا، پاس گوجرانوالہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے پادری بننے کی تعلیم حاصل کی اور پھر ایک برطانوی شہریت رکھنے والی پاکستانی نژاد عورت سے شادی کر لی جو میری ماں تھی۔ میں برطانیہ میں پیدا ہوئی تھی اور میری شہریت وہیں کی ہے۔ میرا ایک بھائی ہے جو کبھی پاکستان میں ہوتا ہے اور کبھی برطانیہ۔ وہ بزنس کرتا ہے اور یہاں کی سیاسی برادری میں اس کا بہت اثر رسوخ ہے۔ میں زیادہ عرصہ برطانیہ میں رہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی تھی لیکن مجھے نن بننے کی تعلیم دی جانے لگی تھی۔ مجھے تو پہلے ہی سب پسند نہیں تھا اور پھر سے ایک نوجوان پادری میرے جسم کے حصول میں لگ گیا۔ دراصل مجھے نن نہیں بنایا جا رہا تھا، بلکہ ایک ایجنٹ بنانے کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اسی دوران میرے باپ نے میری ماں کو قتل کر دیا۔ وہ پکڑا نہیں گیا، بلکہ وہاں سے فرار ہو گیا اور پھر اس کے بعد ہم نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پھر کیا ہوتا تھا، ہماری بلکہ میری بدقسمتی کا آغاز ہو گیا۔ مجھے لوٹ کا مال تصور کر لیا گیا۔ سب سے پہلے اس نوجوان پادری نے مجھے اپنی رکھیل بنائے رکھا۔ جب وہ مجھ سے اکتا گیا تو برے کردار کے الزام کے ساتھ مجھے نن تو نہ بننا پڑا، مجھے ایجنٹ بننے کی تربیت دی جانے لگی۔ میری شکل صورت دیکھ کر لوگوں کو ورغلانے کی تربیت دی جانے لگی۔ دوسرے لفظوں میں مجھے تربیت یافتہ طوائف بنا دیا گیا۔" اس نے انتہائی دکھ سے بتایا

"روہی کیسے پہنچی؟"

"مجھے پاکستان میں چھوڑا گیا اور یہاں کے کئی سیاست دانوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کا ٹارگٹ دیا گیا اور میں کرتی رہی۔ میں چند سیاست دانوں کے بارے میں تو پوری تفصیل سے بتا سکتی ہوں۔ کون، کیا ہے؟ اسی دوران مجھے ایک ابھرتے ہوئے سیاست دان کا ٹاسک دیا گیا۔ ظفر سیال تھا نام اس کا، میں اس کے قریب ہوئی لیکن وہ میرے ہتھے نہ چڑھ سکا۔ اس کا کردار بہت مضبوط تھا۔ مجھے اسے قتل کر دینے کا کہا گیا۔ میں نے اسے قتل نہیں کیا بلکہ اسے ساری صورت حال بتا دی۔ وہ روہی کا در پردہ تھا۔ اس نے مجھے وہاں بھیج دیا۔ پھر خدا بخش نے مجھے بہت عزت دی۔ میں نے جو سیکھا تھا سب وہاں سکھا دیا، جیسے تم نے نشانہ بازی کا تحفہ وہاں دیا۔"

"دیکھو، یہ راز تمہارے اور میرے درمیان ہی رہے گا۔ تم کیا تھیں اور کیا ہو، یہ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں یہاں عزت ہی ملے گی۔" میں نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ پھر اسے الگ کر کے آنکھوں ہی آنکھوں میں یقین دلایا۔ وہ ایک دم سے دوبڑی پھر بولی۔

"جمال! کس قدر ذلیل ہوتی ہے یہ عورت جب اسے لوٹ کا مال سمجھ لیا جائے۔"

"لیکن اب نہیں ہو۔ یہاں رہو، ہمارے ساتھ فیملی ممبر بن کر، باقی سب بھول جاؤ۔" میں نے کہا تو اس نے آنسو پونچھ لیے۔ پھر اس کے بعد ہم دیر تک بیٹھے روہی کو

یاد کرتے رہے۔



صبح کا سورج طلوع ہو گیا تھا۔ جسپال بیدار ہوا اور کتنی ہی دیر تک پڑا سوچتا رہا کہ سندیپ اگروال عرف سندو کو کہاں تلاش کرے۔ اسے غائب کرنے والی بھارت کی ریاستی خفیہ تنظیم "را" بھی۔ اسے یہ تو اعتماد تھا کہ یہاں کام کے لیے وہ اکیلا نہیں ہوگا۔ اسے لوگ مل جائیں گے مگر وہ کس سے کیا کام لے؟ اگر یہ معلوم ہوتا کہ سندو کہاں ہے، تب کوئی پلاننگ کی جا سکتی تھی، اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ بھارت میں بھی ہے یا نہیں، یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ زندہ بھی ہے، اسے مار کر اس کا وجود ہی ختم کر دیا گیا ہو۔ وہ پھر جا سے ساری عمر ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے۔ سندو، اسے کہاں ملتا۔ یہ سوچتے ہوئے اچانک اسے خیال آیا، سب کہیں اس کے لیے دھوکا تو نہیں؟ اسے خواہ مخواہ ایک ایسا ٹاسک دے دیا گیا ہے جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ وہ ایک دم سے بے چین ہو گیا۔ اگر جسمیندر نے ایسا کیا تو یہ بہت غلط کیا تھا۔ کیا اسے اب وہ اس کا دوست نہیں رہا اور اسے بڑے آرام سے راستے سے ہٹا دینا چاہتا ہے؟ جسپال کو بھرے ایسے خیال آتے چلے گئے۔ ایک دم سے اسے لگا جیسے وہ اگر یہاں کچھ دیر اور پڑا رہا تو پاگل ہو جائے گا۔ لہٰذا اسے یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔ وہ اٹھا اور کچن کی طرف چل دیا۔ ابھی اس نے چائے کا پانی دھرا ہی تھا کہ گرمیت کسی جن کی طرح آ گیا۔

"او باؤ جی مجھے بتاؤ، میں آپ کو چائے دے کے آتا ہوں۔"

"میں نے کہا تمہیں کیا تکلیف دینی ہے یار۔" جسپال نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"او نہیں باؤ جی، آپ بیٹھ جا کر، میں لاتا ہوں چائے، میڈم تو ابھی دیر سے اٹھے گی، آپ ناشتہ کہو تو وہ بھی بنا دیتا ہوں۔"

"ابھی چائے لے آ۔" یہ کہہ کر جسپال اپنے کمرے کی بالکونی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ باہر کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا کہ گرمیت چائے لے کر آ گیا۔ جسپال نے سپ لے کر کہا۔

"یار چائے تو تم نے اچھی بنائی ہے۔" یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر پوچھا۔

"یار گرمیت تو نے کبھی سندو صاحب کو دیکھا ہے؟"

"کیوں نہیں جی، چھوٹا سا تھا جب میں ان کے پاس آیا تھا، پھر یہیں پلا بڑھا ہوں۔" اس نے تیزی سے بتایا تو وہ ایک دم سے چونکتے ہوئے بولا۔

"دیکھ، تجھے معلوم ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں، تیری میڈم کو تو صرف اتنا معلوم ہے کہ سندو کا کچھ پتہ نہیں، اب انہیں تلاش کرنا ہے، تو مجھے یہ بتا سکتا ہے کہ تجھے کس پر شک ہے؟" جسپال نے پوچھا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو سندو صاحب کو اپنی جان دے کر بھی لے آتا۔" اس نے حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولا۔

"چل تو مجھے یہ بتا کہ سندو کو سب سے زیادہ کس پر اعتماد تھا۔ وہ اپنے اہم مشورے کس سے کرتا تھا۔" جسپال نے پوچھا۔

"ہاں یہ میں بتا سکتا ہوں، یہیں چندی گڑھ کا ہی ایک نوجوان ہے، سندو صاحب جتنی عمر تھی اس کی۔ نام اس کا ہے سردار کلیان سنگھ لیکن سب اسے کول کہتے تھے۔"

"تھے کا کیا مطلب؟" جسپال نے چونک کر پوچھا۔

"بزنس تو وہ پہلے ہی کرتا تھا اب اس کا بزنس بہت بڑھ گیا ہے۔ وہ بڑا آدمی ہے، اب سارے اسے کلیان سنگھ ہی کہتے ہیں۔" گرمیت نے بتایا۔

"یہیں چندی گڑھ میں ہوتا ہے یا......" اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"یہاں ہوتا ہے جی، یہاں کی سیاست میں اس کا بڑا نام ہے، سندو صاحب سے جب دوستی تھی، تب بھی سیاست میں اس کا نام بولتا تھا۔" اس نے تیزی سے بتایا۔

"اچھا، تم کیا سمجھتے ہو کہ سندو کا سب سے بڑا دشمن

کون تھا؟" اس نے پوچھا۔
"کئی سارے تھے، کوئی ایک تھا۔ حکومت کے لوگ اس کے پیچھے تھے، انڈر ورلڈ کے لوگ الگ، کاروباری دشمن الگ، کوئی ایک نام پتہ نہیں ہے۔" گرمیت نے بتایا۔
"اچھا تو ایسا کر، بہترین ناشتہ بنا، میں اتنے میں تیار ہوتا ہوں۔ اس دوران تو نے یہ سوچنا ہے کہ سندو کا سب سے بڑا دشمن کون تھا اور وہ کہاں پایا جا سکتا ہے، بس اتنا یاد کر کے بتا۔" جسپال نے اسے خالی مگ دیتے ہوئے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے پلٹ گیا۔ جسپال نے ایک سرا پکڑ لیا تھا۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ اس کے آخر میں کچھ ملتا بھی ہے یا نہیں۔ اسے تو کوشش کرنا تھی۔ اس نے نجانے کب یہ سنا تھا کہ چوری تلاش کرنی ہو تو پہلے اسی جگہ سے کرو، جہاں چوری ہوئی ہو۔ شاید وہاں سے کوئی نہ کوئی ایسی راہ مل جائے گی اور اگر چوری غائب کرنی ہو تو اس جگہ وہیں سے بھٹکایا جا سکتا ہے۔
وہ تیار ہو کر ناشتہ کر چکا تو اسی دوران جسمیندر کا فون آ گیا۔
"لگتا ہے اچھا خاصا آرام کر لیا ہے تو نے۔"
"تجھے خواب آ گیا، یا ویسے ہی کہہ رہے ہو؟" جسپال نے خوشگوار موڈ میں کہا۔
"یار ہم جس دنیا میں ہیں نا، وہاں لہجے سے نیت پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں، تم نے فون نہیں کیا، میں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ تم آرام کر رہے ہو۔"
"میں نے آرام بھی کر لیا اور خود کو تیار بھی، اب تم بولو۔" جسپال نے کہا۔
"پہلی بات تو یہ ہے کہ نیہا کے اس ٹھکانے کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہئے، اس کے پاس فی الحال کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ تم جس قدر جلدی ہو سکے یہاں سے شفٹ کر جانا، دوسری بات یہ ہے کہ ابھی یہاں سے نکلو تو سکھنا جھیل کے جنوب مغرب میں گرو ساگر صاحب کا گردوارہ ہے۔ وہاں ماتھا ٹیکنے پہنچو، وہیں کچھ لوگ تمہیں مل جائیں گے۔ اگر چاہو تو اسی گردوارے میں رہ سکتے ہو۔"
"مجھے ٹھکانے کی پروا نہیں، بس بندے کام کے دے دینا، باقی رب جانے۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ نیہا ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور باہر نکلتا چلا گیا۔
مرور روڈ سے آگے جا کر اسے کچھ رکشے کھڑے دکھائی دیئے۔ اس نے ایک رکشہ لیا اور گردوارے چل پڑا۔ اس نے گولف کلب کی طرف سے راستہ لیا تھا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ گردوارے کے سامنے تھا۔ ماتھا ٹیکنے کے بعد وہ پلٹ کر صحن میں آیا تو ایک نوجوان لڑکے نے اس کے سامنے آ کر کہا۔
"ست سری اکال، جسپال بائی جی۔"
"ست سری اکال، کیا نام ہے تمہارا۔" جسپال نے پوچھا تو وہ بولا۔
"نام تو جی گرو مہاراج کا ہے جی۔ ہم تو سیوک ہیں جی۔ آپ سیوک سنگھ ہی کہہ لو جی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک طرف اشارہ کیا، جہاں ایک لڑکی کھڑی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "آئیں جی، میں آپ کو اپنی دوست سے ملواؤں۔" یہ کہہ کر وہ اس طرف بڑھ گیا۔ جسپال اس کے پیچھے چلا گیا۔ اس کے پاس پہنچے تو نارنجی رنگ کے شلوار قمیص میں ملبوس لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔
"یہ رونیت کور ہے، سمجھیں میری باس ہے، یہیں چندی گڑھ سے پڑھی ہے۔ باقی آپ اس سے خود پوچھ لیجئے گا۔"
"ست سری اکال جی۔" اس لڑکی نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ جسپال نے اس کے چہرے پر دیکھا، اس کی آنکھیں زیادہ روشن اور باتیں کرنے والی تھیں۔ اس نے بھی فتح بلائی تو دوسری طرف اشارہ کر کے کہا۔
"اگر کہیں بیٹھ کے بات کرنی ہے تو وہاں دالان میں بیٹھتے ہیں، ورنہ کہیں باہر چلتے ہیں۔"
"میرے خیال میں کہیں باہر بیٹھ جاتے ہیں۔" جسپال نے کہا تو سیوک سنگھ باہر کی طرف چل پڑا، وہ

تینوں بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔ گردوارے کے گرد کافی کھلا کان تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر اجنبیت دور کرنے میں لگ گئی۔ تبھی جسپال نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ آپ میری کیسے مدد کریں گے، لیکن ہمیں ایک آدمی تلاش کرنا ہے جس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ زندہ بھی ہے یا پورا ہو گیا ہے۔''

''آپ کے ذہن میں کوئی بات ہے؟'' رونیت کور نے پوچھا۔

''ہاں ہے۔ مجھے ایک ایسے بندے سے اس کی تلاش شروع کرنا ہوگی جس پر مجھے محض شک ہے۔'' جسپال نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''کون ہے وہ؟'' سیوک سنگھ نے پوچھا۔

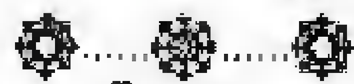
''وہ اس شہر کا مشہور بدمعاش کلیان سنگھ ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلومات چاہئے۔'' جسپال نے کہا تو رونیت کور اور سیوک سنگھ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر رونیت کور بولی۔

''جو بھی معلومات ہوں گی مل جائیں گی۔''

''تو پھر آج ہی سے کام شروع کردیں۔'' جسپال نے کہا تو سیوک بولا۔

''اگر آپ گردوارے میں رہنا چاہتے ہیں تو بات کر لیتا ہوں۔ مسئلہ کوئی نہیں ہوگا۔ لیکن اگر آپ کہیں دوسری جگہ رہنا ہے تو آپ ہمارے ساتھ چلیں، یہ رونیت کور آپ کی میزبان ہوگی۔''

''چلو۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ دونوں اس کے ساتھ چل پڑے۔



وہ میلے کے آخری دن کی دوپہر تھی۔ میں اپنے گھر ہی میں تھا۔ اس تیسرے دن کی شام میرا ارادہ تھا کہ میں میلے میں جاؤں۔ وہ دن تک کسی کی طرف سے کچھ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ لوگ امن اور سکون کے ساتھ میلے سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ اگرچہ عوام کو یہی احساس تھا کہ میلے کی آخری رات ہی رقص وسرود کی محفل سجے گی، لیکن کوئی بھی طوائف وہاں کسی کے ہاں نہیں پہنچی تھی۔ اب اس علاقے میں کوئی ایسا بندہ نہیں رہا تھا کہ ان کی میزبانی کر سکے۔ ممکن تھا کہ اپنے طور پر وہاں کوئی آجائے، اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

شام کا سورج مغرب میں غروب ہونے جا رہا تھا۔ افق پہ نارنجی رنگ پھیل گیا تھا۔ میں گھر سے نکلا اور میلے والے میدان کی جانب نکل گیا۔ میری خواہش تھی کہ میں کچھ دیر درویش کے پاس بیٹھوں گا اور میلے کو دیکھ کر آ جاؤں گا۔ جب تک میں میلے کے میدان میں پہنچا، سورج غروب ہو گیا تھا۔

میں نے کار برگد کے درخت کے پاس روکی۔ وہاں نہ درویش تھا اور نہ ہی اس کی گدڑی۔ درخت کی جڑ میں چند اینٹیں اور راکھ پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے عشق کے بارے میں کسی کی تعریف یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا کہ، بس ٹوٹی ہوئی رسیاں اور تھوڑی سی راکھ، یہی عشق ہے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ یہاں سے کہیں دوسری جگہ کوچ کر گیا ہے۔ میں کچھ دیر یونہی کھڑا رہا۔ جیسے اس کے ہونے کا احساس کر رہا ہوں۔ پھر چھاکے کو فون کیا

''کدھر ہو تم سب لوگ؟''

''اچھا ہوا تمہارا فون آ گیا یار، میں ابھی تمہیں فون کرنے لگا تھا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''خیریت تو ہے نا؟'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''فی الحال تو خیریت ہے۔'' اس نے جواب دیا

''تو پھر بات کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بات یہی ہے کہ ہمیں تو یہ یقین تھا کہ کوئی طوائف وغیرہ نہیں آئے گی، آئے گی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ لیکن یہاں تو کافی ساری لڑکیاں پوری تیاری سے آ گئی ہیں، سینکڑوں لوگوں کا مجمع ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''تو پھر کیا ہوا، ناچنے دیں انہیں۔ آخر کسی کے پاس تو

آ نے ہوں گے نا؟" میں نے سکون سے کہا۔

"ابھی تو پتہ نہیں چل رہا، میں نے معلوم کیا ان منتظمین سے لیکن کسی کو نہیں معلوم، باقی مجھے ان کے ناچنے سے نہیں کوئی تکلیف، میرے خیال میں کوئی شر پیدا نہ ہو جائے۔" اس کے لہجے میں بھی تشویش تھی۔ میں نے چند لمحے سوچ کر کہا۔

"اچھا تم بتاؤ کہاں ہو، میں آتا ہوں۔"

وہ مجھے بتانے لگا۔ میں نے لوکیشن سمجھی اور فون بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اس وقت میں کار کی جانب بڑھا ہی تھا کہ اچانک میری گردن پر پسٹل کی نال آ لگی۔ میں ایک دم سے ٹھٹک گیا۔

"مڑ کر مت دیکھنا، چلو کار میں بیٹھو۔"

خطرے کا الارم بج گیا تھا۔ دشمن نے اچانک وار کر دیا تھا۔ وہ چاہتے تو مجھے اسی وقت گولی مار دیتے لیکن ایسا انہوں نے نہیں کیا تھا۔ بلاشبہ وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ مجھے ایسے ہی موقع کی تربیت تھی۔ میلے سے چھن کر آنے والی دھیمی روشنی سے مکمل اندھیرا نہیں تھا۔ میں نے ایک دم سے جھکائی دی اور پلٹ گیا۔ میرے سامنے ایک اجنبی تھا۔ اس نے فائر کر دیا۔ گولی نجانے کدھر گئی لیکن تب تک ایک اور شخص اس کی مدد کو آ گیا۔ لیکن اس لمحے میں حیران رہ گیا، جب اس نے اس اجنبی کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ اسی وقت نجانے کس طرف سے ایک راکٹ لانچر آیا اور میری کار کے پرخچے اڑ گئے۔ دھماکا بہت زوردار تھا۔ میں نے اس لمحے کو غنیمت جانا اور ایک طرف بھاگ نکلا۔ میں نے محسوس کیا میرے پیچھے کئی سارے لوگ ہیں۔ دھماکے سے وہاں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ اچانک میرے اردگرد فائرنگ ہونے لگی۔ میں ایک دم سے رک گیا۔ میں نے دیکھا میرے اردگرد سات آٹھ لوگ تھے۔ میں کب تک بھاگتا، مجھے ان کا مقابلہ کرنا ہی تھا۔ میں ان کی طرف دیکھنے لگا تو وہ ایک دم سے آہستہ ہو کر میری جانب بڑھنے لگے۔ میرے اردگرد گھیرا تنگ ہوا تو ایک دم وہ رک گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، پھر ایک موٹے سے شخص نے انگریزی میں دہاڑتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارا شکار ہے، اگر تم لوگ اب ذرا بھی آگے بڑھے تو میں......" لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ ایک فائر ہوا تو وہ ڈکارتا ہوا گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ ایک دوسرے پر فائرنگ کرنے لگے۔ کیا وہ ایک دوسرے کے مخالف تھے اور سبھی مجھے پکڑنا چاہتے تھے؟ وہ کون تھے جو مجھے اغوا کرنا چاہتے ہیں؟ اسی دوران میں نے محسوس کیا کہ فضا میں ہیلی کاپٹر موجود ہے۔ وہ یہاں کیوں؟ یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا، میں ایک دم سے بھاگ نکلا تھا، میری کوشش تھی میں چھابے وغیرہ کی طرف چلا جاؤں، مگر مجھے راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اچانک ہیلی کاپٹر کی آواز تیز ہونا شروع ہو گئی۔ میں نے روشنی کی جانب دیکھا، تیز روشنی سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس کے ساتھ ہی تیز روشنی کا ہالہ میرے اردگرد ہو گیا۔ میں جدھر بھی جاتا، وہ ہالہ مجھے گھیرے ہوئے تھا جیسے وہ روشنی مجھ ہی پر فوکس ہو گئی ہو۔ اچانک میرے سامنے ایک بڑا سارا جال آ گیا۔ میں اس سے بچنا چاہتا تھا مگر نہیں بچ سکا۔ میں اس جال میں پھنس گیا۔ اگلے ہی لمحے میں فضا میں اٹھتا چلا گیا۔ میلے اور میلے کی روشنیاں کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ تیز ہوا سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ میں جال میں پھنسا جھول رہا تھا۔ مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ میں کہاں جا رہا ہوں، اور مجھے اغوا کرنے والے کون ہیں؟

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)



پراسرار ہاتھ

ڈاکٹر درخشاں انجم

زندگی میں کچھ واقعات ایسے بھی پیش آتے ہیں عقل جن کی نہ توجیہ پیش کر سکتی ہے اور نہ ہی اسے رد کرتی ہے صرف اسے قدرت کا کرشمہ کہہ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

زیر نظر کہانی بھی ایک ایسے ہی سچے واقعے پر مبنی ہے' عقل جس کی توجیہ پیش کرنے میں ناکام ہے۔

راولپنڈی میں ایک میاں بیوی کو پیش آنے والے پراسرار واقعے کی روداد

اسٹیشن کی حدود سے باہر آتے ہی انہوں نے وہاں کھڑے اکا دکا ٹیکسی والوں کو رکنے کا اشارہ کیا مگر اب کوئی ادھر جانے کو تیار نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویسے بھی ان دنوں شہر کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ دہشت گردی عروج پر تھی لنک روڈ پر صبح ہی تو انہوں نے بم بلاسٹ کی خبریں سنی تھیں۔ پولیس نے جگہ جگہ ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ رات بارہ بجے کے بعد کسی کے شہر کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہزاروں طرح سے جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ جب ہی ان کے گھر والوں نے انہیں رات اسٹیشن ہی کے ویٹنگ روم میں گزارنے کو کہہ دیا تھا ویسے بھی ٹرین چھ گھنٹے کی تاخیر سے پہنچی تھی۔

رات کے تقریباً بارہ بجے کے قریب وہ سب پہنچے تھے۔ انہیں لینے کے لیے آنے والے انتظار کر کے شہر کے حالات کے پیش نظر واپس جا چکے تھے ویسے بھی یہ پنجاب کا علاقہ تھا کراچی کا نہیں جہاں راتیں جاگتی ہیں۔ یہاں تو رات کے دس بجتے ہی سناٹوں کا آغاز ہونے لگتا ہے۔ اس بات پر تو دونوں میاں بیوی میں اکثر بحث چھڑ جایا کرتی تھی۔ وہ بڑی نخوت سے ناک منہ چڑھا کر اپنے شہر کی تعریفیں کرتی جو سر شام ہی بستر پکڑ لیتے ہیں تو دن بھر کی مصروفیت کے بعد سوچ مستی کا وقت ہوتا ہے بقول ان کے تب صبح احمد بھی اٹھتے اور بے بھاؤ کی سنا ڈالتے۔

''ہمیں الوؤں کی طرح رات کو جاگنے کا کوئی شوق نہیں رات کو الو جاگتے ہیں۔''

''ہاں بابا صحیح کہتے ہیں۔'' بچے بھی باپ ہی کی سائیڈ لے لیتے۔ یہ باتیں تو یونہی مذاق میں ہوتیں مگر صبیح اسے سنجیدگی سے لیتے اگر والد صاحب کی طبیعت خراب نہیں ہوتی تو وہ آرام سے ویٹنگ روم میں رات گزار لیتے۔ اتفاق سے ان کی واپسی سے ایک دن پہلے ہی والدہ کی خراب طبیعت کی اطلاع ملی تھی ان کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ پر لگا کر اڑ جاتے وہ اس دن کو کوسنے لگے جب بچوں کے کہنے پر یہاں آئے تھے کہ اس بار گرمیوں کے بجائے سردیوں کی چھٹیاں کراچی میں گزاریں گے گرمیوں میں انہیں یہاں کی گرمی زیادہ پریشان کرتی تھی۔

ایک ہفتے کا عرصہ پلک جھپکتے ہی گزر گیا تھا۔ ابھی تو انہوں نے بہت ساری جگہوں پر جانا تھا۔ صبیح احمد نے اب انہیں اپنا سامان سمیٹنے کو کہا مگر وہ سب تو اتنی جلدی واپس جانے سے فکر مند ہو رہے تھے بکنگ ہو چکی تھی ایسے میں گھر سے بھائی صاحب کا فون آ گیا کہ ماں جی کو فالج کا اٹیک ہوا ہے وہ ابھی تک قومے میں ہیں۔ وہ تو اسی وقت سے واپسی کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگے مگر کراچی سے پنڈی تک کا سفر

بغیر سیٹوں کے وہ بھی خاتون کے ہمراہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اگلے دن تو انہیں روانہ ہونا ہی تھا ان کے سالے طلحہ نے انہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی مگر ان کا دل کسی طور مان نہیں رہا تھا۔

"تو پھر ایسا کریں آپ دونوں دو تین گھنٹے کے اندر اندر تیار ہو جائیں تیز گام بے شام کے پانچ بجے روانہ ہو جائیں قلی یا گارڈز سے کانٹیکٹ کر کے کوئی ایک آدھ سیٹ مل ہی جائے گی میں پیچھے سے بچوں کو لے کر پہنچتا ہوں۔" طلحہ کی بات انہیں معقول لگی۔ جیسے تیسے جلدی جلدی تیار ہو کر اسٹیشن پہنچے گاڑی روانگی کے لیے بالکل تیار تھی ان لوگوں کو ٹرین پر بٹھا کر طلحہ نے ایک آدھ سیٹ کا بندوبست کروا ہی دیا۔ شاید کسی کا پروگرام کینسل ہو گیا تھا وہ اب تک پہنچا نہیں تھا قلی سے وہ سیٹ لے لی یوں کام آسان ہو گیا۔

ٹرین میں بیٹھ کر انہوں نے بھائی کو فون کر کے اطلاع دے دی تھی لیکن انہوں نے کہا کہ اگر ٹرین لیٹ ہو جائے تو تم لوگ اسٹیشن پر ہی رک جانا شہر کے حالات صحیح نہیں ہیں خوامخواہ کی خواری اٹھانے سے بھی بہتر ہوگا۔ اسی وجہ سے وہ بہت دیر تک ٹرین سے اتر کر سوچتے رہے تھے کہ کیا کرنا چاہیے۔ ورنہ وہ تو ٹھہرنا چاہتی تھی مگر یہ نہیں سکتی تھی کہ اگر خدانخواستہ ماں جی کو اتنی دیر میں کچھ ہو گیا تو سمیع تو ساری زندگی انہیں طعنے دیتے رہیں گے۔ ادھر ان کے فیصلہ کرتے کرتے پلیٹ فارم تقریباً خالی ہو چکا تھا وہ جے بھی پیرودھائی کی دوسری سائیڈ پر تھے جہاں سے اسلام آباد کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ ادھر کوئی ٹیکسی والا جانے کو تیار نہیں ہو رہا تھا۔ تب ہی کافی دیر کے بعد ایک ٹیکسی والے نے قریب آتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر ٹیکسی والے کی شکل دیکھ کر انہیں کچھ خوف سا محسوس ہوا پتا نہیں اس روپ میں کوئی چور اچکا ہی نہ ہو عورت کا ساتھ ہے سمیع احمد نے اشارے سے انکار کر دیا۔

"چلو ہم لوگ یہاں سے ٹرانزٹ کیمپ تک چلتے ہیں دو قدم کا تو فاصلہ ہے وہاں سے کوئی معقول سواری مل ہی جائے گی۔" انہوں نے وردہ سے کہا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نکلنے لگے اکا دکا پرائیویٹ گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ابھی وہ سب چوک کراس کر کے ہوٹل کے سامنے جا کر کھڑے ہونے والے تھے کہ ایک سرخ شیورلیٹ ان کے یک دم ساتھ آ کر رکی۔

"کہاں جانا ہے آپ کو۔" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی خاتون نے سر باہر نکال کر پوچھا۔

یہ خواتین شاید کسی تقریب سے واپس آ رہی تھیں کیونکہ ان کے بناؤ سنگھار سے یہی اندازہ ہو رہا تھا۔

"جی ہمیں دراصل پیرودھائی کی طرف جانا ہے ادھر کی کوئی گاڑی نہیں مل رہی ہے۔" دونوں نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"ہمیں بھی ادھر ہی جانا ہے۔" اس کے دوستانہ انداز پر انہیں کچھ حوصلہ ہوا۔

"آپ چاہیں تو ہم پر اعتماد کر سکتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور انہیں مطمئن دیکھ کر بیک ڈور کھول دیا۔ وہ دو تھیں شاید سہیلیاں تھیں دونوں کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ چوک سے رائٹ ٹرن لیتی ہوئی گاڑی جب پشاور روڈ پر پہنچی تب وہ اور مطمئن ہو گئے کیونکہ یہ راستہ پیرودھائی کو جاتا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ گاڑی چل نہیں رہی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ ہوا میں اڑ رہی ہو اور وہ دونوں بالکل کسی ڈمی کی طرح خاموش تھیں۔ گاڑی سیدھے راستے پر چلنے کے بجائے جب اندھیرے ویران میدانوں کی طرف مڑی تب عجیب سا خوف محسوس ہوا۔

"آپ غلط راستے پر جا رہی ہیں ادھر جانا ہے نہیں۔" انہوں نے زور سے کہا۔ مگر یہ کیا ان پر تو جیسے کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔

"دیکھیں ٹھہریں یہ ہمارا راستہ نہیں ہے۔ آپ

"اگر آگے نہیں جانا چاہتیں تو گاڑی یہیں روک دیں۔" ایک بار پھر وہ چلائے اور وردہ تو جیسے تھر تھر کانپنے لگیں۔ انہوں نے پھر چیخنا چاہا تب اس نے مڑ کر دیکھا۔

یہ......وہ......وہ تو نہیں تھی جس نے انہیں گاڑی میں بیٹھنے کو کہا اتنا خوفناک اور مکروہ چہرہ تھا۔ سرخ انگارے کی طرح آنکھوں والا وردہ تو جیسے بے ہوش ہونے والی ہو گئیں اور سمیع احمد ان کے تو کاٹو تو لہو نہیں۔ انہیں اس طرح خوفزدہ دیکھ کر وہ دونوں قہقہے لگانے لگیں...... چاروں طرف خوفناک اندھیرا، ہو کا عالم پر اسرار جنگل کا ماحول کوئی کمزور دل والا ہوتا تو شاید ایسے میں اس کا دل بند ہو چکا ہوتا مگر سمیع احمد ذرا مختلف قسم کے آدمی تھے۔ ان کے باپ دادا اکثر ایسے ویرانوں میں بھٹکی ہوئی روحوں کے قصے سنایا کرتے تھے اب انہیں پتا چلا تھا کہ وہ سب بد روحوں کے نرغے میں گھر چکے ہیں۔ کاش انہوں نے گھر والوں کی بات مان لی ہوتی اور رات اسٹیشن پر ہی گزار لیتے یا پھر اس آخری ٹیکسی والے کی ٹیکسی میں ہی بیٹھ جاتے۔ اب انہیں پچھتاوا ہو رہا تھا لیکن اب تو سوچنے اور پچھتانے کا وقت بھی نہیں تھا اب انہیں یاد آیا کہ قرآنی سورتیں اور آیۃ الکرسی پڑھنی چاہیے۔

ٹھیک دو بجے طلحہ کا فون سمیع احمد کے موبائل آیا جبکہ وہ ابھی اسپتال سے آ کر سونے جا ہی رہے تھے۔ موبائل آن کیا تو طلحہ کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"آپا اور سمیع بھائی گھر پہنچے کہ نہیں؟"

"نہیں تو میں نے انہیں منع کر دیا تھا کہ وہ رات وہیں ٹھہر جائیں اتنی رات کو اتنی دور آنا اچھا نہیں جبکہ حالات بھی خراب جا رہے ہیں جگہ جگہ پولیس پھر رہی ہے ہر آئے گئے کی چیکنگ کی جا رہی ہے۔" انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"لیکن...... میں تو انہیں تقریباً ایک گھنٹے سے کال کر رہا ہوں لیکن کال ریسیو ہی نہیں کر رہے ہیں۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔" طلحہ کا لہجہ اس کی دلی کیفیت کی عکاسی کر رہا تھا۔

"ٹھہرو...... میں دیکھتا ہوں ملاتا ہوں اس کا نمبر"

وہ ساری رات نمبرز ملاتے اور رابطہ کرتے رہے مگر رابطہ ممکن نہ ہو سکا۔ ساری رات ان دونوں کے گھر والے پریشانی میں کبھی اسٹیشن ماسٹر کو فون کر رہے تھے کبھی انکوائری آفس کا نمبر ملا رہے تھے۔

گاڑی فراٹے بھرتے ہوئے آگے چلی جا رہی تھی۔ وہ دونوں مسلسل آیۃ الکرسی کا ورد کیے جا رہے تھے۔

ہاہاہا، کی خوفناک آوازیں ان کی سماعتوں کو پھاڑے جا رہی تھیں۔ دادا جان کہا کرتے تھے کہ ان بد روحوں سے ڈرنا نہیں چاہیے ورنہ ذرا سی کمزوری پا کر یہ انسان کے اعصاب پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ ہر ممکن ان پر غالب آنے کی کوشش کرنی چاہیے ہم اشرف المخلوقات ہیں انہیں ہم سے ڈرنا ہے ہمیں ان سے نہیں۔ آج وہ ان ساری باتوں کو یاد کر کے حوصلوں کو بلند کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ وردہ کی تو آواز ہی نہیں نکل رہی تھی اسے بھی آیتہ الکرسی دہراتے رہے تھے اور پڑھتے بھی جا رہے تھے۔

تب انہیں محسوس ہوا کہ ڈرائیونگ کی رفتار میں کمی آنے لگی تھی۔ اسٹیرنگ پر جمے ہاتھ تھرتھرانے لگے اب ہاہاہا کے بجائے عجیب دم گھٹنے کی آوازیں ان کے منہ سے نکل رہی تھیں۔ جیسے کوئی ان دونوں کا گلا دبوچ رہا ہو۔ عجیب گھٹی گھٹی سی آواز کے ساتھ باہر ایک شعلہ سا بلند ہوا۔ جس کی روشنی میں دو ستون کی مانند ٹانگیں نظر آئیں پھر گاڑی کے زوردار دھماکے کے ساتھ کھائی میں گرنے سے پہلے دو بہت بڑے فولادی ہاتھوں نے انہیں اس طرح سے اندر کھینچ لیا جیسے وہ کوئی کھلونا ہوں پھر انہیں کچھ بھی یاد نہیں رہا۔

صبح تک گھر جیسے ماتم کدہ بن گیا تھا۔ ایک طرف اماں آخری سانسیں گن رہی تھیں دوسری طرف وردہ اور صبیح کا کوئی پتا نہیں چل رہا تھا۔ فصیح احمد تو پہلے ہی دل کے مریض تھے اب ماں کی بیماری اور بھائی بھاوج کی اچانک پر اسرار گمشدگی نے ان کے اوسان خطا کر ڈالے۔ راحیلہ کی ایک ٹانگ گھر میں تھی تو ایک اسپتال میں۔ تھے تو ملنے جلنے والے دور کے رشتہ دار لیکن جو اپنوں کی بات ہوتی ہے وہ اوروں میں کہاں وہ تو بن کہے ایسے وقتوں میں سب ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ جیسے فصیح احمد ماں کے ساتھ بھائی بھاوج کے لیے ماہی بے آب کی تڑپ تڑپ خود بستر پر جا پڑے تھے۔ اب انہیں اپنوں کی اہمیت کا احساس ہوا تھا ان کے تو میکے میں کوئی تھا نہیں والدین کسی حادثے میں جاں بحق ہوگئے تھے چچا چچی نے پال پوس کر بڑا کیا ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ شادی بیاہ کر کرا کر وہ سب یکے بعد دیگرے اپنی فارغ ہوگئے۔ راحیلہ کے سسرال میں بھی کم ہی پھیلی تھی ایک نند ایک دیور نند تو شادی شدہ تھی سال چھ مہینے میں چکر لگا لیا کرتی بس ساس سسر ہی حیات تھے۔ دیور کی شادی کراچی میں اس کے کسی دوست کی بہن سے ہوئی تھی اس کا دوست ان کے ساتھ اتالیک ایجنسی میں کام کرتا تھا۔

وردہ جب کراچی اپنے میکے جاتی تو وہ بڑا سکون محسوس کرتی تھی کہ کبھی کبھی تو اپنی مرضی کرسکیں ورنہ وہی بچے شور شرابے، ہنگامے، دونوں گھروں کے بچے جوں جوں بڑے ہوتے جارہے تھے گنجائشیں بھی تنگ پڑتی جارہی تھیں دونوں کو اپنے اپنے شوہروں کو اس بات کا احساس دلاتی رہتی تھیں مگر کیا مجال کہ ان پر کوئی اثر ہوتا عورتوں میں کبھی کبھار چخ چخ بھی ہوجایا کرتی مگر آج جب اماں بیمار تھیں ان لوگوں کا ابھی تک کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ صبیح بھی بیمار پڑ گئے تھے تب انہیں اپنوں کی اہمیت کا احساس ہوا تھا۔ کاش اس گھر میں کچھ اور افراد ہوتے تو اس اکیلی جان پر اتنا بوجھ نہ پڑتا۔

صبیح کو جب ہوش آیا تو پہلے پہل تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کہاں ہیں بہت دیر تک ذہن پر زور دیتے رہے پھر ذہن اچانک ایک کوندا سا لپکا اور سب کچھ یکدم سے یاد آگیا لیکن میں اس وقت ہوں کہاں؟ انہوں نے چاروں طرف دیکھا وہ ایک بڑے سے آراستہ کمرے میں ایک شاندار سی مسہری پر پڑے تھے ساتھ ہی دوسری مسہری پر وردہ پڑی تھی ہوش وحواس سے بے گانہ وردہ...... وردہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور اسے جھنجوڑنے لگے۔

"انہیں آرام کرنے دیں یہ دوائی کے زیر اثر سو رہی ہیں۔" کسی نے ان کے قریب آکر کہا تو چونک کر اس کی طرف دیکھا یہ تو وہی ٹیکسی والا تھا جو انہیں آخری وقت آنے کو کہہ رہا تھا حیرت کا جھٹکا انہیں لگا۔

"ہمیں یہاں کون لایا ہے۔" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"اور انہیں کیا ہوگیا ہے؟" انہیں وردہ کو اس طرح بے سدھ پڑا دیکھ کر پریشانی ہورہی تھی۔

"میں آپ لوگوں کو یہاں لے کر آیا ہوں۔ آپ لوگ خوف سے بے ہوش ہوگئے تھے۔" کچھ اور کہتے کہتے وہ رک سا گیا۔

"اس وقت میں آپ لوگوں کو لے کر اسپتال گیا تھا ڈاکٹر نے آپ لوگوں کی بے ہوشی کو کسی گہرے خوف کا اثر بتایا اور ادویات دے کر فارغ کردیا کہ صبح تک سب ٹھیک ہوجائے گا۔" وہ کہتا جارہا تھا اور رات کے واقعات ان کے ذہن کے پردے پر کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔ "چلیں میں آپ لوگوں کو آپ کے گھر تک چھوڑ آؤں۔" اس نے وردہ کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا جواب جاگنے کو کسمسا رہی تھیں۔

گھر کے سامنے پہنچتے ہی انہیں لوگوں کا ایک ہجوم نظر آیا پاس شامیانے کے اندر سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ سمجھ گئے کہ ماں جی گزر گئیں۔ انہیں گاڑی سے اترتے دیکھ کر تمام حیرت کے عالم میں سب کچھ بھول کر ان کی طرف بڑھے فصیح پر تو جیسے شادی مرگ طاری ہو گئی تھی لیکن سامنے ماں کا جنازہ بھی پڑا تھا کئی دن یونہی سوئم چہلم کو بھگتاتے گزر گئے۔ بس سب کو مطمئن کرنے کے لیے اتنا بتا دیا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا۔ پھر اطمینان سے ایک دن جب اکٹھے بیٹھے تو فصیح احمد نے سارا احوال پوچھا اور صبیح احمد نے من وعن ساری روداد سنا دی۔ اب انہیں پتا چلا کہ وردہ اتنی سہمی سہمی سی کیوں ہے۔

"چلو تمہارے اس میزبان کا شکریہ تو ادا کریں ہم تو بے چارے کو اس دن ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں سکے۔ شکریہ ادا کرنا تو درکنار۔" انہوں نے بھائی سے کہا۔

"اور پھر تمہارے علاج کے سلسلے میں جو اخراجات وغیرہ آئے ہوں گے وہ بھی تو ادا کرنا ہے۔"

"کیا خرچ آئے ہوں گے ایک رات کی تو بات تھی۔" انہوں نے بے پروائی سے کہا۔

"جی نہیں پورے تین دن تم ان کی نگہداشت میں رہے تھے۔" بھائی کے سنجیدہ لہجے پر وہ تو حیرت سے گنگ ہو گئے۔

"کیا واقعی ہم نے تین دن کسی اجنبی کے ساتھ گزارے وہ تو شکر ہے وردہ یہاں نہیں تھی ورنہ وہ تو اور بھی خوفزدہ ہو جاتی۔ انہوں نے ارد گرد نظر دوڑائی۔

"لیکن اس نے تو کہا تھا کہ مجھے اس صبح ہی اسپتال سے فارغ کر دیا گیا کیونکہ مجھے کوئی چوٹ

مسکرائیے

○ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کب ہوتا ہے؟

☆ جب گوالے کی بھینس زیادہ پانی پی لے۔

○ تارے گننے کا آسان طریقہ؟

☆ آنکھیں بند کرلیں۔

○ اگر بلاوجہ دل اداس ہو؟

☆ کسی گرلز کالج کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔ کسی لڑکی کا بھائی یا رشتے دار آپ کی ساری اداسی دور کردے گا۔ کیا سمجھے؟

○ گدھے کے سر سے سینگ کیسے غائب ہوئے تھے؟

☆ گھوڑے کے مقابلے میں الیکشن لڑنے کی پاداش میں۔

○ ڈاکو اور فنکار میں کیا فرق ہے؟

ڈاکو کے ہاتھ میں کلاشنکوف ہوتی ہے جبکہ فنکار کے ہاتھ میں جعلی ادویات کا تھیلا (یہاں فنکار سے مراد اداکار یا گلوکار نہیں)

ریاض بٹ ...... حسن ابدال

وغیرہ نہیں آئی تھی صرف خوف سے غشی طاری ہوئی تھی۔" انہوں نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے ان کے گھر آ کر تم دواؤں کے زیر اثر رہے اور تمہیں یاد نہ ہو۔" فصیح احمد نے موضوع کو ختم کرنا چاہا مگر صبیح اس گتھی کو حل کر لینا چاہتے تھے۔

"بھائی میری تو جیسے ہی آنکھ کھلی میں نے پاس سوئی ہوئی وردہ کو اٹھانا چاہا تو اس نے منع کر دیا کہ وہ ابھی غنودگی میں ہے تھوڑی دیر کے بعد خود اٹھ جائے گی۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ ناشتہ وغیرہ کی اس وقت تک وردہ بیدار ہو چکی تھی۔ اجنبی نے ناشتے پر ہمیں روکنا چاہا مگر مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ تب وہ خود اپنی گاڑی پر یہاں چھوڑ گیا۔"

”بس اب یہی کرنا ہے کہ کسی دن جا کر ہم اس اجنبی کا شکریہ بھی ادا کرلیں اور اسپتال وغیرہ کا جو خرچہ ہے اسے دے آئیں۔“ فصیح احمد کی بات تو معقول تھی مگر غلطی تو صبیح سے ہی ہوئی تھی کہ اس نے اس کا ایڈریس ہی نہیں لیا تھا۔ اگر اسپتال کا بھی پتا ہوتا تو مطلوبہ ڈیٹ کی انٹری فائل سے اس کا پتا شاید مل ہی جاتا۔ مگر یہ تو معمہ ہی بن گیا تھا۔ وہ بہت دنوں تک اس علاقے کے مختلف اسپتال میں پتا کرتے رہے مگر بے سود اس ضمن میں انہوں نے کچھ جاننے والوں کو بھی کہہ رکھا تھا اب جبکہ وہ سب نا امید ہو کر اپنی تلاش کا سلسلہ موقوف کرنے ہی والے تھے کہ کسی نے انہیں ترنال کے قریب ایک نئی قسم کے شفا خانہ کے بارے میں بتایا کہ یہاں یکم جنوری کی صبح تین بجے دو مریض لائے گئے وہ دونوں میاں بیوی تھے اور خوف سے بے ہوش تھے شوہر کو تو دوسرے دن فارغ کر دیا گیا تھا جبکہ خاتون دو روز تک بے ہوش رہیں انہیں دو دن کے بعد ان کے میزبان اپنے گھر لے گئے تھے۔“ دونوں بھائی بھاگم بھاگ وہاں پہنچے ڈیوٹی ڈاکٹرز نے تو انہیں فوراً ہی پہچان لیا۔

”اور سنائیں مسٹر صبیح کیا حال ہیں اب آپ کا آپ کے میزبان نے شاید آپ کا شناختی کارڈ دیکھ کر یہی نام لکھوایا تھا۔“ انہیں اس طرح چونکتے دیکھ کر ڈاکٹر نے ان کی مشکل آسان کر دی وہ تو بالکل بھی یہاں کسی کو پہچان نہیں پائے اس وقت وہ ہوش میں تھے ہی کب البتہ اس رات ڈیوٹی پر موجود سارا عملہ انہیں پہچان چکا تھا۔

”اور سنائیں آپ کی مسز کیسی ہیں؟“ ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ دریافت کیا۔

”ٹھیک ہے وہ بھی مگر اب تک ان کے خوف میں خاطر خواہ کمی نہیں آئی ہے۔“ صبیح نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”دراصل اس میزبان کا اتا پتا کرنے آئے ہیں جو ہمیں یہاں لے کر آئے تھے ان کا شکریہ بھی ادا کرنا تھا اور جو کچھ انہوں نے خرچہ کیا تھا وہ بھی انہیں ادا کرنا تھا۔“ فصیح احمد نے اپنا مقصد واضح کیا۔

”اوہ، میں نے کبھی اس سے پہلے انہیں نہیں دیکھا تھا ایسا اکثر ہی ہوتا ہے اس دنیا میں جہاں برے لوگ بستے ہیں اچھے لوگوں کی بھی کمی نہیں اور میں داد دوں گا ان کی انہوں نے سب کچھ اپنی جیب سے کرنے کے علاوہ ساری رات جاگ کر آپ کا خیال بھی رکھا۔ یہ ہے ان کا ایڈریس انہوں نے فائل سے ان کا نام پتا لکھ کر ان کے حوالے کیا۔

”دونوں بھائی آج ہی اس مسئلے کو نمٹا دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے جلدی سے مطلوبہ مقام کی طرف گاڑی موڑ دی اللہ جانے کس کونے میں ہے یہ جگہ وہ سب ایڈریس ہاتھوں میں لیے چلتے جا رہے تھے مگر یہ کیا یہاں تو کوئی آبادی ہی نہیں تھی یہ کوئی جھیل کا کنارا تھا جہاں دور دراز تک درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ جھیل کا پانی شام کے سرمئی اندھیرے میں چاندنی کی طرف چمک رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ایڈریس لیے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور اسی لمحے صبیح کو وہ ٹیکسی ڈرائیور اور پھر دو مضبوط ہاتھ یاد آ گئے جنہوں نے گاڑی کے تباہ ہونے سے پہلے کسی کھلونے کی طرح انہیں اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا تھا۔ چلیں کافی دیر کے بعد انہوں نے بھائی کو کہا جو کسی حد تک صورت حال کو سمجھ چکے تھے۔

”ہاں چلو......!“ وہ اب خود بھی اس پر اسرار ماحول سے نکل جانا چاہتے تھے۔

رانگ نمبر

خلیل جبار

سائنس کی ترقی نے جہاں انسان کو سہولیات بہم پہنچائی ہیں وہیں نت نئی ایجادات نے اسے راہ راست سے بھٹکنے کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔ خاص طور پر گھٹن زدہ ماحول میں زندگی بسر کرنے والی ہماری خواتین جو ذرا سی روزن کو آزادی کا راستہ سمجھ کر بھٹک جاتی ہیں۔
اک لڑکی کا فسانہ عجب' وہ بلا سوچے سمجھے گھر سے نکل آئی تھی

میں ابھی ابھی بس لے کر سہراب گوٹھ پہنچا تھا' آج بس میں سواریاں بہت کم تھیں' ہفتے میں چند دن ایسے ہوتے ہیں جس میں سواریاں کم ہوتی ہیں لیکن سواری کم ہو یا زیادہ' بس کا پہیہ چلتا رہنے سے روزی آتی ہے اور پہیہ رک جانے پر روزی بھی رک جاتی ہے۔

میں پانچ سال سے ڈرائیوری کے پیشے سے وابستہ ہوں اس سے قبل کنڈیکٹری کرتا تھا' کنڈیکٹری کے دوران ہی ڈرائیونگ سیکھی تھی اب میرا شمار اچھے ڈرائیوروں میں ہوتا ہے۔ میرے استاد وقاص احمد نے مجھے ڈرائیونگ سکھاتے ہوئے چند گر بتائے تھے جن پر سختی سے عمل کرتا ہوں۔ بس چلاتے ہوئے میری نظر پہلے سامنے رہتی ہے' اوور ٹیک کرنے سے پہلے دائیں بائیں کے شیشوں پر ضرور نظر مار لیتا ہوں' بس کو اوور ٹیک اس طرح کرتا ہوں کہ بس مسافر سمیت اچھل نہ سکے کیونکہ اوور ٹیک کرتے ہوئے بس سلپ یا مسافر اپنی سیٹوں سے اچھل پڑیں تو یہ ڈرائیور کا اناڑی پن ہوتا ہے۔

موبائل کی بیل بجنے پر میں نے اسکرین دیکھی نغمہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ نغمہ سے میری دوستی موبائل پر ہی ہوئی تھی' یہ اتفاق تھا کہ میں اس دن چھٹی پر تھا' گھر میں آرام کر رہا تھا کہ موبائل پر کال آئی' نمبر نیا تھا پھر بھی میں نے کال اوکے کر دی۔

"ہیلو۔" میں نے کہا۔

"جی مجھے رشیدہ سے بات کرنی ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"یہ نمبر کسی رشیدہ خاتون کا نہیں ہے اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ہمارے پورے محلے میں رشیدہ نام کی کوئی خاتون نہیں رہتی۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ارے آپ ناراض ہو گئے۔" وہ بولی۔

"میں بھلا ناراض کیوں ہوں گا' میں نے صرف تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے کہا ہے۔"

"لگتا ہے رانگ نمبر لگ گیا ہے۔"

"ہاں جبھی تمہیں میری آواز سنائی دے رہی ہے' بہت برا لگ رہا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب ایسی بری آواز بھی نہیں کہ برا لگے۔"

"پھر کیا خیال ہے میں باقاعدہ گلوکاری شروع کر دوں۔"

"ارے ایسا غضب نہ کرنا' میں نے ایسے ہی تمہارا دل رکھنے کو کہہ دیا تھا۔" وہ بولی۔

"ابھی میری آواز کی تعریف کر رہی تھیں اور اب گلوکاری کرنے کو منع کر رہی ہو۔"

"ضروری نہیں کہ ہر شخص گلوکار بننے کی صلاحیت رکھتا ہو' ناکام ہونے پر خوامخواہ دل برداشتہ ہو کر مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دو گے اس لیے سمجھا رہی ہوں آگے تمہاری مرضی ہے۔" وہ بولی۔

"سمجھانے کا شکریہ ویسے میں مذاق کر رہا تھا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ بڑے دلچسپ ہیں۔"
"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے کہا۔
"باتوں سے۔"
"اچھا میری باتوں سے اندازہ ہوا ہے ویسے بتادوں کہ میں باتیں ہی اچھی نہیں کرتا بلکہ ڈرائیونگ بھی اچھی کرلیتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"کون سی گاڑی ڈرائیو کرتے ہیں؟"
"کراچی اور حیدرآباد کے درمیان چلنے والی بس میں ڈرائیونگ کرتا ہوں آج اتفاق سے چھٹی پر ہوں۔"
"آدمی کا برسر روزگار ہونا ضروری ہے ورنہ بڑے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔"
"ہاں پیسہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے پیسے سے سارے مسائل حل ہوجاتے ہیں، روزگار نہ ہونے پر پیسہ دور بھاگتا ہے اور مسائل کم ہونے کی بجائے بڑھتے ہیں۔" میں نے کہا۔
نغمہ سے اس دن موبائل پر بات کیا ہوئی پھر باقاعدگی سے اس کے فون آنا شروع ہوگئے۔ ابتدا میں ہماری باتیں مختصر ہوتی تھیں پھر بات چیت میں مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہونے سے طویل گفتگو ہونے لگی تھی۔ نغمہ کے والدین کا انتقال ہوچکا تھا، وہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھی اس کی بھابی سے بنتی نہیں تھی، اس لیے زیادہ تر وہ اپنے کمرے تک ہی محدود رہتی تھی جب اس کا دل گھبراتا تھا وہ اپنی سہیلیوں کو فون کرکے بلالیا کرتی تھی یا ان کے پاس ملاقات کرنے چلی جاتی تھی۔ مجھ سے بھی ملاقات کرنے کی غرض سے کئی بار تاج کمپلکس بس ٹرمینل آچکی تھی، میں اسے بس میں بٹھا کر سہراب گوٹھ تک لے آتا تھا اور پھر وہاں سے اسے اس کے گھر جانے والی بس میں بٹھا کر روانہ کرکے خود حیدرآباد کے لیے روانہ ہوجاتا۔ نغمہ شکل وصورت کی اچھی تھی اس لیے مجھے پسند آگئی تھی چنانچہ ہم دونوں میں اکٹھے زندگی گزارنے کے عہدو پیماں ہوچکے تھے۔
اس کے بھائی اور بھابی کو اس کی شادی کی بالکل بھی فکر نہ تھی جیسے جیسے نغمہ کی عمر بڑھ رہی تھی وہ نفسیاتی الجھن کا شکار ہوتی جارہی تھی اور مجھے نغمہ سے شادی کرکے ان الجھنوں سے آزاد کرانا تھا۔ میں نے جیسے ہی کال اوکے کی اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔
"کیا بات ہے میری کال اوکے کرنے میں اتنی دیر کیا مجھ سے اتنی جلدی اکتا گئے ہو۔"
"ارے بھئی ایسی بات نہیں ہے جیب سے موبائل نکالنے میں کچھ وقت لگتا ہے اس لیے ناراض نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔
"کال اوکے نہ کرنے پر میں حقیقتاً ناراض ہوجاتی۔" وہ غصے سے بولی۔
"کیا بات ہے غصہ ناک پر ہر وقت کیوں دھرا رہتا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"تمہیں سب پتا ہے مجھے غصہ کیوں آتا ہے۔"
"ہاں بھئی مجھے پتا ہے جب تمہارے بھائی بھابی نظر انداز کرتے ہیں ایسے میں تمہیں بہت غصہ آجاتا ہے کیا آج پھر کوئی بات ہوگئی ہے۔"
"بات کب نہیں ہوتی میرے بھائی کو میرا ذرا بھی خیال نہیں اور انہیں کیوں خیال آئے گا ان کا گھر بس گیا ہے مصیبت میری ہے کوئی میرے لیے سوچنے والا نہیں ہے۔"
"ایسی بات تم کیوں سوچتی ہو میں ہوں نا تمہارے لیے فکر مند ہونے والا، گھبراؤ نہیں ہم بہت جلد شادی کرکے ایک ہوجائیں گے۔"
"نا جانے وہ دن کب آئے گا۔" وہ بولی۔
"ضرور آئے گا تم بالکل فکر مند نہ ہو اچھا میں تم سے تھوڑی دیر میں بات کروں گا۔" میں نے کہا۔
"کیوں ابھی بات کیوں نہیں ہوسکتی؟"
"میری بس سہراب گوٹھ پہنچ چکی ہے اور اگلا اسٹاپ لاسف اسکوائر ہوگا جیسے ہی بس ٹول پلازہ سے نکلے گی میں تم سے بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"دیکھو ضرور بات کرلینا۔"

"ہاں ہاں میں بات کرلوں گا۔" میں نے اسے یقین دہانی کراتے ہوئے کال کاٹ دی۔

"بھائی ڈرائیور! یہ بس کب چلے گی؟ دو گھنٹے سے زیادہ ہوگیا ہے۔ بس میں بیٹھے۔" ایک مسافر نے زور سے کہا۔

"بس اسٹاپ سے نکلی ہے تو چلے گی بھئی' کچھ سواریاں اور آجائیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"کیا سواری نہیں آئے تو یہ بس نہیں چلے گی۔" دوسرے مسافر نے کہا۔

"یہ تم سے کس نے کہا کہ سواری نہیں آئے گی تو بس بھی نہیں چلے گی' بلکہ بیٹھو اور آجائیں۔ ہم کمانے کے لیے بس چلاتے ہیں اپنا نقصان کرنے کے لیے نہیں۔" ناچاہتے ہوئے بھی مجھے غصہ آگیا۔

کنڈیکٹر نے جیسے ہی مجھے چلنے کا سگنل دیا' میں نے بس آگے بڑھادی اور الا صف اسٹاپ پر جاکر ہی بس روکی۔ بس کے رکتے ہی کھانے پینے کی اشیاء بیچنے والے اور مسافر بس میں سوار ہونے کو آگے بڑھے۔ ہر خوانچہ فروش بہت جوش سے بس میں چڑھنے کی کوشش میں تھا۔ کنڈیکٹر علی نواز چیزیں بیچنے والوں سے اکثر تنگ آجاتا تھا کیونکہ یہ لوگ مسافروں سے پہلے خود چڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی بات اسے بری لگتی تھی اس کے بار بار منع کرنے کے باوجود وہ نہیں مان رہے تھے اچانک علی نواز غصے سے بھڑک اٹھا جیسے ہی ایک امرود بیچنے والے نے بس میں چڑھنے کے لیے پائیدان میں پاؤں رکھا اس نے زور سے اسے دھکا دے دیا وہ زمین پر گرتے گرتے بچا۔

"کیا بات ہے دھکا کیوں دے رہے ہو؟" اس نے کہا۔

"تم لوگوں کو میری بات سمجھ میں نہیں آتی' پہلے مسافروں کو چڑھنے دو پھر بھلے چیزیں بیچ لینا۔" نواز نے کہا۔

"یہ بات زبانی بھی کہہ سکتے تھے دھکا دینے کی کیا ضرورت ہے۔" امرود والے نے غصے سے بپھرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے سامنے سے ہٹو مسافروں کو چڑھنے دو۔" علی نواز نے مسافروں کو آتا دیکھ کر کہا۔

وہ دونوں میاں بیوی تھے شوہر نے ہاتھوں میں بیگ لیا ہوا تھا جبکہ خاتون نے بچے کو چھاتی سے لگایا ہوا تھا۔

"کتنی سیٹیں ہیں؟" کنڈیکٹر نے پوچھا۔

"دو سیٹیں ہیں۔" خاتون نے کہا۔

"یہاں تین والی سیٹ پر بیٹھ جائیں۔" علی نواز نے دو سیٹ والی جگہ خالی نہ دیکھ کر کہا۔

"نہیں نہیں ہم کو دو والی سیٹ چاہیے۔"

"وہ خالی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر ہم اتر جاتے ہیں' کسی دوسری بس میں بیٹھ جاتے ہیں۔" خاتون نے اترنے کو پاؤں نیچے کی طرف کیے۔

"یہاں کھڑکی کے پاس بیٹھ جائیں' ہوا بہت اچھی آئے گی سفر بھی اچھا کٹ جائے گا" علی نواز نے کہا۔

"نہیں نہیں دو والی سیٹ چاہیے۔" خاتون نے ضد کی۔

مردوں کے مقابلے میں خواتین ہم بس والوں کو بہت تنگ کرتی ہیں' بس میں چڑھتے ہی ان کے نخرے آسمان سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اسے ہماری مجبوری کہہ لیں یا پیشہ ورانہ ذمہ داری کہ ہم ان خواتین کے ناز نخرے برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کھڑکی کے پاس بیٹھنے کی ضد اس لیے کرتی ہیں کہ انہیں ہوا چاہیے ان کا دل گھبراتا ہے جب بس شہر سے باہر نکلتی ہے پھر انہیں وہی ہوا تنگ کرتی ہے اور وہ فوراً کھڑکی کو بند کردیتی ہیں۔ چاہے دوسرے مسافروں کا گرمی سے برا حال ہی کیوں نہ ہورہا ہو۔ اس طرح کے واقعات ہم دیکھنے کے اس قدر عادی ہوچکے ہیں کہ اب اس بارے میں سوچتے ہی نہیں۔ مرد چاہے شوہر ہو' دکاندار ہو

کنڈیکٹر ہو کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو عورت اسے تنگ کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔

نفر سے میں نے محبت کے عہد و پیماں ضرور کر لیے تھے لیکن اس کا تعلق بھی عورتوں کی کیٹیگری سے ہی تھا نا جانے شادی کے بعد اس کا میرے ساتھ کیا سلوک ہو۔

میں نے پلٹ کر اس خاتون کو دیکھا کنڈیکٹر علی نواز کے چہرے سے بے بسی جھلک رہی تھی وہ بھرپور کوشش کر رہا تھا کہ خاتون بس سے اتر نے نہ پائے یہی بات سوچتے ہوئے ایک سیٹ کی جانب بڑھا جہاں ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔

''بڑے صاحب! آپ ایسا کریں کہ اس سیٹ پر بیٹھ جائیں انہیں یہاں بیٹھ جانے دیں۔'' کنڈیکٹر نے ایک سیٹ کی جانب اشارہ کیا۔

''کیوں......؟ کیوں بیٹھ جاؤں کیا میں نے کرایہ نہیں دیا۔ ابھی کہہ رہے ہو یہاں بیٹھ جاؤ پھر کہو گے یہاں سے اٹھ جاؤ وہاں بیٹھ جاؤ' تم لوگ بس میں مسافروں کے ساتھ بھی ڈرامے بازی کرتے ہو سفر کو عذاب بنا کر رکھ دیتے ہو۔''

''بڑے صاحب غصے نہ کریں' دو گھنٹے کا سفر ہے سب ہی اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔''

''دل نہیں چاہ رہا تھا اس جگہ سے اٹھنے کا لیکن تمہارے کہنے پر اٹھ رہا ہوں اب دوبارہ سیٹ سے اٹھنے کو نہ کہنا۔'' بڑے میاں نے سیٹ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا کریں بڑے صاحب! خواتین کا خیال کرنا پڑتا ہے۔'' علی نواز نے کہا۔

''کیا سارے مرد خواتین کا احترام کرنے کے لیے رہ گئے ہیں' جب دیکھو خواتین کے احترام کی باتیں ہوتی ہیں' کیا بزرگوں کا احترام کرنا گناہ ہے۔'' بڑے میاں غصے سے بھڑک اٹھے۔

علی نواز بڑے میاں کی بڑبڑاہٹ کو نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''آپ کی کتنی سیٹ ہیں؟'' اس نے آنے والے مسافروں سے پوچھا۔

''ہماری تین سیٹ ہیں۔'' ایک خاتون نے کہا۔

''یہاں بیٹھ جائیں۔'' علی نواز نے آگے خالی سیٹوں کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں ہم پیچھے والی سیٹ پر بیٹھیں گے۔''

''کمال ہے ہر ایک کہتا ہے کہ ہم آگے بیٹھیں گے اور آپ کہہ رہی ہیں کہ پیچھے بیٹھیں گے۔'' علی نواز نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔

''آگے بیٹھنے والے مرد سگریٹ پیتے ہیں ان کا سارا دھواں ہم پر آئے گا' اس لیے پچھلی سیٹ پر بیٹھیں گے۔'' خاتون نے کہا۔

''آ...... آپ ایسا کریں اگلی سیٹ پر بیٹھ جائیں۔'' علی نواز نے ایک مسافر سے کہا۔

''کیوں کیا میں یہاں بیٹھا ہوا برا لگ رہا ہوں۔'' مسافر نے تنک کر کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے دراصل خواتین کو جگہ دینی ہے۔'' علی نواز نے کہا۔

''آگے جو سیٹ خالی پڑی ہے وہاں انہیں کیوں نہیں بٹھا دیتے۔'' مسافر نے بگڑ کر کہا۔

''خواتین آگے نہیں بیٹھنا چاہ رہی ہیں۔''

''کمال ہے بس میں بٹھاتے ہوئے بڑی محبت دکھاتے ہو' جیسے ہی بس اڈا صفِ اسکوائر پہنچتی ہے مسافروں کو تنگ کرنا شروع کر دیتے ہو' بہانے بہانے سے تنگ کرتے ہو۔'' مسافر نے سیٹ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

موبائل پر کال آنے پر میں نے کال اوکے کر دی' نفر کی کال تھی' میرے ہیلو کہنے سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔

''کیا بات ہے تم نے ابھی تک مجھ سے بات نہیں کی۔''

"میں کال کروں گا' میں نے کب بات کرنے سے انکار کیا ہے۔" میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"اتنی دیر ہوگئی ہے میں کب سے تمہاری کال کی منتظر تھی مگر مجال ہے جو کال آئے مجبوراً خود ہی کال کرنی پڑ گئی۔" وہ غصے میں لگ رہی تھی۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ بس ٹول پلازہ کراس کرلے گی تو بات کروں گا۔ ابھی میں لالہ آصف اسکوائر پر ہی ہوں بے فکر رہو ٹول پلازہ کراس کرتے ہی میں کال کروں گا۔" میں نے کہا۔

"جب تم ابھی تک لالہ آصف اسکوائر پر ہی ہو تو آگے کیسے جاؤ گے۔"

"خیریت ہے نا آج تمہیں بہت غصہ آرہا ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے بھائی پر بہت غصہ آرہا ہے آج بھی صبح ان سے لڑائی ہوگئی۔"

"اچھا آج پھر تمہاری بھائی سے لڑائی ہوگئی۔"

"کون سا دن ہوتا ہے جب بھائی سے لڑائی نہ ہوتی ہو ہر وقت میرے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑی رہتی ہیں۔"

"شکر ہے ہاتھ دھوکر پیچھے پڑتی ہے گندے ہاتھوں سے پیچھے پڑنے سے تمہارے کپڑے خراب ہوجاتے اور روز تمہیں نئے کپڑے پہننا پڑتے۔"

"میری بات کو مذاق میں مت ٹالو مجھے بہت غصہ آرہا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں تمہاری بات کو مذاق میں نہیں ٹالتا' تم بھی اپنا غصہ تھوک دو کیونکہ غصہ حرام ہوتا ہے۔"

"میں کیا کروں وہ ہر بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہے آج تھوڑی دیر سے اٹھی تھی بس شور مچا دیا کہ کام سے بچنے کے لیے دیر سے اٹھتی ہوں۔"

"دیکھو نغمہ بات یہ ہے کہ چند دنوں کی بات ہے ہماری شادی ہوجائے پھر بھائی سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔" میں نے اسے سمجھایا۔

غیبت

مجلس میں ایک شخص نے دوسرے کی برائی شروع کی ایک عقل مند آدمی نے اس سے کہا: بھائی ہمارے سامنے کسی کی برائی مت کرو کیوں کہ اس سے اپنے بارے میں اچھا گمان ہونے لگتا ہے۔

محروم القسمت لوگ بعض باکمال لائق انسانوں کی برائی کرنے لگ جاتے ہیں بوجہ حسد ان کو دیکھ نہیں سکتے پیٹھ پیچھے ان کی برائی کرتے رہتے ہیں' جس طرح عام کتے شکاری کتے کے پیچھے بھونکتے رہتے ہیں لیکن سامنے آنے کی ہمت نہیں کرتے۔

حوالہ: گلدستہ گلزار سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ
انتخاب: مبارک احمد..... چیچہ وطنی

"چند دن کیوں میں کہتی ہوں یہ کام آج ہی ہوجائے۔" وہ بولی۔

"نغمہ بے وقوفی کی باتیں نہیں کرتے' یہ کام اتنے آسان نہیں ہوتے' میں اپنے گھر والوں کو اس رشتے کے لیے تیار کررہا ہوں وہ جیسے ہی ہاں کہتے میں کورٹ میں جاکر تمہارا حلفیہ بیان ریکارڈ کرا کے نکاح کرکے گھر لے جاؤں گا۔"

"ہم کرائے کے مکان میں رہ لیں گے' جب تمہارے والدین مان جائیں پھر مجھے گھر لے جانا۔" نغمہ بولی۔

"میں کچھ دیر کے بعد تم سے بات کرتا ہوں ابھی میرا ذہن بس اور سواریوں میں الجھا ہوا ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔

نغمہ بہت ہی جذباتی لڑکی تھی بات کی نزاکت کو سمجھتی نہیں تھی میرے گھر والے میری شادی برادری سے باہر کرنے کے خلاف تھے میں انہیں ہلکے پھلکے انداز میں وقفے وقفے سے قائل کرنے کی کوشش کررہا تھا ان کی مرضی کے خلاف نکاح کرلینے سے وقتی طور پر گھر چھوڑنا پڑ جاتا اتنی مہنگائی کے دور میں کرائے کے

مکان میں رہنا کھیل نہیں ہے۔ ابتدا میں ویسے ہی بیوی کے ناز نخرے اٹھانے کی غرض سے خرچ کرنا پڑتا ہے پھر آہستہ آہستہ خرچے پر کنٹرول کرنا پڑتا ہے یہ بات میں نے شادی شدہ لوگوں کے تجربے سے سیکھی ہے۔ سمجھدار لوگ وہی ہوتے ہیں جو خود تجربہ کرنے کی بجائے دوسروں کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔ نغمہ کی جب بھی کال آتی اس کی یہی ضد ہوتی تھی کہ میں بھائی کے ساتھ اور گزارہ نہیں کر سکتی' فوراً شادی کر لو تاکہ سارے مسائل سے نجات مل جائے حالانکہ جذباتی پن سے مسائل ختم نہیں بلکہ بڑھ جاتے ہیں میں نغمہ کا بھلا چاہ رہا تھا مگر میری باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔

''اس بس میں بیٹھے ہوئے میرے اسلامی بھائیو! میرا نہایت ہی ادب سے سلام قبول کرو۔'' ایک پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس اور ٹوٹی پھوٹی چپل پہنے ہوئے ایک شخص نے مسافروں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا' اس کے چہرے پر بڑھی شیو اس کی غربت کی غمازی کر رہی تھی۔

''شکریہ...... شکریہ کہ آپ نے میرے سلام کا جواب دیا' میرے اسلامی بھائیو! جناح اسپتال میں میری بچی کا آپریشن ہے اور میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ اس کی دوائیاں ہی لے لوں اگر آپ میری کچھ مدد کر دیں تو میری بچی کی دوائی آ جائے گی۔''

''کمال ہے مجھے دو سال ہو گئے اس کی یہ بات سنتے ہوئے ابھی تک اس کی بچی کا آپریشن ہی نہیں ہوا ہے۔'' ایک نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا یہ دو سال سے یہی کیسٹ چلا رہا ہے؟'' دوسرے نوجوان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی میں تقریباً روز ہی کام کے سلسلے میں کراچی آتا رہتا ہوں' یہ ہیروئنچی ہے نشہ کرنے کے لیے پیسے جمع کرتا ہے۔''

''کوئی اس دھوکے باز کو پکڑ کر پولیس کے حوالے نہیں کرتا۔'' دوسرے نوجوان نے پوچھا۔

''اگر ذرا سا اس کو کچھ کہہ دو تو پھر دیکھو کئی خواتین بس میں اس کی حمایت میں کھڑی ہو جاتی ہیں اس لیے کوئی نہیں بولتا۔''

اس شخص نے ایک بھرپور نظر بس کے مسافروں پر ڈالی اور پھر بولا۔

''اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ سب کو حفاظت سے اپنی منزل مقصود پر پہنچائے۔ آپ بھی میرے شہر کے لوگ ہیں الحمدللہ میں بھی حیدرآباد کے علاقے کنو شاہ کے رہنے والا ہوں۔ بچی کے علاج کے لیے کراچی آنا پڑا' بچی کی تیمارداری' دوائیوں اور ٹیسٹ کرانے پر میری جمع پونجی خرچ ہو گئی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس شخص نے رونے جیسا منہ بنا لیا۔

''وہ دو سال میں یہ بھی ملتان' بہاولپور' میاں چنوں اور دیگر شہروں کا بتاتا تھا اور آج یہ حیدرآباد کا باسی ہو گیا۔'' اس نوجوان نے کہا۔

اس شخص کی درد بھری آواز سے متاثر ہو کر خواتین نے دو دو پانچ پانچ روپے اسے دینا شروع کر دیے تھے۔

''چل بے فراڈیے' اتر بس سے اور مسافروں کو الو بنانے دے۔'' علی نواز نے اسے دھکا دے کر بس سے اتارنے کی کوشش کی۔

''دھکا تو نہ دو میں خود ہی بس سے اتر جاؤں گا۔'' وہ بولا۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے اسے کیوں تنگ کر رہے ہو؟'' ایک خاتون نے غصے سے کہا۔

''ارے اماں یہ پکا فراڈی ہے۔'' علی نواز نے کہا۔

''بھلے فراڈی ہو تم سے تو پیسے نہیں مانگ رہا۔'' دوسری خاتون بھی آپے سے باہر ہو گئی۔

''کتنا مسکین آدمی ہے لوگوں میں ذرا بھی کسی کا خیال نہیں ہے' پیسے مانگ کر چلا جائے گا۔ دو منٹ اس کو بس والے برداشت کرنے کو تیار نہیں۔'' ایک اور خاتون اپنی کرسی سے اس کی حمایت میں کھڑی ہو گئی۔

علی نواز نے اس موقع پر بڑی بے بسی سے میری

طرف دیکھا' میں نے اسے مصلحتاً خاموش رہنے کا اشارہ کیا' وہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے آنے والے مسافروں کو بس میں بٹھانے لگا۔ بس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کا احتجاج بڑھتا جا رہا تھا کہ بس کو فوری چلایا جائے۔ علی نواز کی کوشش تھی کہ بس کو مسافروں سے کھچا کھچ بھر دیا جائے لیکن وہ اپنی کوشش میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوا تھا اس سے پہلے کہ مسافروں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا میں نے بس چلا دی اور سبزی منڈی پر ہی جا کر بریک لگایا۔

''ارے بھئی یہ تم نے کیا بس کو کلپ بنا کر رکھ دیا ہے' جگہ جگہ روک رہے ہو۔'' میرے بائیں طرف بیٹھے ہوئے نوجوان مسافر نے کہا۔

''زیادہ جلدی ہے تو کوچ میں بیٹھ جاؤ۔'' میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتے ہوئے چھلک گیا۔

''کوچ ہی میں بیٹھنا ہے تو اس بس میں بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ بولا۔

''پھر صبر کرو اور ہمیں اپنا کام کرنے دو۔'' میں نے غصے سے دوسری طرف منہ کر لیا۔

سبزی منڈی سے دو مسافر بس میں چڑھے تھے وہ دونوں ہر ہفتے حیدر آباد سے سبزی اور فروٹ لینے آتے تھے۔ علی نواز تیزی سے فروٹ اور سبزی سے بھری پیٹیاں بس کی چھت پر چڑھانے میں مصروف ہو گیا۔ مسافر ہماری مجبوری کو سمجھے بغیر دبے دبے لفظوں میں کچھ کہہ رہے تھے' ان سے بحث کرنا فضول تھا اس لیے میں خاموش تھا۔

علی نواز کے سامان چھت پر رکھتے ہی میں نے بس چلا دی اب آخری اسٹاپ ٹول پلازہ پر تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے بس روک دی' بس کے رکتے ہی موبائل کی گھنٹی بج اٹھی' کال نغمہ نے کی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج اس کو کیا ہو گیا تھا جب میں نے کہہ دیا تھا کہ بس ٹول پلازہ سے نکلے گی میں کال کر لوں گا پھر بھی بار بار کال کر کے تنگ کر رہی تھی' جی میں آیا کہ کال کاٹ دوں پھر یہ سوچ کر بس ٹول پلازہ سے نکلنے والی ہے' کال اوکے کر دی۔

''تمہیں میری کوئی فکر نہیں ہے اتنی دیر ہو گئی ہے کال نہیں کی۔'' نغمہ نے کہا۔ اس کی آواز سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

''جانو کیا بات ہے کیوں پریشان ہو رہی ہو؟'' میں نے اپنے لہجے کو کسی قدر نرم کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے بہت رونا آ رہا ہے۔''

''کیوں رونا آ رہا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''ابھی ابھی مجھے بھابی نے کام چور کے خطاب سے نوازا ہے' وہ کہہ رہی تھیں سوائے مجھے موبائل پر اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کے کچھ نہیں آتا جس گھر میں جاؤں گی وہاں کے لوگ اپنا سر پیٹ لیں گے۔''

''تمہارے سسرال والے سر پیٹیں گے نا کم از کم تمہاری بھابی کی جان چھوٹ جائے گی۔'' میں نے اسے ہنسانے کو چھیڑا۔

''کیا میں اتنی بری ہوں؟'' وہ زور سے دہاڑی۔

''ارے میرا مطلب ہے کہ تم تو بہت اچھی ہو' جہاں جاؤ گی سسرال والے خوش ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''کیا......؟'' وہ زور سے چیخی۔

''کیا بجلی کو چھو لیا ہے جو اتنی زور سے چیخی ہو۔'' میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''میں نے کوئی بجلی نہیں چھوئی اور نہ ہی میں بجلی سے ڈرتی ہوں' تم نے جو بات کی ہے کہ جہاں جاؤ گی سسرال والے خوش ہوں گے اس بات پر جھٹکا لگا۔''

''میں نے بات کی ہے کوئی بجلی کا کرنٹ نہیں چھوڑا ہے۔''

''یہ بجلی کے کرنٹ سے زیادہ خطرناک بات ہے اس جملے سے لگ رہا ہے کہ تم مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتے اور میری کہیں اور شادی کروا دینا چاہتے ہو۔''

''اتفاق سے یہ جملہ ادا ہو گیا اگر تمہیں برا لگ گیا ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں اور کوشش کروں گا کہ آئندہ ایسی کوئی بات میرے منہ سے نہ نکلے۔'' میں

نے کہا۔

"ہاں یہ بات ہوئی نا۔"

"نغمہ تم کال مت کاٹنا میں ٹول پلازہ سے نکلنے والا ہوں۔" میں نے بس چلاتے ہوئے کہا۔

بس کے ٹول پلازہ سے نکلتے ہی میں نے موبائل کو پھر کان سے لگا دیا۔

"ہاں بھئی نغمہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنی بھابی کا کام میں ہاتھ بٹایا کرو اس سے وہ خوش ہوں گی اور زیادہ شور نہیں کریں گی۔"

"میں کیوں اس کے کام میں ہاتھ بٹاؤں اور کون سا اسے میرا کام پسند آتا ہے میرے ہر کام میں سو کیڑے نکالے بنا چین نہیں آتا ہے میں اس لیے کام کو ہاتھ ہی نہیں لگاتی۔" وہ بولی۔

میں ابھی کچھ کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ اچانک سائیڈ میں چلتا ہوا ٹرالر سامنے آ گیا' مجھے فوری طور پر ایمرجنسی بریک لگانا پڑا ورنہ بس زور سے ٹرالر سے جا ٹکراتی۔ ٹرک ڈرائیور اور ٹرالر والوں کی یہ حرکت مجھے سمجھ نہیں آتی وہ چلتے چلتے اچانک بس کے سامنے آ جاتے ہیں جس کے سبب آئے دن حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ ایمرجنسی بریک لگنے پر بس زور سے اچھلی مسافروں کو بھی زوردار جھٹکا لگا تھا۔

"او بھائی! خدا کے لیے اس موبائل کو رکھ دے ہمیں حیدرآباد پہنچا دے پھر جی بھر کر موبائل پر بات کر لینا۔" ایک مسافر نے کہا۔

"دھیان سے گاڑی چلاؤ بس میں پچاس سے ساٹھ مسافر ہوتے ہیں اپنی زندگی کا خیال نہیں تو کم از کم ہماری جانوں کا خیال کر لو۔" ایک بڑے میاں نے کہا۔

"انکل اس میں میرا کیا قصور ہے اچانک ٹرالر سامنے آ گیا' مسافروں کو بچانے کے لیے بریک لگانا پڑ گیا۔" میں نے کہا۔

"اس موبائل کو کچھ وقت کے لیے بند کر دو میاں!" بڑے میاں پھر بولے۔

میں نے غصے میں آ کر کال کاٹ دی' کال کٹتے ہی دوبارہ کال آ گئی۔ کال نغمہ کی تھی' اس لیے میں اس سے پہلے کہ بس میں مزید بدمزگی بڑھتے' کال کاٹ کر موبائل کو سائلنٹ کر کے جیب میں رکھ لیا' بس چلاتے ہوئے شروع میں مسافروں کا شور شرابا ہو جائے تو پھر سارے راستے شور شرابا ہی ہوتا رہتا ہے۔ مجھے سخت غصہ آ رہا تھا' ذہن یہ سوچنے سے قاصر تھا کہ غصہ مجھے مسافروں پر تھا یا نغمہ کی کال بار بار آنے پر تھا۔ بہر حال جیسے تیسے سفر خاموشی سے ہی کٹا۔ واپسی پر بھی میں زیادہ تر خاموش ہی رہا' میری خاموشی علی نواز سے چھپی نہ رہی۔

"استاد! کیا بات ہے آج بڑے چپ چپ ہو' خیریت ہے نا؟"

"ہاں خیریت ہی ہے' بس کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئی بھی غصہ آ ہی جاتا ہے۔"

"استاد بشیر! سواریوں پر غصہ نہ کیا کرو' مسافروں کے ناز نخرے اٹھانا ہی ہمارا کام ہے' ان کی باتوں کو دل سے لگا لینے پر یہ کام ہم نہیں کر سکیں گے۔" علی نواز نے کہا۔

"اس بات کا احساس ہے' جبھی اکثر سخت غصہ آنے پر بھی ضبط کر جاتا ہوں' دیکھا نہیں تم نے جوتے کی دکان والے کس طرح ہمارے پاؤں میں بیٹھ کر جوتے پہناتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں کسی کے پاؤں میں جوتا پہننا پڑ جائے تو اس وقت ہم اپنا کس طرح سبکی محسوس کریں گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں استاد تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" علی نواز نے کہا۔

صبح ہونے پر میں پھر بس میں بیٹھا ہوا تھا' مسافروں کو ان کی منزل مقصود پر پہنچانے کے لیے ہماری زندگی کا مقصد شاید یہی ہے کہ روزانہ مسافروں کو ان کی منزل پر پہنچائیں۔ ہماری طرح ہر انسان کسی نہ کسی طرح انسانیت کے کام آ رہا ہے' بس سب کی ذمہ داریاں الگ الگ ہیں۔ میں کیپری سینما کے پاس کھڑا تھا' بس میں ابھی تک چار مسافر ہی سوار ہوئے تھے' میں

اپنی سیٹ پر بیٹھا آئینے سے بس کے اندر کا معائنہ کررہا تھا' ایک خاتون دروازے سے اندر داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں ایک کپڑے کا تھیلا تھا اس نے چہرہ نقاب میں چھپایا ہوا تھا۔ وہ سیدھی چلتی ہوئی میرے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئی اس نے جیسے ہی اپنا نقاب الٹا' مجھے ایک جھٹکا لگا وہ نغمہ تھی۔

''ارے اس حلیے میں تمہیں آنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟'' میں نے کہا۔

''تمہارے ساتھ حیدرآباد جانا ہے اس لیے برقعہ پہن کرآئی ہوں۔''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے' کبھی کبھی انسان کو برقعہ بھی پہن کر جانا چاہیے۔''

''انسان نہیں عورت۔'' اس نے مجھے ٹوکا۔

''ہاں انسان سے میری مراد خاتون ہی تھا' ویسے میری تصحیح کا شکریہ۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

''مجھے حیدرآباد لے کر جاؤ گے نا۔''

''ہاں ہاں' جب میں دوسروں کو حیدرآباد لے کر جاسکتا ہوں تو تمہیں کیوں نہیں۔''

''میں کرایہ نہیں دوں گی؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''تم سے کون کمبخت کرایہ مانگ رہا ہے۔''

''علی نواز کرایہ مانگ سکتا ہے۔''

''اس سے کہہ دینا میں ڈرائیور کے ساتھ ہوں پھر وہ کرایہ نہیں لے گا۔''

''کل تم نے میری کال کاٹ دی اور پھر میرے بار بار کال کرنے پر کیوں اوکے نہیں کیا؟'' نغمہ نے پوچھا۔

''موبائل بجنے پر مسافروں سے بدمزگی ہوگئی تھی' اس لیے غصے میں آ کر موبائل سائلنٹ پر لگادیا تھا۔''

''ہاں میرے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی ورنہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ میں کال کروں اور تم نہ اٹھاؤ۔'' نغمہ مسکرائی۔

نغمہ کے آنے سے مجھے خوشی ہورہی تھی آج ہم پہلی بار طویل سفر اکٹھے کریں گے' علی نواز نغمہ کو دیکھ کر مسکرارہا تھا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر میں بھی مسکرادیا آج ہفتے کا دن تھا ہفتے کے دن بس میں مسافروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ نوکری پیشہ لوگ اتوار کو چھٹی اپنے گھر منانے لازمی جاتے ہیں اس لیے ان کی وجہ سے بسیں مسافروں سے کھچا کھچ بھر کر جاتی ہیں۔

میں بس کو سڑک پر دوڑاتا ہوا ٹول پلازہ کے قریب پہنچ چکا تھا' بس میں دو تین سیٹیں خالی تھیں۔ ٹول پلازہ کے قریب ہمارا آخری اسٹاپ تھا یہاں بھی اکثر سواریاں مل جاتی ہیں۔ بس کے رکتے ہی مسافر بس میں چڑھنے لگے' دو والی سیٹ پر ایک بزرگ عورت اکیلی بیٹھی تھی جبکہ اس کے سامنے تین والی سیٹ پر دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ علی نواز نے جب اس بزرگ عورت کو وہاں سے اٹھا کر تین والی سیٹ پر بٹھانا چاہا وہ غصے سے بھڑک اٹھی۔

''تو مجھے شکل سے خطرناک لگتا ہے' خوامخواہ مجھے پریشان کررہا ہے۔''

''اماں تم دو والی سیٹ پر اکیلی بیٹھی ہو میں چاہتا ہوں کہ تم اس سیٹ پر بیٹھ جاؤ تاکہ میں ان میاں بیوی کو اس دو والی سیٹ پر بٹھادوں۔'' علی نواز نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''میں بس میں سوار ہوئی تھی اسی وقت تجھے دیکھ کر سمجھ گئی تھی تو خطرناک ہے۔'' بزرگ خاتون غصے سے بھر کر اٹھی اور تین والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ علی نواز نے اس کے اٹھتے ہی ان میاں بیوی کو سیٹ پر بٹھادیا۔ وہ بزرگ خاتون ابھی تک غصے سے علی نواز کو گھور رہی تھی' میں یہ منظر آئینے میں دیکھ رہا تھا' علی نواز جیسے ہی مسافروں کو سیٹ پر بٹھا کر میرے پاس آیا' میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں بھئی تم خطرناک ہو' یہ ہمیں پتا ہی نہیں تھا۔ ان خاتون سے پتا چلا ہے کہ تم خطرناک ہو۔''

"بزرگ خاتون ہیں ان کے کیا منہ لگیں پتا نہیں میں انہیں کہاں سے خطرناک لگ رہا ہوں۔"

"جبھی اس نے سیٹ چھوڑنے میں دیر نہیں لگائی۔" میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ علی نواز جھینپ گیا۔

بس ٹول پلازہ سے نکل کر آگے بڑھ گئی' راستے بھر مختلف اسٹاپ کر کے مسافروں کو ان کی منزل پر اتارتی ہوئی آگے بڑھتی ہی جارہی تھی' حیدرآباد آنے پر میں نے نغمہ کی طرف دیکھا جو بے خبر بیٹھی ہوئی تھی۔

"نغمہ صاحبہ! حیدرآباد آگیا ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر میں کیا کروں؟"

"کیا... بھئی تم حیدرآباد آنے کے لیے بس میں سوار ہوئی تھیں اور اب کیا ہیں ارادے ہیں؟"

"میرا حیدرآباد میں کون ہے جس کے پاس جاؤں' میں نے گھر کو خیرآباد کہہ دیا ہے اب تمہاری مرضی ہے تم مجھے کہیں بھی لے چلو' میں آنکھیں بند کر کے تم پر اعتماد کر کے چل دوں گی۔" نغمہ نے کہا۔

"بھئی مذاق نہ کرو' جلدی سے اتر جاؤ مجھے واپس کراچی بھی جانا ہے۔"

"ہاں چل دو کراچی' میں نے کب روکا ہے' بس اتنا یاد رکھو کہ میں گھر چھوڑ کر آئی ہوں' آتے ہوئے پرچی لکھ چھوڑ آئی ہوں کہ میں اپنی مرضی سے جارہی ہوں' مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" نغمہ نے بتایا۔

اس کی بات سن کر میرے پسینے چھوٹ گئے تھے' میں حیرت سے اس بے وقوف لڑکی کو دیکھ رہا تھا' نغمہ کو خود اندازہ نہیں تھا کہ وہ بہت بڑی غلطی کر چکی ہے جس کا خمیازہ اسے ہی بھگتنا تھا' ہم ڈرائیور لوگ بڑے دل پھینک قسم کے ہوتے ہیں' اپنا مطلب نکالا پھر تو کون اور میں کون والی بات ہوتی ہے۔ میں نغمہ کے معاملے میں سنجیدہ تھا کیوں کہ وہ مجھے پسند آگئی تھی اور میں اس سے شادی کا خواہش مند بھی تھا۔ میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا ہمارے یہاں برادری سسٹم ہے' برادری سے باہر شادی کرنا بڑا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ابو کو نغمہ کے حوالے سے قائل کر لیا تھا مگر امی جان راضی نہیں ہو رہی تھیں۔ دراصل وہ میری شادی اپنی بہن ثریا کی بیٹی رقیہ سے کرنا چاہتی تھیں اس لیے وہ نغمہ سے میری شادی کرانے کو تیار نہ تھیں۔ میں اپنی امی سے واقف تھا انہیں مجھ سے بہت محبت تھی اور وہ اس شادی کے لیے راضی ضرور ہو جاتیں' اتنا مجھے پکا یقین ہے لیکن انہیں راضی ہونے میں کچھ وقت درکار تھا۔ نغمہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی' وہ بہت ہی جذباتی اور جلد باز لڑکی تھی اس لیے اپنا گھر چھوڑ آئی تھی کہ کس طرح میں اس سے شادی کر لوں اور اس کی اپنے گھر والوں سے جان چھوٹ جائے۔

"ایسے مجھے کیا دیکھ رہے ہو؟" نغمہ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر بولی۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تمہیں کیا کہوں؟"

"میں نے ایسا کیا کر دیا ہے۔"

"تم نے گھر سے بھاگ کر بہت بڑی غلطی کی ہے جب تک ہم کراچی پہنچیں گے تمہارے بھائی کے علم میں یہ بات آچکی ہوگی کہ تم اپنے آشنا کے ساتھ کہیں بھاگ چکی ہو۔"

"اس لیے خط چھوڑ کر آئی ہوں کہ انہیں میرے گھر سے بھاگنے کی اطلاع ہو جائے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ تم نے کتنی بڑی غلطی کر دی ہے۔ تمہارا بھائی یقیناً تمہارے اغوا کی رپورٹ پولیس میں لکھوا دے گا اور پولیس تمہاری تلاش شروع کر دے گی۔ تمہارے ساتھ میں بھی پکڑا جاؤں گا۔"

"ایک نہ ایک دن ہمیں شادی کرنا ہی تھی' تم میرے ساتھ نکاح پڑھوا لو پھر کوئی ہمیں گرفتار نہیں کر سکے گا۔" نغمہ نے کہا۔

"کس طرح نکاح کر لوں' نکاح سے پہلے تمہارا کورٹ میں حلفیہ بیان ضروری ہے جو ایف آئی آر کٹنے کے بعد ممکن نہیں رہا۔ پولیس تمہارا بیان لینے سے پہلے

ہی تمہیں گرفتار کر لے گی۔" میں نے کہا۔

"پھر اب کیا ہوگا۔" وہ گھبراتے ہوئے بولی۔

"میں یہی بات سوچ رہا ہوں کہ کیا کروں' تم نے مجھے بیٹھے بٹھائے الجھن میں ڈال دیا ہے' ہاں ایک طریقہ ہے میں تمہیں کراچی لے جانے کی بجائے حیدرآباد میں اپنے دوست کے گھر چھوڑ دوں اور ایک دو دن میں چھٹی لے کر حیدرآباد آؤں اور سول کورٹ حیدرآباد میں تمہارا حلفیہ بیان ریکارڈ کرا کے نکاح کرلوں گا۔ نکاح ہونے پر بھی میں تمہیں اپنے گھر نہیں لے جاسکوں گا' ہم کرائے کے مکان میں رہیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم جہاں بھی مجھے رکھو گے میں رہوں گی بس میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

"سوچ لو نغمہ! تم اکیلی کرائے کے مکان میں رہ لو گی۔" میں ڈرائیور آدمی ہوں' میرا کچھ پتا نہیں ہوتا' کبھی ہفتے ہفتے گھر نہیں آتا' اس لیے میں چاہ رہا تھا کہ تم سے شادی اس وقت کروں جب میری ماں راضی ہوجائے۔ ایسی صورت میں تم میری ماں کے ساتھ گھر میں رہتیں' تمہارے اچانک گھر چھوڑ کر آجانے سے میرا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا ہے' مجھے تمہیں اپنے گھر کی بجائے کرائے کے مکان میں رکھنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"تم پریشان مت ہو' جب میں نے گھر سے بھاگنے کی بے وقوفی کی ہے تو اس کا تمہیں قصوروار نہیں ٹھہراؤں گی' جیسے بھی حالات ہوں گے ان کا مقابلہ کروں گی۔" نغمہ نے کہا۔

میں نے اس وقت ایک رکشہ کیا اور نغمہ کو اپنے دوست راشد کے گھر چھوڑ آیا اور اسے اکیلے میں ساری بات سمجھا بھی آیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا تھا' بس میں آنے پر مجھے رہ رہ کر نغمہ کی بے وقوفی پر غصہ آرہا تھا کہ اس نے بیٹھے بٹھائے مجھے پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ راشد کے گھر والے نا جانے نغمہ کے اور

میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔

دو دن بعد جب چھٹی لے کر راشد کے پاس پہنچا اس نے یہ خوشخبری سنائی کہ اس نے ایک وکیل کی خدمات حاصل کرلی ہیں' نغمہ کا سول کورٹ میں حلفیہ بیان آسانی سے ہوجائے گا۔ ہم دونوں نغمہ کو برقع پہنا کر کورٹ لے گئے جہاں بشارت احمد ایڈووکیٹ ہمارا منتظر تھا اس نے کاغذی کارروائی مکمل کی ہوئی تھی' سول کورٹ میں نغمہ کو پیش کردیا گیا جہاں نغمہ کا بیان ریکارڈ ہوا بیان ریکارڈ ہوجانے پر عدالت نے نغمہ کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی اجازت دے دی۔ حلفیہ بیان ہوجانے پر نکاح خواں نے ہمارا نکاح پڑھوادیا' اب نغمہ میری شریک حیات بن چکی تھی۔ نغمہ کی خوشی دیدنی تھی' نکاح ہوجانے پر نغمہ کی ساری ذمہ داری میرے کندھوں پر آگئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے کہاں لے کر جاؤں۔ مجھے پریشان دیکھ کر راشد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں سب سمجھ رہا ہوں کہ تم اس وقت کیا سوچ رہے ہو' میرے ہوتے ہوئے تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کراچی جاکر کرایہ کا مکان ڈھونڈ لو اس وقت نغمہ یہیں میرے گھر ہی رہے گی' جب مکان مل جائے پھر تم اسے اپنے ساتھ کراچی لے جانا۔''

اس کی بات سے مجھے حوصلہ ہوا اور میں کراچی چلا آیا' یہاں آکر کرایہ کا مکان تلاش کرنا شروع کردیا' کورنگی کے علاقے میں مجھے ایک سستا مکان مل ہی گیا۔ مکان مل جانے پر میں نے ضرورت کا کچھ سامان خریدا اور نغمہ کو حیدرآباد سے لے آیا' میں نے چند دن کی چھٹی لی ہوئی تھی اس لیے وہ خوشی وشادمانی کے دن پلک جھپکتے گزر گئے' میں نغمہ کو اور نغمہ مجھے پاکر بہت خوش تھے۔

چھٹیاں ختم ہونے پر میں نے ڈیوٹی سنبھال لی تھی' نغمہ اور میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ ایک دوسرے سے ایک لمحے کو بھی جدا ہوں مگر مجبوری تھی کام کرنے سے ہی گھریلو اخراجات پورے ہوسکتے تھے۔ امی ابو کو میں نے بھی بتایا ہوا تھا کہ بکنگ چل رہی ہے جس کے سبب گھر سونے کے لیے نہیں آرہا ہوں میرے پاس دن میں اتنا وقت نہیں تھا کہ گھر جاسکوں' اس لیے رات میں کچھ دیر کے لیے گھر چلا جاتا۔ امی کو بکنگ کا بتا کر نغمہ کے پاس چلا آتا۔ امی بھی حیران تھیں کہ روزانہ ہی بکنگ کیسے چل رہی ہے ایک دن امی نے اس بات کا اظہار کر ہی دیا۔

''کیا بات ہے بشیر بیٹے! ان دنوں تمہاری بس کی بکنگ کچھ زیادہ نہیں چل رہی حالانکہ یہ مہینہ شادیوں کا بھی نہیں ہے۔''

''امی یہ ہوائی روزی ہے' اس کا کچھ پتا نہیں چلتا کسی مہینے بالکل بھی بکنگ نہیں ہوتی۔'' میں نے بات بنائی۔

''ہاں یہ بات تمہاری ٹھیک ہے پر بیٹے تم اپنی صحت کا بھی خیال رکھو' رات دن جاگ کر ڈیوٹی کرنے سے تم بیمار پڑ جاؤ گے۔ کچھ اپنی صحت کا بھی خیال کرو' کیا ایسا نہیں ہوسکتا ایک دن تم بکنگ پر جاؤ دوسرے دن دوسرا بکنگ پر چلا جائے۔'' امی جان نے کہا۔

''امی جان ایسا ہوسکتا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ جو بکنگ پر جاسکتا ہے وہ شدید بیمار ہے اور اسپتال میں زیر علاج ہے' میں بس میں ہی جب موقع ملتا ہے نیند پوری کرلیتا ہوں۔''

''میں یہ بات سمجھتی ہوں کہ بس جب رک جائے ڈرائیور اور کنڈیکٹر اپنی نیند پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر گھر جیسی پرسکون نیند بس میں کہاں آسکتی ہے۔'' امی جان نے کہا۔

''امی جان میں نے بس مالک سے کہہ دیا ہے کہ وہ دوسرے بس ڈرائیور کا انتظام بھی رکھے' میں بھی بیمار پڑ سکتا ہوں' ایسے میں بس کون چلائے گا اس لیے بس مالک نے اپنے مختلف دوستوں کو کہا ہے جیسے ہی کوئی ڈرائیور آیا مجھے آرام مل جائے گا۔''

''ہاں بیٹے تم بار بار کہتے رہو تبھی یہ مسئلہ حل ہوگا۔'' امی جان نے کہا۔

میں نے وقتی طور پر امی جان کو مطمئن کر دیا تھا لیکن جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ بات ضرور کھل جائے گی۔ میں موقع کی تلاش میں تھا کہ امی جان کی طبیعت قدرے بہتر ہو جائے گی تاکہ میں انہیں اپنے اعتماد میں لے کر نغمہ سے شادی کے بارے میں بتا دوں تاکہ کرائے کے مکان سے نجات مل سکے اور میری غیر موجودگی میں نغمہ کو جو بوریت ہوتی ہے وہ دور ہو جائے۔"

نغمہ سے شادی کے بعد میں محسوس کر رہا تھا کہ اسے بچپن سے توجہ کی ضرورت تھی لیکن اس کے والدین میں ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب ان دونوں میں لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ اس کا بھائی مستقیم ایسے مواقع پر باہر چلا جاتا تھا۔ نغمہ بھی کبھی کسی کونے کھدرے میں چھپ کر ان کے لڑتے جھگڑنے کی باتیں سنتی رہتی۔ مستقیم کی شادی ہونے پر ایک سال کے اندر اندر نغمہ کے امی اور ابو کا انتقال ہو گیا حساس طبیعت کے سبب نغمہ کی اپنی بھابی شائستہ سے بنتی نہیں تھی اس کا میرے ساتھ نکاح ہو چکا تھا میری پوری کوشش تھی کہ نغمہ کو کسی قسم کی تنہائی اور احساس کمتری محسوس نہ ہو۔ میری گھر واپسی مغرب کے بعد ہی ہوتی تھی وہ دن بھر گھر میں بور ہوتی رہتی تھی میں اس کی بوریت دور کرنے کو ٹی وی لے آیا تھا لیکن انسان کب تک ٹی وی کے سامنے بیٹھا رہے گا۔ اسے باتیں کرنے اور جی بہلانے کو کسی انسان کی ضرورت ہے گھر میں ایک سے زائد عورتیں ہونے سے ان کا جی بہلا رہتا ہے ڈرائیونگ کا کام ایسا ہے دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔ جس دن بھی میں گھر دیر سے جاتا نغمہ کا منہ پھولا ہوا تھا بڑی مشکل سے منانا پڑتا تھا حالانکہ میں نغمہ کی تنہائی کا احساس کر کے بکنگ پر بھی نہیں جا رہا تھا پھر اسے اس بات پر غصہ تھا کہ میں وقت نہیں دے رہا ایک رات دس بجے گھر پہنچا وہ سخت غصے میں دکھائی دے رہی تھی مجھے دیکھتے ہی پھٹ پڑی۔

"خود باہر گھومتے رہو مجھے تم نے قیدی بنا کر رکھا ہوا ہے۔"

"نغمہ! کیا ہوا خیریت ہے نا؟" میں نے اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"نا جانے تم مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو میں گھر میں اکیلی بور ہوتی رہتی ہوں۔"

"میں نے ٹی وی کس لیے لا کر رکھا ہے ٹی وی کے ڈراموں سے دل بہلا لیا کرو۔ جب میں گھر آ جاؤں مجھ سے دل بہلا لیا کرو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں بھی انسان ہوں کوئی پتھر نہیں ہوں۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ تم پتھر ہو۔"

"میری بات کو مذاق میں مت ڈالو دن بھر باہر رہنا ہے تو مجھے بھی اپنے ساتھ رکھا کرو۔"

"یہ کیسی بات کر رہی ہو نغمہ! میں دن بھر بس چلاتا ہوں کیا تم میرے ساتھ بس میں گھومو گی۔"

"جب تم دن بھر بس میں اکیلے گھوم سکتے ہو تو میں کیوں نہیں۔"

"نغمہ! میری بات ٹھنڈے دماغ سے سنو میں نے کبھی نہیں چاہا کہ تم اکیلے اور بور زندگی گزارو اسی لیے میں چاہ رہا تھا کہ کسی طرح گھر والوں کو اس رشتے پر راضی کر لوں تاکہ جب تم میری زندگی میں آؤ تو جو پیار و محبت اپنے گھر میں نہیں ملا وہ میرے گھر میں مل جائے لیکن تمہاری جلد بازی نے میرا سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔"

"میں اب تمہاری بیوی ہوں تم اپنے والدین کو میری خاطر نہیں منا سکتے۔"

"میں مناسب موقع کی تلاش میں ہوں تم گھبراؤ نہیں میں بہت جلد تمہیں اپنے والدین کے پاس لے جاؤں گا۔" میں نے اسے سمجھایا۔

"میری قسمت ہی خراب ہے نا جانے وہ خوش نصیب دن کب آئے گا جب تم مجھے اپنے والدین کے پاس لے کر جاؤ گے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے رونا شروع کر دیا۔

میں نے بڑی مشکل سے اسے خاموش کرایا' وہ بضد تھی کہ میں اسے اپنے والدین کے پاس لے جاؤں' میں نغمہ کو گھر لے کر نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ اسے گھر لے جانے کا مطلب یہ تھا کہ میرے والدین ہمیشہ کے لیے گھر کے دروازے نغمہ کے لیے بند کر دیتے۔ میں انہیں راضی کر کے نغمہ کو گھر لے جانا چاہتا تھا' جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور آتا بھی کیسے وہ ایک جذباتی لڑکی تھی محض جذبات میں آ کر اس نے میرا سارا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا میری نیت صاف تھی اسی لیے میں نے نغمہ سے نکاح کیا تھا۔ میری نیت صاف نہ ہونے پر میں بھی کا اس کی عزت کو خاک میں ملا کر ہمیشہ کے لیے اس سے جان چھڑا لیتا۔

نغمہ کے ساتھ نکاح کر کے جو تین ماہ گزر رہے تھے وہ میرا دل ہی جانتا تھا میں دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ گیا تھا نغمہ کہتی تھی کہ میں اسے گھر والوں کے پاس لے کر جاؤں' میری والدہ دن بدن بیماری کے سبب کمزور ہوتی جا رہی تھیں اور وہ بار بار کہتی تھیں رات کی بکنگ چھوڑ دو اور رات گھر پر گزارو جہاں وہ چاہتی ہیں شادی کر لوں۔ اکثر جب بس ڈرائیونگ کر رہا ہوتا تھا۔ نغمہ کال کر کے مجھے احساس دلاتی کہ وہ گھر میں اکیلی بور ہو رہی ہے جب وہ اس طرح تنگ کرتی مجھے اس پر بہت غصہ آتا اور دل چاہتا کہ اسے طلاق دے کر اس روز روز کے عذاب سے جان چھڑا لوں لیکن میری آنکھوں کے سامنے اس کی معصوم صورت آ جاتی اور میں غصے کو پی جاتا کہ میرے سوا دنیا میں کون ہے اس کا وہ طلاق کا داغ لے کر کہاں جائے گی۔ اس نے گھر سے بھاگ کر جو شادی کی ہے ایسے میں کوئی بھی رشتے دار اسے اپنے گھر پناہ نہیں دے گا۔ میں روز یہ سوچ کر گھر جاتا کہ آج امی سے نغمہ کے بارے میں ضرور بات کروں گا لیکن امی کی بگڑتی حالت دیکھ کر خاموشی اختیار کرنا پڑ جاتی کہ کہیں وہ نغمہ کا نام سن کر بھڑک نہ اٹھیں' ایسے میں ان کا بلڈ پریشر زیادہ ہونے پر انہیں فوری اسپتال لے جانا پڑے گا۔ ابا جان بھی دبے لفظوں میں مجھے کہہ چکے تھے کہ میں امی جان کی بات مان کر جہاں وہ چاہتی ہیں شادی کر لوں۔ عجیب بے بسی کے عالم میں دن کٹ رہے تھے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلے کا حل کس طرح سے نکلے گا۔ ایک طوفان تھا جو صرف میری زبان ہلنے سے برپا ہو سکتا تھا۔

ایک دن جب میں تھکا ہارا پہنچا اس نے پھر مجھ سے والدین کے پاس لے جانے کی ضد کی اور دھمکی دی کہ اگر میں اسے گھر لے کر نہیں گیا تو وہ خود چلی جائے گی۔ میں نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا کہ وہ کسی بھی صورت میرے گھر نہیں جائے گی جس پر حسب روایت اس نے رونا شروع کر دیا۔ میں نے بھی اسے نہیں منایا اور خاموشی سے جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ نا جانے کتنی دیر تک روتی رہی مجھے خبر نہیں رہی۔ میں تھکا ہارا آیا تھا اس لیے چارپائی پر گرتے ہی نیند کی وادیوں میں کھو گیا تھا' صبح بیدار ہونے پر منہ پر پانی مار کر گھر سے چلا آیا۔ نغمہ مجھے گھر سے نکلتا ہوا دیکھتی رہی لیکن بولی کچھ نہیں۔

دوپہر کے وقت جب میں نوری آباد پہنچا میرے موبائل کی گھنٹی بجی' کال نغمہ کی تھی میں نے نا چاہتے ہوئے بھی کال او کے کر دی۔

"بہت جلدی میری یاد آ گئی۔" میں نے طنزیہ کہا۔

"شیر! تمہاری ماں نے مجھے اپنے گھر سے بہت ذلیل کر کے نکال دیا ہے۔"

"کیا...... تم میرے منع کرنے کے باوجود گھر پہنچ گئیں۔" مجھے حیرت کا زبردست جھٹکا لگا۔

"میں اس گھر کی بہو ہوں' تم مجھے گھر لے کر نہیں جا رہے تھے اور میں اکیلے کرائے کے مکان میں پڑے پڑے تنگ آ گئی تھی ایسی زندگی گزارنے سے بہتر ہے انسان کچھ کھا کر خودکشی کر لے۔"

"نغمہ تم بھول رہی ہو میں نے تمہیں گھر سے بھاگنے پر مجبور نہیں کیا تھا' میری آخری حد تک کوشش تھی تم اپنے گھر سے رخصت ہو کر آؤ' اس مقصد کے لیے

میں اپنی امی کو راضی کر رہا تھا لیکن تمہیں گھر سے بھاگنے کی لگی ہوئی تھی اس لیے تم نے یہ اقدام اٹھایا اور خود بھی پریشان ہو رہی ہو اور مفت میں مجھے بھی پریشان کر رہی ہو تمہیں کیا ضرورت تھی گھر جانے کی؟''

''آخر ہوتا ای ماں کے بیٹے! اس نے ابھی مجھے یہی طعنہ دیا ہے کہ میں گھر سے بھاگ کر آئی ہوں اور ایسی عورتیں قابل بھروسہ نہیں ہوتیں پھر کوئی اچھا یار مل گیا اس کے ساتھ بھاگ لیتی ہیں۔ کاش یہ سننے سے پہلے مجھے موت کیوں نہ آ گئی۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''میں تمہیں اسی لیے گھر لے کر نہیں جا رہا تھا کہ امی کے غصے میں تمہیں کچھ کہہ دیں گی اور تم اس بات کو دل سے لگا لوگی اس لیے چاہ رہا تھا کہ جب میری امی کے دل میں تمہارے لیے نرم گوشہ ہو جائے پھر گھر لے کر جاؤں۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں اس گھر کی اب بہو ہوں انہیں چاہیے تھا کہ جب بیٹے نے پسند کی شادی کر لی ہے تو پھر مجھے وہی عزت دیں جو ایک بہو کا حق ہوتا ہے۔''

''بہو کو عزت اس وقت ملتی ہے جب وہ عزت کے ساتھ گھر سے رخصت ہو کر آتی ہے۔ تمہاری بے صبری نے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کس طرح امی کو منا کر تمہیں گھر لے جاؤں گا۔''

''ہاں میں نے گھر سے بھاگ کر بہت بڑی غلطی کی ہے جس کی مجھے اتنی بڑی سزا مل رہی ہے اے میرے مولا تو نے مجھے موت کیوں نہ دے دی جو آج یہ باتیں سننے کو مل رہی ہیں۔''

''نغمہ! ایسی باتیں فون پر نہیں ہوتیں میں گھر آ کر بات کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے کسی کی بات نہیں سننی ساری دنیا مطلبی ہے۔''

''ساری دنیا مطلبی سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہاری ماں اپنی پسند سے شادی کر کے لاتیں کیا پھر بھی وہ اپنی بہو سے ایسا سلوک کرتیں جو انہوں نے میرے ساتھ کیا ہے؟'' وہ بولی۔

''او استاد! گاڑی چلا لو میں اپنے گھر بھی جانا ہے چار گھنٹے ہو گئے ہیں اس بس میں سفر کرتے ہوئے۔'' ایک مسافر نے زور سے کہا۔

''ہاں ہاں میاں! یہ باتیں تم پھر کبھی کر لینا' ہمیں اپنی منزل پر پہنچا دو۔'' ایک بڑے میاں نے کہا۔

میں نے غصے سے ان مسافروں کو دیکھا جو اتنے بے صبرے ہو رہے ہیں کہ سکون سے بات بھی مکمل ہونے کا انتظار نہیں کر سکتے۔

''کل تک پہنچا ہی دے گا۔'' ایک نوجوان مسافر نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''زیادہ جلدی ہے تو دوسری بس میں چلے جاؤ۔'' میں نے غصے سے اسے گھورا۔

''کیوں چلا جاؤں' کرایہ دیا ہے مفت میں نہیں جا رہا۔''

www.paksociety.com

”کرایہ کی دھونس جمانے کی ضرورت نہیں ہے‘ علی نواز اس کا کرایہ پکڑا کر بس سے نیچے اتار دے۔“

”کیوں بس سے اتروں اسی بس میں جاؤں گا۔“ وہ بھی اکڑ گیا۔

”پھر اپنی چونچ کو بند رکھ۔“ میں نے کہا۔

مجھے مسلسل گھورتا دیکھ کر وہ نوجوان وقتی طور پر خاموش ہو گیا‘ میں نے موبائل کو دوبارہ کان سے لگایا لیکن کال کٹ چکی تھی۔

رات کو میں دیر سے گھر پہنچا‘ دروازہ کھلا ہوا تھا حالانکہ رات میں نغمہ دروازہ بند رکھنے کی عادی تھی اس لیے میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کچن سے ہوتا جب کمرے میں داخل ہوا مجھے زبردست حیرت کا جھٹکا لگا‘ نغمہ چارپائی پر اس طرح لیٹی ہوئی تھی کہ اس کا جسم بے ترتیب انداز میں نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا ایک ہاتھ کی مٹھی میں ایک شیشی تھی جبکہ دوسرے ہاتھ میں ایک پرچہ دبا ہوا تھا‘ میں نے فوراً ایک کر کے مٹھی کو کھول کر شیشی کو دیکھا تو گولیوں کی خالی شیشی دیکھی۔ میں نے جب دوسرے ہاتھ سے پرچہ کھول کر پڑھا تو میرے پاؤں سے زمین سرکتی محسوس ہوئی‘ پرچہ میں لکھا تھا۔

”بشیر!

میں اس پُرفریب دنیا میں ذلت و رسوائی کی زندگی گزارنے کی بجائے موت کو ترجیح دیتی ہوں‘ نیند آور گولیاں کھا کر ہمیشہ کے لیے اس دنیا کو چھوڑ کر جا رہی ہوں زندگی میں تو سکھ نہیں ملا شاید مر کر چین آ جائے۔

فقط بدنصیب

نغمہ“

میں نغمہ کو فوراً اسپتال لے کر بھاگا‘ میرے پاس نغمہ کے بھائی مستقیم کا موبائل نمبر موجود تھا اس لیے میں نے اس واقعہ کی اطلاع کر دی تھی۔ امی اور ابو بھی اطلاع ملتے پر اسپتال پہنچ گئے۔ امی جان بہت شرمندہ دکھائی دے رہی تھیں کہ انہوں نے غصے میں نغمہ کو نہ جانے کیا کیا باتیں سنا دی تھیں جو نغمہ برداشت نہ کر سکی اور خودکشی جیسا اقدام کر بیٹھی تھی۔ ڈاکٹرز نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی مگر بہت دیر ہو چکی تھی اس لیے وہ زندہ نہ بچ سکی۔

نغمہ کی تدفین ہو چکی تھی مگر علاقے کی پولیس اس معاملے کو قتل کا رنگ دینے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی مگر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ نغمہ کے بھائی مستقیم نے پولیس کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ان کی بہن نغمہ نفسیاتی مریضہ تھی اس لیے وہ گھر سے بھاگی اور اب مشکلات کا سامنا نہ کر سکنے کے باعث خودکشی کر لی۔ وہ صبر و شکر سے کام لیتی تو یہ انجام نہ ہوتا۔

مستقیم کے لیے مجھے جیل میں بھجوانے کا اس سے بہترین موقع پھر کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ نغمہ نے گھر سے بھاگ کر جو بھائی اور خاندان کی عزت پر داغ لگایا تھا وہ اس طرح دھل سکتا تھا مگر گھر سے بھاگنے کے بعد وہ بھائی کے دل سے اتر گئی تھی۔ اس لیے مجھ سے اس نے کسی قسم کا بھی انتقام لینے کو ترجیح نہیں دی۔

مجھے بھی اس واقعہ سے زندگی کا بہت بڑا سبق ملا تھا کہ آئندہ پھر کبھی موبائل پر کسی لڑکی سے دوستی نہیں کروں گا کیونکہ موبائل پر دوستیاں کرنے والی زیادہ تر جذباتی قسم کی گھر والوں سے بغاوت کا جذبہ رکھنے والی لڑکیاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے اچھا بھلا آدمی پریشانیوں میں گھر جاتا ہے اور اس کا مستقبل تابناک ہونے کی بجائے تاریک ہو جاتا ہے۔ خاندان میں طے ہونے والے رشتے ہی کی قدر سے بہتر ہوتے ہیں کیونکہ انسان خاندان کے لوگوں کے بارے میں واقفیت رکھتا ہے۔



آخری قسط

آتشِ زیرپا

سبینہ ابیذر سعید

وہ ظلم کی گرد سے اٹھنے والا ایک طوفان تھا' جس نے ظلم کا پنجہ مروڑ دیا' جس کے سبب وہ قانون کا بھی مجرم ٹھہرا۔

حالات کی بے رحم کروٹ اسے جرم و گناہ کی سفاک دنیا میں دھکیل کر لے گئی' اس کے سینے میں آتش فشاں دہکتے تھے اور پوروں میں انگارے سلگتے تھے جس کے سبب اسے ایک پل کو چین نہ تھا۔ مجرم اس کی سفاکی سے لرزتے تھے جرم کے بڑے بڑے چراغ اس نے چٹکی میں بجھادیئے تھے۔ قانون کے لمبے ہاتھ اس نے قانون کی ہی گردن میں باندھ دیئے تھے اس کا نام بڑے بڑوں کا پتا پانی کردیتا تھا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا اس سفاک شخص کے سینے میں ایک نرم و گداز دل دھڑکتا ہے' ایک نازک سی لڑکی اس کی کل کائنات ہے۔

پھر ایک دشمن جاں نے شب خوں مارا اور اس کی کائنات اجاڑ دی۔

اس کی وحشت دو چند ہوگئی' وہ آتش زیرپا قاتل کی تلاش میں قریہ قریہ بھٹک رہا تھا۔

پھر ایک جوہر شناس نے اس کی وحشت کو لگام دے کر مثبت سمت میں موڑ دیا۔

سطر سطر بکھرے لفظ لفظ تجسس' نئے افق کی ہی سنسنی خیز سلسلے وار کہانی

سچ کہوں تو نیلی کے قتل نے مجھے حواس باختہ کردیا تھا۔ مجھ پر پہلے ہی جانے کتنے مقدمات درج تھے' ان میں سے کچھ سچ تھے لیکن اکثر جھوٹ پر مبنی تھے۔ یہ ہمارا نظام ہی ایسا ہے یہاں جو سچا ہو وہ جائز رپورٹ درج کروانے کے لیے تھانوں کے چکر کاٹتا رہتا ہے لیکن کوئی اس کی فریاد سننے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس مجرم دندناتے ہوئے تھانے میں داخل ہوتے ہیں اور جسے قتل کرکے آئے ہوں اسی کے خاندان پر مقدمات درج کروادیتے ہیں جس شہر میں پولیس چند ماہ کے دودھ پیتے بچے پر مقدمہ دائر کردے اور عدالت اس کی ضمانت منظور کرے وہاں اور کسی مثال کی ضرورت ہی کہاں رہتی ہے۔

میں نے نیلی کو قتل کیا یا نہیں کیا تھا' یہ بات مجھ سے کسی نے نہیں پوچھی تھی۔ میں لاکھ قسمیں اٹھاتا لیکن کسی نے میرا یقین نہیں کرنا تھا۔ بے اعتباری کی فضا بھی تو ہم نے خود ہی پیدا کی ہے۔ سنا ہے ایک وقت ایسا بھی تھا کہ جب کوئی بزرگ اپنی پگڑی اتار کر قدموں میں رکھ دیتا تو سات خون معاف کردیے جاتے تھے۔ جب کوئی قرآن درمیان میں لے آتا تو دلائل رد کردیے جاتے تھے۔ قرآن کے مقابلے میں قرآن نہیں اٹھایا جاتا تھا اور قسم کے بعد دلیل نہیں مانگی جاتی تھی۔

پھر ایک نیا دور شروع ہوا' شیطان کا خون اپنی اصلیت دکھانے لگا۔ خدا جانے وہ کون سا پہلا شخص تھا جس نے جھوٹی قسم اٹھائی اور جھوٹا حلف اٹھایا۔ وہ جو کوئی بھی تھا میں اسے نہیں جانتا البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس نے نسل انسانی کے منہ پر کالک مل دی تھی اور انسان کو اعتبار اور یقین کے اعلیٰ مقام سے اٹھا کر بے غیرتی کی دلدل میں پھینک دیا تھا۔

شاید وہ شخص سب سے بڑا مظلوم تھا' جس کو غلط ثابت کرنے کے لیے جھوٹا حلف دیا گیا ہوگا اور جھوٹی قسم اٹھائی گئی ہوگی۔ وہ بے چارہ مدتوں تک سوچتا رہا ہوگا کہ اس سے پہلے ایسا کب ہوا؟ بھلا کوئی جھوٹی قسم بھی اٹھا سکتا ہے؟ یا پھر یہ بھی ممکن ہے لوگوں نے جھوٹی قسم پر یقین کر

کے اس پر تھوکا گیا ہو اور وہ وہیں زمین پر گر کر دم توڑ گیا ہو۔

بہرحال جو بھی ہوا تھا حقیقت یہی تھی کہ اب انسان کا قسم سے اعتبار اٹھ چکا ہے۔ اب عدالت قسم پر یقین نہیں کرتی۔ تھانے میں کوئی قسم اٹھائے تو عام سا کانسٹیبل بھی اسے ماں بہن کی گالیاں بکتا ہوا دو چار لگا دیتا ہے۔ اس لیے میں بھی لاکھ قسمیں اٹھاتا کسی نے میرا اعتبار نہیں کرنا تھا۔

بظاہر حالات میرے خلاف تھے۔ میرے ہاتھ میں خون آلود چھری تھی۔ نیلی کا خون میرے کپڑوں پر لگا ہوا تھا اور زیورات اور رقم والا ٹرنک کھلا پڑا تھا جس میں سے سب کچھ چرایا جا چکا تھا۔ میرے ہاتھ میں پکڑے لفافے میں اسی ٹرنک سے نکالی گئی رقم تھی۔ حالات میرے خلاف جا رہے تھے۔

اب تک کے تجربات سے میں جان چکا تھا کہ ہمارے ملک میں قتل کرنا کوئی جرم نہیں بڑے بڑے قاتل اور ڈکیت اسمبلیوں تک پہنچ کر قانون بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کہ جن کے خلاف قانون بنایا جاتا ہے وہ اس قانون کو بنانے کے دوران اپنی رائے دے رہے ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں اصل جرم قتل کرنے کے بعد پکڑے جانا ہے گرفتار ہونے والے پر جرم ثابت ہونے سے پہلے وہ سلوک کیا جاتا ہے کہ اسے نانی یاد آ جاتی ہے۔ اگر وہ دولت مند ہو تو پولیس اہلکار یہ دولت رگوں سے بھی کھینچ لانے میں ماہر ہیں۔ اگر وہ غریب ہو تو تھانہ میں موجود "چھتر" اسی کے لیے ہوتا ہے ہر کسی کا غصہ اسی پر اتارا جاتا ہے جو قابو آ چکا ہو۔

کسی کی بیوی لڑ کر میکے گئی ہوتی ہے اور وہ مجرم کو بیوی سمجھ کر مارتا ہے کسی کا بچہ نشے کی لت میں پڑ چکا ہوتا تو وہ مجرم کی تشریف کو اپنے بیٹے کی تشریف سمجھ کر چھتر مارتا ہے۔ کسی کی کمیٹی نہیں نکلی تو وہ کمیٹی والی خالہ کا غصہ مجرم پر نکالتا ہے۔ کسی کو اپنے افسر پر غصہ ہوتا ہے اور وہ افسر کو گالیاں بکتا ہوا پوری قوت سے ملزم کو چھتر مارتا ہے اور پھر مظلوم سی شکل بنا کر اپنے افسر کو سلیوٹ کرنے پہنچ جاتا ہے۔

حالات کے مارے یہ پولیس اہلکار رشوت لینے کے باوجود خوش نہیں ہوتے قدرت اپنا انتقام کچھ یوں لیتی ہے کہ ان سے سکون چھین لیتی ہے۔ یہ ملزم کی چھترول کرتے ہیں اس پر ڈنڈے برساتے ہیں اور اکثر اس کی ٹانگوں پر رولر پھیر کر عمر بھر کے لیے معذور بنا دیتے ہیں۔ ان کی گرفت میں آنے والا امام مسجد بھی ہو تو اگلے ہی دن وہ قتل اور ڈکیتی سمیت کئی وارداتوں کا اعتراف کر چکا ہوتا ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ مال بھی برآمد کروا دیتا ہے۔ چوبیس گھنٹے میں اس بیچارے کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ اپنے گھر ڈکیتی کا بھی اقبالی ہو جاتا ہے۔

دوسری جانب جو مجرم گرفتاری سے بچ جاتا ہے وہ آزاد نظر آتا ہے۔ لوگ اسے حاجی صاحب کہتے ہیں اور اپنے مسائل حل کروانے اس کے ڈیرے پہ آتے ہیں۔

میں بھی گرفتار نہیں ہونا چاہتا تھا اس لیے شمشم بانی کے کوٹھے سے فرار ہونا میرے لیے زندگی موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ قتل کی آواز بلند ہو چکی تھی۔ اب میں جتنی دیر کرتا اتنا ہی جال میں پھنستا چلا جاتا۔ میں تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ اچانک سامنے سے کوئی تیزی سے میری جانب بڑھا اور اس نے مجھے پنجاب کے خاص دیہاتی انداز میں جپھا ڈال لیا۔

جن لوگوں نے دیسی اسٹائل کی پہلوانی دیکھی ہے اور اکھاڑے میں پہلوانوں کو لڑتے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ کشتی کے دوران پہلوان مخالف کو اپنے بازوؤں میں لے کر "جپھا" ڈال لیتے ہیں اور پھر بازوؤں کے زور سے ہی بعض اوقات مخالف کی پسلیاں توڑ دیتے ہیں۔ اس خاص انداز سے پسلیاں توڑنا ہر پہلوان کے بس کی بات نہیں لیکن بہرحال وہ اپنے مخالف کو ہرانے میں کامیاب ضرور ہو جاتا ہے۔

مجھے جپھا ڈالنے والا اس داؤ میں اتنا ماہر نہیں تھا لیکن اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی میں نے اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے زور لگایا لیکن ناکام رہا۔ اس زور آزمائی میں وہ دو تین بار دیوار سے ٹکرایا لیکن مجھے چھوڑنے پر آمادہ

نہ تھا۔ اسے تھوڑا سا وقت اور مل جاتا تو کافی لوگ یہاں پہنچ جاتے اور پھر میرا نکلنا محال ہو جاتا۔

میں نے جھنجلاہٹ میں سر کی زوردار ٹکر اس کے ناک پر ماری جس سے وہ لڑکھڑا گیا اور اس کی گرفت قدرے ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا لیکن اس نے فوراً ہی دوبارہ اپنی گرفت مضبوط کی اور سر پیچھے کو جھکا لیا۔ اب وہ زور لگا کر مجھے پیچھے دیوار سے لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے مجھے بازوؤں کے اوپر سے پکڑ رکھا تھا جس کی وجہ سے میں خود کو کسی قدر بے بس سا محسوس کر رہا تھا۔ میرے سر کی مخصوص ٹکر کے بعد اس نے دوبارہ اپنی گرفت مضبوط کی تو کسی قدر میرا ایک بازو مخصوص دائرے میں حرکت کے قابل ہو گیا اتفاق سے میرے اسی ہاتھ میں خون آلود چھری تھی جو اس دھکم پیل اور زور آزمائی کے دوران بھی میرے ہاتھ سے نہ نکلی تھی۔ میں نے وہی چھری اس کے پہلو میں گھونپ دی اور ہاتھ کو تھوڑا سا گھماتے ہوئے چھری باہر نکال لی ہاتھ کو اس طرح گھمانے سے چھری کا چھوٹا کٹ گہرا ہو گیا اور زخم کھل گیا۔ وہ درد سے کسی بکرے کی مانند ڈکرایا اور مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے اسے دھکا دیا تو لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ حالات خطرناک رخ اختیار کرتے جا رہے تھے مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس بے وقت کی لڑائی میں وقت ضائع کرنا میرے لیے مزید خطرات کا باعث بن چکا ہے۔ میں تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا لیکن گلی میں شور کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔

یہ اندرون لاہور کا شاہی محلہ تھا اندرون لاہور میں اصل لاہور ہے جو بارہ دروازوں کے درمیان بند ہے۔ یہاں ابھی بھی بعض روایات بہت مضبوط ہیں۔ لاہور کے لوگ اپنے ہمسائے کو خطرے میں دیکھ کر دروازے بند نہیں کرتے بلکہ للکارتے ہوئے باہر نکل آتے ہیں۔ یہی اس وقت ہوا تھا۔

گلی میں اٹھنے والا شور اور بھاگ دوڑ کی آوازیں واضح کر رہی تھیں کہ شبنم بائی کے کوٹھے پر قتل ہو چکا ہے۔ باہر اکٹھے ہونے والے لوگ کسی بھی پل کوٹھے میں داخل ہو سکتے تھے میں واپس اوپر کی جانب بھاگا مجھے اس چوہے دان میں نہیں پھنسنا تھا ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی چیخ بلند کرنے والی اتفاقاً وہاں آ گئی تھی یا اس قتل میں اسی کا ہاتھ تھا یہ ممکن تھا کہ قاتل نے اپنا آپ بچانے کے لیے جو پھندا لگایا ہوا اس میں میرا پاؤں پڑتے ہی رسی کھینچنے والا بھی وہی ہو۔

میرے ساتھ جو بھی ہوا اس کا پتا بھی تب ہی چلنا تھا جب میں یہاں سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو پاتا۔ میں اوپر جاتے ہوئے اپنے پیچھے دروازے بند کرتا چلا آیا تھا یہ عارضی طور پر وقت حاصل کرنے کا ایک حربہ تھا۔ ورنہ میں بخوبی جانتا تھا کہ اس پرانے دروازوں کی کنڈیاں اتنی مضبوط ہرگز نہیں تھیں کہ آنے والوں کو زیادہ دیر روک سکیں۔

کوٹھے کی چھت پر پہنچ کر میں نے تیزی سے دائیں بائیں دیکھا پرانے طرز تعمیر پر بنے ہوئے گھر آپس میں ملے ہوئے تھے ان کی دیواریں اتنی اونچی نہیں تھیں کہ کمال جست انہیں پھلانگ نہ سکے۔ نچلی منزلوں پر دروازے توڑنے کا شور سنائی دے رہا تھا۔ لوگ شاید زور لگا کر دروازے کے قبضے اکھاڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں تیزی سے دائیں جانب بڑھا اور منڈیر پر ہاتھ رکھ کر اسے پھلانگتا ہوا ساتھ والی چھت پر چلا گیا۔

اس چھت پر کوئی نہیں تھا غالباً گلی میں اٹھنے والے شور اور قتل کے شور نے سب کو متوجہ کر رکھا تھا۔ اس گھر کے مکین بھی شاید گلی میں کھڑے تماشا دیکھ رہے ہوں گے میرے چھت پر آنے سے ہلکی سی دھمک ضرور ہوئی لیکن کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا گیا۔ اس دھمک سے کہیں زیادہ توجہ کا حامل وہ قاتل تھا جس کے بارے میں اکثریت کا خیال تھا کہ وہ ابھی تک شبنم بائی کے کوٹھے کے کسی کمرے میں پناہ لیے ہوئے ہے۔ میں اس چھت پر بھی زیادہ دیر نہیں رک سکتا تھا۔ اس لیے فوراً ہی اگلے کوٹھے کی دیوار پھلانگ گیا۔

اچانک گلی میں پولیس سائرن کی آواز گونجنے لگی۔ تھانہ اس کوٹھے کے ساتھ ہی تھا شاید فون کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوئی ہو کسی نے پیدل جا کر ہی تھانے میں اطلاع کر دی ہوگی۔ اس گلی میں گاڑیوں کا آنا بھی انتہائی مشکل تھا۔ اس لیے پولیس نے گلی کے باہر ہی گاڑی کھڑی کر کے سائرن چلا دیا تھا۔ اہلکار یقیناً فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شبنم بائی کے گھر تک آ پہنچے ہوں گے۔

جب انہیں پتا چلا ہوگا کہ قتل کا الزام جس پر لگا ہے وہ بڑھکیں مارنے کی بجائے بائی کے کوٹھے پر کسی کمرے میں پناہ لیے ہوئے ہے تو انہیں اپنی بہادری اور فرض شناسی یاد آ گئی ہوگی۔ اس لیے انہوں نے بھی دروازہ توڑنے کے کارخیر میں حصہ لیا۔

میں تیزی سے ایک گھر کی چھت سے دوسرے گھر کی چھت پر جاتے ہوئے اس منحوس کوٹھے سے دور جاتا جا رہا تھا موت ایک مرتبہ پھر میرے تعاقب میں تھی اور میں اسے جل دینے کی کوشش کر رہا تھا آگے جا کر مکانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اگلے مکان کی چھت کافی دوری درمیان میں گلی تھی۔

کبھی کبھی یونہی بھاگتے بھاگتے ایک دم ہمارے سامنے گہری کھائی آ جاتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ پیچھے ہٹ کے دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا کھائی میں کود جایا جائے۔ یہ دونوں فیصلے خطرناک ہوتے ہیں لیکن ہمیشہ ایک تیسرا راستہ بھی موجود ہوتا ہے۔ یہ تیسرا راستہ کم خطرناک ہوتا ہے لیکن اسے تلاش کرنا ہی اصل کام ہے۔

میں نے تیزی سے اردگرد کا جائزہ لیا اور پھر میری آنکھوں نے وہ تیسرا راستہ تلاش کر لیا۔ یہ سیڑھیاں تھیں جو گھر کے اندر جا رہی تھیں۔ میں واپس نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اب تک یہ راز کھل چکا تھا کہ خوفزدہ قاتل کمرے میں نہیں چھپا ہوا بلکہ کہیں فرار ہو چکا ہے۔ میرے فرار کا راستہ تلاش کرنے والوں کا دھیان یقیناً چھت کی جانب ہی جاتا تھا۔ اس کے علاوہ فرار کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔

میں اب آگے بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ گلی کی صورت ایک گہری کھائی میری منتظر تھی میں کسی فلم کا کردار نہیں تھا جو طویل جمپ لگا کر گلی کے پار دوسری چھت پر پہنچ جاتا۔ مجھے اب انہی سیڑھیوں کی جانب بڑھنا تھا۔ یہ فیصلہ مجھے محفوظ راستہ بھی مہیا کر سکتا تھا اور مشکل میں بھی ڈال سکتا تھا۔

مجھے علم نہیں تھا کہ یہ کس کا گھر ہے اور یہاں کتنے لوگ موجود ہیں۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اور پھر سیڑھیوں سے نیچے اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس گھر کا نقشہ بھی ایسا ہی تھا جیسا اندرون لاہور کے اکثر چھوٹے اور تنگ گھروں کا نقشہ ہے۔ ہر منزل پر ایک آدھ کمرہ اور تنگ سی سیڑھیاں، میں تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے احتیاط کا دامن چھوڑ بیٹھا۔ اس وقت میرا مقصد بس کسی بھی طرح یہاں سے نکلنا تھا۔

پہلی منزل سے اترتے ہوئے مجھے اپنے پیچھے تالیوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو دو اسلحہ بردار افراد نے مجھ پر رائفلیں تان رکھی تھیں جبکہ ان کے پیچھے ایک سوکھی سی خاتون کھڑی تالیاں بجا رہی تھی۔ میرے قدم رکتے ہی اس نے کہا۔

”یہاں کھیل ختم ہو چکا ہے اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔“

میں نے ایک نظر اسلحہ برداروں کو دیکھا وہ مکمل طور پر ہوشیار نظر آ رہے تھے اگر میں اس منحوس عورت کی ہدایت پر عمل نہ کرتا تو وہ یقیناً گولی چلا دیتے۔

میں ان کے گھر میں موجود تھا اور اسی علاقہ میں ایک قتل کا الزام بھی مجھ پر ڈالا جا چکا تھا۔ میرے ہسٹری ریکارڈ کے مطابق میں خطرناک دہشت گرد تھا جو پولیس مقابلوں کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ اگر وہ مجھے گولی مارنے کا حکم دے دیتی تو بھی اس پر کوئی الزام نہ آتا کیونکہ وہ صاف کہہ سکتی تھی کہ اپنے گھر گھسنے والے دہشت گرد کو اس نے اپنے دفاع میں قتل کیا۔

میں ہدایت کے مطابق نیچے بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے میرے پاس اسلحہ کے نام پر چھری تک نہ تھی اس لیے ہاتھ اوپر اٹھانے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ میرے اس طرح بیٹھنے پر اس عورت کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اشارہ کیا تو ایک گن مین نے میرے قریب آ کر میری تلاشی لینا شروع کردی۔

آنے سے پہلے وہ اپنی رائفل اسی عورت کے قدموں میں رکھ آیا تھا۔ لہٰذا میرا اس پر ہاتھ ڈالنا یا مزاحمت کی کوشش کرنا خود اپنے آپ کو قتل کرانے کے مترادف ہوتا۔ میں نے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اپنی تسلی کرنے دی۔ میری تلاشی لے کر اس نے اس عورت کی جانب اطمینان بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سر ہلایا اور واپس اپنی جگہ چلا گیا۔

مجھ سے کچھ برآمد نہ ہونے کے بعد ان کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اس عورت نے واپس مڑتے ہوئے ان دونوں گن مینوں سے کہا۔

''اسے میرے کمرے میں لے آؤ۔''

اپنی بات کہہ کر اس نے جواب سنے بنا ہی ایک جانب قدم بڑھا دیے۔ ایک شخص میرے قریب آیا اور پشت کی جانب کھڑے ہو کر رائفل میری پشت سے لگا کر بولا۔

''چل او یے، کھڑا ہوجا بہت آرام کرلیا میرے شہزادے نے۔''

اس کا طنزیہ لہجہ سن کر میرا خون کھول اٹھا لیکن اس وقت مجھے جذباتیت کی بجائے ٹھنڈے مزاج سے کام لینا تھا۔ ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے تو دروازے کے سامنے ہی مسہری پر وہی عورت شاہانہ انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا اور دونوں اسلحہ بردار میرے پیچھے اپنی اپنی رائفل کی نال میری پشت سے لگائے کھڑے تھے۔ وہ چند لمحے یونہی نگاہوں میں تولتی رہی پھر کہنے لگی۔

''میاں کن چکروں میں تھے، کچھ چرانا ہوتا تو کوئی ہتھیار بھی پاس رکھتے ہیں، یا پھر شکیلہ بائی کے کوٹھے پر کوئی دل چرانے آئے ہو؟''

اس کے لب ولہجے سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ بھی شبنم بائی کی طرح کسی نائیکہ کا گھر ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اسے ابھی تک شبنم بائی کے کوٹھے پر ہونے والے قتل کا علم نہیں تھا اگر اسے علم ہوتا تو اس کا لہجہ بدل چکا ہوتا اور وہ اتنے آرام سے میٹھی بات نہیں کررہی ہوتی۔ صورت حال کسی حد تک میرے حق میں تھی۔

وہ محض ایک نہتے چور کو قتل نہیں کرسکتی تھی البتہ یہ ضرور تھا کہ اگر وہ مجھے پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیتی تو یہ بات میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی نوبت یہاں تک آنے سے پہلے ہی مجھے صورت حال اپنے حق میں ہموار کرنی تھی۔ وہ عورت میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہی شکیلہ بائی ہے میں نے لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر کہا۔

''شکیلہ بائی دل چرانے والے اسلحہ نہیں لاتے، یہ دنیا کا نہیں دلوں کا سودا ہے۔''

شکیلہ بائی مسکرائی۔ ''دل چرانے والے جب کوٹھے پر آتے ہیں تو گھر بیچ کر ساری رقم یہاں قدموں میں ڈھیر کردیتے ہیں۔'' اس نے اپنے پاؤں کی جانب اشارہ کیا۔

''اگر دل چرانے والا کنگال ہو تو پھر کیا کرے؟'' میں نے اس کے بے ساختہ اور طنزیہ جواب کے بدلے میں سوال کردیا۔

''کنگال لوگ تو کہیں ڈوب مرکر نشہ کرتے ہیں اور دھرتی کا بوجھ ختم کرتے ہیں۔''

''شکیلہ بائی تم نے پوری بات نہیں کی۔ کنگال لوگ اگر دل چرانے پر آ جائیں تو شہزادیاں محل کا عیش وآرام چھوڑ کر جھونپڑی میں چلی آتی ہیں اور اگر دل والے اپنی آئی پر آجائیں تو مکان بیچ کر دولت نہیں لاتے بلکہ کوٹھے کی اصل دولت اٹھا کر گھر لے جاتے ہیں۔''

میری بات سن کر شکیلہ بائی کی آنکھوں میں داد

تحسین کی جھلک نظر آئی۔ اس نے تالی بجاتے ہوئے داد دی اور کہا۔

”تو پھر اب تم کسے اٹھا کر گھر میں بسانے کا خواب دیکھ رہے ہو۔؟“

میں نے ایک نظر ڈھلتی عمر کی اس نائیکہ کو دیکھا اور جوا کھیلتے ہوئے کہا۔

”میں تو شکیلہ بائی کو اٹھانے آیا تھا اس نے خود مجھے ہی اغوا کر رکھا ہے۔“

شکیلہ بائی طنزیہ مسکرائی اور کہنے لگی۔

”میرا خیال ہے اب اس کھیل کو یہیں ختم کر دیا جائے سچ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی یہ بتاؤ لیلیٰ کے علاوہ اور کتنے لوگوں کا قتل کر چکے ہو۔“

شکیلہ بائی کے منہ سے یہ جملہ نکلتے ہی جیسے کسی نے میرے سر پر بم دے مارا اسے سب معلوم تھا اور وہ محض مجھ سے بلی چوہے والا کھیل کھیل رہی تھی۔ اس سے پہلے میں اس کے محافظوں سے اسلحہ چھیننے کی کوشش کرتا اور وہاں سے فرار ہونے کا راستہ تلاش کرتا وہ جیسے میرا ارادہ بھانپ گئی۔

”فکر نہ کرو میں تمہیں نہ تو گرفتار کراؤں گی اور نہ ہی کسی کے حوالے کروں گی میں تمہیں یہاں سے بچ کر جانے دوں گی۔“

یہ میرے لیے دوسرا بڑا جھٹکا تھا۔ میں نے اس کے انسانیت میں دو دو قتل کیے تھے باہر پورے بازار میں شور مچا ہوا تھا پولیس میری تلاش میں تھی اور اندر یہ نائیکہ کوئی تعلق اور رشتہ ہونے بنا مجھے بچانا چاہتی تھی۔

میں اب اس بازار کے مزاج کو سمجھ چکا تھا۔ یہاں مطلب اور مفاد کے بغیر یوں کسی اجنبی کی مدد نہیں کی جاتی تھی۔ جہاں دلوں کے سودے ہوں وہاں ہمدردی کھوٹے سکے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ دل کی خرید و فروخت کا ظالمانہ کاروبار ہے جب جب دل کی قیمت لگائی گئی تب تب ہوس کا بازار سجا ہے دل تو انمول ہوا کرتے ہیں یہ بِک جائیں تو بھی ان کی قیمت کا تعین نہیں ہو سکتا۔

یہ تو عام دنیا کی باتیں ہیں طوائفوں کے نگر کے تو اصول ہی مختلف ہیں۔ یہاں رحم کھایا جائے یا کسی سے ہمدردی جتائی جائے تو کاروبار ہی ٹھپ ہو جائیں۔ اس لیے مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ بلاوجہ مجھے اس مصیبت سے کیوں نکالنے کی کوشش کرے گی۔

وہ چاہتی تو مجھے پولیس کے حوالے کر کے اپنے آپ کو معتبر ثابت کر سکتی تھی۔ پولیس کے ساتھ اچھے تعلقات ہی اس دھندے کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ اسی طرح جس کے پولیس سے تعلقات خراب ہو جائیں اس کے گاہک واپس لوٹنے لگتے ہیں۔ یہ بھی چاہتی تو مجھے پولیس کے حوالے کر کے خود کو تھانیدار کے قریب کر سکتی تھی جس سے اسے فائدہ پہنچ سکتا تھا۔

اس کا رویہ اس سے برعکس تھا۔ اسی لیے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کا کوئی ایسا مفاد مجھ سے وابستہ ہے جس کی خاطر وہ مجھ پر احسان کرنا چاہ رہی ہے۔ میرے لیے اس وقت سب سے اہم اس جگہ سے باہر نکلنا تھا۔ یہ محلہ میرے لیے خطرناک ہو چکا تھا اس کے باوجود میں خود کو سوال کرنے سے نہ روک پایا اور اس سے پوچھ ہی لیا کہ اس کے بدلے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ وہ اسی ادا سے بے نیازی سے مسکرائی اور کہنے لگی۔

”زیادہ کچھ نہیں ہوگا ایک دو قتل تم کر ہی آئے ہو اس سے پہلے بھی کیے ہوں گے بس ایک ایسا قتل بھی تمہارے سر پڑ جائے گا۔“

”کیا مطلب، کون سا قتل؟“ میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

میں نے اس سے پہلے بھی قتل کیے تھے لیکن وہ سب اپنے دفاع میں کیے تھے یا پھر انتقامی جذبات کے طور پر کیے تھے میں پیشہ ور قاتل نہیں تھا آج ہی ایک دم سے وہ دو ایسے قتل میرے کھاتے میں ڈالے جا رہے تھے جن سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

میرے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر شکیلہ بائی ہنسنے لگی۔

''آج اس گلی میں صرف لیلیٰ ہی قتل نہیں ہوئی بلکہ ایک اور طوائف چنبیلی بھی قتل ہوگئی ہے۔ وہ میرے ساتھ والے کوٹھے میں رہتی تھی۔ تم اسی کا کوٹھا پھلانگ کر میرے کوٹھے کی چھت پر آئے تھے۔ اس کی وجہ سے میرا دھندا چوپٹ ہو رہا تھا اس لیے اس کا مرنا بہت ضروری تھا اسے میں نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہے اس کے چہرے پر بھی تیزاب پھینک دیا ہے تم گرفتار ہوگئے تو اس کے قتل کی الگ سے تفتیش شروع ہوجائے گی اور اس کا الزام مجھ پر ہی آجائے گا۔ اب تم میرے لیے امید کی کرن بنے ہو۔ اگر تم فرار ہونے میں کامیاب ہوجاتے ہو تو اس قتل پر کوئی بھی تفتیش نہیں کرے گا بلکہ اسے براہ راست تمہارے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا۔ اس طرح تم ہی اس قتل کے اصل ذمہ دار سمجھے جاؤ گے پولیس سمجھے گی کہ تم نے میرے گھر کے بجائے اس کے گھر کا انتخاب کیا تھا اور وہاں سے فرار ہوتے وقت تم نے کسی وجہ سے چنبیلی کو بھی قتل کردیا تھا۔''

میں لمحوں میں ساری کہانی سمجھ گیا۔ وہ اپنا ملبہ مجھ پر ڈال کر مجھے یہاں سے نکالنا چاہتی تھی بعد میں مجھے گرفتار کرکے یہ وارداتیں بھی اگلوائی جائیں تب وہ مکر جاتی تو میں کچھ نہ کرپاتا۔ یہ سیدھا سادا سا سچ لو، کچھ دو کا اصول تھا۔

میں نے چند لمحوں میں صورت حال کا جائزہ لیا میرے لیے اس وقت سب سے اہم یہاں سے کسی بھی طرح نکلنا تھا۔ اگر میں یہاں پر پھنس جاتا تو پھر شاید کبھی بھی اپنے اصل مقصد میں کامیاب نہ ہوپاتا۔ اگر میں نکل جانے میں کامیاب ہوجاتا تو پھر امکان تھا کہ میں اپنے اصل مقصد کو پورا کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔

دوسری بات یہ بھی تھی کہ میں جب بھی گرفتار ہوجاتا مجھ پر بنائے گئے پہلے مقدمات ہی مجھے پھانسی کے پھندے پر پہنچانے کے لیے کافی تھے۔

اگر سچ کہوں تو گرفتاری کے بعد شاید ہی مجھ پر مقدمات چلائے جاتے مجھ پر جس حد تک مقدمات درج ہوچکے تھے اور ان میں جو جو دفعات لگائی جاچکی تھیں ان سے آدھی بھی کسی ملزم پر ہوں تو اسے عدالت میں پیش کرنے کے بجائے پولیس مقابلے میں مار دیا جاتا ہے۔ اس کے ذمہ دار یہ مجرم خود بھی ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے مجرم اگر تاکافی ثبوتوں اور گواہوں کے منحرف ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر ہتھکنڈوں کی بناء پر رہا ہونے میں کامیاب ہوجائیں تو وہ اپنی رہائی کے بعد اس تھانہ کے عملے کو مار دیتے ہیں جنہوں نے اسے گرفتار کیا ہو یہی سلوک ان کے خلاف گواہی دینے والے افراد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس لیے پولیس یا تو ایسے خطرناک اشتہاریوں کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی یا اور انہیں ان کا کام کرنے دیتی ہے۔

جنوبی پنجاب میں کچے کا علاقہ ایسے اشتہاریوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ سب خوفزدہ پولیس اہلکاروں اور افسروں کی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ دوسری جانب اگر پولیس انہیں گرفتار کر ہی لے تو پھر انہیں زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاتا یا تو انہیں پولیس مقابلے میں پار کردیا جاتا ہے یا پھر ان کے کسی مخالف سے ساز باز کرکے رہائی کے فوراً بعد مخالفین کی گولیوں کا نشانہ بنوا دیا جاتا ہے۔ اس طرح پولیس اہلکار ان کے ساتھیوں کے عتاب سے بھی بچ جاتے ہیں اور ان کی توجہ ان کے ہی مخالفین کی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور ان اشتہاریوں کے بدلے سے بھی محفوظ ہوجاتے ہیں یا یہ ایک تیر سے دو شکار کے مترادف ہے۔

میں لاکھ انکار کروں لیکن یہ حقیقت تھی کہ میرا شمار ایسے ہی مجرموں میں ہونے لگا تھا۔ کچہری کے احاطے میں کی جانے والی فائرنگ سے لے کر شاہد ملتانی کے ہمراہ پولیس مقابلے تک میرے کھاتے میں اس قدر مقدمات درج ہوچکے تھے کہ اب مجھے ناپ بدمعاشوں میں شمار کیا جانے لگا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ میرے نام یا چہرے کی بھنک اور سرکاری ریکارڈ اس بازار تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ البتہ یہ لازم تھا کہ میرے فرار کے بعد جنہاں والے کے

ایک ایک گھر کی سخت تلاشی لی گئی ہوگی تا کہ زخمی کمالے کو برآمد کیا جاسکے۔

شکیلہ بائی کی نظریں مجھ پر تھیں اور میں سود وضیاع کے چکر میں الجھا ہوا تھا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کرلیا مجھ پر ایک قتل ڈالا جاتا یا سو قتل ڈال دیے جاتے میں محفوظ تب تک ہی تھا جب تک پولیس کی گرفت سے باہر تھا۔ اس لیے میں نے ایک اور قتل قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

میرا جواب سنتے ہی شکیلہ بائی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اسے یقین دلانے کے لیے کہا۔

"شکیلہ بائی تم ابھی مجھے نہیں جانتی میں اس قدر قتل کرچکا ہوں کہ اب مزید کسی قتل سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا اس لیے اگر یہ قتل میرے کھاتے میں ڈالنے سے تمہاری جان بچ جائے گی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم یہ شوق پورا کرسکتی ہو۔"

میرے جواب سے شکیلہ بائی کے محافظوں کے تنے ہوئے اعصاب بھی ڈھیلے پڑگئے۔ اب میں اس قتل میں ان کا حصے دار تھا۔ اس لیے بائی کے اشارے پر انہوں نے اپنی رائفلوں کا رخ نیچے کرلیا اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

یہ ایک طرح سے مجھے بتایا گیا تھا کہ اب میں اس کے لیے قابل اعتبار ہوں میں جانتا تھا کہ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے اس کے محافظ بظاہر کمرے سے باہر چلے گئے تھے لیکن اب بھی مجھ پر ان کی گہری نظر ہوگی اور میری ایک غلط حرکت میری موت کا باعث بن سکتی تھی۔

میرا فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا جو مجھے خطرے میں ڈال دے اس لیے میں آنکھیں بند کرکے ایک طرف بیٹھ گیا۔ بائی کمرے سے باہر چلی گئی اور کچھ دیر بعد کھانا لے آئی۔ میں نے کھانا کھاتے ہوئے اس سے پوچھا کہ مجھے کب یہاں سے نکالے گی اس نے کہا۔

"تم چاہو تو ابھی چلے جاؤ میں تمہیں نہیں روکوں گی لیکن ابھی حالات ٹھیک نہیں ہیں باہر تمہیں تلاش کیا جارہا ہے اس لیے رات ڈھلنے دو صبح یہاں رات ہونے لگتی ہے تم اگر 7 یا 8 بجے جاؤ گے تو اس بازار کے بھی مکین سو رہے ہوں گے۔ اور گرد موجود بازاروں میں دکانیں کھلنا شروع ہوچکی ہوں گی اور کاروباری سرگرمیاں آنکھ کھول کر جاگ گئی ہوں گی اس وقت تم انہی میں شامل ہوکر یہاں سے نکل سکتے ہو۔

ابھی بظاہر رات ہے لیکن اس وقت یہ بازار خوب روشن ہے تمہیں رات کے اندھیرے میں فرار ہونا ہے لیکن یہ ذہن میں رکھنا کہ اس بازار میں رات تب آتی ہے جب شرفا کے شہر میں دن ہوتا ہے۔ میں نے سر ہلایا تو اس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ابھی کافی وقت پڑا ہے تم چاہو تو اطمینان سے سو سکتے ہو۔ جب وقت ہوگا میں تمہیں جگا دوں گی۔"

پھر وہ کمرے سے باہر کی جانب چل دی۔ دروازے کے پاس اس نے مڑ کر میری جانب دیکھا اور کہنے لگی۔

"یہ شک اپنے ذہن سے نکال دو کہ میں تمہیں دھوکے سے پکڑوا دوں گی اگر میں نے ایسا کرنا ہوتا تو پھر اس وقت تمہیں گرفتار کروا دیتی جب تم میرے گن مینوں کے نشانے پر تھے۔ تمہاری گرفتاری میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے تم پکڑے گئے تو ساتھ والے گھر میں پڑی لاش میرے گلے کا پھندا بن جائے گی۔ اس لیے تمہیں ہر حال میں یہاں سے فرار کروانا میرے لیے بہت ضروری ہے۔"

وہ لحظہ بھر کو سانس لینے کے لیے رکی اور پھر کہنے لگی۔

"میں تم پر احسان نہیں کررہی بلکہ اپنا جرم تمہارے سر ڈال رہی ہوں۔ ویسے ہی جیسے لوگ یہاں آکر اپنا جرم ہمارے سر ڈال جاتے ہیں۔ یہ دنیا ہے پیارے، یہاں ایسے ہی ہوتا ہے تمہاری زندگی میں ہی میری زندگی ہے تم یہاں سے نکل کر کسی گاڑی کے نیچے آجاؤ یا تمہارا کوئی مخالف تمہیں گولی مار دے تو میری بلا سے۔"

میں اس کی جانب حیرت سے تکنے لگا۔ وہ بنا کوئی لگی رکھے بنا صاف صاف جتا رہی تھی میں نے گہری سانس لی

اور مسہری پر لیٹ گیا۔ دل اس نائیکہ پر اعتبار کرنے کا مشورہ دے رہا تھا اس لیے میں نے اطمینان سے کچھ دیر سونے کا فیصلہ کرلیا۔ آگے کا سفر غیر واضح تھا۔ خدا جانے کب آرام کا موقع میسر آئے۔ اس لیے ضروری تھا کہ میں کچھ دیر آرام کرلوں۔

میں کافی دیر تک سوتا رہا پھر مجھے شکیلہ بائی نے ہی آکر اٹھایا۔ فرار کا وقت آچکا تھا۔ اب آگے کیا ہونا تھا یہ میری قسمت پر تھا۔ عین ممکن تھا کہ کسی اشتہاری کی طرح مجھے قتل کرادیا جاتے۔ میں یہاں سے باہر نکلوں تو معلوم ہو کہ لیلیٰ کا ہی کوئی عزیز میری سپاری لے چکا ہو یا پھر انتقامی جذبات کی بھینٹ چڑھا دیا جاؤں۔ مجھے تو فقط ایک ٹھکانہ چاہیے تھا جہاں میں یہاں سے فرار ہو کر پہنچ سکوں لیکن فی الحال پہلا مرحلہ باہر جانے کا تھا۔

شکیلہ بائی مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ اس نے دروازے کی چٹخنی ہٹائی اور کہنے لگی۔

"یہاں تک میری ذمہ داری تھی اب آگے تمہیں خود اپنا بچاؤ کرنا ہے کوشش کرو یہاں سے نکل کر جتنی دور داتا دربار کے احاطے میں پہنچ جاؤ وہاں کسی کونے میں بیٹھ جانا اور گھٹنوں میں سر دے کر سوچنا کہ اب آگے کہاں جانا ہے۔ فی الحال اس سے بہتر پناہ گاہ کہیں نہیں ملے گی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ یہ گلی پار کرنے میں مجھے بہت احتیاط سے کام لینا پڑا۔ اس کے بعد تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس علاقے سے دور ہوتا چلا گیا مختلف گلیاں مڑتے مڑتے میں شاہی قلعہ کے پچھلے چھوٹے دروازے سے ہوتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔

بادشاہی مسجد اپنے پورے جلال کے ساتھ میرے سامنے کھڑی تھی اور اپنی کم مائیگی اور گناہوں کا احساس لیے میں اس سے نظریں چراتا ہوا سڑک پر آگیا آہستہ آہستہ چلتا جارہا تھا میرا رخ داتا دربار کی جانب ہی تھا۔

داتا کے دامن میں سیکڑوں لوگ پناہ لیتے ہیں۔ انہیں صرف پناہ ہی نہیں ملتی بلکہ کھانا بھی ملتا ہے مجھ جیسے دنیادار آتے ہیں پناہ لیتے ہیں کھانا کھاتے ہیں اور پھر نیا راستہ نظر آنے پر نظریں چراتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی آتے ہیں جو گناہوں کی پوٹلی اٹھائے لڑکھڑاتے ہوئے آتے ہیں اور اپنے سے زیادہ وزنی پوٹلی داتا کے قدموں میں ڈال کر ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ داتا کا دامن پکڑتے ہیں اور پھر اٹھنے سے انکار کردیتے ہیں۔ انہیں نہ پناہ سے مطلب ہوتی ہے اور نہ کھانے کی فکر بس ڈھیٹ بن کر کسی سوال کی طرح پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ پھر ان کے لیے خاص در کھلتا ہے۔ گنج بخش کے دربار سے ایک خاص سلسلہ جاری ہوتا ہے جو صرف انہی کے لیے مخصوص ہے۔

ان منگتوں کو اس در میں پناہ ملتی ہے اور پھر ہم جیسے ان کے مقام و مرتبہ کا اندازہ لگاتے رہ جاتے ہیں۔

میں اسی داتا دربار کی جانب گامزن تھا لیکن میرے ذہن میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ لیلیٰ کا قاتل بھی اب میرا دشمن بن چکا تھا۔ اب مجھے اس کو بھی تلاش کرکے کیفر کردار تک پہنچانا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں خود اسی بازار سے فرار ہو رہا تھا۔ میں یہاں سے جان چھڑانا چاہتا تھا لیکن آخری لمحے میں راشد ملتانی نے مجھے روک لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو نے مجھے حوصلہ دیا تھا کہ میں جلد ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اب جب مجھے امید کی کرن نظر آئی تھی تو کسی نے مجھے وہاں سے نکلنے پر مجبور کردیا تھا۔

بازار حسن نے مجھ پر دو ایسے قتل ڈال دیے تھے جو میں نے نہیں کیے تھے۔ یہ اس بازار کی پرانی روایت ہے۔ یہاں کسی کا گناہ کسی کے سر ڈالا جاتا ہے اور کسی کے جرم میں کسی اور کو پھنسا دیا جاتا ہے۔ یہاں نہ جرم اپنا ہوتا ہے اور نہ سزا اپنی ہوتی ہے یہاں تک کہ دولت بھی اپنی نہیں ہوتی۔ ادائیں تک چرائی جاتی ہیں۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ میں بازار حسن سے بھاگ کر داتا کے دامن میں پناہ لینے جارہا تھا۔ ظلم یہ تھا کہ اس پر بھی ندامت نہیں تھی اور حق یہ تھا کہ اپنے تمام تر گناہوں کے باوجود یقین کامل تھا کہ

بازار حسن سے قتل کے دو مقدمات گلے میں لٹکائے نکلنے والے کو بھی داتا دربار میں پناہ مل جائے گی۔

مجھے ایک دفعہ بھی محسوس نہ ہوا کہ داتا دربار کے باہر مجھے روک لیا جائے گا۔ اپنے ہی خیالوں میں گم یونہی چلتا چلتا داتا دربار پہنچ گیا۔ اندر جا کر پانی پیا اور لنگر سے کھانا کھایا۔ اس کے بعد ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ حالات مجھے اپنی ہی رو میں بہائے لیے جا رہے تھے اور میں کسی لاوارث تنکے کی طرح ڈولتا ہوا تقدیر کے قدموں کے نشانات پر چلتا ہوا جانے کس سمت جا رہا تھا۔

داتا دربار کی دیوار سے ٹیک لگائے یونہی بیٹھے بیٹھے مجھ پر قنوطیت سی طاری ہونے لگی۔ یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے اب میں کبھی اپنا انتقام نہیں لے پاؤں گا۔ جب سے جناں والا سے نکلا تھا تب سے سارا رابطہ ہی ٹوٹ گیا تھا۔ میرا زندہ بچنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا لیکن اپنے مقصد سے دور ہوتے جانا بھی کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ میں نے شدت سے دعا مانگی کہ مجھے کوئی راستہ مل جائے میں حق پر تھا۔ مجھے نے جو ظلم کیا تھا اس کا حساب چکانا میرا فرض بنتا تھا۔ میں اتنا عظیم نہیں تھا کہ اسے معاف کر پاتا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

یہ دنیا کا کوئی بازار یا چوراہا نہیں تھا جہاں کالا جٹ اپنی آنکھوں پر بند باندھتا یہ داتا کے دربار کا احاطہ تھا۔ یہاں بڑے بڑے سلطانوں نے آنسو بہائے تھے۔ دنیا بھر کو اپنے قدموں تلے زیر کرنے والے یہاں آ کر خود زیر ہو جاتے ہیں۔ میں خاموشی سے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور آنسوؤں سے چہرہ بھیگتا جا رہا تھا۔

مایوسی کے عالم میں اچانک خیال آیا کہ میں ابھی بالکل تنہا نہیں ہوں میری جیب میں موبائل فون موجود تھا جس میں راشد ملتانی کا نمبر تھا وہی راشد ملتانی جو اب تک کئی بار میری مدد کو آ چکا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اب میں تنہا کالا جٹ نہیں رہا تھا۔ جناں والی سمیت اس ساری پٹی میں میرا نام چل رہا تھا۔ جرائم کی دنیا کے بڑے بڑے نام اب چند ہی روز میں مجھ سے ملنے کی خواہش کرنے والے تھے۔ کیونکہ اس سارے علاقے میں راشد ملتانی کے سارے دھندے میری نگرانی میں ہونے تھے۔ میں نے بازار حسن کی ایک دکان میں بیٹھ کر راشد ملتانی سے اس معاملے پر گفتگو کی تھی۔ میری خود اعتمادی لوٹنے لگی۔ میں نہ صرف اپنا انتقام لے سکتا تھا بلکہ مضبوط حوالہ بھی رکھتا تھا۔ میں نے جیب سے موبائل فون نکالا اس میں صرف ایک ہی نمبر فیڈ کیا گیا تھا جو راشد ملتانی کا تھا میں نے نمبر ملایا تو دوسری ہی بیل کے بعد راشد ملتانی کی آواز سنائی دی۔

"ہاں جٹ سنا ہے دو دو قتل کر دیے ہیں شیر ہے یار پکا شیر ہے۔" میں چونک اٹھا۔

راشد ملتانی بے خبر نہ تھا اس کے ذرائع بہت مضبوط تھے جو اسے پل پل کی خبروں سے آگاہ کرتے رہتے تھے میں نے کہا۔

"وہ قتل میں نے نہیں کیے بلکہ مجھ پر الزام لگایا گیا ہے۔ اصل قاتل کوئی اور ہے۔" میری بات سن کر راشد ملتانی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور بولا۔

"کس دنیا میں رہتے ہو؟ تمہاری اس بات پر کون یقین کرے گا میں جانتا ہوں تم نے انہیں قتل نہیں کیا کیونکہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولتے لیکن میرا مشورہ ہے کہ تم کھلے بندوں یہ بات کرو، اگر تم کہو گے کہ تم نے قتل نہیں کیا تو لوگ تمہاری بات پر یقین کریں گے۔ اس کے باوجود وہ تمہیں ہی قاتل سمجھیں گے کہ قتل تو اسی نے کیا تھا لیکن ڈر گیا ہے۔ اس کے برعکس تم اعلانیہ کہو کہ ہاں تم نے ہی دو قتل کیے ہیں تم دیکھنا کہ عام لوگ تو دور ان کا اصل قاتل بھی تم سے ڈرنے لگے گا۔ یہ نفسیاتی گیم ہوتی ہے بازی اسی کے ہاتھ آتی ہے جو پہلے اچھا داؤ مار جائے۔ اب وقت تمہارے پاس آیا ہے اسے گنواؤ گے تو خسارے میں رہو گے۔"

"تو پھر اب میں کیا کروں؟" میں نے سوال پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

"تم صرف اتنا کرو کہ اگر تم سے کوئی پوچھے تو اس

وقت کا انکار نہ کرو باقی معاملات میں خود دیکھ لوں گا۔ تم اس وقت کہاں ہو؟" بات ختم کر کے اس نے اگلا سوال پوچھ لیا۔

"داتا دربار کے احاطے میں ہوں۔"

"او کے، میں آ تا ہوں تم باہر نکل کر دربار مارکیٹ کے شروع میں موجود جوس کارنر پر آ جاؤ۔" اس کے ساتھ ہی اس نے فون کاٹ دیا۔

راشد ملتانی سے بات ہو جانے کے بعد میں ایک دفعہ پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تھا وہ بھی سلسلے جڑ گئے تھے جو ایک ہی پل میں مجھ سے کھو گئے تھے میں سرشاری کی سی کیفیت میں اٹھا اور دربار کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ایک ذرا لاوارث ہو جانے والا کمالا جٹ انگڑائی لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ایک سہارا بھی کافی ہوتا ہے۔ داتا دربار کے احاطے میں دوبارہ سے مل جانے والا یہ سہارا میرا اعتماد بحال کرنے کے لیے کافی تھا۔

میں دربار کے احاطے سے نکلتا چلا گیا۔ اب میں نے ایک بار بھی سر اٹھا کر دربار کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ شاید یہ ہم انا پرستوں کی فطرت کا حصہ ہے۔ ہم پر مصیبت آ جائے تو سہاروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ دعائیں، مناجات اور لمبے لمبے سجدے شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی مصیبت ٹلتی نظر آتی ہے ویسے ہی ہمارا رویہ بدلنے لگتا ہے۔ ہم تمام عبادات اور سہارے بھول جاتے ہیں۔

میں بھی آیا تو میرے ذہن میں تھا کہ مجھے صرف داتا دربار میں پناہ مل سکتی ہے۔ اس وقت یہ دربار میرے لیے سب سے بڑی پناہ گاہ تھی۔

اب صورت حال بدل چکی تھی۔ راشد ملتانی سے ہونے والی گفتگو کے بعد میں پل بھر کے لیے بھی نہ رکا تھا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میرے قدم زمین میں دھنس گئے۔ میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے واپس مڑا اور پھر دیوانہ وار بھاگتا ہوا دربار کے صحن کو عبور کر کے مزار کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو چکے تھے۔ میں نے فاتحہ پڑھی اور الٹے قدموں دربار پر نظریں جمائے پیچھے کی جانب آنا شروع ہو گیا۔ اسی طرح چلتا ہوا سیڑھیوں تک پہنچا اور پھر سر جھکائے دربار سے باہر آ گیا۔

تھوڑے ہی فاصلے پر وہ جوس کارنر تھا۔ جس کی نشاندہی راشد ملتانی نے کی تھی میں وہاں پہنچ کر راشد ملتانی کا انتظار کرنے لگا مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ چند ہی لمحوں میں پہنچ گیا اس کی سیاہ لینڈ کروزر میں اس کے اسلحہ بردار ساتھی نظر آ رہے تھے۔ سرعام اسلحہ کی نمائش پر پابندی تھی لیکن لینڈ کروزر میں بیٹھے اسلحہ برداروں سے شاید پورے لاہور میں سوال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسی گاڑیوں اور اسلحہ کو دیکھتے ہی پولیس اہلکار خود راستہ چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ عام طور پر ان میں بیٹھے شخص کے ہاتھ اس قدر وسیع ہوتے ہیں کہ اس کے ماتھے پر پڑنے والی شکن ہی پولیس افسروں کو معطل کرانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

راشد ملتانی نے مجھے لینڈ کروزر میں آنے کا اشارہ کیا اور میرے بیٹھتے ہی گاڑی انجانی منزلوں کی جانب چل پڑی۔ ہم داتا دربار سے دور نکل آئے تو راشد ملتانی مجھ سے بازار حسن میں پیش آنے والے واقعات کا پوچھنے لگا۔ میں نے اسے ساری تفصیلات بتا دیں۔ وہ ساتھ ساتھ مختصر تبصرے اور بھاری بھرکم گالیاں بکتا رہا۔ شکیلہ بائی کے ذکر پر تو جیسے اس کے منہ سے گالیوں کا آبشار ابل پڑا۔

میں نے راشد ملتانی سے پوچھا کہ اب میں کہاں رہوں گا؟ کیا ہم لاہور سے باہر جا رہے ہیں تو اس نے یہ کہہ کر مجھے پریشان کر دیا کہ مجھے اب بھی اسی بازار حسن میں رہنا ہے۔ میں نے اس کی بات سن کر حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

"میں وہیں سے تو فرار ہوا ہوں وہاں مجھ پر قتل کے دو دو مقدمات درج ہو چکے ہوں گے اور پولیس مجھے ڈھونڈ رہی ہوگی اور پولیس ہی نہیں بلکہ جو دو طوائفیں قتل ہوئی

ہیں ان کے ساتھی اور چاہنے والے ابھی میری تلاش میں ہوں گے۔ پھر میں کیسے ان حالات میں وہاں رہ سکتا ہوں۔ ابھی تو قتل ہونے والے کے قل بھی نہیں ہوئے۔"

شاہد ملتانی نے میری جانب دیکھا اور سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"کمالے میری بات غور سے سنو۔ اگر تم آج بھاگے تو ساری عمر بھاگتے رہو گے یہ دنیا طاقتوروں کی ہے آج تمہارا اصل امتحان ہے۔ تم ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرو کہ تم نے ان دونوں کو قتل کیا ہے اور اگر کوئی اور تمہارے سامنے سر اٹھائے گا تو تم اسے بھی انہی دونوں کے پاس بھیج دو گے پھر دیکھنا یہی سب کتے کی طرح قدموں میں لوٹنے لگیں گے۔ یہاں پیار بھی تب تک ہوتا ہے جب تک جیب میں پیسے اور جان محفوظ ہو جب اپنی جان پر بن آئے تو پھر پیار خود ہی اپنی اوقات دکھا دیتا ہے۔"

بات ختم کر کے راشد ملتانی نے کسی کو فون کیا اور کچھ احکامات دینے شروع کر دیے۔ مجھے اتنا ہی اندازہ ہوا کہ کسی مکان کے لین دین کا کوئی چکر ہے میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور آنکھیں موند لیں۔ راشد ملتانی نے بھی مجھ سے مزید کوئی بات نہ کی۔ وہ فون پر اپنے معاملات نمٹاتا رہا کچھ دیر بعد گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو میں نے آنکھیں کھول لیں۔ راشد ملتانی کے باہر نکلتے ہی میں تیزی سے باہر آ گیا اردگرد کی عمارتوں کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم اندرون لاہور کی کسی گلی نما بازار میں کھڑے ہیں۔ ہمارے سامنے ایک تنگ سی گلی تھی۔ راشد ملتانی اسی گلی میں چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ تیسرے مکان پر پہنچ کر اس نے دستک دی تو دروازہ جھٹ سے یوں کھل گیا جیسے کوئی دروازے کے پاس کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ مکان سے ایک مخنی سا شخص باہر نکلا۔ اس نے خاموشی سے چابی راشد ملتانی کو دی اور ایک طرف چلا گیا۔ راشد ملتانی نے وہ چابی مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"کمالے اب یہ تمہارا گھر ہے۔ کچھ ہی دیر میں یہاں جدید اسلحہ اور گولہ بارود پہنچ جائے گا۔ میں علاقے کے ایس ایچ او کو بھی کہلوا دوں گا وہ اب تمہاری جانب نہیں دیکھے گا۔ بدلے میں اسے مکمل نذرانہ پیش کیا جاتا رہے گا۔ تم نے بس اس علاقہ پر اپنی دھاک بٹھانی ہے۔ اس علاقے میں ہونے والی ہر واردات کی خبر کسی نہ کسی ذرائع سے پولیس اور مجرم دونوں طرف سے پہنچ جاتی ہے۔ اگر تم اس علاقہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے تو زیر زمین دنیا ہی نہیں پولیس بھی تمہاری ہو جائے گی۔ ہمارے پاس بہترین موقع ہے۔ اسے ضائع کرنے کی بجائے اس سے فائدہ اٹھاؤ۔"

ابھی راشد ملتانی کی گفتگو جاری ہی تھی کہ گلی کے باہر دو تین گاڑیوں کے ٹائر چرچرانے کی آوازیں سنائی دیں اور پھر کچھ افراد لکڑی کی پیٹیاں اٹھائے ہماری جانب آ گئے۔ راشد ملتانی نے انہیں سامان اس مکان کے اندر رکھنے کا کہا۔ ہم بھی ان کے ساتھ اندر آ گئے جبکہ وہ ایک کمرے میں یہ پیٹیاں ترتیب سے رکھنے لگے۔ راشد ملتانی نے ایک پیٹی کا ڈھکن اوپر اٹھایا تو مجھے اس میں موجود گولیاں نظر آنے لگیں۔ باقی پیٹیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ان سب میں جدید اسلحہ ہے۔ دستی بم سے لے کر کلاشنکوف، ریپیٹر اور دیگر رائفلیں بھی شامل ہیں۔ دو پیٹیاں صرف گولیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ سب تمہارے کام آئیں گی۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرا شہر تباہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں نے تو صرف اپنے دشمنوں سے حساب برابر کرنا ہے۔"

میری بات سن کر اس نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔

"کمالے پہلے اپنے آپ کو طاقت ور تو بنا لو۔ شیر کے شکار کے لیے اس سے زیادہ طاقت ور ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اردگرد کے گیدڑ بھی راستے میں آ کھڑے ہوتے ہیں۔"

میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے سر ہلایا تو اس نے

کہا۔

"تم جتھاں والے میں میرے دھندوں کے انچارج ہو اور اس کی بات سمجھتے ہوئے سر ہلایا تو اس نے کہا۔

"اب تم جتھاں والے میں میرے دھندوں کے انچارج ہو اور اس بازار حسن میں بھی تم ہی میرے مخالفین کے سامنے کھڑے ہو گے آج ہم یہاں اتنی فائرنگ کریں گے کہ کل پورا بازار تمہیں سلام کرنے آئے گا۔"

سارا سامان مکان کے اندر رکھنے کے بعد ہم نے ان پیٹیوں کے ڈھکن کھولے اور مختلف رائفلیں نکال لیں۔ پھر بے شمار راؤنڈ نکال کر سامنے رکھ لیے اور ضرورت کے مطابق سب نے تیاریاں شروع کر دیں۔ ہمارے میگزین ہی نہیں جیبیں بھی گولیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ شاہد ملتانی کے کہنے پر ہم سب باہر آئے اور ایک ساتھ ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ دس افراد بیک وقت ہیوی اور لائٹ گنز سے مسلسل فائرنگ کر رہے تھے اردگرد سے چیخوں کی آوازیں سنائی دیں۔ لوگ خوف کے مارے چیخ رہے تھے لیکن جلد ہی خاموش ہو کر دبک گئے۔ مسلسل فائرنگ سے فضا میں بارود کی بو رچ بس گئی تھی اور دھواں پھیل گیا تھا۔ ہم نے لگ بھگ گولیوں کی ایک پیٹی اسی ہوائی فائرنگ میں استعمال کر دی تھی۔

مکان کے اندر آئے تو راشد ملتانی نے نوٹوں کی ایک گڈی مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہارے کام آنے کی ہے سمجھو کہ تم جتنی جلدی اس علاقہ میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرو گے اتنی ہی جلدی اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے گے علاقہ کے تھانیدار کو میں پیغام بھیج چکا ہوں۔ اب اس سے مل کر جاؤں گا۔ ویسے تو اسے ہڈی ڈال دی گئی ہے لیکن ابھی یہاں جس قدر فائرنگ کی گئی ہے اس کے بعد وہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس سوروں کو یا تو ہڈی رام کر لی ہے یا پھر یہ بھی ڈنڈے کی سنتے ہیں۔"

شاہد ملتانی گیا تو میں وہیں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ میں کیا تھا، کیا کرتا تھا اور کس طرف چل پڑا تھا۔

عجیب وغریب سی زندگی تھی جو مزید الجھتی چلی جا رہی تھی۔

اس رات میں نے ساری صورت حال کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ملتانی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر مجھے تکھے مل سے انتقام لینا تھا تو پھر اس سے زیادہ طاقتور بننا ضروری تھا۔ ہمارے کامیاب لوگوں کی ایک جیب میں مجرم اور دوسری میں قانون ہوتا ہے جبکہ ان کے پیچھے دولت کا پہاڑ کھڑا ہوتا ہے۔ مجھے بھی اب اسی سطح پر آنا تھا۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد میں نے وہی کیا جو شاہد ملتانی چاہتا تھا۔

میں دو سال بازار حسن سے ملحقہ علاقے میں رہا اور اس دوران میری دھاک بیٹھ گئی۔ چھوٹے موٹے جرائم پیشہ اپنے جھگڑوں کے فیصلے کے لیے میرے پاس آنے لگے۔ بازار حسن کی کئی نائیکہ میرا نام سن کر کانپ جاتی تھیں۔ ان دو سالوں میں کمالے جٹ نے کئی لوگوں کو دوسری دنیا پہنچا دیا البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ بھی خطاکار تھے۔ میں نے کبھی مظلوم پر ظلم نہیں کیا اور ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں خود بھی ظلم کا شکار ہو کر اس دلدل میں آیا تھا کمال جٹ کو کمالا جٹ بنانے والے وہی تھے جو معاشرے میں طاقت کے بل بوتے پر شرفا کی پگڑیاں اچھالتے پھرتے ہیں اور غریبوں کی بیٹیوں کی عزتیں لوٹتے پھرتے ہیں۔ میری تو لڑائی ہی ان کے خلاف تھی پھر میں بھلا کیسے ان کے ساتھ کھڑا ہو سکتا تھا۔ اپنی دہشت قائم رکھتے ہوئے بھی میں نے کبھی کسی مظلوم اور غریب پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا البتہ ایسے بگڑے ہوئے پھنے خانوں کو ضرور قتل کر دیا تھا جو خود کو دھرتی کا خدا سمجھتے تھے۔

یہ دو سال میری زندگی کے ہنگامہ خیز سال ثابت ہوئے۔ پولیس ریکارڈ میں میرا نام اوپر سے اوپر آتا رہا اور میرے خلاف درجنوں مقدمات درج ہو چکے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہی مقدمات درج کرنے والا تھانیدار رات میرے پاس حاضری دیا کرتا تھا اور میرے دشمنوں کو میرے گھر لا کر سزائیں دیا کرتا تھا۔ میں نے ان دو سالوں میں ایک نیا روپ اختیار کر لیا تھا۔ تکھے مل کو

ہونے والے نقصانات کی اطلاع مجھے ملتی رہتی تھی اور اس تک ہر بار میرا نام پہنچتا رہتا تھا کہ اسے یہ نقصان پہنچانے والا کون ہے۔ وہ میرے خون کا پیاسا تھا لیکن میرے خلاف تھی پر آکر میرے مقابل کھڑے ہونے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

میں نے اس سارے عرصہ میں کائنات سے کوئی رابطہ نہیں کیا لیکن اس کو بھول بھی نہ پایا تھا۔ وہ میری محبت تھی۔ ہم نے اکٹھے زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے۔ یہاں تک کہ وہ میرے ساتھ جہاں والا بھی آ گئی تھی لیکن یہ سب ماضی کی باتیں تھیں۔ تب کمالا جٹ ڈاکٹر بن رہا تھا۔ وہ معاشرے کا با عزت شہری تھا اور اس کے سامنے روشن مستقبل تھا اب حالات بدل چکے تھے میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر اسے کہوں کہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ محبت خود غرض ہوتی ہے لیکن اتنی خود غرض نہیں ہوتی کہ اپنے ہی محبوب کی زندگی برباد کر دے۔ میں جس دنیا میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس کا انجام پھانسی کا پھندا یا اندھی گولی ہی تھا۔ اس راہ کے مسافر زیادہ طویل عمر نہیں جی پاتے۔ چند ایک کو چھوڑ کر زیادہ تر ایسے مجرم جوانی یا ادھیڑ عمری میں ہی گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اب اگر ان حالات میں کائنات کو اپنے ساتھ زندگی بسر کرنے کا کہتا تو یہ اس معصوم کی زندگی تباہ کرنے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔ اب وہ خواب بکھر چکے تھے۔ میں کمال جٹ سے کمالا بن چکا تھا اور کائنات کے ڈاکٹر بننے کے آخری مراحل میں تھی۔ شاید اب تک وہ مجھے ویسے ہی بھول چکی ہو۔ اس لیے میں نے لاہور میں رہتے ہوئے اس سے کبھی رابطہ نہیں کیا۔ میں ان علاقوں اور ان گلیوں میں بھی جانے سے کتراتا تھا جہاں اس کا سامنا ہونے کا امکان ہو۔ اس کے باوجود خدا گواہ ہے کہ میری کوئی رات اس کی یاد سے خالی نہیں گئی۔ وہ میری دھڑکن بن چکی تھی اور دھڑکن سے جان چھڑانے والے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ان دو سالوں میں میرا کائنات سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ یہ محبت بھی عجیب ہوتی ہے جب پاس ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک دن کی جدائی بھی مار ڈالے گی اور جب دور ہوں تو دو دو سال گزر جانے کے باوجود انسان زندہ رہتا ہے ہجر و وصال کی اس کیفیت سے باہر بھی محبت کا الگ ہی وجود ہے۔

اسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ عجیب سے احساسات ہوتے ہیں یا پھر میرے ساتھ ہی یہ سب ہوا کہ دو سال تک میں کائنات کی یاد میں زندگی کا سفر طے کرتا رہا اور اب جبکہ میں اس کے لیے قابل نفرت بدمعاش بن چکا تھا تو ایک دم اس کے بنا رہنا دوبھر ہو گیا۔ وہ اس شدت سے میرے اعصاب پر سوار ہوئی کہ مجھے شکست تسلیم کرنا پڑی۔ چاہے اسے دور سے ہی دیکھ لیتا لیکن اب اسے دیکھنا ضروری ہو گیا۔ پہلے میں اس لیے اس سے دور بھاگتا رہا کہ اس کی زندگی میں ایک قاتل، بدمعاش اور اشتہاری کی کوئی جگہ نہیں ہے اب میرے ہی پاس ہزاروں تاویلیں موجود تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے سمجھ سکتی ہے اسے تو معلوم ہے کہ میں بے گناہ اور مظلوم تھا۔ وہ مجھ سے ویسی ہی محبت کرتی ہوگی۔ اگر وہ مجھ سے خفا ہوئی تو بھی میں اسے منا لوں گا۔

ایک ہی پل میں میری حالت غیر ہونے لگی تھی۔ میں خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔ ایک طرف مجھ پر دیوانگی کا دورہ پڑا ہوا تھا دوسری طرف صورت حال یہ تھی کہ میرے پاس کائنات کا رابطہ نمبر تک نہیں تھا۔ تمام تعلقات اور تمام رابطے میں بازار حسن کے اس پار چھوڑ آیا تھا۔ میں اپنے ساتھ مقدس رشتوں اور مخلص دوستوں کو اس بازار کے کیچڑ میں نہیں لایا تھا۔

میں نے کائنات سے ملنے کا فیصلہ تو کر لیا لیکن اب اس کا نمبر حاصل کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس سمیت میرا کسی سے بھی رابطہ نہیں تھا۔ سب سے کٹ جانے والے کے لیے دو سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ میرے پاس صرف ایک کلیو تھا وہ یہ کہ مجھے اپنے میڈیکل کالج کا معلوم تھا میں اور کائنات اکٹھے پڑھتے تھے اگر اس نے تعلیمی سلسلہ

جاری رکھا ہوا تھا تو اسی کالج سے اس کا معلوم ہو سکتا تھا لیکن اس قدر طلبا میں اسے تلاش کر لینا ناممکن نہیں تو اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں کسی بھی طرح اسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔

اگلے ہی دن میں کالج جا پہنچا۔ عجیب سے احساسات تھے یہ وہی کالج تھا جہاں میں ڈاکٹر بننے کے لیے آیا تھا اور اب ایک خطرناک مجرم بن کر دوبارہ اسی ادارے میں داخل ہو رہا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ ویسے ہی پڑھاکو طالب علم اور دل کے ہاتھوں ہار جانے والے نوجوان۔ بہتر مستقبل کے خواب دیکھتے ہوئے یہاں تک آئے تھے اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ کالا جٹ جیسا نامی اشتہاری ان کے درمیان موجود ہے تو شاید وہ اصل صورت حال کا معلوم کیے بنا ہی چیختے چلاتے بھاگ جاتے۔ میں نے دو سال میں ہی جرائم کی دنیا میں خاصا نام کما لیا تھا لیکن میڈیکل کے طالب علم ہونا اخبارات اور خبروں پر زیادہ توجہ نہیں دے پاتے۔ اس لیے انہیں اگر میرا نام معلوم بھی تھا تو شکل سے نہیں پہچانتے تھے۔ میں کالج کے اندر کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ کس جانب جاؤں اور اپنی کائنات کو کہاں تلاش کروں کہ اچانک سامنے سے مہرین آتی نظر آئی۔ وہ ہماری کلاس فیلو تھی میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا وہ ایک لمحے کے لیے چونکی اور پھر اس نے مجھے پہچان لیا حیرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ لیے۔ میری داستان کالج میں دو سال پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ مہرین سے ہی معلوم ہوا کہ کائنات مجھے نہیں بھولی اور نہ ہی وہ مجھ سے دست بردار ہوئی تھی۔ وہ آج بھی میرے لوٹ آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میرے گروپ نے ہاؤس جاب شروع کر دی تھی لیکن آج کسی وجہ سے کالج آئے تھے۔ مہرین کائنات کی ہمراز تھی۔ میں اس سے کائنات کی باتیں سنتا رہا اور پھر میری آنکھ کے گوشے نم ہونے لگے۔ کائنات کو معلوم تھا کہ کمال جٹ اب کالا بدمعاش بن چکا ہے لیکن اس کے باوجود وہ میرے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ اس نے کئی بار مہرین سے کہا تھا کہ اگر میں اسے مل گئی تو وہ اپنی ڈاکٹری بھول کر میرے ساتھ چلی جائے گی۔ وہ مجھے کہیں دور لے جانا چاہتی تھی لیکن اگر نا کام رہتی تو پھر میرے ساتھ ایسی ہی زندگی گزار لیتی جس میں زندگی کی ضمانت نہیں ہے۔ میں مہرین سے کائنات کی باتیں سنتا رہا اور پھر مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی میں اپنی کائنات کو ملنا چاہتا تھا مہرین نے بتایا کہ وہ بھی آج کالج آئی ہے اور اس وقت کینٹین میں ہے۔ میں اور مہرین کینٹین کی جانب چل پڑے میں سوچ رہا تھا کہ آج میں کائنات کو پھر سے پا چکا ہوں لیکن مجھے علم نہ تھا کہ تقدیر دور کھڑی مجھ پر ہنس رہی ہے۔ ہمارے ساتھ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم میدان مار چکے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر کوئی اور کھیل کھیل رہی تھی۔ دراصل ہم سب ہی زندگی کی بساط پر سجے مہرے ہیں کوئی پیادہ ہے تو کوئی بادشاہ یا وزیر ہے۔ سب کا یہی خیال ہے کہ میدان ہمارے ہاتھ میں ہے لیکن ہم جب مہرے ہی ہیں اس سے زیادہ ہماری اوقات نہیں۔ اصل کھیل اس کا ہوتا ہے جو بساط سے باہر ان مہروں کو حرکت دیتا ہے۔ ہم اکثر اس حرکت دینے والے کو بھول جاتے ہیں اور خود کو اصلی بادشاہ سمجھ لیتے ہیں اس کی مرضی کے بنا تو حرکت تک ممکن نہیں ہے۔ وہ جسے چاہے اٹھا کر بساط سے باہر پھینک دے اور جسے چاہے پیادے سے وزیر بنا ڈالے۔ میرے ساتھ ہی وہی سلوک ہونے والا تھا جو شطرنج کی بساط پر گھوڑے کو شکار کرنے کی خواہش رکھنے والے پیادے کے ساتھ ہوتا ہے گھوڑا ڈھائی قدم چل کر نہ صرف خود کو پیادے سے بچا لیتا ہے بلکہ اس کے کسی ساتھی کی جان بھی لے لیتا ہے۔ یہاں زندگی کی بساط پر بھی ایسا ہی کھیل شروع ہو چکا تھا کینٹین میں کائنات مجھے دور سے ہی نظر آ گئی تھی۔ وہ ایسی ہی تھی ہزاروں میں بھی دور سے ہی نظر آ جاتی تھی اس نے ساتھ کھڑی لڑکی سے کوئی بات کرتے کرتے گردن گھمائی اور

پھر جیسے ساکت ہوگئی۔ دنیا جیسے تھم سی گئی تھی۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں اور پھر جیسے وہاں اور کوئی نہ رہا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں مجھے پہچان لیا تھا اس کے چہرے پر بے یقینی کی سی کیفیت تھی جیسے ابھی کوئی خواب ختم ہوجائے گا۔ ہم دونوں ایک سی کیفیت سے گزر رہے تھے۔ شاید محبت کرنے والے کبھی ملن کے لمحات میں اسی کیفیت سے دوچار ہوتے ہوں۔ کائنات نے میری جانب قدم بڑھایا یہ اس بات کی علامت تھی کہ اس نے مجھے میری تمام تر خامیوں سمیت قبول کرلیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر حقارت کا اظہار نہیں کیا تھا نہ ہی اس کے چہرے سے نفرت چھلک رہی تھی۔ وہ میری تھی اور میری جانب بڑھ رہی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ اب میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں پولیس کو مطلوب ہوں اس کے باوجود میری کائنات میری جانب آرہی تھی۔ اچانک چلتے چلتے وہ لڑکھڑائی اور دھم سے زمین پر آگری۔ گولی چلنے کی آواز میں نے بھی سنی تھی اس کے باوجود ایک لمحے کے لیے مجھے اندازہ نہ ہوسکا کہ کیا ہوا ہے۔ میں ماحول سے کٹ کر اپنی کائنات کو کھو چکا تھا وہ زمین پر گری تو جیسے چھن سے کوئی خواب ٹوٹ گیا میں دوبارہ ماحول میں لوٹ آیا۔ کینٹین میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ میں تیزی سے کائنات کی جانب گیا۔ وہ خون میں لت پت تھی۔ اس کے سینے سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا میں نے دیوانگی کے عالم میں خون روکنے کی کوشش کی لیکن سیکنڈ کے سوویں حصے میں میرا ہاتھ خون سے بھر گیا۔ میں نے کائنات کو بانہوں میں اٹھایا تاکہ طبی امداد کے لیے لے جاسکوں اسی لمحے اس نے آنکھ کھولی اور مسکرا کر میری جانب دیکھا اس کے ساتھ ہی اس کی گردن ڈھلک گئی۔ کائنات دم توڑ چکی تھی شاید اسے مرنے کے لیے میری بانہوں کا انتظار تھا اس کی آخری مسکراہٹ میں اذیت، کرب اور اطمینان کے پیغامات تھے میں کائنات کا لاشہ پیچھے رکھنے کی بجائے خود بھی نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ اسی لمحے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کائنات کو گولی کس نے ماری؟ یہ سوال ذہن میں آتے ہی جیسے میں ہوش میں آگیا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ارد گرد دیکھنے لگا سبھی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ ان میں کائنات کا قاتل کون تھا اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بھاگنے والوں میں قاتل بھی تھا اور معصوم طالب علم بھی اسی دوران ایک اور فائر ہوا میں نے تیزی سے اس جانب دیکھا تو فضا میں بلند ایک ہاتھ نظر آیا جس میں پسٹل چمک رہا تھا اس شخص نے ہجوم کو خود سے دور رکھنے اور فرار ہونے کے لیے فائر کیا تھا اس کا خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ اس کے ساتھ بھاگنے والے اس فائر پر رخ بدل کر مخالف سمت بھاگنے لگے۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ جس ممکنہ موت سے بچ کر وہ بھاگ رہے تھے۔ وہ موت بھی ان کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی۔ لوگوں کے مخالف سمت بھاگنے سے قاتل کو یہ فائدہ ہوگیا کہ اب اس کے فرار کا راستہ صاف تھا لیکن اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگیا کہ اب وہ میری نظروں میں آگیا تھا میں اس کے تعاقب میں بھاگنے لگا۔ وہ کافی دور نکل چکا تھا اور اتنے فاصلے سے اسے پکڑنا اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ وہ اس قتل کی نیت سے آیا تھا کہ اس لیے اس نے اپنے فرار کا منصوبہ پہلے سے بنا رکھا ہوگا عین ممکن تھا کہ وہ گیٹ پر پہنچتا اور وہاں اس کا کوئی ساتھی پہلے سے تیار بیٹھا ہوا جو اسے ساتھ بٹھا کر نو دو گیارہ ہوجاتا اور میں پاگلوں کی طرح کھڑا اسے تلاش کرتا رہتا۔ میں جانتا تھا کہ ہمارے درمیان جتنا فاصلہ پیدا ہوچکا ہے اس کی وجہ سے میں اسے پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا لیکن اس کے باوجود میں اس کے تعاقب میں بھاگ رہا تھا۔ اسی دوران ایک جگہ مڑتے ہوئے اس کا چہرہ میرے سامنے آیا۔ وہ جعفر ایرانی تھا وہی جعفر ایرانی جو کائنات کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور کائنات نے اسے ٹھکرا کر مجھے اپنانے کا فیصلہ کیا تھا اب اسی جعفر ایرانی نے کائنات کو ماردیا تھا یہ بھی عجیب فلسفہ ہے کہ محبوب اگر میرا نہ ہوا تو اسے کسی کا بھی نہ ہونے دیں خدا جانے یہ کیا

فلسفہ ہے لیکن ہمارے ہاں اکثر ناکام عاشقوں نے یہی فلسفہ اپنا رکھا ہے کہیں اپنے ہی محبوب کے چہرے پر تیزاب پھینک کر اس کا چہرہ مسخ کر دیا جاتا ہے کہیں قتل کر دیا جاتا ہے اور کہیں اسی محبوب کو اغوا کر کے گینگ ریپ کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کہیں اس کی برہنہ ویڈیو کلپ بنائے جاتے ہیں تو کہیں کوئی اور سزا دی جاتی ہے۔ عجیب محبت ہے اور عجیب ہی فلسفہ ہے۔ کم از کم میرے نزدیک یہ محبت نہیں بلکہ ہوس کی تکمیل میں ناکامی کے بعد انتقامی جذبہ ہے۔ یہی حرکتیں بتاتی ہیں کہ کون عاشق تھا اور کون ہوس کا پجاری تھا۔ محبت کا نقاب اوڑھ کر ہوس کی تکمیل کرنے والے یہیں آ کر بے نقاب ہوتے ہیں۔ جعفر ایرانی فرار ہو گیا تھا لیکن اب اس کا مجھ سے بچنا ممکن نہ تھا۔ وہ میری زندگی چھین کر گیا تھا میں اب اس کی زندگی چھین لینے والا تھا میرے بڑے دشمنوں میں جعفر ایرانی بھی شامل ہو چکا تھا۔

جعفر ایرانی تو وقتی طور پر میری پہنچ سے باہر نکل چکا تھا لیکن مہرین بھاگتی ہوئی میری جانب آ گئی اس کا سانس پھول رہا تھا اس نے لمحہ بھر کے لیے رک کر گہری سانس لی تاکہ تنفس کا عمل بہتر ہو سکے پھر کچھ بتانے لگی۔ اس کا سانس پھول چکا تھا اس لیے وہ صحیح طور پر مجھ سے بات نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ چاہتی ہو کہ میں یہاں سے فوری طور پر چلا جاؤں۔ میرے لیے یہ ممکن نہ تھا میں جان چکا تھا کہ میری کائنات اب اس دنیا میں نہیں رہی لیکن اس کی لاش کو یوں چھوڑ کر جانا بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔ ابھی جو کچھ ہوا وہ ذہنی طور پر بہت بڑے جھٹکے سے کم نہ تھا میرے اور کائنات کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ تھا لیکن جعفر ایرانی جیسے کینہ پرور شخص نے اسے ہمیشہ کے فاصلے میں تبدیل کر دیا تھا مہرین کو ابھی شاید اندازہ نہیں ہوا تھا کہ کائنات مر چکی ہے۔ وہ مجھے کھینچتی ہوئی باہر لائی اور اپنی گاڑی میں دھکیل کر گاڑی بھگاتی ہوئی وہاں سے نکلتی چلی گئی۔

مہرین مجھے اپنے فلیٹ پر لے گئی یہاں یہ چار لڑکیاں رہتی تھیں۔ اتفاق سے چاروں میری کلاس فیلو رہ چکی تھیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اس وقت وہاں کوئی نہ تھا کائنات کے کا دھچکا ایسا تھا میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا تھا میرے پاس اس کے سوا اب بچا ہی کیا تھا مہرین نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ان کا پورا گروپ مہرین کی ایمبولینس کے ساتھ اسپتال گیا ہے وہاں اسی کے استاد سرجن موجود ہیں اس لیے بے فکر ہوں۔ کائنات جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اسے بتایا تا کہ کائنات اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ ایک ہی گولی نے اس کے دل کے پاس ایسی جگہ بنائی کہ وہ لمحوں میں دم توڑ گئی۔ اس کی آخری مسکراہٹ اور آخری نظر میرا دل چیر رہی تھی۔ میں نے بے تابی سے کہا۔

”مہرین میں بھی اسپتال جانا چاہتا ہوں، مجھے میری کائنات کے پاس جانے سے مت روکو اب بھی نہ جا سکا تو کبھی بھی اسے نہیں دیکھ پاؤں گا۔“ مہرین نے سختی سے روک دیا۔ اس نے بتایا کہ میں جب جعفر ایرانی کے پیچھے بھاگ رہا تھا تو اس کے چیلوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا کہ کمالا جٹ کالج میں آیا ہے اور اسی نے کائنات کو گولی ماری ہے۔ جعفر ایرانی یہاں کا طالب علم ہے لیکن کمالا جٹ اب پولیس کو مطلوب خطرناک دہشت گرد تھا۔ کچھ اور لوگوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ آج انہوں نے بھی کمالے جٹ کو کالج میں دیکھا ہے۔ اس طرح لمحوں میں ہی میرے خلاف ایسی فضا بنا دی گئی کہ کائنات کا قتل مجھ پر ڈال دیا گیا۔ وہاں ایسا ماحول دیکھتے ہی میرے ایک دوست نے مہرین کو میری جانب دوڑایا مجھے لے کر یہاں سے نکل جائے ان کا خیال تھا کہ کائنات ہوش میں آ کر خود ہی پولیس کو اصل صورت حال سے آگاہ کر دے گی اور یہ بھی واضح کر دے گی کہ اسے گولی مارنے والا جعفر ایرانی تھا۔ لیکن اس وقت میرے خلاف جو فضا بنا دی گئی تھی اس کے پس منظر میں میرا پکڑے جانا بہت زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پولیس کی گرفتاری کی نوبت

ہی خدا آئی اور مجھے یہیں پر تشدد سے مار دیا جاتا۔ ایسی صورت حال جعفر ایرانی کے حواری پیدا کر سکتے تھے جس کے بعد کائنات کے قتل کے ساتھ ساتھ میں بھی مارا جاتا اور بظاہر یہی لگتا کہ کائنات کا قاتل مشتعل طالب علموں کے ہاتھوں مارا گیا۔ میں پہلے ہی پولیس کو متعدد مقدمات میں مطلوب تھا۔ اس لیے میرے قتل کو "خس کم جہاں پاک" کا نام دیا جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مجھے کالج میں دیکھتے ہی جعفر ایرانی نے لمحوں میں بہت خوب صورت پلان ترتیب دے لیا تھا۔ لمحوں میں ترتیب دیے جانے والے اس منصوبے میں بہت زیادہ جھول تھے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس قدر تیز رفتاری سے اتنا بڑا منصوبہ کوئی عام شخص ترتیب نہیں دے سکتا تھا۔

میرے ذہن میں یہ سوال بھی گردش کر رہا تھا کہ جعفر ایرانی اور کائنات کے درمیان کیا اختلاف تھا وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا محض میری جانب بڑھنے کے جرم میں اس کو گولی مار دی گئی تھی۔ یہ میڈیکل کالج تھا یہاں لڑکے اور لڑکیاں دونوں اکٹھے پڑھتے تھے اور ان کا ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا کائنات اب ڈاکٹر بن چکی تھی اس کی ہاؤس جاب شروع ہو چکی تھی اس نے روزانہ کئی مریضوں اور ان کے لواحقین سے بھی ملنا تھا اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ جعفر ایرانی صرف میری جانب بڑھنے کے جرم میں ہی اسے گولی مار دیتا۔ اس نے اگر اسی وجہ سے گولی چلائی ہوتی تو پھر اس کی پستول کا رخ کائنات کی بجائے میری طرف ہوتا۔

مجھے اس سوال کا جواب بھی مہرین سے مل گیا۔ وہ بتا رہی تھی کہ جعفر ایرانی کی گستاخیاں شروع تو پہلے ہی ہو چکی تھیں لیکن میرے پولیس مقابلے اور پھر اشتہاریوں کے ساتھ فرار ہو جانے کی داستانیں کالج پہنچیں تو جیسے جعفر ایرانی بے خوف ہونے لگا۔ وہ مسلسل کائنات کو زچ کرنے لگا تھا میری گمشدگی یا اشتہاری ہونے کے بعد وہ کائنات کو بلا شرکت غیرے اپنی ملکیت سمجھنے لگا تھا۔ کائنات میرے غائب ہو جانے کے باوجود خود کو میری امانت سمجھتی تھی اس لیے اس نے ہر موقع پر جعفر ایرانی کو بری طرح دھتکار دیا لیکن اس کے باوجود اس نے کائنات کا پیچھا نہ چھوڑا یوں لگتا تھا جیسے اب کائنات اس کی ضد بن چکی ہے۔ اس نے صحیح معنوں میں معصوم کائنات کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ جعفر ایرانی کے بارے میں پورے کالج کو معلوم تھا کہ وہ شرابی اور زانی ہے۔ اسی طرح اس کا الگ ہی گینگ بنا ہوا تھا کائنات نے جس بری طرح اسے دھتکارا تھا اس نے اسے اپنی تذلیل سمجھتے ہوئے کسی بھی صورت میں کائنات کو زیر کرنے کی ضد پکڑ رکھی تھی۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ ایک روز اس نے راہ چلتے کالج کی کینٹین میں کائنات کا ہاتھ پکڑا تو کائنات نے پوری شدت سے اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ یہ منظر کئی لوگوں نے دیکھا جعفر ایرانی نے وہیں کھڑے ہو کر کائنات سے کہا۔

"پہلے بس میں تمہیں زیر کرنا چاہتا تھا چاہے چند لمحوں کے لیے ہی لیکن اب تم میری بیوی ہو گی مجھے کل تک شادی کی تاریخ بتا دو ورنہ۔۔۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور وہاں سے چلا گیا۔

اگلے دن جعفر ایرانی جب اپنا جواب لینے کینٹین میں کائنات کی طرف آ رہا تھا تو اسے کمال جٹ نظر آ گیا مجھے دیکھتے ہی وہ شاید یہ سمجھا کہ اس کے جواب کے لیے کائنات نے مجھے بلایا ہے اسے علم نہیں تھا۔ میں کائنات سے رابطے میں ہوں یا نہیں۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنے کسی فیصلے کا سوچ لیا اور میرے پہنچنے کے لیے انتظار کرنے لگا کہ کائنات میرے ساتھ کس طرح پیش آتی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی کائنات کا جو ردعمل ہوا اس نے جعفر ایرانی کو اس کی اوقات سمجھا دی اور وہ غصے سے باؤلا ہو گیا اس نے کائنات کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی اسے گولی مار دی۔ جعفر ایرانی نے جس طرح ایک ہی گولی چلائی اور وہ ایک گولی ہی ایسی جگہ لگی جہاں لگنے کے بعد کائنات کی زندگی ممکن نہیں تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ جعفر ایرانی بھی کوئی معمولی طالب علم نہ تھا مجھے یہ تو معلوم تھا کہ جعفر ایرانی کا تعلق جرائم پیشہ افراد سے ہے لیکن اس طرح کا بے داغ نشانہ چھوٹے موٹے مجرموں کا بھی نہیں

ہوتا۔ میرے ذہن میں کچھ کھٹکنے لگا۔ جعفر ایرانی بظاہر جو نظر آتا تھا در حقیقت وہ نہیں تھا اس کی اصلیت کچھ اور تھی اس کے چہرے پر ایک ایسا نقاب چڑھا ہوا تھا جس کے پیچھے کوئی اور ہی کہانی بند تھی۔

مہرین سے ساری صورت حال سن کر میرا کھولتا ہوا دماغ اور بھی کھولنے لگا۔ میرا بس چلتا تو ابھی جا کر اس کو قتل کر دیتا لیکن میں جانتا تھا اب وہ اپنے کسی پرانے ٹھکانے پر بھی نہیں ملے گا۔ کالج میں ایک طالبہ قتل ہو چکی تھی یہ اتنی معمولی خبر نہ تھی کہ اس پر انتظامیہ حرکت میں نہ آتی یہ ضرور تھا کہ مشکوک افراد میں اب میں بھی شامل تھا بعض عینی شاہدین اگر زبان کھولنے پر آتے تو انہوں نے حکام کو بتا دیا تھا کہ قاتل کمالا جٹ نہیں بلکہ جعفر ایرانی ہے دوسری جانب ایرانی کے گروہ کی بھی یہی کوشش ہوئی تھی کہ کسی طرح یہ ثابت کر دیا جائے کہ کائنات کے قتل میں کمالے جٹ کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے کئی متعدد گواہ کھڑے کر دیئے تھے۔

یہ ایک پیچیدہ کیس بنتے جا رہا تھا ایسے کیس مدتوں چلتے رہتے ہیں لیکن میں لمحوں میں فیصلہ کر چکا تھا کہ کائنات کے قتل کا کیس میں عدالت سے باہر چلاؤں گا۔

یہ قانون کی خلاف ورزی تھی لیکن یہ بھی سچ تھا کہ جعفر ایرانی نے سیاسی پناہ بھی حاصل کر لی تھی ایسی صورت میں اس نے ایسے ہتھکنڈے استعمال کرنے تھے کہ اس کیس کا فیصلہ ہی نہ ہو پائے۔ ہمارے ہاں ایسے کیس کو لمبے عرصہ تک لٹکانے کے حربے بھی وکیل ہی بتاتے ہیں وہ تو اپنے کلائنٹ کا کسی آگے پہنچانے سے قبل اس کا سودا کر چکے ہوتے ہیں۔ ہمارے اکثر وکلا کے انہی ہتھکنڈوں کی وجہ سے اپنے بوسیدہ مقدمات لٹکائے رکھتے ہیں۔ تاکہ ان کی انصافی "روٹی پانی" کا حساب کتاب چلتا رہے۔

یہ سب باتیں مجھے مجبور کر رہی تھیں کہ میں اپنی کائنات کو انصاف دلانے کے لیے خود میدان میں اتر جاؤں اور اپنا فیصلہ خود کراؤں۔ بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ اور نظام ہی ایسا ہے کہ لوگ خود انصاف حاصل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ غلط ہی سہی لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ کائنات کے قاتل کو میں خود ماروں گا۔

اسپتال سے اطلاع آ گئی تھی کہ کائنات اس دنیا میں نہیں رہی۔ میری بدقسمتی یہ کہ میں اس کے جنازے میں بھی شرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میں دنیا کی نظر میں خطرناک اشتہاری مجرم تھا اور اب چند دوستوں کے علاوہ کالج میں بھی سبھی کا یہ خیال تھا کہ میں کائنات کو قتل کرنے آیا تھا۔ میری آمد اور موقع پر موجودگی کی کڑیاں کائنات کے قتل سے ملائی جا رہی تھیں۔ اس کے گھر والوں کا بھی یہی خیال تھا اور پولیس کو مکمل یقین تھا کہ کمالا جٹ ہی کائنات کا قاتل تھا۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں کائنات کے جنازے میں شریک ہو سکوں۔ وہاں بھی یقیناً میری گرفتاری کے لیے سادہ لباس میں پولیس موجود ہوتی مجھے بس یہ اعزاز حاصل تھا کہ مجھے جس کو کائنات کا قاتل قرار دیا جا رہا تھا اس نے میری بانہوں میں دم توڑا اور آخری بار آنکھیں کھول کر تسلی کی تھی کہ میں اس کے پاس ہوں۔ اس کی آخری مسکراہٹ بھی صرف کمالے جٹ کے لیے ہی تھی۔

مہرین سمیت سبھی کائنات کے گھر گئے ہوئے تھے۔ میں تنہا بیٹھا ماضی میں کھو چکا تھا کائنات کے میرے ساتھ گزرے دن کسی فلم کی طرح ذہن کے پردے پر چل رہے تھے۔ اسی دوران مجھے احساس ہوا کہ میرے فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی ہے۔ اسکرین پر انجانا نمبر تھا ویسے بھی اس موبائل میں صرف راشد ملتانی کا نمبر ہی محفوظ تھا۔ میں نے کال ریسیو کیا تو دوسری جانب فون کرنے والے نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ واجد ترین صاحب تھے وہی واجد ترین جنہوں نے میری جان بچانے کے لیے راشد ملتانی کو میرے پاس بھیجا تھا اور انہی کے فارم ہاؤس سے نکلتے ہوئے میرا پولیس سے ٹاکرا ہوا تھا۔ واجد ترین کے مجھ پر بہت احسانات تھے۔ جتاں والا میں میجر صاحب اور ان کے بیٹے واجد ترین نے ہر لمحے میرا ساتھ دیا تھا ایک مدت کے بعد وہی واجد ترین مجھ سے بات کر

رہے تھے۔ میرا لہجہ بھیگنے لگا۔ ایک ایک کر کے میرے پچھلے رابطے بحال ہو رہے تھے۔ یہ بے لوث لوگ نہ ہوتے تو شاید میرا انسانیت سے اعتبار اٹھ چکا ہوتا۔

واجد صاحب بتا رہے تھے کہ وہ کبھی بھی مجھ سے لاتعلق نہیں رہے۔ راشد ملتانی سے انہیں پل پل کی خبریں مل رہی تھیں اور وہ اسے میرے حوالے سے خصوصی ہدایات دے رہے تھے۔ وہ کہنے لگے۔

"کمالے! دنیا کو زیر کرنے کے لیے طاقت ور بننا ضروری ہوتا ہے اسی لیے تمہیں اس ماحول میں رکھا گیا تھا مجھے یقین تھا کہ تم بدمعاش بن کر بھی مظلوم کے خلاف نہیں اٹھو گے۔ تم خود اس کیفیت سے گزر چکے ہو جو مظلوم پر گزرتی ہے۔ اگر تمہیں ان حالات میں نہ رکھا جاتا تو لاکھ تربیت کے باوجود تم میں وہ خود اعتمادی نہ آتی جو اب آ چکی ہے۔ اب تم بڑے سے بڑا فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔"

میں نے دل سے واجد ترین کا شکریہ ادا کیا کیونکہ وہ درست کہہ رہے تھے جو تربیت خود میدان میں اتر کر خطرات مول لینے سے ملتی ہے وہ کسی کلب یا ادارے سے نہیں ملتی۔ واجد ترین نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کمالے اب صورت حال بدل چکی ہے پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور اور خطرناک مجرم تمہارے مقابلے پر ہے۔" میں ان کی بات سن کر چونک گیا۔

"کون؟" میں نے بے ساختہ سوال کیا تو انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"جعفر ایرانی پاکستان مخالف طاقتوں کا ایجنٹ ہے ہماری اس پر پوری نظر ہے اور ہم نے یہاں اس کے سیٹ اپ کو مفلوج کیا ہوا تھا۔ اب اس نے جو قتل کیا ہے اس سے واضح ہو گیا کہ وہ اس شہر میں مزید نہیں رہ سکتا۔ وہ اب کسی اور جگہ فرار ہو جائے گا اور پھر وہاں سے اپنا نیٹ ورک چلائے گا۔"

واجد ترین سے جعفر ایرانی کا نام سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ اس نے میرے سامنے کائنات کو مارا تھا اس کا نام سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے کائنات کے آخری لمحات آ جاتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی مسکراہٹ کہہ رہی ہو کہ کمالے مجھے یقین ہے کہ تم میرا انتقام لو گے۔

واجد ترین بولتے چلے جا رہے تھے وہ کہہ رہے تھے۔

"اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جعفر ایرانی کے مقابلے پر کھل کر اترا جائے اس کے لیے تمہارا انتخاب ہوا ہے تم اس کا پیچھا کرو گے تو پس منظر میں تمہاری حالیہ دشمنی اور کائنات کی موت نظر آئے گی یا انتقامی جنگ لگے گی۔ تم چاہو تو میری آفر سے انکار کر سکتے ہو ہم جعفر ایرانی کے لیے کسی اور کا انتخاب کر لیں گے۔"

میں نے واجد ترین کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"سر جعفر ایرانی کے مقابلے میں ہی میں اتروں گا۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ نکھے مل اور جعفر ایرانی میرے ہاتھ سے ہی مریں گے۔ اب معاملہ میری ذات سے آگے جا چکا ہے۔ وہ ملک دشمن ایجنٹ ہے تو بات میرے ملک کے دفاع کی ہے اب چاہے انجام کچھ بھی ہو یہ اعزاز میرے لیے مختص کر دیں کہ کمالا جٹ اپنے وطن کے دشمنوں سے لڑا۔ اب مارا گیا تو بھی سرخرو ہوں گا۔ مار دیا تو بھی خود پر فخر کروں گا۔ میں سب سے پہلے اس وطن کا بیٹا ہوں۔ مجھے اس سے پہلے یہ موقع ملا ہوتا تو شاید میری یہ سمت ہی نہ ہوتی۔ مجھے میرے وطن کے دشمنوں سے لڑنے کے اعزاز سے محروم نہ کریں۔"

واجد صاحب کہنے لگے۔ "کمالے میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن وہ تربیت یافتہ ایجنٹ ہے اگلے 24 گھنٹوں میں کرنل سلیم تم سے رابطہ کریں گے۔ میں تمہیں ان کے حوالے کر رہا ہوں۔ وہ تمہیں باقاعدہ تربیت دیں گے اور پھر ملک دشمنوں کے خلاف تمہاری جنگ شروع ہو جائے گی۔"

بات ختم کرتے ہی واجد ترین نے فون بند کر دیا۔ میں کرنل سلیم کے فون کا انتظار کرنے لگا۔ میں ایک عام شخص

تھا جو طاقتور اور با اثر لوگوں کے ظلم کا نشانہ بنا اور اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے نکل کھڑا ہوا معاشرہ مجھے ایک خطرناک اشتہاری مجرم کے طور پر جانتا تھا میرے خلاف متعدد جعلی مقدمات درج ہو چکے تھے لیکن اب مجھ ایسے ناکارہ شخص کو ہی یہ اعزاز دے رہا تھا کہ میں اپنے وطن کے دشمنوں کے مقابلے پر اترنے والا تھا۔ میرا تو کبھی کچھ ختم ہو چکا تھا۔ میری زندگی آئی ایس آئی ہی تھی کہ پچھلے دل سے اپنا انتقام لیتا اور پھر کسی دور دراز کے قصبے میں جا کر گمنامی کی زندگی بسر کرتا کہیں مزدوری کرتا یا کوئی دکان کھول لیتا۔ غلط راہ کا مسافر بنتا تو یہی بدمعاشی جاری رکھتا اور کسی دن دشمنوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا۔ واجد ترین کے ایک فون نے ہی مجھے میری نظروں میں معتبر بنا دیا تھا۔ اب مجھے اپنے وطن کے لیے کام کرنا تھا میں نے اپنا بدلہ تو لینا ہی تھا کہ یہ میرا حق بھی تھا لیکن اب کہیں بڑا اعزاز ملنے والا تھا۔ انہی سوچوں میں گم تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس بار بھی انجانا نمبر ہی تھا میں نے کال ریسیو کی تو کسی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”میں کرنل سلیم بات کر رہا ہوں۔ باہر ایک سیاہ رنگ کی جیپ کھڑی ہے اس میں بیٹھ جاؤ باقی باتیں ملاقات کے بعد ہوں گی۔ اب تمہیں واپس نہیں آنا اس لیے اپنے میزبانوں کو فون پر ہی بتا دو تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔“ میں نے میزبان کو فون کر کے مختصراً بتایا کہ جعفر ایرانی لاہور سے نکل گیا ہے اور میں اس کے تعاقب میں نکلنے لگا ہوں۔ زندگی رہی تو دوبارہ ملاقات ہو جائے گی وہ کہتی رہی کہ رک جاؤں اور ان کے آنے کے بعد جاؤں جہاں بھی جانا ہو لیکن اب میرے پاس رکنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ میں باقی تفصیلات گول کر گیا تھا کیونکہ میرے خیال میں وہ سب میرے وطن کی امانت تھیں۔ میں ایک عام سا پاکستانی تھا لیکن جانے کیوں واجد صاحب سے گفتگو کے بعد عجیب سے احساسات ہو رہے تھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں اسی مقصد کے لیے پیدا ہوا تھا۔ کرنل سلیم کی گاڑی مجھے ایک سیف ہاؤس میں لے گئی وہیں کرنل سلیم سے ملاقات ہوئی اس کے بعد میرے مختلف امتحانات شروع ہو گئے یہ نفسیاتی اور جسمانی صلاحیتوں کے امتحانات تھے۔

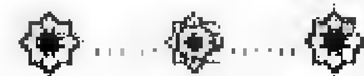
ایک پوری ٹیم یہ جانچ رہی تھی کہ کیا میں ایسے کسی مشن پر بھیجے جانے کا اہل ہوں بھی یا نہیں۔ میرا ذاتی انتقام کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ اب مجھے اپنے وطن کا انتقام لینا تھا ملک بھر میں ہونے والے بم دھماکوں میں ملوث ملک دشمن عناصر اس ملک کو تباہی کی جانب دھکیلنا چاہتے تھے اور مجھے انہی طاقتوں کے بڑے آلہ کار کا تعاقب کرنا تھا کرنل سلیم اور ان کی ٹیم نے مجھے لگ بھگ 6 ماہ تک مختلف ٹریننگ کورسز اور مشقوں سے گزارا۔ ان چھ ماہ میں متعدد بار ایسا محسوس ہوا کہ اگر وطن کا قرض اتارنے کا جذبہ نہ ہوتا تو شاید میں یہاں چند ہفتے بھی نہ گزار پاتا۔

چھ ماہ کے بعد کمال جٹ یکسر بدل چکا تھا۔ اب میں ذہنی طور پر پہلے سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔ جسمانی طور پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جسم میں خون کے بجائے بجلیاں دوڑ رہی ہوں۔ مجھے لڑائی کے ایسے ایسے داؤ پیچ آ گئے تھے جو عام آدمی کے وہم و گمان میں نہ ہوں گے بلیڈ سے لے کر جدید ہتھیاروں کا استعمال از بر ہو چکا تھا۔ اب میں چلتا پھرتا آگ کا گولہ تھا۔ کرنل سلیم نے مجھے چھ ماہ میں کندن بنا دیا تھا۔ اب میرا اصل امتحان شروع ہونے والا تھا۔ ملک کی آنکھیں ملک دشمن جعفر ایرانی کو مکمل فوکس میں رکھے ہوئے تھیں۔ وہ فانا پہنچ چکا تھا۔ وہاں کے ایک بڑے بدمعاش کی سرپرستی میں آ کر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید وہ وطن کے محافظوں کی پہنچ سے دور ہو چکا ہے۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا لاہور سے فرار ہونا صرف کائنات کو قتل کرنے کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ اس کے ماں باپ کی آئی اے اور را کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے اس سے پالک بیٹے کے خلاف شکنجہ کسا جا رہا ہے۔ وہ نظروں میں تھا اور اس کے خلاف تمام شواہد اکٹھے کر لیے گئے تھے۔ اب بھی وہ یہیں رکتا تو کتے کی موت مارا جاتا یا

پھر گرفتار ہوتا اور دنیا کے سامنے اپنے ماں باپ سی آئی اے اور را کے کرتوت بیان کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اسے اب فرار ہونا ہی تھا۔ لاہور میں کائنات اس کا آخری شکار بنی اور اب وہ فاٹا میں پہنچ چکا تھا۔ کرنل سلیم سے گلے ملنے کے بعد میں جیپ میں بیٹھا اور جعفر ایرانی کے تعاقب میں فاٹا کی جانب نکل گیا۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ وہاں کرنل سلیم دور رہ کر میری مدد کریں گے اور مجھے رہنمائی دیں گے۔ خفیہ کوڈز اور سیٹلائٹ فون کے نمبرز بھی مجھے بتا دیے گئے تھے۔ ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا اور میں آنے والی مہم کا سوچ رہا تھا۔ میری پنڈلی سے خنجر لگا ہوا تھا اور بغل میں جرمن ساختہ سیمی آٹو میٹک پسٹل لٹک رہا تھا۔ ایک جدید رائفل میری گود میں تھی۔ میں کچھ دیر ادھر ادھر کے مناظر دیکھتا رہا اور پھر آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا کہ میرا پرانا دوست گلریز خان مجھے اپنے سامنے پا کر کیا کرے گا گلریز خان بھی اس مشن میں ہمارے ساتھ تھا۔ قبائلی ہونے کی وجہ سے اسے حالات کا درست علم تھا۔ اس کا گھر ہی میرا بیس کیمپ تھا۔ گاڑی انجانی منزلوں کی سمت سفر کر رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ شاید اس مشن سے میری لاش ہی واپس آئے۔



گاڑی اونچے نیچے راستوں پر تیزی سے جا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کنکر پہیوں کی رگڑ سے ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے مٹی کا ایک طوفان تھا۔ میں نے بیک مرر میں دیکھا پیچھے مٹی اور گرد و غبار کے سوا کچھ نظر نہ آ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا میری لینڈ کروزر کے پیچھے مسلح افراد سے بھری دو جیپیں بھی آ رہی ہیں۔ ہم پاؤندوں کے قبیلے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہی پاؤندوں کا قبیلہ جہاں گلریز خان مجھے قید سے رہا کرانے آیا اور واپسی پر خود دشمنوں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ اب ہم پھر اسی راستے پر جا رہے تھے۔ تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

میرے اس طرح وہاں پہنچنے پر پورے قبیلے میں تھرتھلی مچ گئی۔ کچھ لوگ حیران تھے کہ سردار کی قید میں آنے والا اب اس حال میں آ گیا کہ وہ خود ایک طاقتور سردار بن چکا تھا کچھ وہ تھے جو میرے خلاف سرگرم رہے تھے اور اب ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں جبکہ کچھ کے چہروں پر خوشی اور مسرت کے تاثرات تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو برے حالات میں بھی میرے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہے تھے۔

سردار نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا اور ماضی میں ہونے والی کوتاہی یا گستاخی پر شرمندگی کا اظہار کیا میں نے سردار کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اسے یقین دلایا کہ میں اس سے کسی بھی بات پر ناراض نہیں ہوں بلکہ اس کی سابقہ دعوت پر ثابت اور دارا کے درمیان ہونے والا مقابلہ دیکھنے آیا ہوں۔

سردار نے بتایا کہ دو دن ہماری میزبانی کرے گا اور تیسرے دن مقابلہ کروایا جائے گا تاکہ دیگر لوگوں کو بھی علم ہو سکے اور وہ بھی یہ مقابلہ دیکھنے آ سکیں۔ دیگر لوگوں سے مراد ارد گرد کے وہ لوگ تھے جن کے پاؤندوں سے اچھے تعلقات تھے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اگلی صبح میں اس جگہ چلا گیا جہاں ثابت کو داؤ پیچ سکھایا کرتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ اپنی پریکٹس کر رہا تھا۔

اس ایک رات میں یہ تصدیق ہو چکی تھی کہ میرا دوست اور محسن گلریز خان دارا اور اس کے کارندوں کے حملے میں ہی مارا گیا تھا۔ شامل خان رات بھر مجھ سے اسی موضوع پر گفتگو کرتا رہا۔ اس نے جو کہانی سنائی اس کے مطابق جس دن میں یہاں سے گیا اسی دن کسی دشمن سے جھڑپ میں دارا کے تین اہم ساتھی مارے گئے تھے جبکہ لگ بھگ بارہ ساتھی زخمی ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ جب دارا واپس آیا تو اس کی اور اس کے ساتھیوں کی گاڑیاں گولیوں کے نشانات سے بھری ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ ایک بڑی جنگ لڑ کر آئے ہیں۔

دارا نے قبیلے کو یہی کہا کہ وہ شکار کے لیے نکلے تھے کہ

سکیورٹی فورسز سے ان کی جھڑپ ہوگئی جس کے نتیجے میں ان کا جانی و مالی نقصان ہوا۔ ان کی کچھ گاڑیاں مکمل طور پر تباہ ہوگئی تھیں۔ شامل خان نے دارا کی واپسی کے وقت اور دیگر جو باتیں بتائیں ان سے یہ واضح ہوگیا کہ وہ اپنے اندر کا کینہ چھپا نہ سکا تھا۔ اس لیے اس نے مجھے مارنے کے لیے ہمارے نکلتے ہی دوسرے راستے سے ہم سے آگے پہنچا اور ہم پر حملہ کردیا اس حملے میں میری زندگی بچ گئی لیکن میر احسن اپنے وفادار ساتھیوں سمیت جاں بحق ہوگیا تھا۔

میں نے شامل خان سے تفصیلی گفتگو کی۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ دارا اب قبیلے کے رسم و رواج اور روایات کے برعکس چل رہا ہے۔ اس کے ظلم کی انتہا ہو چکی تھی۔ دوسری طرف اس کی غلط حرکات و سکنات سے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ اب کسی کے مفادات کے لیے بھی کام کرتا ہے اس کی دولت میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا تھا۔ شامل خان کا کہنا تھا کہ اب دارا کا ختم ہو جانا ہی قبیلے اور لوگوں کے حق میں بہتر ہے۔

شامل خان اس قبیلے کے محافظ دستے کا سالار تھا اس سے قبل اس کی یہی کوشش رہتی تھی کہ کسی طرح قبیلے کے افراد کو بچا لیا جائے اس نے اکثر دارا کی بھی بے جا سفارش کی تھی لیکن اب وہ بھی صورت حال سے کافی پریشان تھا۔ دارا کی وجہ سے پاوندوں نے اپنے کئی دوستوں سے محروم ہو چکے تھے اور کئی نئے دشمن بنا بیٹھے تھے۔ پاوندوں کا قبیلہ اس وقت مشکل حالات سے گزر رہا تھا اور تیزی سے اپنے حمایتوں سے محروم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ دوسری طرف قبیلے کے اندر بھی دو واضح گروہ سامنے آرہے تھے۔ ایک طرف دارا اور اس کے کارندے تھے جبکہ دوسری طرف اس کے ظلم کا نشانہ بننے والے افراد تھے۔ یہ لوگ تعداد میں زیادہ لیکن طاقت اور حیثیت میں کم تھے۔ اب یہ صورت حال کا ذمہ دار سردار کو قرار دے رہے تھے۔

اکثریت کا خیال تھا کہ سردار اسے سالار ہونے کی وجہ سے اس کو اس کی حرکتوں سے نہیں روکتا اور اسے کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ ہم خیال لوگوں کی محفلوں میں یہ باتیں بھی ہونے لگی تھیں کہ اگر سردار قبیلے کو دارا کے ظلم اور عمل دشمنوں سے نہیں بچا سکتا تو پھر اسے سرداری کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔

شامل خان کو ڈر تھا کہ اگر حالات اسی رخ پر سفر کرتے رہے تو پھر قبیلے میں سردار کے خلاف بھی بغاوت ہو سکتی ہے۔ جس کے نتیجے میں خون خرابا اور قبیلے کی تباہی کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ میں نے شامل خان کو تسلی دی تھی کہ وہ بے فکر رہے اب کی بار میں جاؤں گا تو دارا زندہ نہیں ہوگا۔ میں اسے اس طرح ماروں گا کہ اس کے ساتھیوں میں سے کوئی احتجاج تک نہیں کرسکے گا۔

ثابت اپنی جگہ پر موجود تھا اور پورے جوش و خروش سے دارا کے خلاف لڑائی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس کے دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ باری باری ثابت پر حملہ کرتے اور اسے گرفت میں لینے کی کوشش کرتے لیکن وہ یا تو انہیں چل دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا یا پھر کوئی نہ کوئی داؤ لگا کر زمین پر پٹخ دیتا تھا میں نے نوٹ کیا کہ ثابت زیادہ تر ڈھولی پیچ کا استعمال کرتا ہے یہ پنجاب کے پہلوانوں کا مشہور داؤ ہے جو میں نے ہی ثابت کو سکھایا تھا۔

مجھے دیکھ کر ثابت رک گیا۔ وہ اور اس کے دوست میری جانب آگئے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے میں نے ثابت کی پیٹھ تھپکی اور اسے ایک طرف لے گیا۔ اس کے دوست سمجھ گئے کہ میں تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے خود بھی فاصلے پر چلے گئے میں نے ثابت کو کچھ ہدایات دیں اور دو تین مزید داؤ سکھائے۔ اب یہ جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ ثابت کی شکست میری شکست تھی اور میں اس شکست کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

جس دن ثابت اور دارا میں مقابلہ ہونا تھا اس دن میدان لوگوں سے بھرا ہوا تھا پورا پاوندہ قبیلہ پنڈال میں موجود تھا۔ میں قبیلے کے سردار خوش حال خان کے ہمراہ

اس خان سے مقابلہ دیکھنے آیا کہ ہمارے اردگرد میرے محافظوں نے حصار بنا رکھا تھا۔ ہمارے لیے مخصوص نشستوں پر بیٹھتے ہی سردار نے روایتی انداز میں مقابلہ شروع کرنے کا اعلان کیا دارا اور ثابت میدان میں موجود تھے۔ جبکہ ان کے حمایتی اپنے اپنے ساتھی کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ دارا اس وقت غیض و غضب کی علامت بنا ہوا تھا اس کے برعکس ثابت خاموشی سے پرسکون انداز میں اپنی جگہ کھڑا تھا اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس کا اس مقابلے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ وہ بے پروائی کے عالم میں کھڑا تھا لیکن اس کی نظریں اپنے حریف پر ہی تھیں۔ اس کا یہ انداز اشتعال دلانے والا بھی تھا اور شکست خوردہ بھی۔ مجھے معلوم تھا کہ جس انداز سے وہ کھڑا تھا اس نے دارا سمیت کئی لوگوں پر نفسیاتی اثر ڈالا تھا۔ یا تو دارا کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا یا پھر مقابلے سے قبل ہی شکست تسلیم کر چکا تھا۔

باقاعدہ لڑائی کی اجازت ملتے ہی دارا کسی پاگل بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا ثابت کی جانب آیا وہ اس انداز سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا کہ جیسے ایک ہی ٹکر میں ثابت کو زمین پر گرا دے گا۔ ثابت کا انداز ابھی تک پہلے جیسا ہی تھا جس پر اس کے ساتھیوں کی آنکھوں میں ایک دم تشویش کے سائے سے لہرا گئے۔ دارا جیسے ہی ٹکر رسید کرنے ثابت کے قریب پہنچا ثابت بلا کی پھرتی سے ایک دم دائیں جانب ہو گیا۔ یہ محض پاؤں کی ایک مخصوص حرکت تھی وہ پاؤں کے بل گھوم گیا تھا لیکن اس کے ہاتھ دارا کی جانب ہی تھے ایک طرف پہلو بچاتے ہوئے ثابت نے دارا کی گردن اور سر پر مخصوص جگہ ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے دوبارہ پنجوں پر گھوم گیا۔ کڑک کی مخصوص آواز سنائی دی اور دارا کا جسم ثابت کے ہاتھوں میں لٹک گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی گردن کا منکا ٹوٹ چکا ہے اور دارا مر چکا ہے۔

بیڈلو یا بندوں کے قبیلے کے پاس پہلے سے نہیں تھا اس لیے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دارا جس قدر رفتار اور طاقت سے ثابت کی جانب آیا تھا ثابت نے اسی رفتار اور طاقت کو اس کی گردن کی جانب موڑ دیا تھا۔ یہ جوڈو کا مخصوص داؤ تھا جو میں نے ثابت کو سکھایا تھا اور بلاشبہ اس نے اس کا بہت خوب صورتی سے استعمال کیا تھا۔

عام طور پر ان مقابلوں میں مخالف کی دھلائی کی جاتی ہے اور طاقتور شخص اپنے حریف کی ٹانگیں بازو توڑ کر اسے کئی کئی ماہ تک بستر پر لیٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ شکست کھانے والا جب بستر سے اٹھنے قابل ہوتا ہے تو اس کے لیے یہ بہت بڑی ذلالت ہوتی ہے کہ اس کی محبوبہ اب اس کے حریف کے بچے کی ماں بن چکی ہے۔ حریف کو اس طرح ذلیل کرنے کے لیے عموماً اسے شدید زخمی کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن قبائلی قوانین کے مطابق اگر ان مقابلوں میں کوئی مارا جائے تو اس کے قتل کی ذمہ داری خود مرنے والے کے سوا کسی پر عائد نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے ثابت پر بھی اس قتل کا کوئی الزام نہیں تھا اور نہ ہی کوئی دارا کا بدلہ لینے کا اعلان کر سکتا تھا۔

اب دارا کا بدلہ لینے والے کو بھی بزدل قرار دیا جاتا اور اسے قبیلے کے قوانین کے مطابق چھت سے پیچھے گولی مار کر تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ اس لیے فی الوقت ثابت نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ اس لڑائی میں ایک اور فرق بھی پڑا تھا وہ یہ کہ عموماً زندگی اور موت کے یہ مقابلے کافی طویل چلتے تھے اور کافی دیر بعد جب لڑ لڑ کر دونوں میں سے ایک قتل یا بے ہوش ہو جاتا تب ختم ہوتے تھے لیکن ثابت نے پہلے ہی وار میں دارا کو دوسرے جہان پہنچا دیا تھا۔ اس کا بھی لوگوں پر بہت برا اثر ہوا۔ ان کے نزدیک ثابت انتہائی خطرناک شخص بن چکا تھا جو بظاہر تو سادہ اور بزدل نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں اتنا خطرناک تھا کہ دارا جیسے شخص کو پہلے ہی وار میں دوسری دنیا پہنچا سکتا تھا۔ اب دارا سے زیادہ ثابت کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ قبیلے کے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ ثابت کو یہ طاقت اور داؤ پیچ کس نے سکھائے ہیں اور اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ دارا جیسے وحشی صفت شخص کو ایک ہی جھٹکے میں دوسری دنیا

پہنچانے کے قابل ہو گیا ثابت کی طرف حیرت سے اٹھنے والی نگاہیں اب تحسین آمیز انداز سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

سردار خوشحال خان کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا دارا اس کا سالا تھا اس کے باوجود خوشحال خان اپنی جگہ پرسکون انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ ثابت نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ دارا سے زیادہ طاقتور ہے اور گل دانہ کا اصل حق دار ہے۔ ثابت کا لالچی چچا اپنے منصوبے میں ناکام ہو چکا تھا کیونکہ اب وہ کسی بھی طرح گل دانہ کو ثابت کی بیوی بننے سے نہیں روک سکتا تھا۔ ثابت کے چہرے سے خوشی چھوٹ رہی تھی کیونکہ کچھ عرصہ قبل تک اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ دارا کو شکست دے سکتا ہے۔ وہ تو پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا تھا۔ ثابت کے دوست اب خوشی کے اظہار کے لیے ہوائی فائرنگ کر رہے تھے جبکہ دارا کے کارندوں کے چہرے لٹکے ہوئے تھے ان کا سرغنہ انتہائی بے بسی کی موت مارا گیا تھا۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بازی پلٹ چکی ہے اور اب شاید ان کے ظلم و ستم اور زیادتیوں کا نشانہ بننے والے انہیں بھی نہ چھوڑتے۔

سردار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی سبھی اس کی جانب متوجہ ہو گئے اور شہنائیوں اور ماتم کا شور تھم گیا۔ سردار خوشحال خان نے ثابت کی بہادری اور داؤ پیچ میں مہارت کی دل کھول کر تعریف کی اس نے کہا کہ دارا میرا سالا تھا لیکن اب ثابت میرا بیٹا ہے۔ اس نے ثابت کو بہادری کے اس اعلیٰ مظاہرے کی بدولت دارا کا عہدہ اور رتبہ دینے کا بھی اعلان کر دیا اور اگلے ماہ کے پہلے ہفتے ثابت اور گل دانہ کی شادی کا بھی اعلان کر دیا۔ سردار کے اس اعلان کے ساتھ ہی ثابت اور اس کے دوستوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ثابت اب ایک ڈرپوک انسان کے بجائے قبیلے کا بااثر شخص بن چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی آمدنی میں بھی اضافہ ہونے والا تھا میرا خیال تھا کہ ان اعلانات کے بعد ثابت کے سسرال والے اسے نہ صرف دل سے قبول کرلیں گے اور اس سے تعلق ہونے پر خوشی کا اظہار کریں گے بلکہ مستقبل میں گل دانہ اور ثابت کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جانے والا تھا۔ سردار نے گفتگو کرتے ہوئے مجھے بھی اس دلچسپ مگر حیران کن لڑائی کے بارے میں تبصرہ کرنے کی دعوت دے دی۔ میں نے اپنی گفتگو کے دوران متعدد بار ذو معنی گفتگو کی جسے باقی لوگوں نے تو شاید روزمرہ زندگی کا حصہ سمجھا لیکن سمجھدار لوگ اس میں شامل اشاروں کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔ میں نے قبیلے سے خطاب کے دوران کہا۔

"دارا کو اس کے گناہوں کی سزا ملی ہے۔ وہ جو فصل بو رہا تھا وہی فصل آج کٹ گئی ہے۔ دارا کے ایک جرم کی سزا تھی۔" میرے آخری جملے نے دارا کے ساتھیوں کو چونکنے پر مجبور کر دیا اس پر واضح ہو چکا تھا کہ مجھ پر گل ریز خان کے قاتلوں کا راز کھل چکا ہے اور میرے تربیت یافتہ ثابت نے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت دارا کو اس کے جہاں پہنچا دیا تھا۔ میرے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ سردار خوشحال خان بھی چونک اٹھا۔ میں جانتا تھا کہ گل ریز خان کو قتل کرنے والے دارا کا انتقام بھی مجھ سے یا ثابت سے لینے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مزید کہا۔

"مجھے یہ معلوم نہیں کہ آپ لوگ اپنے دشمنوں کو معاف کر دیتے ہو یا سزا دے کر دیتے ہو لیکن مجھے اپنا پتا ہے ہم جیسے اگر معاف کرنے پر آجائیں تو اپنی ہی لاش پر کھڑے شخص کو بھی معاف کر دیں اور اگر انتقام لینے پر اتر آئیں تو پھر اپنی جانب زیادہ دیر تکنے والے کی آنکھیں نکال دیتے ہیں اور میرے بارے میں اگر کسی کو غلط فہمی ہو تو یقین کریں کہ میں اپنے اوپر حملہ کرنے والے کو دوسرے وار کی مہلت تک دینے کا قائل نہیں، ابھی میرے کئی دشمن زندہ ہیں لیکن ان میں سے ہر کسی کے لیے سزا یا جزا تجویز ہو چکی ہے۔ کسے کب کس طرح دوسری دنیا پہنچانا ہے اس کا فیصلہ میں خود کرتا ہوں۔

میری تقریر میں بہت سے پیغامات اور اشارے تھے یہی وجہ تھی کہ دارا کے ساتھیوں کے چہروں پر واضح پر

برا اسپلی کی سی کیفیت نظر آنے لگی۔ دارا کی ثابت جیسے شخص کے ہاتھوں ایک ہی وار میں ہلاکت نے پورے قبیلے کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ میں اٹھا تو سردار بھی میرے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم سردار کے خیمے میں آ گئے۔ باہر ثابت کے دوست اس کی فتح کا جشن منا رہے تھے۔

میں نے واپسی کا قصد کیا تو سردار نے بتایا کہ اس نے ہمارے لیے عشائیہ کا خاص اہتمام کروانے کا کہا ہوا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ رات ثابت کی بہادری اور کامیابی کا جو روایتی جشن ہونا تھا میں اس میں شرکت کروں میں نے اس کی یہ بات مان لی۔ میں اپنے دوست ثابت سے بھی بھرپور ملاقات چاہتا تھا اسی طرح میں یہ بھی چاہتا تھا کہ جشن میں شرکت کی وجہ سے دارا کے ساتھیوں کو یقین ہو جائے کہ ثابت کی پشت پر میں کھڑا ہوں تاکہ وہ اس کے ساتھ کسی قسم کی شرارت سے باز رہیں۔

رات قبیلے میں دن کا سماں تھا روایتی لوک رقص پیش کیا جا رہا تھا اور سردار کی جانب سے بکری کے لیے بھنے ہوئے دنبوں کا انتظام کیا گیا تھا وقفے وقفے سے ہوائی فائرنگ بھی ہو رہی تھی۔ مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ دارا سردار کا سالا تھا لیکن اس کی موت کے بعد نہ تو سردار زیادہ دیر سوگ کی کیفیت میں رہا اور نہ ہی اس نے ثابت کے خلاف کوئی انتقامی قدم اٹھایا۔ اس کے برعکس وہ ثابت کو اعزازات سے نواز رہا تھا۔ ثابت کو قبیلے میں اہم مقام دے دیا گیا اور سردار نے اس کی بہادری کو بھی بہت سراہا۔

آخر میں سردار سے پوچھ ہی لیا کہ دارا کی موت پر دکھ نہیں ہوا اس کی تو دارا سے قریبی رشتہ داری بھی تھی۔ سردار میرے سوال پر چند لمحے خاموش رہا اور پھر کہنے لگا۔

"مجھے دارا کی موت کا دکھ ہے میری بیوی نے بھی کل سے رو رو کر برا حال کیا ہوا ہے اس لیے میں نے خیمے تک محدود کر دیا ہے۔ لیکن مجھے ثابت کی بہادری پر بھی فخر ہے یہ ایک ڈرپوک انسان تھا آپ نے اسے قبیلے کا طاقتور ترین انسان بنا دیا ہے ہمارے قبیلے کا کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دارا جیسے پہلوان کے سامنے دو منٹ بھی کھڑا رہ سکے لیکن ثابت نے اسے چند سیکنڈز میں جان سے ہی مار دیا۔ مجھے ثابت کے روپ میں دارا سے کہیں زیادہ طاقتور شخص مل گیا ہے۔ اس سے ہمارے قبیلے کی طاقت میں کہیں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ ہمارے ہاں رشتے بعد میں ہوتے ہیں پہلے طاقت کا قانون چلتا ہے۔ کل ثابت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بڑے سے بڑے مقابلے میں ہلچل مچا سکتا ہے اس کے باوجود وہ میرے سامنے عاجزی سے کھڑا ہوتا ہے۔"

سردار خوشحال خان دم لینے کو رکا اور پھر کہنے لگا۔

"ثابت جیسا بہادر شخص اس قبیلے کی حفاظت میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے دارا اگر ثابت کے ہاتھوں نہ مارا جاتا تو پھر کسی اور کے ہاتھوں بھی تو مارا جا سکتا تھا کچھ عرصہ قبل اس کی سیکیورٹی فورسز سے شدید جھڑپ ہوئی۔ اس لڑائی میں قبیلے کے لوگ بھی مارے گئے ان مرنے والوں میں دارا بھی شامل ہوتا تو میں کیا کر لیتا؟"

سردار کی بات سن کر میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا اور کہا۔

"خوشحال خان یہ بات ذہن سے نکال دو کہ دارا نے سیکیورٹی فورسز کے ساتھ جھڑپ میں اس قبیلے کے لوگ مروائے تھے۔"

سردار خوشحال خان میری بات پر چونک اٹھا۔ کہنے لگا۔

"تم نے آج اپنی تقریر میں بھی کچھ ایسی باتیں کی تھیں جن پر میرے ذہن میں سوال اٹھے تھے۔ کیا کوئی ایسی بات ہے جس کا تعلق دارا یا ہمارے قبیلے سے ہے لیکن میں لاعلم ہوں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔

"ہاں سردار مجھے افسوس ہے کہ دارا تم سے بھی جھوٹ بولتا رہا ہے اس پر کسی سیکیورٹی فورس نے حملہ نہیں کیا تھا بلکہ اس نے تمہارے مہمانوں پر حملہ کیا تھا۔ اس دن تمہاری میزبانی سے لطف اندوز ہونے کے "جرم" میں

میرا بھائی دارا کی گولیوں کا نشانہ بنا تھا۔ اس نے ہمیں گھیرے میں لے لیا اور فائرنگ شروع کردی اس جھڑپ میں گلریز خان اپنے وفاداروں سمیت جاں بحق ہوگیا اور آج دارا اپنے انجام کو پہنچ گیا۔"

میری باتیں خوشحال خان کے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھیں۔ وہ اس قبیلے کا سردار تھا لیکن اس کے علم میں لائے بنا اس کے مہمانوں کو واپسی پر قتل کیا گیا تھا۔ قبائلی روایات کے مطابق یہ بہت بڑی بے غیرتی اور بزدلی کی علامت تھی میں نے دیگر الفاظ میں سردار کو اس کے خیمے میں بیٹھ کر بے غیرت اور بزدل کہا تھا لیکن جو سانحہ ہوچکا تھا اس کے بعد وہ مجھے وضاحت دینے کا احتجاج کرنے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ اس کا پورا جسم غصے اور بے بسی کی کیفیت میں لرزنے لگا۔

ایک طرف خوشحال خان کو اپنی بے عزتی کا غصہ تھا تو دوسری طرف یہ خوف بھی تھا کہ شاید اب میں اس قبیلے سے گلریز خان کی موت کا بدلہ لینے آیا ہوں۔ میرے ساتھ ضرورت سے زیادہ محافظ بھی تھے جن کی وجہ سے یہ تاثر مزید گہرا ہورہا تھا۔ سردار نے میرے سامنے حقیقتاً ہاتھ جوڑ دیے اور کہنے لگا۔

"مجھ سے جو بھی قسم چاہو اٹھوالو مجھے اس بات کا علم نہیں تھا اگر مجھے پتا ہوتا تو اول تو دارا ایسی گھٹیا حرکت کر ہی نہ پاتا اور اگر کرتا بھی تو اس کے بعد اس کے بھیانک انجام کو دیکھ کر سب ہی کانوں کو ہاتھ لگانے پر مجبور ہوجاتے ہیں لیکن میں اب مرنے کے بعد بھی دارا کو سزا دے کر رہوں گا۔"

سردار نے میرا ہاتھ پکڑا اور پنڈال میں آگیا۔ جشن اپنے عروج پر تھا۔ سردار کے اشارے پر اس کے محافظوں نے سب کو خاموش کروا دیا تو سردار نے سب کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں ایک بات آپ سب کو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ دارا قبیلے کا غدار تھا۔ اس نے میرے مہمانوں پر حملہ کیا تھا اور ان میں سے کچھ کو قتل بھی کیا تھا مجھے یہ بات آج ہی معلوم ہوئی ہے ورنہ میں خود دارا کو مہمانوں پر حملے کی ایسی سزا دیتا کہ اس کی اگلی نسلیں بھی یاد رکھتیں۔ بہرحال میں روایت کے مطابق دارا کے اس جرم پر سردار کمال جٹ سے پورے قبیلے کی جانب سے معافی مانگتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کرتا ہوں کہ دارا اس قبیلے کا غدار تھا اور اس کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو کسی غدار کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ اب نہ تو کوئی اس کی آخری رسومات میں شرکت کرے گا اور نہ ہی اس کا ہم سے کوئی تعلق سمجھا جائے گا۔ دارا کی لاش پہاڑی سے نیچے پھینک دی جائے گی تاکہ کتے اور جنگلی جانور کھاسکیں۔"

سردار خوشحال خان کے اس اعلان کے ساتھ ہی بہت سے لوگوں کو سانپ سونگھ گیا لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ چوں چراں کرسکتا۔ اس فیصلے کے بعد میری نظر میں سردار کی عزت اور بڑھ گئی۔ وہ بعض کمزوریوں کی وجہ سے کچھ طاقتور قبیلوں سے خوف کھاتا تھا لیکن بہرحال یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ اصول اور عزت کے لیے وہ اپنے قریبی رشتوں اور ساتھیوں کو کڑی سزا دینے سے بھی نہیں ہچکچاتا تھا۔

تارت کی فتح کا جشن رات بھر جاری رہا۔ اس رت جگے کے بعد صبح ہم سوئے ہی تھے کہ گرجیوں کی تڑتڑاہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ خیمے کے باہر بے تحاشہ فائرنگ ہورہی تھی پہلے گولیاں ایک طرفہ طور پر چلائی جارہی تھی لیکن اب دوطرفہ فائرنگ شروع ہوچکی تھی۔ میں نے ایک طرف پڑی کلاشنکوف اٹھائی اور باہر آگیا۔ میں جس خیمے میں تھا اس کے بالکل سامنے ایک تناور درخت موجود تھا اس لیے میں فوراً باہر نکلا اور اس درخت کی آڑ میں کھڑا ہوکر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔

کسی نے سردار خوشحال خان اور اس کے قبیلے پر حملہ کردیا تھا۔ قبیلے کا محافظ دستہ حملہ آوروں کو روکے ہوئے تھا جبکہ میرے محافظوں کی جانب سے فائر کیے جارہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ساتھی قبیلے کی حفاظت کے لیے نہیں لڑ رہے بلکہ وہ اپنی وفاداری نبھارہے تھے۔

مختلف چیزوں کی اوٹ لے کر نامعلوم حملہ آوروں کو روکنے کے ساتھ ساتھ وہ میرے قریب بھی آتے جارہے تھے۔ ایک طرح سے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان کا اصل مقصد مجھے اپنے گھیرے میں لے کر یہاں سے نکلنا ہے۔ پاوندہ قبیلہ اور اس کے لوگ ان کی طرف سے بھاڑ میں جاتے۔ انہیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ یہاں کی مجھ سے وفاداری تھی ان کا کام بطور سردار میری حفاظت کرنا تھا نہ کہ پاوندہ قبیلے کے دشمنوں سے لڑنا۔ میں البتہ یہ نہیں سوچ رہا تھا۔ پاوندوں کے اس قبیلے میں میرا اچھا وقت گزرا تھا اور میرے لیے ممکن نہ تھا کہ کم از کم میری موجودگی میں یہاں حملہ ہوتا اور میں خاموشی سے نکل جاتا۔ میں نے سالار خان کو اشارہ کیا اور خود بھی حملہ آوروں کی جانب فائرنگ شروع کردی۔ اسی دوران مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا حملہ آوروں میں سے کوئی چیخ چیخ کر میرا نام لے رہا تھا۔ یہ اعلان بھی کر رہا تھا کہ اگر قبیلہ کمالے جٹ کو اس کے حوالے کردے تو وہ فائرنگ بند کردے گا اور قبیلے کو کچھ نہیں کہے گا۔ جواب میں خوشحال خان کی آواز بلند ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اپنے مہمان کی حفاظت کے لیے پاوندے آخری دم تک لڑیں گے۔ خوشحال خان کے اس اعلان کے ساتھ ہی فائرنگ میں شدت آگئی۔

مجھے حملہ آوروں میں سے اس شخص کی تلاش تھی جس نے میرا مطالبہ کیا تھا یہ واضح ہو چکا تھا کہ پاوندوں پر یہ مصیبت کمالے جٹ کی وجہ سے آئی تھی اس لیے میں اپنی تربیت کے مطابق سب سے پہلے دشمن کا سالار مار دینا چاہتا تھا لیڈر کی موت سے آدھی سے زیادہ جنگ ہار جانے کا باعث بنتی ہے۔ میں بھی دشمن کا لیڈر مارنے کے چکر میں تھا اس کے مرتے ہی حملہ آوروں کے حوصلے ٹوٹ جانے تھے لیکن اگر میں باقی لوگوں کو نشانہ بناتا رہتا تو شاید دو چار بندے مار دیتا لیکن پھر بھی جب تک لیڈر میدان نہ چھوڑتا تب تک اس کے ساتھی بھی لڑتے رہتے۔ یہ نکتہ مجھے کرنل سلیم کے زیر سایہ تربیتی کیمپ میں ہی سکھایا گیا تھا۔

میری نظر حملہ آوروں کے سرغنہ پر پڑی تو جیسے میرا خون ابل پڑا۔ وہ جعفر ایرانی تھا۔ وہی جعفر ایرانی جس کا تعاقب کرتے کرتے میں لاہور سے فاٹا پہنچا تھا اور اب پاک افغان سرحدی علاقے میں افغانستان کی حدود میں کھڑا تھا۔ جعفر ایرانی میری کائنات کا قاتل تھا لیکن اس کا اس سے بھی سنگین جرم یہ تھا کہ وہ پاکستان کا دشمن تھا۔ پاکستان کے خلاف سرگرم ایجنسیوں کی طرف سے پاکستان میں ہینڈلر کے طور پر کام کر رہا تھا۔

میں جعفر ایرانی کے حوالے سے پہلے الجھا ہوا تھا اس سے پہلے میں جعفر ایرانی کی شکل کے ایک شخص کو مار چکا تھا لیکن آخری لمحوں میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے ہاتھوں مرنے والا جعفر ایرانی کا ہمشکل تو تھا لیکن وہ جعفر ایرانی نہیں تھا مجھے ابھی تک اس بات کا علم نہیں ہوسکا تھا کہ جعفر ایرانی کا وہ ہمشکل کون تھا۔

یہ بات تو واضح تھی کہ جعفر ایرانی یہاں کسی پکی خبر کے نتیجے میں ہی آیا تھا اور اس نے آکر تصدیق کے بجائے براہ راست قبیلے پر حملہ کر کے میرا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ یہ پکی خبر اسے دارا کے کسی ہمدرد نے ہی پہنچائی تھی۔ اس کے علاوہ وہاں میرا کوئی دشمن نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو جعفر ایرانی اور میری دشمنی کا علم تھا۔

یہ بات واضح ہوتی جا رہی تھی کہ دارا کی مشکوک سرگرمیاں کس قسم کی تھیں۔ وہ جعفر ایرانی سے بھی رابطوں میں تھا یا پھر اس کے مفادات کے لیے کام کر رہا تھا یہ پاک افغان سرحدی علاقہ پاکستان مخالف طاقتوں کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے اس لیے ان کی کوشش رہتی ہے کہ کسی طرح یہاں اپنا نیٹ ورک بنا سکیں جو انہیں پاکستان میں تخریب کاری کے لیے مدد فراہم کر سکے۔ افغانستان میں بھارت کے درجنوں قونصل خانے دراصل را کے بیس کیمپ کا کام کر رہے تھے۔ لیکن انہیں پاک افغان سرحد پر بھی خفیہ کیمپوں کی ضرورت رہتی تھی۔ یہاں جعفر ایرانی اور دارا کے تعلقات بہت سی باتوں سے

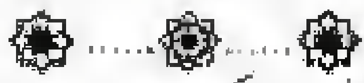
پردہ اٹھا رہے تھے۔

جعفر ایرانی نے ایک بار پھر چلاتے ہوئے کہا۔

''کمالے جٹ اپنے بل سے باہر نکل آ آج تجھے نہ تو یہ قبیلہ بچا سکے گا اور نہ ہی کوئی اور تیری مدد کے لیے آئے گا۔ تو نے میرا بھائی مارا ہے آج اس کا حساب دینا ہی پڑے گا۔''

جعفر ایرانی کی بڑھکوں سے یہ واضح ہو گیا کہ میرے ہاتھوں مارا جانے والا اس کا بھائی تھا۔ اسی لیے اس کی شکل جعفر ایرانی سے ملتی تھی۔ میں نے جعفر ایرانی کی طرف کلاشنکوف کا رخ کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ لمحوں میں بڑھکیں لگاتا جعفر ایرانی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر آ گرا۔ جعفر ایرانی کو میں نے جس طرح گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا اس کے بعد اس کا زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔

مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ میں جذبات میں ہوش کھو بیٹھا تھا۔ وطن کا دشمن میرے سامنے تھا اور مجھے زندگی میں پہلی بار وطن کی خاطر فرض نبھانا تھا اس لیے تربیت کے دوران دی گئی ہدایات نظر انداز کر بیٹھا۔ جنگ میں چھوٹی چھوٹی باتیں، بہت بڑے نقصان یا فائدے کا باعث بن جاتی ہیں۔ میں نے جعفر ایرانی کو تو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا لیکن یہ بھول بیٹھا کہ اس کے ساتھی بھی موجود ہیں۔ اصولاً مجھے گولیاں چلاتے ہی اپنی پوزیشن تبدیل کر لینی چاہیے یا مکمل طور پر آڑ میں ہو جانا چاہیے تھا گولیاں چلا کر میں اپنی موجودگی کی نشاندہی کر چکا تھا۔ جس کا خمیازہ یہ نکلا کہ جعفر ایرانی کے زمین پر گرتے وقت ایک جانب سے آنے والی درجنوں گولیوں میں سے کچھ گرم سلاخوں کی طرح میرے جسم میں اتر گئیں۔ میں لہراتا ہوا درخت کی جڑ میں گرا۔ میرے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ تیزی سے بہنے والے خون نے جیسے جسم سے ساری جان نچوڑ لی تھی۔ آہستہ آہستہ بند ہوتی آنکھوں اور ڈوبتے ذہن کے باوجود مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ حملہ آور فرار ہو رہے ہیں۔ گولیوں کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھی اور ان کی شدت میں بھی کمی آ رہی تھی۔ آخری احساس یہی تھا کہ سالار خان میرے پاس آ چکا تھا اور مجھے اٹھا کر کہیں لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔



میری آنکھ کھلی تو میں کسی اسپتال میں تھا۔ یہ شاید وہی اسپتال تھا جہاں پچھلی بار میں انگریز خان کو لایا تھا اور وہ مر گیا تھا۔ اب میری باری تھی لیکن میں ہوش میں آ گیا تھا۔ میرے پاس ہی سالار خان اور دیگر ساتھی کھڑے تھے۔ ایک طرف کرنل سلیم بھی موجود تھے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو کرنل سلیم نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے سے منع کر دیا۔

مجھے تین دن بعد ہوش آیا تھا کرنل سلیم کے مطابق میں درمیان میں بھی ہوش میں آیا تھا لیکن سچ کہوں تو مجھے یاد نہیں۔ آپریشن کر کے جسم سے گولیاں نکال لی جا چکی تھیں جبکہ خون کی بوتل ابھی بھی لگی ہوئی تھی۔ اب میری حالت خطرے سے باہر تھی۔ صرف خون بہنے کی وجہ سے قدرے نقاہت طاری تھی۔

کرنل سلیم میرے سرہانے بیٹھ گئے میرے اصرار پر دھیرے دھیرے مجھے صورت حال سے آگاہ کرنے لگے۔ وہ بتا رہے تھے کہ جعفر ایرانی اور اس کا بھائی مارے جا چکے ہیں۔ ان وطن دشمنوں کو ختم کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا ہے اس کے علاوہ جعفر ایرانی کی موت سے پاکستان مخالف طاقتوں کو شدید دھچکا پہنچا تھا۔ ان کا علاقائی نیٹ ورک تباہ ہو گیا تھا اور ہمارے خفیہ اداروں نے بروقت آپریشن کرتے ہوئے اس نیٹ ورک سے جڑے متعدد ایجنٹوں اور غداروں کو گرفتار کر لیا تھا۔

پاکستان کے دشمن اپنا پورا سیٹ اپ برباد ہونے کے بعد اپنے ہی زخم چاٹ رہے تھے۔ کرنل سلیم نے ہی بتایا کہ بیکھے مل اور اس کے دیگر ساتھی راشد ملتانی کے ہاتھوں جہنم واصل ہو گئے ہیں۔ راشد ملتانی نے جشان والا اور اس کے ارد گرد اپنا نیٹ ورک بنا لیا تھا۔ یہ نیٹ ورک میرے ہی نام سے چل رہا تھا اور بظاہر یہی ظاہر کیا

جارہا تھا کہ اس علاقے کے سارے دو نمبر دھندوں میں راشد ملتانی کے نائب کی حیثیت سے میں ہی کام کررہا ہوں۔ راشد ملتانی کے آنے سے بیکھے مل کے دھندے چوپٹ ہوگئے جس کی وجہ سے انہیں مجھ پر شدید غصہ تھا۔ انہیں شدید مالی و جانی نقصان ہورہا تھا اور ہر نقصان کے پیچھے انہیں کمالا جٹ کا نام ہی سننے کو ملتا تھا۔ وہ اپنے نقصان پر پاگل ہوچکے تھے۔ دوسرا انہیں اس بات پر بھی غصہ تھا کہ میں متعدد بار ان کے گھیرے سے نکل جانے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ ان کے ہاتھوں نہ مرنے والا کمالا جٹ اب ان کے منہ کو آگیا تھا اور ان کے مقابل پورا گینگ بنا کر اپنے دھندے چلا رہا تھا۔ یہ بات بھی انہیں ہضم نہیں ہورہی تھی۔

بیکھے مل نے براہ راست ٹانگ اڑانی شروع کردی تھی۔ اپنے اندر چھپے حسد اور کینے کی وجہ سے اس نے بعض معاملات میں فراڈ اور دو نمبری شروع کردی۔ وہ شاید بھول بیٹھا تھا کہ دو نمبری کے دھندوں کا اصول ہے کہ دھندے میں دو نمبری نہیں کی جاتی یہ دھندے زبان یا ہتھیار کے بل پر ہی چلتے ہیں کیونکہ ان میں اسٹامپ پیپر نہیں لکھوائے جاتے۔ انہی جھگڑوں میں حد سے زیادہ بڑھنے کی وجہ سے ایک روز وہ راشد ملتانی گینگ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

مجھے بیکھے مل اور اس کے حواریوں کے اس طرح مرنے کا افسوس تھا۔ میری خواہش تھی کہ وہ میرے ہاتھوں ہی قتل ہو لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ میرے اہم دشمن مارے جاچکے تھے۔ یہ باتیں کرنل سلیم کی جگہ کوئی اور بتاتا تو شاید مجھے اتنی جلدی اعتبار نہ آتا لیکن میں جانتا تھا کہ کرنل سلیم جھوٹ نہیں بولتے۔

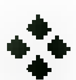
میں نے آنکھیں بند کرلیں اب مجھے جلد از جلد تندرست ہوکر واپس جانا تھا۔ میں نے مہک بھابی سے وعدہ کیا تھا کہ انہیں اور گل ریز خان کے بیٹے کو یہاں سے لے جاؤں گا۔ گل ریز خان کے بیٹے نے ان جھگڑوں میں الجھنے کے بجائے وطن کا محافظ بننا تھا۔ مہک بھابی کی بھی یہی خواہش تھی اور میں بھی یہی چاہتا تھا میرا ارادہ تھا کہ انہیں جتاں والا لے جاؤں گا۔ وہاں ابھی بھی میرے کچھ ایسے اپنے موجود تھے جو انہیں اپنے گھر کے ایک فرد کی طرح ساتھ رکھ سکتے تھے۔

جہاں تک میری بات تھی تو اب کمالا جٹ اپنی نظروں میں معتبر ہوچکا تھا۔ میرا یہ پہلا مشن کرنل سلیم کی امیدوں سے بھی زیادہ کامیاب رہا تھا اس لیے انہوں نے مجھے چپکے سے یہ خوشخبری سنادی تھی کہ اب میں وطن کے دشمنوں سے مستقل لڑتا رہوں گا کم از کم اس وقت تک مجھے وطن کے لیے لڑنا تھا جب تک انہی گمنام راہوں میں مارا نہ جاؤں۔ شاید میری لاش بھی واپس نہ آئے یا پھر مرنے کے بعد مجھے شہید کے بجائے چور، ڈاکو یا اشتہاری مجرم کے طور پر ہی شناخت کیا جائے کہ اس راہ کے مسافر کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ نہ تو ہم شہید مانتی ہے اور نہ کوئی ادیب ہمیں اپنا لکھتا ہے۔ لیکن تاریخ ہمیں وطن کے لیے لڑنے والے خفیہ ہیروز کے طور پر یاد رکھتی ہے۔

باقی میں سب کے لیے کمالا جٹ ہی ہوں وہی کمالا جو درجنوں مقدمات میں اشتہاری مجرم کے طور پر شناخت کیا جاتا ہے۔ جاتے جاتے کرنل سلیم مجھے کہہ گئے کہ جعفر ایرانی کا راست چند دن نکلنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اسے نیا نیٹ ورک بنانے میں کامیاب ہونے سے روکنے کے لیے ایک بار پھر کمالے جٹ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس لیے جلد از جلد تندرست ہوجاؤ۔

میں نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں کیونکہ کرنل سلیم نہیں جانتے تھے کہ اب کمالا جٹ اگلے ہی دن اپنے پاؤں پر چل رہا ہوگا۔ وطن کے غداروں کا نام سن کر میرے پاؤں میں لگنے والی آگ مجھے اسپتال کے بیڈ سے اٹھنے پر مجبور کررہی تھی۔

وطن کے دفاع کے لیے ایک نیا مشن میرا منتظر تھا۔



تین سوال

خان شفیق

اللہ تعالیٰ کا تصور دنیا کے تمام مذاہب میں یکساں ہے کہ اس نے دنیا بلکہ تمام کائناتوں کو تخلیق کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو خلق کر کے انسانوں کو اس دنیا میں بھیجا۔ مگر ایمان کے ساتھ ہمارے اذہان میں اس کے وجود کے بارے میں طرح طرح کے تصور جنم لیتے ہیں' کوئی اسے جبار و قہار سمجھتا ہے تو کوئی رحیم و کریم سمجھ کر دنیا میں آزادی اختیار کر لیتا ہے۔ مگر وہ اپنی وجۂ تخلیق پر غور نہیں کرتا۔
ایک ایسی بستی کا قصہ' جو خوف کے عذاب میں مبتلا تھی۔

شام کے سائے دبیز ہوتے جا رہے تھے لیکن راستے کے مناظر ایسے حسین اور دلکش تھے کہ بزرگ مسافر کو تھکن اور کسالت کا ذرا بھی احساس نہ ہوا تھا پھر اس کے سفر کا ایک مقصد تھا وہ اس سرسبز وادی کے نشیب و فراز سے گزرتا رہا جہاں دور دور تک کسی آبادی کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اب وہ نشیب کی جانب اترنے لگا تھا۔ نشیب میں ایک حسین وادی تھی' دور تک پھیلا ہوا ہموار میدانی اور خاصے طویل فاصلے پر پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آ رہا تھا جہاں سے جھرنے بہتے ہوئے ہموار میدانوں میں بل کھاتے ہوئے چشموں کی شکل اختیار کر گئے تھے یہاں کچھ آبادی کے آثار بھی معلوم ہوتے تھے۔

"دراصل شاید اسی ریاست کی سرزمین ہے جہاں کی اطلاع مجھے ملی تھی۔" مسافر نے سوچا' آبادی کے مکانوں سے دھواں سا اٹھتا ہوا نظر آتا تھا اور وہاں کا ماحول دھندلایا ہوا تھا۔ مسافر آہستہ آہستہ نشیب کا رخ کر رہا تھا اور سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے وہ نیچے اتر آیا۔ وادی کا ماحول سنسان تھا اور یہاں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے' وہ ایک سمت روانہ ہو گیا ابھی کچھ تھوڑا فاصلہ ہی طے ہوا تھا کہ اس نے ایک چرواہے کو کچھ بکریوں کے ساتھ ایک جانب جاتے ہوئے دیکھا۔

"سنو! ذرا میری بات سنو' " اس نے چرواہے کو آواز دی۔ چرواہے نے اس کی طرف بے اعتنائی سے دیکھا اور بدستور بکریوں کو ہانکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بزرگ مسافر نے محسوس کیا کسی ایک بکری کی گردن میں گھنگھرو بندھے ہوئے نہیں تھے۔

چشمے بہہ رہے تھے اعتدال کے ساتھ ہوا چل رہی تھی' سورج تمام دن کا سفر طے کرنے کے بعد مغرب کی سمت ڈوب رہا تھا اور افق پر قرمزی رنگ ابھر آئے تھے۔

"یہ رات کیسے بسر ہوگی؟ کہاں بسر ہوگی؟" وہ سوچنے لگا اسی دوران ایک ادھیڑ عمر کا شخص سر جھکائے نمودار ہوا وہ ایک جانب جا رہا تھا۔

"اے بھائی ذرا میری بات سنو۔" بزرگ نے کہا لیکن وہ شخص رکا نہیں بلکہ مسافر کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

"عجیب پُراسرار لوگ اور پُراسرار وادی ہے یہ سکوت' خوف زدہ ماحول۔" بزرگ مسافر نے سوچا' سورج اب ڈوب چکا تھا۔ اشجار سرنگوں تھے' پرندے اپنے اپنے آشیانوں کا رخ کر رہے تھے اور مسافر حیران و پریشان تھا کہ دفعتاً ایک عمر رسیدہ شخص سفید لباس پہنے ہوئے ایک سمت سے نمودار ہوا۔

شاید یہ شخص میری جانب متوجہ ہو جائے' مسافر نے سوچا۔ "اے برادر! کیا آپ میری بات سننا پسند

کریں گے۔" یہ سن کر وہ شخص ٹھہر گیا اور مسافر کا جائزہ لینے لگا۔

"کیا کہنا چاہتے ہیں آپ شاید نو وارد ہیں۔" اس شخص نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں میں ایک مسافر ہوں اور صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں' رات بسر کرنے کا کوئی ٹھکانہ' کوئی سرائے یہاں ہے۔"

"ٹھکانہ' سرائے' رات گزارنے کے لیے..... آپ ایک وادیٔ خوف میں آ گئے ہیں۔" اس نے یہ الفاظ بڑے سہمے لہجے میں ادا کیا۔ "بہر حال وہ دور فاصلے پر کچھ روشنی دیکھ رہے ہیں آپ؟"

"ہاں دیکھی ہے روشنی۔" مسافر نے کہا۔

"زیادہ دور نہیں تقریباً چار فرلانگ کا فاصلہ ہے وہاں ایک بڑا سا احاطہ ہے شمالی دیوار میں صدر دروازہ ہے۔ وہاں چلے جائیں شاید وہ آپ کو جگہ دے دیں۔" اس شخص نے کہا اور پھر چلا گیا۔ مسافر روشنی کی سمت روانہ ہو گیا۔ آخر وہ احاطے کے پھاٹک پر پہنچ گیا' پھاٹک میں بنے ہوئے چھوٹے سے دروازے پر دستک دی' ایک بار' دو بار اور تیسری بار دروازے سے تھوڑی ہی دیر گزری تھی اندر سے ایک شخص لالٹین ہاتھ میں لے آیا' اس نے تھوڑا سا پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھولا۔

"کون ہیں آپ' یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"ایک مسافر ہوں رات گزارنا چاہتا ہوں۔" اس شخص نے غور سے بزرگ مسافر کو دیکھا اور کہا۔

"ذرا یہاں ٹھہریں میں مہتمم صاحب سے پوچھ کر آتا ہوں۔" وہ دروازہ بند کر کے واپس چلا گیا' پھر نصف گھنٹے کے بعد لوٹا۔

"اندر آ جائیں۔" اس نے کہا اور مسافر اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھا یہ مربع شکل کا احاطہ تھا جس نے تقریباً ایک ہزار گز زمین کو گھیر رکھا تھا' اس کے تین اطراف میں کمرے بنے ہوئے تھے مغربی سمت نماز پڑھنے کا چبوترہ' باورچی خانہ پھر غسل خانے اور حوائج ضروریہ کی جگہیں تھیں۔ ہر کمرے میں لالٹین روشن تھی اور کچھ جگہوں پر مشعلیں بھی جل رہی تھیں۔ وہ شخص مسافر کو لے کر ایک کمرے کی طرف چلا گیا جو نسبتاً دوسرے کمرے سے چھوٹا تھا۔

"اس کمرے میں آپ قیام کریں۔" اس نے کہا کمرے میں لالٹین روشن تھی' یہاں ایک چارپائی' پانی کا گھڑا اور ایک آبخورہ رکھا تھا۔ مسافر نے اپنا بستر کھول کر چارپائی پر بچھا دیا' صبح اس کے کانوں میں اذان کی آواز آئی اور وہ ضروریات سے فارغ ہو کر حوض کی طرف چلا گیا۔ نماز کے بعد ہر شخص کلام پاک کی تلاوت میں مصروف ہو گیا' یہ سلسلہ سورج طلوع ہونے تک جاری رہا۔

"آپ اپنے کمرے میں بیٹھیں' ناشتہ وہیں آ جائے گا۔" ایک شخص نے آ کر کہا۔

اس دوران مسافر نے محسوس کیا کہ یہ لوگ بہت خوف زدہ تھے اور آپس میں باتیں بھی سرگوشیوں میں کرتے تھے۔ ایک پراسرار سا ماحول یہاں طاری تھا' کیا وجہ تھی' کیا سبب تھا' مسافر کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔ یوں لگتا تھا تمام وادی پراسراریت کی زد میں تھی۔ فجر کی نماز کے بعد امام صاحب نے جس انداز میں دعا مانگی لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

"اے بار الٰہی! رحم کر ہم عاجزوں پر' معاف کر دے ہماری کوتاہیوں' لغزشوں اور خطاؤں کو۔" مسافر کی سمجھ میں اب کچھ کچھ آنے لگا تھا' یہ لوگ کسی سزا یا عذاب میں مبتلا تھے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

پیر کی ابتدائی شب میں مسافر یہاں پہنچا تھا' دو روز اطمینان سے گزرے اور ان لوگوں کا رویہ بھی اس دوران خاصہ شائستہ رہا۔

"آج آپ یہاں سے روانگی کا قصد کریں۔" جمعرات کی صبح ناشتے کے بعد ایک شخص نے آ کر قدرے روکھے پن سے کہا' مسافر خاموش رہا' اس نے ذہنی طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس صورت حال کو بدل

کر رہے گا۔ کیا راز ہے؟ کیوں یہ لوگ ایک انہونی اذیت میں مبتلا ہیں یقیناً کوئی وجہ ضرور ہے۔ مسافر ان ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ نصف گھنٹہ گزر جانے کے بعد ایک دوسرے شخص آیا اور کہا۔

"کیوں محترم ابھی تک آپ نے جانے کی تیاری نہیں کی براہ کرم جلدی کریں ہم مزید آپ کو یہاں نہیں ٹھہرا سکتے۔" مسافر اس شخص کا چہرہ دیکھنے لگا پھر وہ چلا گیا اور مسافر بدستور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

"عجیب شخص ہیں آپ کسی صورت جانے کا نام نہیں لیتے آخر کیا سوچا ہے آپ نے؟" ایک تیسرے شخص نے آکر خاصے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں نے سوچا ہے کہ میں یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک آپ کے مہتمم سے بات نہ کرلوں آپ جا کر بتا دیں۔"

"زبردستی ہے کیا؟"

"ہاں زبردستی ہے جائیں اور جا کر بتا دیں۔" وہ شخص سیدھا مہتمم کے حجرے میں داخل ہوا اور مسافر کے بارے میں بتا دیا۔

"وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔" مہتمم نے کہا۔

"جی محترم اس کا کہنا ہے کہ آپ سے ملے بغیر نہیں جائے گا۔" اس شخص نے مہتمم صاحب سے کہا۔

"کیوں بضد ہے وہ مجھ سے ملنے کے لیے کچھ لوگ پہلے بھی یہاں آچکے ہیں اور خاموشی سے چلے گئے۔" مہتمم صاحب نے اپنے دل میں کہا۔

"ٹھیک ہے عزیز! میں اس سے مل لیتا ہوں اور تم اب جاؤ۔" انہوں نے اپنے آدمی سے کہا پھر کچھ دیر بعد وہ اس کے کمرے میں چلے گئے۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام!" مسافر نے جواباً کہا۔

"آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"جی۔"

"کیوں؟"

کون ہے کا خوابوں کی تعبیر

برٹش گورنمنٹ ختم ہوگئی تو انگریز یہاں سے چلا گیا' لیکن خود فوجی جرنیل' بیوروکریٹ' جاگیردار' سرمایہ دار اور وہ سیاسی خاندان جو اپنے عہد حکومت میں تیار کر چکا تھا' انہوں نے تو اسی ملک میں رہنا تھا اور اپنے آقا کی غلامی کا حق ادا کرتا تھا' برصغیر کے مسلمانوں نے آزادی کا جو خواب دیکھا تھا' بدقسمتی نے وہ خواب ہی شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا۔ نہ تو فرنگی جمہوری نظام کی جگہ شرعی اسلامی نظام آیا نہ ہی اقتدار معاشرہ فرنگی نواز ملک وملت کے غداروں کے ہاتھ سے نکل کر صلحاء اور معززین معاشرہ کے ہاتھ آیا اور نہ ہی وہ تاریخی اسلامی خلافت اور مملکت بحال ہوئی' جس کا خواب مسلمانان برصغیر نے دیکھا اور جس کے حصول کے لیے اپنی جانوں اور عصمتوں کے نذرانے پیش کیے تھے۔ ہے کوئی آزادی کے ان متوالوں کے خوابوں کی تکمیل کرنے والا؟

مرسلہ: اقبال احمد...... اسلام آباد

سفارش

جائز و ناجائز حلال و حرام اور گناہ کا امتیاز اٹھ جانے کی وجہ سے سفارش کرانا اور کرنا ایک فیشن' رسم اور رواج کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ حالانکہ سفارش صرف حق کے لیے جائز ہے ورنہ ناجائز سفارش حرام اور گناہ ہے۔ جن امور حق کے لیے سفارش جائز ہے ان کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ سفارش اس طریق پر کرے کہ مخاطب آزادی میں رائی برابر خلل نہ پڑے اسے اس کے لیے مجبور نہ کرے۔ اس پر زور نہ دے۔ اس کے قرابت داروں یا دوستوں کو بار بار اس کے پاس نہ بھیجے اور نہ سفارش کرنے کے لیے لوگوں کو رشوت پہنچائے جیسے بڑے آدمیوں کے عزیز و اقارب ان کے معتقد یا بااثر لوگوں سے کام نکلوانے کے لیے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ تحائف دیتے ہیں جو رشوت ہی کی ایک قسم ہے اس طرح دوسروں کو بددیانتی اور حق تلفی کے لیے مجبور کرنا ہوتا ہے۔

ارشد علی...... لاہور

''اس کی معقول وجہ ہے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں آپ لوگ اتنے زیادہ خوف زدہ کیوں ہیں' ابتدا میں آپ لوگوں کا رویہ میرے ساتھ انتہائی شائستہ تھا اور پھر اس میں تلخی پیدا ہوگئی۔ کیا مہمانوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا جاتا ہے پھر خاص طور پر آپ فجر کی نماز کے بعد انتہائی عاجزی سے دعا مانگتے ہیں کہ مجھے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ آپ لوگ کسی بڑی اذیت میں مبتلا ہیں آخر کیا بات ہے؟ کیا راز ہے؟ کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کرسکتا ہوں۔'' محترم ابومصعب نے نگاہیں اٹھا کر مسافر کو دیکھا۔

''ہاں آپ کا یہ قیاس درست ہے' ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ کسی بھی فرد واحد سے ہم اپنے دکھ' اپنے درد اور اپنی اذیت کا تذکرہ نہیں کریں گے۔ مددگار تو صرف اللہ ہی ہے صرف اس سے مدد مانگیں گے۔'' محترم ابو مصعب نے کہا۔

''محترم مدد کے مختلف طریقے ہیں' جب سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا' وہاں کلیسائے کبریٰ کے پادریوں کا خیال تھا کلیسا کی دیواریں پھٹ جائیں گی فرشتے نمودار ہوں گے اور ترکوں کو تہس نہس کردیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ دوسری جانب نپولین مصر کی طرف بڑھ رہا تھا اور جامعہ ازہر میں ختم خواجگان ہو رہا تھا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا اور نپولین مصر کو روندتا ہوا گزر گیا' جب تلوار اٹھانے کی ضرورت ہو دعاؤں سے کام نہیں چلتا۔'' ابومصعب بزرگ مسافر کا چہرہ دیکھنے لگے۔

''محترم مسافر! ہم بڑے عذاب میں مبتلا ہیں آج جمعرات ہے اور آج عصر کے وقت ہم پر یہ عذاب پوری شدت سے نازل ہونے والا ہے' ہم جانتے ہیں کہ مہمان کی حرمت کیا ہے اور اسی خیال سے کہ کہیں آپ بھی اس عذاب میں مبتلا نہ ہوجائیں' ہم نے چاہا کہ آپ کو یہاں سے رخصت کردیا جائے۔''

''یہ عذاب کیا ہے؟'' مسافر نے پوچھا۔

"یہ عذاب....." ابومصعب نے گہرا سانس لیا اور مسافر ہمہ تن گوش ہوگیا۔ "عصر کے وقت دراز قامت لوگ جن کے چہرے سیاہ نقابوں سے ڈھکے ہوتے ہیں قوی ہیکل گھوڑوں پر سوار' ہاتھوں میں تازیانے لیے ایک سمت سے نمودار ہوتے ہیں اور ہم سب کو میدان میں اکٹھا کر لیتے ہیں کسی ایک شخص کو بھی اس کے گھر میں نہیں رہنے دیتے اور ہم لوگ ان کے سامنے بے بس ہوتے ہیں۔" ابومصعب نے ایک بار پھر گہرا سانس لیا اور خوف زدہ نگاہوں سے شمالی سمت دیکھنے لگے جہاں سے یہ جابر شہسوار ظاہر ہوتے تھے۔

"پھر....."

"پھر اے محترم مسافر! ان کا سردار بلند آواز میں کہتا ہے "کون ہے جو آج ہمارے سوالوں کا جواب دے گا" کوئی نہ کوئی شخص آگے بڑھتا ہے اور ان کے تین سوالوں کے جواب دیتا ہے پھر اذیت کا بازار گرم ہو جاتا ہے اس قدر تازیانے وہ ہماری کمر پر برساتے ہیں کہ ہم سب بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں جب ہوش آتا ہے تو ستارے ہمارے درد ہمارے دکھ پر طنزیہ مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اگر چاندنی راتیں ہوتی ہیں تو چاند کا طباق جیسا درخشاں چہرہ ہمارا مذاق اڑا رہا ہوتا ہے کیوں یہ عذاب ہم پر مسلط ہے' ہمارے ذہن یہ سوچ سوچ کر گم صم ہو کر رہ گئے ہیں۔" اتنا کہہ کر ابومصعب خاموش ہو گئے ان کی آنکھوں میں درد کے ستارے ابھر آئے تھے۔

"اور یہ سوال.....؟" مسافر نے کہا اور ابومصعب نے سوالات بتا دیئے۔

"یہ سوال ان کے جوابات بالکل درست دیے جاتے ہیں اس لیے کہ آفاقی حقائق کو کہیں بدلنے کی گنجائش نہیں ہوتی ہے' ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ہر شے کا خالق اللہ ہے ان کے جوابات کے بعد تازیانے حرکت میں آ جاتے ہیں ہمیں ایسی بے رحمی سے ہمیں زدوکوب کیا جاتا ہے جس کی تکلیف ناقابل برداشت

اہل تصوف کی کرامت

کہتے ہیں کہ حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمتہ اللہ علیہ ہندوستان تشریف لا رہے تھے کہ راستے میں ان کا گزر ایک ایسے مقام سے ہوا جہاں پارسیوں کا بڑا آتش کدہ تھا۔ حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمتہ اللہ علیہ نے اس کے قریب قیام کیا اور اپنے خادم کو بھیجا کہ افطار کے واسطے آگ پر روٹی پکالائے خادم گیا تو آتش پرستوں نے آگ نہ دی حضرت کو خود اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا جب آپ آگ کے قریب پہنچے تو وہاں ایک بوڑھا موبد مختار نام کا سات برس کے لڑکے کو گود میں لیے کھڑا تھا حضرت نے اس سے گفتگو کی آپ نے اس سے فرمایا کہ آگ ایک فانی چیز ہے ایک چلو پانی سے معدوم ہو جاتی ہے اس کو کیوں پوجتے ہو؟ اور جو خالق کائنات ہے جو اس آگ کا خالق ہے اسے کیوں نہیں پوجتے۔ اس نے کہا کہ آگ ہمارے مذہب میں بڑا مرتبہ رکھتی ہے اس کو کیوں نہ پوجیں۔ حضرت نے کہا کہ تم اتنی مدت سے آگ کی صدق دل سے پرستش کرتے ہو کیا تم یہ کر سکتے ہو کہ اپنا ہاتھ یا پاؤں اس آگ میں ڈالو اور وہ نہ جلائے۔ بوڑھے موبد نے کہا جلانا آگ کی خاصیت ہے جو اس میں ہاتھ ڈالے گا جل جائے گا۔ حضرت نے موبد کی یہ بات سن کر موبد کے فرزند کو اس کی آغوش سے لیا اور خود یہ آیت کریمہ پڑھتے ہوئے آگ میں داخل ہو گئے قلنا یا نار کونی بردا وسلاما علیٰ ابراہیم۔ یہ دیکھ کر موبد اور اس کے ساتھی حیران اور پریشان ہو گئے آگ کے گرد شور کرنے لگے اور آہ و فغاں بلند کرتے مگر اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ تھوڑے دیر کے بعد حضرت خواجہ اس بچے کے ساتھ آگ کے شعلوں میں سے اس طرح نکلے کہ ان کے کپڑوں پر کوئی داغ دھبہ نہ تھا تمام آتش پرست یہ حال دیکھ کر ششدر رہ گئے اور حضرت کی کرامت دیکھ کر ان کے ہاتھ پر ایمان لائے' سات سالہ بچے کا نام ابراہیم اور بوڑھے موبد کا نام شیخ عبداللہ رکھا۔ سیرالعارفین کے مصنف کا کہنا ہے ان دونوں ہستیوں کے عالیشان مقبرے میں نے دیکھے اور قیام بھی کیا۔

شمائلہ رفیق..... سمندری

ہوتی ہے اور ہم بے ہوش ہو جاتے ہیں۔" اتنا کہہ کر ابو مصعب خاموش ہو گئے ماحول سوگوار تھا۔ فضا اداس تھی آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں سفید بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے اور درد کی ایک دنیا اجاگر تھی۔

"آج یہ عذاب آپ کے سروں سے ٹل جائے گا۔" مسافر نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"عذاب ٹل جائے گا' یا آپ کہہ رہے ہیں؟" ابو مصعب سراپا حیرت بن گئے تھے۔

"کیسے...... کیونکر......؟"

"مجھے آپ ان سوالوں کے جوابات دینے کی اجازت دیں؟"

"آپ کو......"

"ہاں مجھے۔" مسافر کی آنکھوں میں ایک پُر اسرار چمک تھی۔

"لیکن......"

"کچھ نہیں محترم ابو مصعب اطمینان رکھیں۔"

شام ہونے لگی سورج کا جھکاؤ مغربی سمت بڑھ گیا۔ لوگ اس میدان میں اکٹھے ہونے لگے' فضا اداس تھی ماحول سوگوار تھا۔ دلوں کی دھڑکنیں دھیمی پڑ گئی تھیں اور بے بسی کے سائے منڈلا رہے تھے پھر شمالی سمت سے غبار اٹھا' دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور یہ ہیبت ناک شہسوار اس میدان میں در آئے۔

"کون ہے جو آج ہمارے سوالوں کے جوابات دے گا؟" ان جابروں کے سردار نے گھوڑا آگے بڑھا کر بلند آواز میں کہا۔

"میں دوں گا تمہارے سوالوں کے جواب۔" بزرگ مسافر خم ٹھونک کر آگے بڑھے۔

"تم......"

"ہاں میں۔" سردار اپنی آنکھوں سے جو نقاب سے جھانک رہی تھیں انہیں دیکھنے لگا۔

"بتاؤ اس کائنات' اس دنیا کو کس نے پیدا کیا؟"

"خدائے بزرگ و برتر نے۔"

"جواب دو تمہیں کس نے پیدا کیا؟"

"خدائے لم یزل نے۔" مسافر کی نگاہوں کی چمک میں تیزی سی ہو گئی تھی۔

"بتاؤ' ہاں بتاؤ ہمیں کس نے پیدا کیا؟" سردار اور اس کے ہمنواؤں کے تازیانے بلند ہونا شروع ہوئے جیسے حرکت میں آنے والے ہوں۔

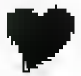
"تمہیں...... تمہیں......" مسافر کی آنکھوں کی چمک ایک اعتماد کو ظاہر کر رہی تھی۔ "تمہیں پیدا کرنے والے ہم ہیں۔" اتنا کہنا تھا کہ ایک زوردار دھما کا ہوا جس سے تمام وادی گونج گئی' گرد و غبار کے بادل اٹھے وقت سے پہلے اندھیرا چھانے لگا اور جب مطلع صاف ہوا تو لوگ بت بنے ہوئے تھے۔

"آپ نے دو سوالوں کے جوابات کہ اس کائنات کو اور ہمیں کس نے پیدا کیا' وہی دیئے جو ہم دیتے رہے ہیں لیکن تیسرا سوال کہ انہیں کس نے پیدا کیا' ہمارے جوابات سے مختلف تھا۔"

"نادان ہیں آپ لوگ' نہیں سمجھے کہ تیسرے سوال کے پس منظر میں کیا حقیقت تھی۔ یہ ہمارے برے اعمال تھے جو عمال کی صورت میں ہم پر مسلط ہو گئے تھے۔ میرا مقصد پورا ہو گیا اور اب میں جا رہا ہوں۔"

"بزرگ مسافر آپ ہیں کون؟"

"میں تمہاری پُر خلوص دعاؤں کی تجسیم ہوں۔" اس نے کہا اور چلا گیا۔



انجانے فیصلے

زرین قمر

بڑے کہتے ہیں جو بھی فیصلہ کرو سوچ سمجھ کر کرو تاکہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے مگر کچھ لوگ فیصلے کرنے میں عمر گزار دیتے ہیں اور جب کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں تو وقت نکل چکا ہوتا ہے۔ لیکن کچھ فیصلے بالکل انجانے میں اس طرح اچانک ہوجاتے ہیں کہ آدمی دیکھتا رہ جاتا ہے۔

اک الماس حسن کا فسانہ' اس کی خزاں رسیدہ شاموں پر اچانک بہار اتر آئی تھی۔

اسرار اور تجسس سے لبریز روایت سے ہٹ کر ایک خوبصورت ناولٹ

شازیہ جلال نے خیرآباد کی سپر مارکیٹ کے مخصوص دروازے سے اندر قدم رکھا تو اس کا سر فخر سے تن گیا' وہ سپر مارکیٹ کے جس گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی وہ صرف سپر مارکیٹ میں داخل ہونے کے لیے اس کا اسٹاف ہی استعمال کرسکتا تھا اسے امید تھی کہ آج کا دن اس کی زندگی کا یادگار دن ثابت ہوگا کیونکہ آج اسے اس سپر مارکیٹ کے ایک نئے اسٹور میں ملازمت مل گئی تھی۔

سپر مارکیٹ کی یہ سفید اور سرمئی رنگ کی عمارت خیرآباد کے عین درمیان میں واقع تھی اور حال ہی میں تعمیر کی گئی تھی اور اب اس کے مختلف فلورز پر نئے اسٹور سجائے جارہے تھے

"یہ ہمارے لیے ناگزیر ہوگیا تھا کہ ہم تمہیں ایک ڈیپارٹمنٹ سے دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دیں۔" سپر مارکیٹ میں قدم رکھتے ہوئے شازیہ کو اپنے پرسنل منیجر کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی' اس نے ان کی اس بات کا برا نہیں مانا تھا' اس نے سوچا تھا کہ اسے تو ملازمت ہی کرنا ہے چنانچہ کوئی بھی ڈیپارٹمنٹ ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

سپر مارکیٹ میں داخل ہونے کے بعد وہ اس اسٹور تک آسانی سے پہنچ گئی تھی۔ جہاں اسے ملازمت دی گئی تھی' وہاں اسے اس کا کام سمجھا دیا گیا تھا اور اس نے کام شروع کردیا تھا۔ پھر جب وہ مختلف چیزوں پر سے گرد اور مٹی صاف کررہی تھی تو منیجر اسسٹنٹ نے اسے بتایا تھا کہ مختلف رنگوں کے کپڑے اور دوسری چیزیں کہاں اور کیسے اسٹاک کی جاتی ہیں' شازیہ خاموشی سے اس کی ہدایات سنتی رہی تھی وہ اس نئے ڈپارٹمنٹ میں آنے پر بہت خوش تھی اور اسے اس نئے اسٹور اور پرانے بوتیک اسٹور میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا جہاں وہ اب سے کچھ عرصے پہلے تک کام کرتی رہی تھی۔

شازیہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اچانک اس کے بوتیک کے مالک مسٹر ہارون اپنے چار افراد کے ساتھ جو ان کے شریک تھے اپنا شوروم ایک کنسٹرکشن کمپنی کے حوالے کردیں گے وہ اس بوتیک میں تین سال سے ملازم تھی اس کی عمر بیس سال تھی اور اس کے خیال میں دنیا کو سمجھنے کے لیے یہ عمر ناکافی تھی۔ شازیہ اپنی ساتھیوں سے بہت مختلف تھی اس کی ساتھی لڑکیوں کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ وہ ایک دن کی سیل میں سامان فروخت کرلی ہیں تو دوسرے دن کھلونے بیچتی نظر آتی ہیں' جبکہ وہ ہمیشہ سلک اور نرم اونی سامان کے کام کو پسند کرتی تھی' مسٹر ہارون کے بوتیک میں اس کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ ماڈلز کے لیے ریشمی ملبوسات اور اونی شالیں تیار کرتی تھیں اور یہ اس کا پسندیدہ کام تھا۔

جس روز شازیہ کو اپنی پرانی ملازمت سے جواب ملا تھا اس سے اگلے روز شازیہ کا کزن جو اس کا منگیتر بھی تھا اس

کے والدین سے ملنے آدم پور آیا تھا' شازیہ اور اس کے کزن جمیل احمد کا بچپن آدم پور ہی میں گزرا تھا انہوں نے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی وہ دونوں ایک دوسرے کے ملنے والے تھے۔ لوگ بھی جب کسی دعوت اور پارٹی میں انہیں بلاتے تھے تو ساتھ ہی بلاتے تھے وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم تھے۔

جمیل آدم پور ہی کی ایک اسٹیٹ ایجنسی میں ملازم تھا لیکن چند ماہ پہلے وہ اس ملازمت کو چھوڑ کر نئی فرم میں چلا گیا تھا' جو آدم پور سے کچھ فاصلے پر واقع ایک چھوٹے سے قصبے خیر آباد میں واقع تھی۔

"وہاں میرے لیے ترقی کے زیادہ امکانات ہیں۔" اس نے شازیہ کے پوچھنے پر بتایا تھا۔

"میں وہاں کے میڈیکل کالج میں داخلہ لے رہا ہوں اس طرح میری تعلیم بھی جاری رہے گی۔" جمیل کی اس بات پر شازیہ خاموش ہوگئی تھی پھر جمیل کے جانے کے بعد اس نے ہر موقع پر اس کی کمی کو محسوس کیا تھا۔

شازیہ کو بوتیک کی ملازمت سے جواب ملنے کے بعد جب جمیل آدم پور آیا تھا تو وہ ہمیشہ کی طرح تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ دلکش وکشادہ آنکھوں والی خوبصورت لڑکی تھی جو اسپورٹس کار میں اس کے برابر فرنٹ سیٹ پر براجمان ہے۔

"ہادیہ' راحیلہ انور کی کزن ہے۔" جمیل نے ان دونوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ بھی تمہارے ساتھ خیر آباد میں ملازمت کرتی ہے۔" شازیہ نے پوچھا۔

"ہاں' یہ وہاں کی سپر مارکیٹ میں ملازم ہے۔ وہ سپر مارکیٹ نئی تعمیر ہوئی ہے اور وہاں صرف خواتین ہی دکان دار اور خواتین ہی خریدار ہوں گی میں یہ تو نہیں جانتا کہ یہ وہاں کیا کرتی ہے لیکن اتنا پتہ ہے کہ یہ وہاں کے کاؤنٹرز میں سے ایک پر موجود ہوتی ہے۔" جمیل نے ہنستے ہوئے تفصیل بتائی پھر اس نے شازیہ کو بھی وہاں ملازمت کرنے کا مشورہ دیا تھا اور جب آدم پور میں دو روز ٹھہرنے کے بعد جمیل احمد واپس خیر آباد گیا تھا تب بھی ہادیہ اس کے ساتھ ہی گئی اور شازیہ نے ان دونوں کو الوداع کہا تھا' ہادیہ کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ بہت مطمئن اور مسرور ہے جبکہ شازیہ کی نیلاہٹ مائل آنکھوں میں اداسی کے سائے لہرا رہے تھے۔

جمیل احمد کے جانے کے بعد وہ کئی دن تک بہت سنجیدگی سے اپنے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ اسے نئی ملازمت کی ضرورت تھی اور اس کے لیے وہ آدم پور سے باہر کسی بھی جگہ ملازمت کرنے کے لیے تیار تھی۔

شازیہ کے والد کے انتقال کے بعد شازیہ اپنے آبائی گھر میں اپنے بڑے بھائی وہاب الرحمٰن اور بھابی ثریا کے ساتھ رہتی تھی اس کا ایک آٹھ سال کا بھتیجا بھی تھا جس کا نام تو عمران تھا لیکن شازیہ پیار سے اسے عامی پکارتی تھی۔ شازیہ کی والدہ بھی اپنے شوہر کی وفات کے بعد ایک سال تک اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہتی تھی لیکن پھر چھوٹی بہن کے ہاں منتقل ہوگئی تھی اور تب ہی شازیہ نے بھی یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ بھی اپنے بھائی پر بوجھ نہیں بنے گی اور کوئی ملازمت کرے گی' اس کی بھابی ثریا دل کی بری تو نہیں تھیں لیکن مزاج کی ذرا تند تھیں اور شازیہ نہیں چاہتی تھی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بنتے بنتے گھر کا ماحول خراب ہو چنانچہ اس نے جلد ہی مسٹر ہارون کے بوتیک میں ملازمت اختیار کرلی تھی اس طرح اس کا کچھ وقت بھی گھر سے باہر گزر جاتا تھا اور اسے اپنے اخراجات کے لیے ایک معقول رقم بھی مل جاتی تھی۔

پھر بوتیک کی ملازمت ختم ہونے کے بعد جب اسے جمیل احمد کی زبانی علم ہوا تھا کہ قریبی قصبے خیر آباد میں ایک نئی سپر مارکیٹ بنی ہے جہاں خواتین کے لیے بہت سی جگہیں خالی ہیں تو اس نے بھی فیصلہ کیا تھا کہ وہ بھی سپر مارکیٹ میں ملازمت اختیار کرلے اس نے اس موضوع پر کئی دن سوچنے کے بعد اپنے بھائی جان سے بات کی تھی۔

"لیکن اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" اس کے بھائی جان

نے پیار بھرے لہجے میں سوال کیا تھا۔
"تم جو بھی فیصلہ کرو سوچ سمجھ کر کرنا۔ یہ مت کرنا کہ جو بھی پہلی پیشکش تمہیں مل جائے تم بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دو۔"
"ہاں اچھی طرح سوچ لو شازیہ یہاں سے خیر آباد کا راستہ دو گھنٹے کا ہے اور تمہیں روزانہ وہاں آنے جانے میں چار گھنٹے لگا کریں گے اور تھکن علیحدہ ہوگی۔" اس کی بھابی نے کہا۔
"میں نے سوچا ہے کہ اگر مجھے خیر آباد کی سپر مارکیٹ میں ملازمت مل گئی تو میں وہاں کسی ہاسٹل میں رہائش اختیار کر لوں گی۔" شازیہ نے جواب دیا۔
"میرے خیال میں تمہیں ملازمت کرنے کی اتنی بھی ضرورت نہیں ہے کہ تم دوسرے قصبے میں جا کر ہاسٹل میں رہو اور ملازمت کرو۔" اس کے بھائی جان نے ناگواری سے کہا انہیں شازیہ کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔
"بھئی آپ کیوں خواہ مخواہ اس کے معاملات میں ٹانگ اڑا رہے ہیں وہ جو بہتر سمجھ رہی ہے وہ کر رہی ہے۔" بھابی نے تنک کر کہا اور شازیہ کے بھائی جان نے خاموشی اختیار کر لی وہ اپنی بیوی کی کوئی بات نہیں ٹالتے تھے پھر شازیہ کے وہاں نہ رہنے سے ان کی گھریلو زندگی خوشگوار بھی ہو سکتی تھی۔
اپنے بھائی جان سے بات کرنے کے تین دن بعد شازیہ نے اپنی درخواست خیر آباد سپر مارکیٹ بھیج دی تھی اور اس کی توقع کے خلاف اس کا جواب اسے انٹرویو لیٹر کی صورت میں جلد ہی مل گیا تھا جس کے بعد وہ اپنے بھائی جان کے ساتھ ہی خیر آباد گئی تھی اور اپنی ملازمت کے سلسلے میں ہونے والے انٹرویو میں شرکت کی تھی۔
"اب تمہیں سب سے پہلے کسی اچھے ہاسٹل کی تلاش کرنا چاہیے۔" اس کے بھائی جان نے کہا پھر انہوں نے سپر مارکیٹ کے قریب واقع ایک ہاسٹل میں اس کی رہائش کا انتظام کروایا تھا اس کے بعد واپس وہ ان کے ساتھ ہی آدم پور آ گئی تھی اس کی بھابی نے سب جاننے کے بعد خوشی کا اظہار کیا تھا۔
"ارے یہ تو بہت اچھا ہوا کہ تمہیں سپر مارکیٹ کے قریب ہاسٹل میں رہنے کی جگہ بھی مل گئی اب میں خیر آباد میں بھی کبھی تمہارے ساتھ وقت گزار سکوں گی اس طرح شاپنگ بھی اچھی ہو جایا کرے گی۔" بھابی نے ہنستے ہوئے کہا اور یوں خیر آباد ہاسٹل اس کے لیے رہنے کی ایک مناسب جگہ قرار دیا گیا۔
جب جمیل کو اس بارے میں پتا چلا تو اس نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور شازیہ کو یقین دلایا کہ وہ بھی اس سے ملتا رہے گا اس نے بتایا کہ اس کی اکثر شامیں پڑھائی اور لیکچرز کی نذر ہو جاتی ہیں لیکن اسے جتنا بھی وقت ملا وہ شازیہ کے ساتھ گزارے گا وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ پڑھائی پر توجہ نہ دے سکے اور اس کی وجہ سے اپنے والدین کے غصے کا شکار ہو۔
ان حالات میں شازیہ نے سپر مارکیٹ میں کام شروع کیا وہ خوش بھی اور اپنے کام سے بھی مطمئن تھی اس نے اسٹور پر اپنے کپڑوں کی فروخت سے اچھا خاصا کمیشن بھی لیا تھا۔ اس کی ملازمت کے پہلے روز دوپہر بارہ بجے کے قریب مسز پروین ملک اس کے اسٹور میں آئی تھیں وہ اس کی پارٹ ٹائم اسسٹنٹ تھی اور ایسی ہی پارٹ ٹائم اسسٹنٹ خواتین کی ایک اچھی خاصی تعداد تھی جو دوسرے اسٹورز میں بھی اسی طرح دن کے کچھ گھنٹوں کے لیے چارج سنبھالتی تھیں مسز پروین ملک کے آنے کے بعد شازیہ سپر مارکیٹ کی کینٹین میں جانے کے لیے اٹھ ہی رہی تھی کہ وہ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔
"تو وہ نئی لڑکی تم ہی ہو جسے آج ہی ملازمت پر رکھا گیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔
"جی ہاں آج میرا پہلا دن ہے۔" شازیہ نے جواب دیا۔
"میری بھی ایک بیٹی نے پچھلے ہفتے ہی یہاں کے ایک اسٹور میں کام شروع کیا ہے۔" مسز پروین ملک نے کہا۔

"میں نے اسے سمجھایا تھا کہ اسے یہاں کام کرتے ہوئے خود کو خوش قسمت سمجھنا چاہیے یہاں ملازمت حاصل کرنے کی بہت لڑکیاں خواہش مند ہیں لیکن سب کو تو موقع نہیں ملتا یہاں کی ہر چیز نئی ہے اور جدید طرز کی ہے۔" مسز پروین ملک تقریر کے موڈ میں نظر آ رہی تھیں۔

"جی ہاں! آپ کا کہنا درست ہے۔" شازیہ نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

"یہاں کے بعض اسٹور تو اتنے اچھے ہیں کہ جی چاہتا ہے ان میں داخل ہونے سے پہلے جوتے اتار دیے جائیں۔"

"جی....." شازیہ نے کہا اور جلدی سے اسٹور سے نکل گئی۔

پھر وہ سیدھی کینٹین میں پہنچی تھی یہ کینٹین صرف سپر مارکیٹ میں کام کرنے والے اسٹاف کے لیے تھی وہاں اس کی ملاقات کئی ایسی لڑکیوں سے ہوئی تھی جنہوں نے اس کے ساتھ ہی ملازمت اختیار کی تھی اور اب مختلف اسٹورز پر کام کر رہی تھیں۔ یہیں پر اس کی ملاقات بادیہ سے بھی ہوئی وہ سوٹوں کے اسٹور کے کاؤنٹر پر ہوتی تھی۔ بادیہ خود ہی اسے دیکھ کر اس کے پاس آ گئی تھی اور یہاں کی ملازمت کے بارے میں اس سے اس کی رائے پوچھی تھی۔

"ہوں..... اچھی ہے۔" شازیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" بادیہ نے کہا۔ "پیر کا دن میرے لیے اچھا ثابت ہو رہا تھا۔ لیکن دوپہر کے بعد جب خواتین اپنی اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر سپر مارکیٹ کا رخ کرتی ہیں تو ہمیں اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔"

"ہاں صبح کو تو خواتین کو گھر کے کام بہت ہوتے ہیں، کپڑوں کی دھلائی، کھانا پکانا، بچوں کو اسکول پہنچانا۔" شازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا وہ لنچ بھی کرتی جا رہی تھی۔

"شازیہ....." کچھ دیر بعد بادیہ نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

"اگر تم آج رات فارغ ہو اور تمہیں کوئی ضروری کام نہ ہو تو رات کا کھانا میرے گھر پر میرے ساتھ کھاؤ اس طرح ہاسٹل کے ماحول کی یکسانیت سے بھی چھٹکارا ہو جائے گا اور تمہارا کچھ وقت بھی اچھا گزر جائے گا۔"

"اوہ..... ضرور کیوں نہیں۔" شازیہ نے خوش ہو کر کہا۔

"ہمارا گھر ہمدانی بلاک کی گلی نمبر تین میں واقع ہے۔" بادیہ نے اسے پتہ سمجھایا۔ "اور ہاسٹل سے اس کا راستہ صرف ایک گھنٹے کا ہے۔"

شازیہ نے بادیہ کے گھر جانے کی ہامی بھری اور لنچ کے بعد اسٹاف کینٹین سے اپنے اسٹور کی طرف روانہ ہوگئی تھی لیکن سپر اسٹور کی ایک جیسی گیلریوں میں راستہ بھٹک گئی تھی وہ ایک ہی جیسی سیڑھیاں نہ جانے کتنی بار اتری اور چڑھی پھر وہ عمارت کے ایسے حصے میں نکل آئی جو اس کے لیے بالکل اجنبی تھا جس کی لمبی لمبی دیواریں اس کے گرد سر اٹھائے کھڑی تھیں اور کچھ ہی فاصلے پر ایک لمبا سا آہنی گیٹ نظر آ رہا تھا جس پہ بڑے حروف میں "خطرہ" لکھا ہوا تھا۔

وہ تیزی سے اس سمت میں مڑی جس سمت سے ادھر آئی تھی اور اسی وقت اسے سفید کوٹ میں ملبوس ایک شخص اپنی طرف آتا نظر آیا۔

"میں راستہ بھول گئی ہوں۔" شازیہ نے کہا۔ "کیا یہاں قریب میں کوئی راستہ ہے جو مجھے نیچے اسٹور کے ڈپارٹمنٹ تک پہنچا دے۔"

"میں خود راستے کے متعلق کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" آنے والے نے اس کے ہی انداز میں جواب دیا اس کی آنکھوں میں بھی الجھن کے آثار تھے۔

"اوہ! کیا آپ بھی یہاں نئے ہیں؟" شازیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "میں نے اگر ایک ہفتہ یہاں گزار لیا تو راستہ مجھے اچھی طرح یاد ہو جائے گا۔"

"لیکن مسئلہ تو ابھی راستہ تلاش کرنے کا ہے۔" اس

اجنبی نے کہا اور آگے بڑھتے ہوئے ایک دروازہ کھولا۔ "دیکھتے ہیں یہ راستہ کدھر جاتا ہے؟" اس نے کہا اور دروازے میں داخل ہو گیا۔

شازیہ بھی اس کے ساتھ ہی تھی لیکن اس راستے سے آگے بڑھتے ہوئے وہ زیادہ تاریک راہداری میں آ گئے تھے جس کے آخر میں الیکٹرک کے بہت سے آلات نصب تھے۔

"اس عمارت کے چاروں کونوں پر ایمرجنسی کے استعمال کے لیے ایک زینہ بنا ہوا ہے مجھے یہی بتایا گیا تھا۔" اس شخص نے کہا۔ "اگر ہمیں ان میں سے ایک زینہ بھی مل جائے تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔"

"ہوں' لیکن ابھی تک تو ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔" شازیہ نے کہا وہ خاصی گھبرا گئی تھی۔

"ہم اپنی ملازمت کا وقت اس عمارت میں بے مقصد چکر کاٹتے ہوئے تو خرچ نہیں کر سکتے۔" شازیہ نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا اس کے لنچ کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ شازیہ نے بے چینی سے اس شخص کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر اطمینان کے آثار تھے وہ کچھ کچھ دیر بعد اپنے سیاہ گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا تھا اس کا قد لمبا اور جسم چھریرا تھا۔ بس اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کبھی کبھی الجھن کے آثار نظر آتے تھے۔

شازیہ سوچ رہی تھی کہ یہ شخص یہاں کیا کرتا ہے پھر اس نے خود ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ شخص کوئی الیکٹریکل انجینئر یا کوئی ماہر ہوگا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اگر ایسا ہوتا تو اس شخص کو راستے کا علم ضرور ہوتا پھر اچانک ہی اس کی نظر اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذوں کے بنڈل پر پڑی جس کے سب سے اوپر والے کاغذ پر "سرد خانوں میں فر" لکھا ہوا تھا تب شازیہ کی سمجھ میں آیا کہ اس شخص کا تعلق "فر" والے ڈپارٹمنٹ سے ہوگا اور نیلے سوٹ پر سفید کوٹ پہننے کا مقصد اپنے سوٹ کو "فر" کے بالوں سے محفوظ رکھنا ہوگا۔

"آپ کس ڈپارٹمنٹ سے ہیں۔" اس شخص نے ایک کونا مڑتے ہوئے شازیہ سے پوچھا۔

"میں 'فقیرک ہال' میں کام کرتی ہوں' میرا نام شازیہ ہے۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

"کیا تمہیں وہاں کام کرنا پسند ہے؟ ابھی تم کسی فیصلے پر نہیں پہنچی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں ہر کام دلچسپی سے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں اس کے علاوہ اسٹور کا عملہ بھی میرے ساتھ تعاون کرتا ہے میں ان کے درمیان خوش ہوں۔" شازیہ کے جواب پر اس شخص نے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ کوئی تو ہے جو اس کام میں دلچسپی رکھتا ہے۔" اس نے ایک دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ تمہاری دعائیں قبول ہوئی ہیں۔" یہ دروازہ شاید ہمیں سیڑھیوں تک پہنچا دے۔" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ دوسری طرف چند زینے تھے جنہیں اترنے کے بعد وہ ایک ایسے حصے میں آ گئے جہاں کچھ رنگ ساز اور بڑھئی کام کر رہے تھے پھر سیڑھیاں اتر کر وہ ایک دروازے میں پہنچے تھے جس کے پیچھے فلور پر فرنیچر آراستہ تھا گویا وہ عمارت کے اس حصے میں آ گئے تھے جہاں کام جاری تھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" شازیہ نے اس شخص سے کہا' اب اسے راستہ سمجھ آ گیا تھا۔ اور وہ خود آگے جا سکتی تھی۔

"مجھے جلدی اپنے اسٹور پہنچنا چاہیے ورنہ میری سپروائزر کہیں آج ہی مجھے ملازمت سے نہ نکال دے۔" اس نے عجلت سے کہا۔

"میرا خیال ہے آپ بھی آج ہی سرد خانے کے فر ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہوئے ہیں ویسے نئی ملازمت اختیار کرنا شروع میں خاصا مشکل ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کی عادت ہو جاتی ہے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔" شازیہ نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

جب وہ اپنے اسٹور پر پہنچی تو اس کا منیجر سپروائزر راسے

سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"نہیں راستہ بھول گئی تھی پھر راستہ ڈھونڈنے میں دیر ہوگئی۔" شازیہ نے گھبرا کر وضاحت کی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر اس کا سارا دن مصروف ہی گزرا تھا۔ شام کو جب اس کی چھٹی کا وقت ہوا تب بھی وہ اپنی سپروائزر مسز قطب الدین کے ساتھ کاٹن کے تھان الماریوں میں رکھواتی رہی تھی۔

"ہم کل یہاں ایک فیشن شو کروا رہے ہیں جو ہمارے کپڑوں کی پبلسٹی کے لیے ہوگا میں چاہتی ہوں کہ سارے انتظامات بہت اچھے ہوں اس کے لیے کسی ایک لڑکی کو کل جلدی آنا ہوگا اور تمام انتظام سنبھالنا ہوگا۔" مسز قطب نے کہا لیکن شازیہ نے کوئی جواب نہ دیا وہ خاص طور سے شازیہ سے مخاطب بھی نہیں تھیں ان سے فارغ ہونے کے بعد شازیہ نے اسٹور سے ملحق غسل خانے میں منہ ہاتھ دھویا تھا اور میک اپ درست کیا تھا۔ سپر مارکیٹ میں اس کی ملازمت کا پہلا دن خوش اسلوبی سے اختتام کو پہنچا تھا وہ ہاسٹل جانے کے لیے سپر مارکیٹ سے باہر آ گئی تھی جہاں اس نے رک کر کچھ دیر بادیہ کا انتظار کیا تھا لیکن بادیہ کے بجائے کچھ دیر بعد جمیل احمد اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"ہیلو شازیہ! مجھے ڈر تھا کہ سپر مارکیٹ سے اس وقت نکلنے والے ہجوم میں تم مجھے نہیں مل پاؤ گی۔" اس نے شازیہ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "بتاؤ تمہاری ملازمت کا یہ پہلا دن کیسا رہا؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"تم بھول رہے ہو میں ایسی ملازمت پہلے بھی کر چکی ہوں۔ مسٹر ہارون کے بوتیک میں بھی خاصی محنت کرنا پڑتی تھی۔" شازیہ نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"ویسے مجھے پتا نہیں تھا کہ تم مجھ سے ملنے کے لیے آ رہے ہو میں تو بادیہ کے ساتھ اس کے گھر جانے کا وعدہ کر بیٹھی ہوں...... اور...... وہ دیکھو وہ آ گئی۔" شازیہ نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا اور جمیل احمد دیکھنے لگا بادیہ تیزی سے ان کی طرف آ رہی تھی۔

"او شازیہ ایسا کرو آج رات کے کھانے کا پروگرام ملتوی کرتے ہیں اب تم کسی اور دن میرے گھر چلنا۔" بادیہ نے جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا تم نے شازیہ کو کھانے کے لیے کہا تھا؟" جمیل نے پوچھا۔

"ہاں! لیکن پھر سہی۔" بادیہ نے جواب دیا۔

"نہیں ایسا کرتے ہیں کہ ہم تینوں آج ہی کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں۔" جمیل نے تجویز پیش کی۔

"لیکن اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں شازیہ کو کسی اور دن اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔" بادیہ نے مخالفت کی۔ "ایسا کرتے ہیں شازیہ میں کل تمہارے اسٹور آ جاؤں گی۔" اس نے کہا اور پھر شازیہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہاتھ ہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی پھر وہ ایک سانولی رنگت والے شخص کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگی تھی جو شاید اس کا ہی منتظر تھا۔ شازیہ کچھ دیر تک اسے جاتا دیکھتی رہی تھی پھر جمیل کے ساتھ اس کی نئی اسپورٹس کار میں جا بیٹھی تھی۔ "کیا آج کی شام بہت اچھی ہے کیوں نہ شہر سے باہر کسی اچھی جگہ پر کھانا کھایا جائے۔" جمیل نے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" شازیہ نے ہمیشہ کی طرح اس کی بات مان لی۔

پھر جب جمیل نے شہر کی مصروف سڑکوں کو چھوڑ کر شہر سے باہر جانے والی سڑک پر اپنی کار کو ڈالا تھا تو شازیہ خود کو بہت خوش قسمت سمجھ رہی تھی آج ملازمت کا پہلا روز بہت خوش قسمت گزرا تھا اور اب دن کے اختتام پر جمیل اس کے ساتھ تھا جسے وہ اس دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر چاہتی تھی ان دونوں کے درمیان اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا ہو جاتا تھا لیکن جھگڑے ہی کے درمیان وہ کسی بات پر ہنس دیتے تھے اور لڑائی ختم ہو جاتی تھی۔ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر وہ کچھ دور ہی گئے تھے کہ ایک پرانی

کی عمارت کے سامنے جمیل نے کار روک دی اور شازیہ کو ساتھ لے کر عمارت میں داخل ہوگیا۔

عمارت باہر سے جتنی پرانی اور بدرنگ تھی اندر سے اتنی ہی پرکشش اور خوبصورت تھی یہ ایک جدید طرز سے سجا ہوا ہوٹل تھا جمیل شازیہ کے ساتھ ہال میں رکھی ہوئی کونے کی ایک میز پر آ بیٹھا تھا اور ویٹر کو کھانے کا آرڈر دے دیا تھا پھر جب وہ کھانے میں مصروف تھے تو شازیہ نے محسوس کیا تھا کہ جمیل کچھ پریشان سا ہے۔

"کیا بات ہے جمیل؟ تم کچھ پریشان ہو؟" شازیہ نے پوچھا۔

"ہاں۔" جمیل نے جواب دیا۔ "کئی باتیں ہیں جنہوں نے مجھے فکرمند کردیا ہے ان میں سے ایک سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ میں آئندہ ہفتے کسی بھی روز تم سے نہیں مل سکوں گا۔ تین ہفتے بعد میرے امتحان ہونے والے ہیں اور مجھے بہت کام کرنا ہے۔"

"یہ تو کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے میں جس ہاسٹل میں رہتی ہوں وہاں میرے علاوہ اور بہت سی لڑکیاں ہیں جن کے ساتھ میں اپنے فارغ لمحات گزار سکتی ہوں۔ اس کے علاوہ ہادیہ سے اس نے بھی اپنے گھر آنے کی دعوت دی ہے۔"

"مجھے ہادیہ نے بتایا تھا کہ سپر مارکیٹ کا ماحول خواتین کے لیے اچھا ہے وہاں خواتین ہی دکاندار ہیں اور خواتین ہی خریدار ہیں۔ وہاں کی انتظامیہ میں چند مرد شامل ہیں لیکن وہ خواتین کا بہت احترام کرتے ہیں اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔" جمیل نے اطمینان بخش لہجے میں کہا۔

"ویسے ہادیہ بہت سخت مزاج لڑکی ہے۔" شازیہ نے کہا۔ "لیکن اس کی ایک بات مجھے بڑی عجیب لگتی ہے اور وہ یہ کہ جب اس کی ڈیوٹی ختم ہوتی ہے تو وہ ہر بار مجھے کسی نئے شخص کے ساتھ نظر آتی ہے۔" شازیہ نے کہا اس پر جمیل نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور کھانے کے بعد وہ دونوں ہوٹل سے باہر آگئے تھے پھر جمیل نے اسے ہاسٹل چھوڑا تھا۔

"تمہاری ملاقات ہادیہ سے کیسے ہوئی؟" اچانک شازیہ نے اس سے پوچھا۔

"ہماری فرم کی ایک تاپسٹ سے اس کی دوستی ہے وہ اکثر ہمارے آفس آتی رہتی ہے ایک شام سب کے کہنے پر میں نے اس کی ایک پارٹی میں شرکت کی تھی اور جب میں نے کسی کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ میرا تعلق آدم پور سے ہے تو ہادیہ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں راحیلہ انوار کی فیملی کو جانتا ہوں؟ اس نے بتایا تھا کہ راحیلہ اس کی کزن ہے پھر وہ اس سے ملنے میرے ساتھ آدم پور آگئی۔ بس یہی میری اس سے ملاقات کی تفصیل ہے۔" جمیل نے وضاحت کی اور شازیہ کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ وہ ہاسٹل واپسی پر بہت خوش تھی پھر وہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچ گئی تھی اور جب سونے کے لیے لیٹی تو بہت دیر تک آج کے دن کے بارے میں سوچتی رہی جو ہر لحاظ سے بہت اچھا تھا۔

اگلی صبح جب وہ سپر مارکیٹ پہنچی تو مسز قطب کی ہدایت کے مطابق ایک لڑکی اس کے پاس آئی تھی اس نے اپنا نام ثینا بتایا تھا اور مختلف رنگوں کے کاٹن کے کچھ تھان مانگے تھے تاکہ آج ہونے والے فیشن شو کے لیے اسٹیج کو سجایا جاسکے شازیہ نے مطلوبہ تھان تو اس کے حوالے کردیے تھے لیکن مختلف رنگ پسند کرنے کے دوران ثینا بہت سے تھان کھلوا کر ڈال گئی تھی جس پر مسز قطب الدین نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

دوپہر کے قریب فیشن شو کا آغاز ہوا تھا جس میں مختلف ماڈل لڑکیوں نے حصہ لیا تھا اس فیشن شو کو دیکھنے کے لیے بہت سی خواتین آئی تھیں پھر فیشن شو کے اختتام پر شازیہ کو سانس لینے کی فرصت بھی نصیب نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کے اسٹور پر مختلف رنگوں کے کپڑے خریدنے کے لیے خواتین کا ہجوم لگ گیا تھا یہ سب فیشن شو کا کمال تھا اس لیے شازیہ کے اسٹور پر توقع سے زیادہ خریداری ہوئی تھی۔

فیشن شو میں ہادیہ نے بھی ایک ماڈل کے طور پر حصہ لیا تھا اس کے علاوہ سپر مارکیٹ کے مختلف حصوں میں کام کرنے والی اور لڑکیوں نے بھی اس فیشن شو میں حصہ لیا تھا اور شازیہ نے ان کے بارے میں اپنے ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں کی اسسٹنٹ پروین ملک سے پوچھا کہ ان لڑکیوں کا انتخاب ماڈل کے طور پر کیسے کیا جاتا ہے؟

"بعض اوقات لڑکیاں خود ماڈلنگ کے لیے درخواست دیتی ہیں اور بعض اوقات یہاں کی انتظامیہ کا عملہ خود ہی اچھی اور مناسب جسم کی مالک لڑکیوں کو چن لیتا ہے۔" پروین ملک نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"اچھا!" شازیہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"ویسے جن لڑکیوں کو ماڈلنگ کے لیے منتخب کیا جاتا ہے انہیں ایک خاص عرصے تک ٹریننگ دی جاتی ہے کیا تم بھی ماڈل بننا چاہتی ہو شازیہ؟" پروین ملک نے پوچھا۔

"نہیں...... یہ بات نہیں۔" شازیہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"میں ماڈلنگ گرل کے لیے تیار کیے جانے والے مختصر لباس نہیں پہن سکتی۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ ضروری تو نہیں ہے شام کے لیے پہنے جانے والے مخمل اور لمبے لباس بھی تو متعارف کرائے جاتے ہیں۔" پروین ملک نے کہا پھر اس نے شازیہ کو بتایا تھا کہ وہ اپنے ہر روز کے کمیشن کی ایک ایک پائی سنبھال کر رکھتی ہے کیونکہ وہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے ایک خوبصورت سا گھر خریدنا چاہتی ہے اور آئندہ سال اس کی شادی بھی ہونے والی ہے جس کے لیے وہ یہاں شو میں پیش کیے جانے والے دلہنوں کے لباس خاص دلچسپی سے دیکھتی ہے۔

پھر سپر مارکیٹ میں ہونے والے فیشن شو کے تین شو تین دن تک بار بار پیش کیے گئے تھے اور ہر شو کے بعد کپڑوں کی خریداری میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوا تھا۔

تیسرے دن کے اختتام پر جب شازیہ اپنی ڈیوٹی ختم کرنے کی تیاری کررہی تھی تو اس کی نظر مسز قطب الدین پر پڑی جو کچھ فاصلے پر کھڑی دو مرد حضرات سے باتیں کررہی تھیں۔

"او..... شازیہ مصروف نظر آنے کی کوشش کرو کیونکہ منیجر آ گیا ہے۔" پروین ملک نے ان دونوں حضرات کی طرف دیکھتے ہوئے شازیہ کے کان میں سرگوشی کی اور خود بھی جلدی جلدی کپڑے کے تھان لپیٹنے میں مصروف ہوگئی شازیہ نے بھی اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔

"شازیہ کیا تمہارے پاس لسٹ ہے کتنا کپڑا بچا ہے؟" مسز قطب الدین نے اسے پکارا۔

"جی مسز قطب الدین جتنا کپڑا فروخت ہوا ہے اس کی لسٹ ہم نے بنالی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"خوب کل صبح ہم پہلا کام یہی کریں گے کہ اسٹاک میں سے اس فروخت ہونے والے کپڑے کی جگہ نیا کپڑا شامل کریں گے۔" مسز قطب الدین نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اپنے سامنے کھڑے مرد حضرات کی طرف مڑ گئیں۔

"آج کا یہ فیشن شو بہت کامیاب رہا۔" انہوں نے کہا وہ صرف ایک شخص سے مخاطب تھیں اور دوسرا شخص ان کے قریب آ کھڑا ہوا تھا یہ وہی شخص تھا جو تین دن پہلے شازیہ کو اس عمارت میں راستہ بھول جانے پر ملا تھا اور اس نے راستہ ڈھونڈنے میں اس کی مدد کی تھی وہ اس شخص کو مرد خانے میں ملازمت کرنے والا شخص سمجھی تھی وہ اب بھی سفید رنگ کا کوٹ پہنے ہوئے تھا مسز قطب الدین جس سے باتیں کررہی تھیں وہ ادھیڑ عمر اور بھورے بالوں والا شخص تھا وہ اس کے ساتھ کاؤنٹر کے قریب آ گئی تھیں اور شازیہ نے اندازہ لگایا تھا کہ وہی شخص مرچنڈائز منیجر ہوسکتا ہے۔

"تو یہ تمہارا اسٹور ہے جہاں تم ملازمت کرتی ہو۔" مرد خانے میں کام کرنے والے شخص نے شازیہ سے پوچھا۔

"جی...... جی ہاں اور اب میں آہستہ آہستہ یہاں

کے راستوں سے بھی واقف ہوتی جارہی ہوں۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"خوب' میرا خیال ہے یہی کچھ میں اپنے متعلق بھی کہہ سکتا ہوں۔"

"ہاں! جب ہم کہیں نئے ہوتے ہیں تو شروع میں ایسی مشکلات پیش آہی جاتی ہیں۔" شازیہ نے کہا پھر اچانک ہی اسے فر اور منک کوٹوں کا خیال آیا تھا جنہیں سرد خانے میں محفوظ کیا جاتا ہے۔

"اگر میں کبھی آپ کے ڈپارٹمنٹ کی طرف آ نکلی تو کیا میں کوئی..... کوٹ پہن کر دیکھ سکوں گی' میں بھی دیکھنا چاہتی ہوں کہ اتنے مہنگے کوٹ پہن کر کیسا لگتا ہے۔" شازیہ نے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں؟ ہمارے منک کوٹ اور بھی خواتین ٹرائی کرتی ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"جی!" شازیہ نے مختصر سا جواب دیا اس نے محسوس کرلیا تھا کہ اس اجنبی سے گفتگو کرنا مسز قطب الدین اور ان کے ساتھ کھڑے شخص کو پسند نہیں آرہا تھا۔

"مس شازیہ! ایک خاتون خریدار اسٹور کے دوسرے کونے پر تمہاری منتظر ہے۔" مسز قطب الدین نے تیز لہجے میں اسے مخاطب کیا تو شازیہ جلدی سے اسٹور کے دوسرے کونے کی طرف چلی گئی۔ پھر ان دونوں اشخاص کے جانے کے بعد مسز قطب الدین اس کے پاس آگئی تھیں۔

"مجھے امید ہے شازیہ کہ میرے اس طرح بولنے پر تم نے برا نہیں مانا ہوگا لیکن تمہیں آئندہ احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے تم جس شخص سے بات کررہی تھیں وہی ہمارا ہونے والا مرچنڈائز منیجر ہے اس کا نام جاوید بابر ہے اور وہی ہمارے فیشن شو کا منتظم بھی تھا۔" مسز قطب الدین نے اسے بتایا۔

"اوہ۔" شازیہ نے حیرت سے کہا۔ "میں معافی چاہتی ہوں۔ میں سمجھی کہ وہ دوسرا شخص مرچنڈائز منیجر تھا۔" شازیہ نے کہا۔

"ہاں وہ مرچنڈائز منیجر تھے لیکن اب وہ ریٹائر ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ مسٹر جاوید بابر آرہے ہیں' میں نے انہیں سمجھا دیا ہے کہ تم نئی ہو۔" مسز قطب الدین نے کہا۔ "تمہیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کسی بھی موقع پر اپنی سپروائزر کو نظر انداز نہ کرو۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں۔" شازیہ نے معذرت چاہی۔ "میں آئندہ احتیاط کروں گی۔"

پھر ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد ویٹنگ روم میں پروین ملک نے اسے اپنے مذاق کا نشانہ بنایا تھا وہاں دوسری لڑکیاں بھی موجود تھیں۔

"شازیہ میں نے تمہیں پہلے ہی محتاط کردیا تھا لیکن پھر بھی تم حماقت کر بیٹھیں۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں سمجھی تھی کہ وہ دوسرا شخص مرچنڈائز منیجر ہے بھلا میں یہ کیسے سمجھ سکتی تھی کہ یہاں دو دو مرچنڈائز منیجر ہیں۔" شازیہ نے خفت مٹانے والے انداز میں کہا۔

"ہاں لیکن ہمارے فیشن شوز ڈپارٹمنٹ کے لیے مسٹر جاوید بابر کا نیا تقرر ہوا ہے۔" ایک دوسری لڑکی نے کہا۔

"دراصل سپر مارکیٹ کی پرانی عمارت میں وہ ایک ڈپارٹمنٹ میں پہلے ہی موجود تھے پھر وہ اس سپر مارکیٹ کی دوسری شاخ میں کام کرنے فرخ آباد چلے گئے تھے اور اب وہ یہاں نئی عمارت میں پرانے مرچنڈائز منیجر کی جگہ پر آئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں سمجھ گئی۔" شازیہ نے کہا اس نے کسی کو بھی مسٹر جاوید بابر سے اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں نہیں بتایا تھا کیونکہ اس کے خیال میں ایسا کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑسکتا تھا۔

اس روز ہاسٹل واپس جاتے ہوئے وہ بس میں جاوید بابر کے بارے میں ہی سوچتی رہی تھی اسے رہ رہ کر وہ باتیں یاد آرہی تھیں' جو اس نے پہلی ملاقات میں جاوید بابر سے کی تھیں' اسے حیرت تھی کہ جاوید بابر نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے بھی اسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

اگلے روز اس کی ہفتہ وار چھٹی تھی چنانچہ جمیل اسے اپنے ساتھ آدم پور لے گیا تھا اور اسے اس کے بھائی جان کے گھر چھوڑ کر خود اپنے گھر چلا گیا تھا۔ شازیہ اپنے آٹھ سالہ بھتیجے عمران کے ساتھ کافی دیر کھیلتی رہی تھی وہ اس کے لیے ایک خوبصورت موٹر کار لائی تھی وہ بہت خوش تھا کیونکہ اسے کھیلنے کے لیے ایک قیمتی کھلونا مل گیا تھا۔

"عامی تمہیں یہ موٹر کار پسند آئی ہے۔ میں اگلی بار تمہارے لیے اور بھی اچھا کھلونا لاؤں گی۔" اس نے اپنے بھتیجے کو پیار کرتے ہوئے کہا اور عامی کو اپنی ملازمت کے بارے میں بتایا۔ بھائی اور بھابی بھی اس سے مل کر خوش ہوئے تھے اس نے ایک دن اور ایک رات وہاں گزاری تھی اور اپنی بھابی کو اپنی جبرآباد کی مصروفیت کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔

دوسری شام جمیل اسے واپس جبرآباد ہاسٹل لے آیا تھا جب وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا تو اسے اپنے عقب میں ایک مترنم آواز سنائی دی تھی۔

"اوہ کتنا ہینڈسم ہے کیا تمہارا دوست ہے؟" شازیہ نے مڑ کر دیکھا اس کے پیچھے نینا کھڑی تھی جو سپر مارکیٹ میں کام کرتی تھی اور شازیہ کی طرح اس ہاسٹل میں رہتی تھی۔

"ہاں دوست بھی..... اور منگیتر بھی۔" شازیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا تمہاری شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے؟" نینا نے پھر پوچھا۔

"ابھی نہیں... ابھی جمیل کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی ہے۔" شازیہ نے جواب دیا اور ہاسٹل میں داخل ہو کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ نینا اس کے پیچھے اس کے کمرے کے دروازے تک آ گئی۔

"اگر تم چاہو تو اندر آ جاؤ۔" شازیہ نے کہا تو وہ فوراً اس کے کمرے میں آ گئی جیسے اسی انتظار میں ہو۔

"تمہارے یہاں آنے سے پہلے یہ موٹروں کے اسٹور پر کام کرنے والی لڑکی کے ساتھ کئی بار باہر گھومنے گیا تھا تم بھی اس لڑکی کو جانتی ہو اس کی بڑی بڑی کشادہ آنکھیں ہیں۔ اور..... اور....."

"ہاں میں جانتی ہوں۔" شازیہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام ہادیہ ہے اور وہ جمیل کی دوست ہے۔" شازیہ نے کہا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نینا کے بات کرنے کا جو انداز تھا وہ جمیل اور ہادیہ کے خلاف اسے ورغلانا چاہتی تھی اور شازیہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے اور جمیل کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔

اپنی ملازمت کے دوسرے ہفتے کے اختتام پر شازیہ نے خود کو شاباش دی تھی اس نے اسٹور کا کام انتظام سنبھال لیا تھا اور مسز قطب الدین کچھ دنوں کے لیے چھٹی پر چلی گئی تھیں۔ شازیہ نے کوشش کی تھی کہ وہ جو بھی کام کرے اس کے بارے میں اپنی دوسری ساتھیوں سے بہت زیادہ سوالات نہ کرے بلکہ اپنے طور پر کام کو بہتر کرنے کی کوشش کرے اور اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئی تھی پھر ایک روز کام کے دوران وہ اپنے ہونٹوں پر آنے والی ایک تنقید کو نہ روک سکی تھی۔

"میں نے اس سپر مارکیٹ میں ملبوسات' کوٹ' ہیٹ اور میک اپ کے سامان وغیرہ کے اسٹورز پر تو شیشے ہیں جوتوں کے اسٹور پر بھی شیشے ہیں کیونکہ جب تک خواتین یہ نہیں دیکھیں گی کہ ان کے پاؤں میں پہننے کے بعد جوتے کیسے لگ رہے ہیں وہ کیسے خریدیں گی۔"

اس نے کہا۔ "لیکن ہمارے کپڑوں کے اسٹور میں شیشے یا آئینے نہیں ہیں جبکہ خواتین یہ ضرور دیکھنا چاہتی ہوں گی کہ مختلف رنگوں اور پرنٹ کے کپڑے ان کے جسم اور رنگت پر کیسے لگتے ہیں۔" شازیہ نے کہا اور چونک کر جاوید بابر کی طرف دیکھنے لگی تھی جو اسی وقت اسٹور میں داخل ہوا تھا اور اس نے اس کی بات سن لی تھی۔

"پلیز! مس شازیہ اپنی بات جاری رکھیں۔" اس نے درخواست کی۔ "مجھے آپ کی تنقید پسند آئی ہے۔"

"میں معافی چاہتی ہوں سر مجھے اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔" شازیہ نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"عام طور پر ہم لوگ اپنی اسسٹنٹ سے اعتراضات نہیں سنتے حالانکہ ان لوگوں کا خریداروں سے براہ راست واسطہ ہوتا ہے اور ہم لوگ ان کے خیالات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جس سے کارکردگی بہتر ہو سکتی ہے۔" جاوید بابر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور میرے خیال میں آپ درست کہہ رہی ہیں...... یہاں واقعی شیشے لگوانے کی ضرورت ہے۔ کیا آپ بتائیں گی کہ اسٹور میں کس کس جگہ پر شیشے ہونا چاہئیں۔" جاوید بابر نے اس سے پوچھا۔

"چند ستونوں پر آئینے ہونا چاہئیں اور اسٹور کے اسٹاک روم کے دروازے پر اور کاؤنٹر کے پیچھے۔" شازیہ نے جلدی جلدی کہا اور جاوید مسکرانے لگا۔

"میں ان تجاویز پر اسٹور منیجر سے بات کروں گا۔" اس نے کہا اور مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پروین ملک نے گویا اس پر چڑھائی کر دی۔

"اف خدایا تم نے تو حد کر دی تم اس کے سامنے کتنی بے خوفی سے تنقید کر رہی تھیں کر دیتے کیا کرنا چاہیے اگر مسز قطب الدین نے سن لیا تو وہ کتنی چراغ پا ہوں گی تمہیں کچھ اندازہ ہے؟ تمہیں معلوم نہیں کہ انہیں اپنی شکایات یا تجاویز براہ راست انتظامیہ تک پہنچانے کی اجازت نہیں اس کام کے لیے ہمیں اپنے سپروائزر کا سہارا لینا ہوتا ہے۔"

"لیکن میں نے کوئی شکایت نہیں کی ہے انہوں نے خود ہی میری رائے پوچھی تھی میں نے خود تو انہیں یہاں بلا کر بات نہیں کی وہ اس کے لیے خود ذمہ دار ہیں ویسے مسز قطب الدین چھٹی پر ہیں شاید انہیں اس بارے میں پتہ نہ چلے ویسے اگر کوئی انہیں خاص طور سے اس بارے میں کچھ بتائے گا تب ہی انہیں پتہ چلے گا۔" شازیہ نے چبھتی ہوئی نظروں سے پروین ملک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ! تم فکر مت کرو کم از کم میں ایسا نہیں کروں گی لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے بارے میں کوئی اور سن لے اور وہ یہ بات ان تک پہنچا دے۔" پروین ملک نے کہا۔ "ویسے یوں لگتا ہے کہ وہ تمہارا نام اچھی طرح جانتا ہے۔" پروین ملک نے کہا۔

"ہو سکتا ہے تمہارا کہنا درست ہو لیکن کچھ نام ایسے ہوتے ہیں جو جلد یاد ہو جاتے ہیں۔" شازیہ نے جواب دیا پھر اس نے اس موضوع پر مزید بات نہیں کی تھی۔

پھر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی جب جاوید بابر کے آفس میں اسے طلب کیا گیا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچی تھی تو اسٹور منیجر بھی وہاں موجود تھا۔

"بیٹھ جائیں مس شازیہ۔" جاوید بابر نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"ہم فیبرک اسٹور میں آپ کی تجویز کے بارے میں بات کر رہے تھے لیکن ہم نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے کیا آپ اس بارے میں کوئی اور تجویز دینا پسند کریں گی؟"

"نہیں جناب۔" شازیہ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا اس کے لہجے میں اطمینان تھا۔

"مجھے ابھی صرف چند روز ہی ہوئے ہیں اور......"

"اور صرف پندرہ دنوں میں ایک بہت اچھی تجویز آپ نے دی ہے۔" جاوید بابر نے اسٹور منیجر کی طرف دیکھتے ہوئے اس کو کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ ہم تک کتنے اہم خیالات صرف اس لیے پیچھے رہ جاتے ہیں کہ لوگ ہم تک براہ راست نہیں پہنچ پاتے میرے خیال میں ہمیں خود بھی کبھی کبھی مختلف ڈیپارٹمنٹ میں جا کر وہاں کی شکایات اور تجاویز سننا چاہئیں۔" جاوید بابر نے کہا تو اسٹور منیجر نے اثبات میں سر ہلایا پھر وہ اس کے کمرے سے نکل گیا تھا۔

"میں تمہاری ریکارڈ شیٹ دیکھ رہا تھا۔" جاوید بابر نے شازیہ سے کہا۔ "تمہیں ایک بوتیک میں کام کرنے کا تین سالہ تجربہ ہے اب تم فیبرک ہال میں کام کر رہی ہو آئندہ کے لیے تمہارے کیا ارادے ہیں؟" جاوید بابر نے پوچھا۔

"میں نے ابھی آئندہ کے بارے میں کچھ نہیں

سوچا۔" شازیہ نے جلدی سے کہا۔

"میں نے کپڑے کے تھانوں کو رکھنے کا تمہارا انداز بھی دیکھا ہے' کیا تم اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟"

"نہیں' خاص طور سے اس سپر مارکیٹ کے طریقوں کے بارے میں تو نہیں جانتی لیکن جب میں بوتیک میں کام کرتی تھی تو میں کھڑکیوں اور دروازوں کے پردوں کے انتخاب میں بھی مدد دیتی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اب بھی جس شعبے میں ہو اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی ہو اور یہاں تم نے ایک ٹرینی کی حیثیت سے کام شروع کیا ہے؟"

"جی ہاں! میں یہاں ڈسپلے ورک کے بارے میں بھی جاننا چاہوں گی۔" شازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خوب' لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ ایک اسٹور سے دوسرے اسٹور میں تبادلہ آسان ہے میں ایک مرچنڈائز منیجر ضرور ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ مسٹر قطب الدین کی واپسی پر اس بارے میں ان سے بات کر لی جائے۔" جاوید بابر نے کہا۔

اس گفتگو کے بعد شازیہ اپنے اسٹور میں واپس آ گئی تھی اسے حیرت تھی کہ اس نے کس آسانی سے جاوید بابر کے سامنے ڈسپلے سیکھنے کے بہانے ڈسپلے ڈپارٹمنٹ میں جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔

اس روز جب وہ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اسٹور میں آئی تو سفید اوور کوٹ میں ملبوس کئی مرد اسٹور میں کام میں مصروف تھے وہ اسٹور کے ستونوں اور دروازوں کا ناپ لے رہے تھے اس کے بعد انہوں نے کاؤنٹر کے پیچھے لگے دروازوں کا ناپ لیا تھا۔

"حیرت انگیز تبدیلی......" پروین ملک نے شازیہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک دن ایک اہم مشورہ دینے کے بعد اب آئندہ تم سے اس سے بہتر کی توقع کی جائے گی۔"

دوسرے روز تھیرک ہال میں شیشے لگائے جا چکے تھے اور شازیہ اپنی تجویز پر اتنی جلدی عملدرآمد ہونے پر بہت خوش تھی اس روز دوپہر کے وقت ملبوسات کے ڈپارٹمنٹ سے ایک اسسٹنٹ لڑکی ایک سرخ دوپٹہ لے کر شازیہ کے پاس آئی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اس دوپٹے میں کام کرنے کے لیے اس کی میچنگ کی بروکیٹ یا گوٹی اور کپڑا نکال کر رکھ دے۔ شازیہ نے دوپٹہ لے لیا تھا' کسی دلہن کے جوڑے کا دوپٹہ تھا جو ملبوسات ڈپارٹمنٹ میں تیار کیا جا رہا تھا' پھر شازیہ نے دوپٹے کی میچنگ کی بروکیٹ نکال کر دوپٹے کے ساتھ پیک کر کے ایک باکس میں رکھ دی تھی سارا دن اسے خریداروں سے فرصت نہیں ملی تھی اور شام کو جب وہ ہاسٹل جانے کے لیے اپنا ہینڈ بیگ لینے اسٹاک روم میں گئی تو اس کی نظر پروین ملک پر پڑی وہ سرخ دوپٹہ پہنے اور ایک سرخ سلک کا تھان کھول کر سلک اپنے گلے سے لگائے شیشے کے سامنے کھڑی تھی۔

"ارے تم یہ کیا کر رہی ہو؟" شازیہ نے اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں...... بس ذرا یونہی......" پروین سے بات نہ بن پڑی اور شازیہ سمجھ گئی کہ وہ اپنے لیے دلہن کا لباس منتخب کرنے کی کوشش کر رہی ہو گی وہ اس کی عادت سے واقف ہو گئی تھی۔

"دیکھو یہ دوپٹہ ملبوسات ڈیپارٹمنٹ والوں کا ہے۔ خراب نہ ہو جائے...... تم اسے رکھ دو۔" شازیہ نے دوپٹہ پروین ملک سے لیتے ہوئے کہا اور پھر اس کی چیخ نکل گئی نہ جانے کیسے سرخ سلک کے تھان میں آگ لگ گئی تھی اور شازیہ اور پروین اسے بجھانے میں لگ گئی تھیں پھر اچانک شازیہ کو دوپٹے کا خیال آیا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ دوپٹہ بھی جل چکا تھا اچانک نہ جانے کیسے وہاں جاوید بابر بھی ایک سیکورٹی گارڈ کے ساتھ پہنچ گیا اور اس نے بے ہوش پروین کو کلینک بھجوایا جو آگ کی دہشت سے ہی بے ہوش ہو گئی تھی کچھ دیر میں آگ پر قابو پا لیا گیا تھا اور جاوید نے شازیہ کو کل رپورٹ پیش کرنے کا کہہ کر اسے بھی جانے کی اجازت دے دی تھی۔

شازیہ جانتی تھی کہ اسٹور میں آگ بلاوجہ نہیں لگ

سکتی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگ لگنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ اسے ایک لڑکی نے بتایا تھا کہ نینا اس اسٹور میں گئی تھی اور وہ سگریٹ پینے کی عادی تھی پھر اسٹور ہی سے ایک جلا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا بھی ملا تھا۔ شازیہ نے ہاسٹل میں نینا کو بہت ڈھونڈا لیکن وہ نہیں ملی' شاید وہ کہیں گئی ہوئی تھی کافی رات گزر جانے کی وجہ سے شازیہ کو نیند آ رہی تھی چنانچہ وہ صبح نینا سے ملنے کا فیصلہ کر کے سو گئی تھی۔

پھر دوسرے دن اس نے نینا سے بات کی تھی لیکن نینا نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ وہ شازیہ کے اسٹور میں گئی تھی اس روز جاوید بابر نے شازیہ کو اپنے کمرے میں بلایا تھا اور وہاں دوسرے لوگوں کی موجودگی میں ایک میٹنگ کی تھی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ دوپٹہ جل جانے کی خبر کو چھپایا جائے اور جلد از جلد ویسا ہی دوسرا دوپٹہ تیار کیا جائے تاکہ سپر مارکیٹ کی بہترین کارکردگی پر داغ نہ لگ جائے اس سلسلے میں انہوں نے شازیہ کی خدمات حاصل کی تھیں کیونکہ ان کے خیال میں شازیہ نے دوپٹے کے کنٹری میچنگ کے لیے پروکیٹ نکالی تھی اور اس نے دوپٹے کو غور سے دیکھا ہوگا چنانچہ وہ اس کے بارے میں صحیح معلومات دے سکتی تھی' پھر شازیہ کی مدد سے دو دن میں ویسا ہی کامدار دوپٹہ تیار کیا گیا اور جاوید بابر نے اس کے کام کو سراہا اس نے بالکل ویسا ہی دوپٹہ تیار کرنے میں مدد کی تھی اس طرح جاوید بابر نے اسے ایک بڑی مصیبت سے بھی بچا لیا تھا ورنہ دوسری صورت میں اس پر بے پروائی کا الزام لگا کر نوکری سے نکالا بھی جا سکتا تھا۔

دو روز بعد سپر مارکیٹ کے گراؤنڈ فلور کی گیلری میں تصویروں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں جمیل نے بھی شرکت کی تھی جاوید بابر نے اس موقع پر بھی شازیہ کی خدمات حاصل کی تھیں اور تصویروں کی اس نمائش کو بہت پسند کیا گیا تھا لیکن اس موقع پر تقریب میں ذرا سی بدمزگی ہو گئی تھی جب نینا نے اپنی بنائی ہوئی ایک تصویر کے چوری ہو جانے کا شور مچایا تھا اور شازیہ پر الزام لگایا تھا اس کا کہنا تھا کہ شازیہ اس سے جلتی ہے اور اس نے ہی اس کی تصویر چرائی ہے اس نازک موقع پر بھی جاوید بابر ہی نے شازیہ کا ساتھ دیا تھا اور اس نے شازیہ کی مدد سے نینا کی تصویر ڈھونڈ نکالی تھی وہ غلطی سے دیوار پر الٹی لٹکا دی گئی تھی تصویر ملنے کے بعد جاوید بابر نے نینا کو شرمندہ کیا تھا اور اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ شازیہ سے معافی مانگے۔

اس رات نینا' شازیہ کے کمرے میں آئی تو اس کا رویہ بہت بدلا ہوا تھا۔

"میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں شازیہ۔" نینا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ارے تم اب تک پریشان ہو نینا' میں نے تو تمہیں سپر مارکیٹ میں ہی معاف کر دیا تھا۔" شازیہ نے خوش دلی سے کہا۔

"ہاں لیکن میں نے تمہارے ساتھ واقعی بہت زیادتی کی جبکہ تم قصوروار نہیں تھیں۔"

"اس ذکر کو جانے دو نینا' یہ بتاؤ کہ تم کہاں رہتی ہو تمہارے والدین کیا کرتے ہیں؟"

"میرا بچپن فرخ آباد میں گزرا۔" نینا نے کہا اور اس کے بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی وہ کافی پرسکون نظر آ رہی تھی۔

"لیکن اب میرے والدین فوت ہو چکے ہیں کوئی اور رشتہ دار بھی نہیں ہے...... لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو......؟ تمہاری بھی کوئی فیملی ہوگی؟" نینا نے پوچھا اور شازیہ اپنے بیڈ پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"میری والدہ اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ رہتی ہیں۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے اور میرے بھائی اور بھابھی آدم پور میں رہتے ہیں جہاں ہمارا آبائی گھر ہے۔"

"تمہاری کوئی اور بہن؟" نینا نے پوچھا۔

"ہاں میری ایک بہن تھی۔" شازیہ نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "لیکن پچھلے سال اس کا انتقال ہو گیا۔" شازیہ کی اس بات پر نینا نے تاسف کا اظہار کیا۔

"اور...... وہ...... وہ شخص جو تمہیں چھوڑنے اکثر

ہاسپٹل آتا ہے اس کا نام جمیل ہے نا؟"
"ہاں جمیل میرا منگیتر ہے۔" شازیہ نے بتایا اور پھر مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
"تم بتاؤ کیا تمہاری زندگی میں ایسا کوئی شخص آیا ہے جسے تم شریک حیات بنانا چاہتی ہو؟" شازیہ نے نینا سے پوچھا۔
"ہاں وہ نواز ہے..... نواز احمد وہ یہاں کے ایک ہوٹل میں کام کرتا ہے اور مجھ سے شادی کا خواہش مند ہے وہ کل سپر مارکیٹ میں تصویروں کی نمائش میں بھی آیا تھا۔" نینا نے اسے بتایا۔
دوسرے روز کے اخبارات میں سپر مارکیٹ میں ہونے والی تصویروں کی نمائش کی خبر تصویر کے ساتھ چھپی تھی بہت سی تصویروں میں شازیہ بھی نظر آ رہی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نمائش میں خاصی پیش پیش تھی لیکن غلطی سے اس کا نام نازیہ چھپ گیا تھا جب نازیہ سپر مارکیٹ پہنچی تھی تو وہاں بھی اسی بارے میں باتیں ہو رہی تھیں کئی لوگوں کا خیال تھا کہ شازیہ نے تھوڑے ہی عرصے میں وہاں اپنی جگہ بنالی تھی مسز قطب الدین بھی چھٹیوں سے واپس آ گئی تھیں پھر جس اخبار میں خبر چھپی تھی اس کے دفتر سے فون آیا تھا اور مسز قطب الدین نے ریسیور شازیہ کی طرف بڑھا دیا تھا اخبار کا ایڈیٹر اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔
"مس شازیہ جلال۔" دوسری طرف سے پوچھا گیا تھا۔
"جی میں بول رہی ہوں۔" شازیہ نے جواب دیا۔
"ہمیں افسوس ہے کہ آج کے اخبار میں تصویروں کی نمائش کی جو خبر چھپی ہے اس میں آپ کا نام غلطی سے نازیہ چھپ گیا ہے کل کے اخبار میں ہم اس کی تردید چھاپ دیں گے۔"
"جی ٹھیک ہے میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" شازیہ نے کہا۔
"مس شازیہ جلال ہم ایک بات اور جاننا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ کیا آپ نازیہ جلال کو جانتی ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کا ان سے کوئی رشتہ ہے؟ مس نازیہ جلال کا تعلق بھی آدم پور سے تھا اور آپ بھی وہیں کی رہنے والی ہیں۔" شازیہ کا دل چاہا کہ وہ ریسیور رکھ دے اور اس بات کا جواب نہ دے لیکن اگر وہ ایسا کرتی تو اخبار والوں کو ایک اور کہانی ہاتھ آ جاتی۔
"میں آدم پور میں رہتی تھی۔" شازیہ نے مختصر سا جواب دیا۔
"اور نازیہ جلال آپ کی بہن تھی؟"
"آخر آپ یہ کیوں جاننا چاہتے ہیں۔" شازیہ نے پوچھا۔
"دراصل ہمارے پاس نازیہ جلال کی تصویروں کی ایک کٹنگ فائل موجود ہے۔"
"تو اب پھر اس پر مزید کچھ چھاپنے کی ضرورت نہیں ہے۔" شازیہ نے سختی سے کہا۔
"تو گویا آپ اسے جانتی ہیں۔" دوسری طرف سے پوچھا گیا اور شازیہ نے فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔
شازیہ حیران تھی کہ وہ ایڈیٹر اس کا تعلق نازیہ سے کیوں ملا رہا تھا اور پچھلے سال پیش آنے والے واقعے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا خیر آباد میں اور بھی لڑکیاں ہو سکتی تھیں جن کے نام کے آگے جلال لگا ہو سکتا ہے لیکن اخبار کے دفتر سے یہ بات صرف شازیہ ہی سے کیوں پوچھی گئی وہ جانتی تھی کیا اگر اس نے احتیاط سے کام نہ لیا تو اخبارات کی اگلی سرخی یہ ہوگی کہ شازیہ جلال، نازیہ جلال کی چھوٹی بہن ہے جو پچھلے سال ڈوب کر مری تھی جب ایک چھٹی کے دوران اپنے منگیتر کے ساتھ...... وہ اس سے آگے سوچ نہیں سکی تھی۔
وہ جانتی تھی کہ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا حقائق سب کے سامنے تھے۔ نازیہ شازیہ سے دو سال بڑی تھی وہ اپنے منگیتر کے ساتھ ساحل سمندر پر گئی تھی جہاں ڈوب کر ہلاک ہو گئی تھی اور اس کا منگیتر بھی اسے بچانے کی کوشش میں موت سے ہمکنار ہوا تھا۔ شازیہ

کے گھر والے اس موت کو حادثاتی موت کہتے تھے لیکن لوگوں کا خیال تھا کہ نازیہ نے خودکشی کی تھی۔

شازیہ حیران تھی کہ نازیہ کی موت کو کس طرح اس کی تصویر سے ملایا گیا تھا۔ دونوں بہنوں میں کوئی مماثلت نہیں تھی سوائے اس کے کہ ان کے نام ملتے جلتے تھے تو یہ اتفاق بھی ہوسکتا تھا لیکن پوچھنے والے کا انداز ایسا تھا کہ وہ یقین رکھتا ہے کہ شازیہ، نازیہ کی بہن ہے ٹھیک تھا کہ نازیہ بھی پہلے ایک بڑے اسٹور میں کام کرتی تھی لیکن اب تک شازیہ کو ایسا کوئی شخص نہیں ملا تھا جو نازیہ سے واقفیت کا اظہار کرتا۔

شازیہ اسی سوچ میں غرق تھی کہ اچانک اسے خیال آیا کہ کل شام نینا اس کے کمرے میں آئی تھی اور اس کی فیملی کے بارے میں سوالات پوچھتی رہی تھی پھر اس نے خاص طور پر نازیہ کے بارے میں پوچھا تھا لیکن اس کا نام نہیں لیا تھا بس یہ پوچھا تھا کہ کیا تمہاری کوئی بہن بھی تھی۔

شازیہ حیران تھی کہ یہ کونسا نیا چکر شروع ہوگیا ہے اور نینا اور اخبار کے ایڈیٹر کا کیا تعلق ہے دونوں ایک ہی بات کیوں جاننا چاہتے ہیں۔

دوسرے روز جب وہ سپر مارکیٹ گئی تو وہاں اس کی ملاقات سپر مارکیٹ کے کھلونوں کے ایک اسٹور میں نینا سے ہوئی اس کے ساتھ اس وقت ایک شخص بھی تھا جس کا تعارف اس نے شازیہ سے نواز کہہ کر کروایا تھا اور بتایا تھا کہ وہ اس کا منگیتر ہے۔ شازیہ اس اسٹور میں اپنے بھتیجے عامی کے لیے کوئی اچھا کھلونا لینے گئی تھی اس وقت وہاں جاوید بابر بھی آ گیا تھا اور اس سے باتوں کے دوران شازیہ نے ایک خوبصورت سا چینی کا بنا ہوا گھوڑا پسند کیا تھا لیکن لیا نہیں تھا اس نے سوچا تھا کہ جب چھٹی میں واپس ہاسٹل جائے گی تو اسے خرید لے گی لیکن جب وہ بعد میں وہاں پہنچی تھی تو گھوڑا موجود نہیں تھا اور اسٹور کے سپروائزر نے اسے بتایا تھا کہ وہ گھوڑا بک گیا ہے وہ مایوس واپس آ گئی تھی لیکن اپنے بھتیجے عامی کے لیے اس نے دوسرا گفٹ خرید لیا تھا اور اپنی چھٹی پر وہ اپنے بھائی اور بھابی سے ملنے آدم پور گئی تھی اس سے پہلے جمیل اس کے پاس آیا تھا اور اس نے پوچھا تھا کہ وہ آدم پور جا رہا ہے اگر اسے جانا ہے تو وہ بھی چلے لیکن اس نے منع کر دیا تھا بعد میں اکیلی ہی گئی تھی لیکن جب واپس خیرآباد آئی تھی تو نینا کی ایک بات نے اسے پھر پریشان کر دیا تھا۔

"شازیہ! تم نے بتایا تھا کہ جمیل تمہارا کزن اور منگیتر ہے......؟" نینا نے اس سے پوچھا۔

"ہاں تو پھر......؟" شازیہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی تو چند روز پہلے آدم پور گیا تھا تم اس کے ساتھ کیوں نہیں گئی تھیں؟"

"ارے وہ تو میں نے خود ہی اسے منع کر دیا تھا۔" شازیہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا وہ سوچ رہی تھی کہ نینا اس کے معاملات میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہے۔

"دراصل مجھے یہاں کچھ کام تھا میں اس وقت نہیں جاسکتی تھی۔" شازیہ نے وضاحت کی۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن......وہ......تمہاری کزن ہادیہ اس کے ساتھ آدم پور گئی تھی۔" اس نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"ہادیہ!" شازیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "بھئی اس کی کزن وہاں رہتی ہے وہ اس سے ملنے وہاں گئی ہوگی۔" شازیہ نے جلدی سے کہا۔

"ہاں اور واپس بھی جمیل کے ساتھ ہی آئی تھی۔" نینا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اسے جمیل کے ساتھ آنے میں سہولت ہوئی ہوگی۔" شازیہ نے جواب دیا لیکن اس کے دل میں شک نے سر اٹھا لیا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ یہ ہادیہ ہر بار جمیل ہی کے ساتھ آدم پور کیوں جاتی ہے پھر اس کی بھابی نے بھی اسے بتایا تھا کہ کئی بار جمیل کے ساتھ انہوں نے ہادیہ کو آدم پور میں دیکھا ہے پھر خود بخود ہی شازیہ کے ذہن میں کئی ایسے خیالات آ گئے تھے جب جمیل نے اس کی موجودگی میں ہادیہ کو اہمیت دی تھی اور ہادیہ بھی کئی موقعوں پر اس سے لگاؤ کا اظہار کرتی رہی تھی تب شازیہ نے ان باتوں کو

زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب پچھلے کئی منظر اس کی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چل رہے تھے وہ کافی پریشان ہوگئی تھی لیکن اس نے ہینا پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اسے یاد آیا کہ سپر مارکیٹ میں ہونے والے شو میں بھی ایک موقع پر ہادیہ نے باتوں باتوں میں یہ احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ جمیل اسے چاہتا ہے وہ کئی بار شام کو گھومنے کے لیے اس کے بجائے ہادیہ کے ساتھ گیا تھا پھر اکثر ہادیہ اپنی باتوں میں جمیل کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کرنے لگی تھی اور شازیہ ایسے موقعوں پر اس کے پاس سے اٹھ جاتی تھی اس نے دل میں تہیہ کرلیا کہ اب جب جمیل سے ملے گی تو اس سے اس بارے میں ضرور بات کرے گی آخر وہ اس کا منگیتر تھا اور اس کے مستقبل کا دارومدار جمیل پر تھا۔

اگلے روز اس کی ملاقات اتفاقاً جاوید بابر سے ہوئی وہ سپر مارکیٹ کے ایک کاریڈور میں اس سے ٹکرا گیا تھا۔

''ارے شازیہ اچھا ہوا تم مل گئیں مجھے تم سے ایک بات پوچھنا ہے۔'' جاوید بابر نے کہا۔

''جی؟'' شازیہ نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ ہم سپر مارکیٹ میں بہت سی لڑکیوں کو مختلف قسم کی ٹریننگ دیتے ہیں پھر اکثر ان کی شادی ہوجاتی ہے جس کے بعد وہ ملازمت چھوڑ دیتی ہیں اور اگر وہ ملازمت کرتی بھی ہیں تو پارٹ ٹائم کی حد تک۔''

''جی! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' شازیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''میں نے سیلز کے شعبے میں ٹریننگ دینے کے لیے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارا تبادلہ بہت جلد ڈسپلے ڈپارٹمنٹ میں ہونے والا ہے میں جانتا ہوں کہ جمیل سے تمہاری منگنی ہوچکی ہے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم ٹریننگ کے بعد ملازمت چھوڑ دو اور ہماری محنت بیکار جائے۔'' جاوید بابر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔'' شازیہ نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا اس نے محسوس کیا تھا کہ جاوید بابر اس میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا وہ اس کا خیال بھی رکھتا تھا اور اکثر اس کا ساتھ بھی دیتا تھا اس کے دل میں ایک لمحے کو خیال آیا کہ جمیل کا جیون ساتھی کی حیثیت سے انتخاب کر کے اس نے غلطی کی تھی جاوید کی نظروں میں اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات تھے لیکن اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔

پھر تیسرے دن اس کی ملاقات جمیل سے ہوگئی تھی اور وہ اس کی درخواست پر اس کے ساتھ چائے پینے ایک کیفے میں چلی گئی تھی دراصل وہ اس سے ہادیہ کے بارے میں بات بھی کرنا چاہتی تھی۔

''میں نے پچھلے ہفتے تمہارے ہاسٹل فون کیا تھا تاکہ تم سے بات کرسکوں لیکن تم نہیں تھیں تمہاری کسی نے فون اٹینڈ کیا تھا۔'' جمیل نے شکایتی انداز میں کہا۔

''ہاں! میں کچھ مصروف تھی۔'' شازیہ نے کہا اور چند لمحے خاموشی سے جمیل کو دیکھتی رہی۔

''ہادیہ کہاں ہے؟'' اچانک اس نے جمیل سے سوال کیا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''وہ اپنے گھر گئی ہوگی مجھے کیا معلوم؟'' جمیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیوں... وہ تو تمہارے ساتھ ہی جاتی ہے۔'' شازیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہیں اس کی فکر کب سے ہوگئی؟'' جمیل نے پوچھا۔

''جمیل میں نے محسوس کیا ہے کہ تم اس میں حد سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہو۔'' شازیہ نے برا ماننے والے انداز میں کہا۔

''نہیں یہ بات نہیں ہے وہ صرف میری دوست ہے۔'' جمیل نے کہا۔

''لیکن خلاف توقع وہ آج تمہارے ساتھ نہیں ہے۔'' شازیہ نے ناگواری سے کہا۔

"سچ بتاؤں؟ وہ دراصل مجھ سے ناراض ہوگئی ہے۔ تمہارا شک درست ہے وہ واقعی مجھے چاہتی ہے لیکن مجھے اس کا احساس پچھلے ہفتے تک نہیں ہوا تھا لیکن پچھلی بار جب وہ میرے ساتھ آدم پور گئی تو اس نے اپنی چاہت کا اظہار کیا تھا۔" جمیل نے سچائی بتادی۔

"ہوں...... تو تم نے کیا سوچا؟" شازیہ نے پوچھا۔

"کیا سوچا...... کیا مطلب؟" جمیل نے پوچھا۔

"یہی کہ تم مجھ سے شادی کرو گے یا بادیہ سے...... کیونکہ بادیہ سے تمہاری بے تکلفی تو کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔" شازیہ نے کہا۔

"ارے ایسی کوئی بات نہیں شازیہ تم میری منگیتر ہو۔" جمیل نے کہا۔

"ہاں میں تمہاری منگیتر ہوں اور پابند ہوں کہ تمہارے علاوہ کسی اور کی طرف نہیں دیکھوں گی۔ تم سے شادی کروں گی اور تمہارے ساتھ ہی زندگی گزاروں گی۔" شازیہ نے کچھ غصے میں کہا۔ "اور تمہارا جس کے ساتھ دل چاہے گھومو دوستی کرو محبت کرو۔" شازیہ نے کہا اور جمیل پریشان نظر آنے لگا۔

"تم کیسی باتیں کررہی ہو۔" جمیل نے کہا۔

"دیکھو جمیل میں اب اور بے وقوف نہیں بن سکتی تم پہلے فیصلہ کرلو کہ تمہیں آئندہ زندگی کس کے ساتھ گزارنا ہے پھر مجھے بتادینا۔" شازیہ نے کہا اور اس کے پاس سے اٹھ گئی۔ پھر وہ اسے آوازیں دیتا رہا تھا لیکن وہ وہاں نہیں رکی تھی اور اپنے ہاسٹل چلی گئی تھی۔

اگلے چند دن میں اس کا تبادلہ ڈسپلے ڈپارٹمنٹ میں کردیا گیا تھا جہاں اسے ٹینا کی مدد کرنا تھی اور چند روز کام کرنے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ ٹینا نہایت بے پروا اور کام چور ہے وہ سارا کام شازیہ پر چھوڑ دیتی تھی حتیٰ کہ اسٹور سے جو سامان آتا تھا وہ بھی شازیہ ہی لاتی تھی صرف ٹینا واپس کرنے جاتی تھی چند روز بعد اس نے سوچا تھا کہ وہ جاوید بابر سے بات کرے گی اور ٹینا کے بارے میں بتائے گی لیکن اس سے پہلے ہی ایک روز ڈسپلے ڈپارٹمنٹ کے نگران نے اسے روک لیا۔

"شازیہ جب تم اور ٹینا مختلف اسٹورز سے لاتے ہوئے سامان سے ڈسپلے کرتی ہو تو کیا تم بے پروائی سے کام لیتی ہو؟" نگران نے پوچھا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں...... لیکن آپ یہ کیوں کہہ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"دراصل بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں غائب ہیں اور اگر یہ چیزیں نہیں ملیں تو صرف اور صرف ڈسپلے ڈپارٹمنٹ کو ہی ذمہ دار سمجھا جائے گا۔"

"لیکن کون سی چیزیں؟" شازیہ نے پوچھا جس پر نگران نے اسے کاغذ پر لکھی ہوئی ایک فہرست پڑھ کر سنائی۔

"لیکن ہم تو سامان واپس کرتے رہے ہیں۔" شازیہ نے کہا۔

"دیکھو بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر سامان واپس کردیا جائے اور اس کی لسٹ پر واپسی کرنے کے بعد دستخط نہ کروائے جائیں تب بھی چیزوں کو لاپتہ ہی سمجھا جاتا ہے کپڑے کے ڈپارٹمنٹ نے شکایت کی ہے کہ وہ کڑھے ہوئے سوٹ لاپتہ ہیں جو تم نے وصول کیے تھے اس کے علاوہ گفٹ ہال کو شکایت ہے کہ وہاں سے نیا چائے کا جو سیٹ لایا گیا تھا وہ بھی واپس نہیں کیا گیا۔"

"لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ سامان ہم نے خود واپس کیا تھا میں خود وہ سامان لے کر ٹینا کے ساتھ گئی تھی لیکن راستے میں اس نے مجھے کسی کام سے بھیج دیا تھا اور خود سامان واپس کرنے گئی تھی۔"

"کچھ بھی سہی چونکہ سامان آپ لے کر گئی تھیں اس لیے ذمہ دار بھی آپ ہی ہوں گی۔" نگران نے اس سے کہا۔

اس رات جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو وہ بہت پریشان تھی اسے ایک ساتھ کئی باتوں نے پریشان کردیا تھا جمیل کی بے وفائی اسٹور میں چوری کا واقعہ جس کی ذمہ داری اس پر ڈالی جارہی تھی اور اپنی بہن نازیہ کا

واقعہ جس کی وجہ سے اس کی بھابی نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ نازیہ بھی اسٹور کی نوکری کرتی تھی جس کی وجہ سے اس کی جان گئی چنانچہ شازیہ کو وہ نوکری نہیں کرنا چاہیے لیکن شازیہ نے ان کی بات نہیں سنی تھی اور اب اسے خیال آ رہا تھا کہ وہ بھی نازیہ کی طرح آدم پور سے ملازمت کے لیے شہر آ بادانی تھی اور یہاں ایک اسٹور میں ملازمت کرلی تھی شازیہ کی طرح نازیہ کی بھی منگنی کسی سے ہوئی تھی لیکن اسٹور کی ملازمت کے دوران نازیہ کو اسٹور منیجر سے محبت ہوگئی تھی جس کی منگنی بھی کہیں اور ہوئی تھی لیکن بعد میں دونوں نے اپنی پہلے والی منگنیاں ختم کردی تھیں اور جلد ہی شادی کا فیصلہ کیا تھا لیکن پھر نازیہ کی زندگی میں اتنا طوفان آیا تھا جو اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔ شازیہ نے سوچا تھا کہ وہ اپنے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہونے دے گی لیکن اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو رہا تھا ایسا لگتا تھا جیسے تاریخ خود کو دہرا رہی ہے اس نے سوتے سوتے خود سے عہد کیا کہ وہ اپنے آپ کو نازیہ جیسے انجام کا شکار نہیں ہونے دے گی۔

اگلے روز اس نے اسٹور میں نینا کو جا پکڑا تھا اور اس سے گمشدہ سامان کے بارے میں پوچھا تھا تو وہ چراغ پا ہوگئی تھی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ سامان تو تم ہی لائی تھیں؟" نینا نے بھی اسے ہی ذمہ دار ٹھہرا لیا۔

"ہاں لیکن جب میں واپس کر کے آئی تھی تو وہاں دستخط کرتی تھی لیکن جتنا سامان تم واپس کر کے آئیں وہ وہاں درج نہیں ہے تم نے بھی سامان واپس کر کے دستخط نہیں کیے۔"

"مجھے فرصت نہیں ہوتی تھی۔" نینا نے بے پروائی سے کہا۔

"لیکن تمہاری بے پروائی کی وجہ سے مجھے ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔" شازیہ نے غصے سے کہا۔

"تمہاری قسمت۔" نینا نے ایک ادا سے بے نیازی سے کہا اور ہنسنے لگی شازیہ کو غصہ تو بہت آیا لیکن اس نے سوچا کہ وہ کسی اور وقت اس سے بات کرے گی۔ دوسرے روز جب وہ ڈیوٹی پر پہنچی تو نگران نے اسے بتایا کہ نینا کی طبیعت خراب ہے چنانچہ وہ اسٹور نہیں آئی ہے اور شازیہ شام کو وقت نکال کر اس کی خیریت پتا کرنے چلی جائے شازیہ نے سوچتے ہوئے بھی ہامی بھرلی وہ اپنی طرف سے بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی چنانچہ اسٹور سے واپسی پر اس نے کچھ پھول خریدے اور نینا سے ملنے اس کے فلیٹ گئی۔

"او تم شکایت کرنے آئی ہوگی کہ میرے بغیر تمہیں بہت کام کرنا پڑا ہوگا۔" نینا نے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں! مجھے پتہ چلا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے تو تمہاری خیریت پوچھنے چلی آئی۔" میں نے پھول میز پر رکھتے ہوئے اطراف کا جائزہ لیا۔ نینا نے اپنے فلیٹ کو بہت ہی خوبصورت چیزوں سے سجایا ہوا تھا اسے وہاں وہ چینی کا گھوڑا بھی نظر آیا جو اس نے سپر مارکیٹ میں دیکھا تھا اور وہ عالی کے لیے لینا چاہتی تھی لیکن اسے بتایا گیا تھا کہ وہ فروخت ہو گیا ہے۔

"او تم نے یہ گھوڑا خرید لیا؟ یہ مجھے بھی پسند تھا۔" شازیہ نے کہا اور گھوڑا اٹھا کر دیکھنے لگی لیکن نینا نے جلدی سے گھوڑا اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"یہ میرا ہے۔" شہنواز نے دیا ہے۔ یہ اس کا تحفہ ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"او...... اچھا مگر ایسے تو مت چھینو یہ ٹوٹ جائے گا۔" شازیہ نے کہا۔

"ہاں ٹوٹ جائے گا تو تمہیں خوشی ہوگی نا تم تو جلتی ہو کہ میرے فلیٹ میں اتنی اچھی اچھی چیزیں ہیں تم جانتی ہو کہ نواز نے مجھے یہ فلیٹ دیا ہے تو میں اسے چھوڑ کر پھر اسی سڑے ہوئے ہاسٹل میں چلی جاؤں جہاں میری اپنی کوئی چیز نہیں تھی لیکن یہ مت بھولنا کہ میں تمہارے اور تمہاری بہن کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔" نازیہ نے غصے سے کہا اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔

"تم میری بہن کے بارے میں کیا جانتی ہو؟" شازیہ نے اس سے پوچھا۔

"وہ میرے ساتھ شیرآ بار کے ایک چھوٹے سے اسٹور میں کام کرتی تھی اور اسے چوری کے الزام میں وہاں سے نکال دیا گیا تھا اس پر ملبوسات زیورات اور دوسری بہت سی چیزیں چرانے کا الزام تھا کیونکہ وہ ان چیزوں کو استعمال کرکے خود کو دوسروں کی نظروں میں اور زیادہ خوبصورت بنا کر پیش کرنا چاہتی تھیں۔" نینا ہذیانی انداز میں تیز تیز بول رہی تھی۔

"یہ جھوٹ ہے اس نے کبھی چوری نہیں کی۔" شازیہ نے کہا۔

"لیکن میں جانتی ہوں۔ نواز نے مجھے بتایا تھا وہ بھی وہاں کام کرتا تھا اور تمہاری بہن نازیہ چاہتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرے وہ سج دھج کر اسے دکھاتی تھی۔"

شازیہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا وہ سوچ رہی تھی کہ نواز ہی وہ شخص ہوگا جو نازیہ کے اسٹور منیجر میں شامل ہوگا اور نازیہ اس سے محبت کر بیٹھی ہوگی جس کی وجہ سے اس کی منگنی بھی ٹوٹ گئی تھی۔

"میری بہن ایسی حرکت کیوں کرتی؟" شازیہ نے پوچھا۔ "اس کی تو پہلے ہی منگنی ہو چکی تھی اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ نواز جیسے شخص کے لیے وقت ضائع کرے۔"

"ہوں..... وہ تو اسٹور کے ہر فرد کے پیچھے لگ جاتی تھی اور ایک منیجر کے پیچھے تو وہ پاگل ہو گئی تھی اور وہ اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ شہر ہی چھوڑ گیا تھا اور پھر تمہاری بہن نے اس کے غم میں خودکشی کرلی۔" نینا نے کہا۔

"نہیں اس کا ڈوب جانا ایک حادثہ تھا۔" شازیہ نے کہا۔

"تم نے دیکھا مجھے سب پتا ہے۔" نینا نے پاگلوں کی طرح ہنستے ہوئے کہا۔ "اوہ ہاں میں شاید اس سے بھی زیادہ جانتی ہوں لیکن یاد رکھو تم مجھ سے نواز کو نہیں چھین سکو گی تم بھی نواز پر ڈورے ڈالتی ہو اور اس سے ملاقاتوں کو راز میں رکھتی ہو تم بالکل اپنی بہن کی طرح ہو ایک ہی وقت میں کئی دیوانے ہیں تمہارے۔" نینا نے کہا۔

"تمہیں ایسی باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے میری تو منگنی ہو چکی ہے۔" شازیہ نے کہا۔

"لیکن تمہاری انگلیوں میں تمہاری منگنی کی انگوٹھی نہیں ہے؟" نینا نے کہا۔

"میں کام کے وقت انگوٹھی نہیں پہنتی ہوں۔" شازیہ نے اٹھتے ہوئے کہا اسے نینا کی باتوں پر بہت غصہ آرہا تھا۔

"اب میں چلتی ہوں ڈپارٹمنٹ کے نگران کو بتا دوں گی کہ تمہیں آرام کے لیے کچھ وقت چاہیے جب اسٹور آنا چاہو تو خود ہی فون کر دینا۔" شازیہ نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر اس کے فلیٹ سے نکل گئی اس کے فلیٹ سے نکلتے ہی نینا نے چینی کا گھوڑا فرش پر دے مارا تھا۔ اس کے ٹوٹنے کی آواز شازیہ نے بھی سنی تھی لیکن وہ پلٹ کر نہیں گئی تھی پھر جب وہ سیڑھیاں اترتی نیچے آ رہی تھی تو اسے نواز ملا تھا جو اوپر جا رہا تھا۔

"ہیلو! بڑی خوش قسمتی ہے کہ تم سے ملاقات ہوگئی۔" اس نے کہا۔

"خدا حافظ۔" شازیہ نے جواب دیا اس نے مزید کوئی بات نہیں کی تھی لیکن نواز اس کے پیچھے پیچھے آ گیا تھا اور اس کے لیے دروازہ کھول دیا تھا۔

"خدا حافظ مس شازیہ۔" اس نے کہا۔ "تمہارا خاندان جانتا ہے کہ کسی سے بھی سرد مہری کا اظہار کیسے کیا جاتا ہے۔" اس نے سرگوشی میں کہا لیکن شازیہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

پھر وہ کئی دن تک اپنے اور جمیل کے بارے میں بھی سوچتی رہی تھی جاوید بابر بھی اسے بار بار اہم ہونے کا احساس دلا رہا تھا اس نے فیصلہ کرلیا کہ جمیل چونکہ نازیہ میں دلچسپی رکھتا ہے چنانچہ وہ اس سے وفا نہیں کر سکے گا چنانچہ اس سے علیحدگی اختیار کرلی جائے پھر ایک دن اس کی ملاقات جمیل سے ہوئی تو اس نے ہمت کرکے اس

سے بات کرلی۔

"جمیل میں نے تم سے اپنی منگنی کے بارے میں بہت سوچا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں اس منگنی کو ختم کردیا جائے یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔" اس نے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" جمیل نے حیرت سے کہا۔

"دیکھو ہم دونوں میں سے کوئی بھی یہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔" شازیہ نے کہا۔

"یہ تم نے کیسے سمجھ لیا۔" جمیل نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"اداکاری مت کرو جمیل..... تم جانتے ہو کہ ہم دونوں ایک عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہیں۔"

"کیا تم کسی اور......؟" جمیل نے اس کی بات سنے بغیر کہا۔

"نہیں ہرگز نہیں۔ تم یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ تم ہادیہ کو چاہتے ہو۔" اس نے کہا۔

"میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ....." جمیل نے وضاحت کرنا چاہی۔

"میں جانتی ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم ہادیہ سے اور ہادیہ تم سے محبت کرتے ہو تم مجھے بے وقوف کیوں بنا رہے ہو جمیل؟"

"اوہ..... کاش میں اس مثلث سے نکل سکتا۔" جمیل نے کہا۔

"اس کا بہترین طریقہ ہے کہ ہماری منگنی توڑ دی جائے پھر تم آزاد ہو گے اور ہادیہ کو بتا سکو گے کہ اب تمہاری زندگی میں میں شامل نہیں ہوں اس طرح ہادیہ کو بھی تمہارے بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔"

"لیکن میری زندگی میں تم زیادہ اہمیت رکھتی ہو۔" جمیل نے کہا۔

"بات زیادہ اور کم کی نہیں جمیل بات یہ ہے کہ شادی کے بعد بھی شاید میں تم پر اعتماد نہ کرسکوں۔" شازیہ نے صاف گوئی سے کہا۔

"لیکن تمہارے اس فیصلے سے تمہاری اور میری فیملی کو کتنا دکھ ہوگا۔" جمیل نے کہا۔

"تم اپنی اور میری بات کرو جمیل کیا ہم دونوں شادی کے بعد خوش رہ سکیں گے؟" شازیہ نے پوچھا لیکن جمیل کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ شازیہ خاموشی سے اس سے رخصت ہوگئی تھی اس نے مزید کوئی بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا پھر چند روز بعد اس کی ملاقات نینا کے منگیتر نواز سے ہوئی تھی وہ کسی کام سے سپر مارکیٹ آیا تھا اس روز نینا چھٹی پر تھی۔

"شازیہ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔" اس نے شازیہ سے کہا تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"آج نینا نہیں آئی ہے۔" شازیہ نے لہجے میں تلخی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ وہ نواز سے فاصلہ ہی رکھنا چاہتی تھی وہ نینا جیسی احمق لڑکی کا منگیتر تھا اور نینا ذرا سی بات پر بھی غلط فہمی کا شکار ہوسکتی تھی۔

"میری چھٹی کا ٹائم ہوگیا ہے اور میں اب جارہی ہوں۔" اس نے عجلت میں وضاحت کی۔

"تم بالکل اپنی بہن کی طرح ہو۔" نواز نے کہا تو شازیہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"میرا مطلب شکل وصورت سے نہیں دراصل وہ بھی تمہاری طرح نخریلی اور مجھے ٹالنے والی تھی۔" نواز نے کہا تو شازیہ اسے غصے سے دیکھنے لگی۔

"ممکن ہے اسے بھی تمہاری بے تکلفی میری طرح پسند نہ ہو۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"نہیں ایسا نہیں تھا وہ تو مجھے پسند کرتی تھی بہت زیادہ پسند کرتی تھی وہ میرے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔"

"مجھے یقین ہے کہ یہ سب جھوٹ کا پلندہ ہے۔" شازیہ نے بیزاری سے کہا انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے نواز کا نازیہ کے بارے میں گفتگو کرنا پسند نہ آیا ہو۔

"شازیہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو تم نہیں جانتیں تم

اپنی بہن کے بارے میں بہت سے حقائق سے لاعلم ہو۔"
"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔" شازیہ نے کہا۔
"نہیں شازیہ مجھے ایسی باتیں پتہ ہیں جن کا علم اگر سپر مارکیٹ والوں کو ہو جائے تو یہاں تمہاری حیثیت بھی مشتبہ ہو جائے گی۔" نواز نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔
"اب تمہاری بدتمیزی سمجھ میں آئی۔" شازیہ نے غصے سے کہا۔ "اب میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ نازیہ کو تم کس طرح سے بلیک میل کرتے تھے؟"
"اوہ تمہیں ایسی باتیں نہیں کہنا چاہئیں۔" نواز نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔
"میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس ایسی کوئی بات نہیں جو تم میرے اسٹاف منیجر کو بتاؤ اور وہ پہلے سے وہ بات میرے بارے میں نہ جانتا ہو۔" شازیہ نے کہا جس پر نواز نے برا سا منہ بنایا۔
"بہتر یہی ہے کہ تم اپنا وقت برباد نہ کرو۔ خدا حافظ۔" شازیہ نے کہا اور اس کا جواب سنے بغیر اسٹور سے نکل گئی۔
دوسرے روز جب وہ اسٹور گئی تھی تو اسٹور کے نگران نے اس سے چینی کے اس گھوڑے کے بارے میں پوچھا تھا جسے وہ خریدنا چاہتی تھی لیکن پھر وہ فروخت ہو گیا تھا۔
"یہ بات آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔"
"اس لیے کہ میرا خیال تھا کہ وہ فروخت ہو گیا ہے لیکن اب پتہ چلا کہ اسٹور کے فروخت ہونے والے سامان میں اس کا اندراج نہیں ہے چنانچہ اسے کسی نے چرایا ہے۔"
"تو آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں اس سے میرا کیا تعلق ہے۔"
"آپ کا یہ تعلق ہے کہ اس گھوڑے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے آج آپ کی ٹیبل سے ملے ہیں۔" نگران نے اسے بتایا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔
"لیکن یہ تو میں نے ثمینا کے فلیٹ میں دیکھا تھا آپ اس سے اس بارے میں پوچھیں۔" شازیہ نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ "لیکن ثمینا سے میرا ذکر مت کیجیے گا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے۔" شازیہ نے کہا۔
لیکن جب اسٹور کے نگران نے ثمینا سے اس بارے میں پوچھا تو وہ صاف مکر گئی تھی۔
"کون سا گھوڑا......؟ کونسے ٹکڑے......؟" اس نے غصے سے کہا میں کسی گھوڑے کے بارے میں نہیں جانتی۔"
اس نے صاف جھوٹ بول دیا تھا اور نگران کی نظروں میں شازیہ کی پوزیشن اور خراب ہو گئی تھی۔ شازیہ کئی دن اسی پریشانی میں رہی کہ ثمینا اس کے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہے کہ ایک دن جب وہ اسٹور گئی تو اس کی ٹیبل پر ایک اور گفٹ بکس رکھا تھا اور اس پر شازیہ ہی کا نام لکھا تھا جب اس نے بکس کھول کر دیکھا تو اس میں گلابی کلر کا فر کا ٹکڑا تھا اسے حیرت ہوئی کہ یہ کیا معمہ ہے اسے یہ فر کا ٹکڑا کون دے گیا ہے پھر وہ اس گفٹ بکس کو لے کر جاوید بابر کے پاس گئی تھی جو فرڈ پارٹمنٹ کا منیجر تھا اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔
"جاوید صاحب...... میرا خیال ہے کہ کوئی شخص میرے خلاف جال بچھا رہا ہے۔" شازیہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کو چھپاتے ہوئے کہا۔
"پہلے بھی میرے ذمے کئی چیزوں کی گمشدگی کا الزام لگ چکا ہے اور اب یہ پیکٹ آج مجھے اپنی ٹیبل سے ملا ہے...... میں نے سوچا کہ میں آپ کو اس کی رپورٹ دے دوں اس سے پہلے کہ فرڈ پارٹمنٹ اس کی گمشدگی کی اطلاع آپ کو دے اور پھر الزام میرے سر آئے۔"
"تمہیں پتہ ہے نا کہ آج تمہاری سالگرہ ہے۔" جاوید بابر نے کہا اور میں نے یہ تمہیں سالگرہ کے تحفے کے طور پر دیا ہے۔" جاوید بابر نے کہا۔
"اوہ...... آپ کو کیسے پتہ کہ......"
"اگر انسان چاہے تو سب پتہ چل جاتا ہے۔" جاوید بابر نے کہا۔
"میں سمجھی کوئی شخص مجھے احمق بنا رہا ہے۔"
"بھلا کوئی ایسا کیوں کرے گا؟" جاوید بابر نے

پوچھا۔
"شاید آپ کو حقیقت کا علم نہیں۔" شازیہ نے کہا۔
"تو تم بتا دو۔" جاوید نے کہا اور شازیہ نے اسے اصل بات سمجھانے کا فیصلہ کرلیا۔
"چند سال پہلے میری بہن خیر آباد کے ایک پرانے اسٹور پر کام کرتی تھی کہ اسے چوری کے الزام میں ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔ یہاں چند لوگ ایسے ہیں جو کہ اس اسٹور ہی سے یہاں آئے ہیں اور وہ یہ جانتے ہیں کہ میں نینا کی بہن ہوں۔"
"لیکن اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے؟"
"جب یہاں مختلف چوریاں ہوئیں تو وہ میرے نام سے منسوب کی گئیں اور یہ ظاہر کیا گیا کہ میں بھی اپنی بہن کی طرح چور ہوں۔ مثال کے طور پر کرسٹل کا چینی کا بنا ہوا گھوڑا جس کے ٹکڑے میری ٹیبل پر ملے لیکن آپ جانتے ہیں کہ......"
"مجھے یقین ہے کہ وہ گھوڑا تم سے اتفاقی طور پر ٹوٹ گیا ہوگا پہلے جب وہ گھوڑا غائب ہوا تو میں سمجھا تم نے اسے خرید لیا ہوگا وہ مجھے بھی پسند تھا لیکن اب اس ذکر کو جانے دو تم یہ فرقبول کرلو میں یقین دلاتا ہوں کہ فر کے اسٹور کا مالک اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں کرائے گا یہ میں نے تمہارے لیے خریدا ہے۔" جاوید بابر نے کہا اور شازیہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔
اس روز ہاسٹل جانے کے بعد شازیہ بہت دیر تک جاوید بابر کے تحفے کے بارے میں سوچتی رہی کئی اس نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ جاوید بابر نہ صرف اس پر مہربان ہے بلکہ وہ اسے پسند بھی کرتا ہے لیکن اس نے کبھی شازیہ سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا دوسرے روز جب وہ اسٹور گئی تھی تو وہ بہت مصروف رہی تھی۔ نینا بھی موجود تھی لیکن ان دونوں کے درمیان زیادہ بات نہیں ہوئی تھی شام کو جب شازیہ کی واپسی کا وقت ہونے والا تھا تو اچانک ایک ہال کے دروازے سے دھواں نکلتا ہوا محسوس ہوا اس ہال میں آئندہ ہونے والے ایک فنکشن کی ریہرسل ہو رہی تھی اور شازیہ ہی اس کی انچارج تھی وہ ایک دم پریشان ہوگئی وہ فوراً اس طرف بھاگی دروازے کے باہر راہداری میں بھی دھواں تھا اور آخر میں کھلنے والے ایک دروازے کے قریب ایک سیکیورٹی گارڈ موجود تھا پھر اچانک وہ دروازہ کھلا اور نینا باہر نکلی اس کے ہاتھ میں فون تھا۔
"کیا فائر اسٹیشن کو فون کر رہی ہو؟" شازیہ نے اس سے پوچھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سیکیورٹی گارڈ نے موقع کو بھانپتے ہوئے خود ہی فائر اسٹیشن کو فون کر دیا تھا۔
"تمہیں معلوم ہے یہاں فنکشن کی تیاری ہو رہی ہے تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" شازیہ نے نینا سے پوچھا۔
"میں نواز کو فون کر رہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔
"تمہارا یہاں کیا کام؟ تم کہیں اور سے بھی فون کرسکتی تھیں؟" شازیہ نے کہا۔
"تمہیں اس سے مطلب؟" نینا نے غصے سے کہا اور وہاں سے جانے لگی لیکن سیکیورٹی گارڈ نے اسے روک لیا۔
"آپ کو یہاں رکنا ہوگا مس.... آپ کو وضاحت کرنا ہوگی کہ آپ ڈیوٹی آورز کے بعد اس کمرے میں کیا کر رہی تھیں؟"
"میں پرسکون جگہ دیکھ کر فون کرنے آئی تھی۔" نینا نے کہا لیکن گارڈ نے اسے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔
کچھ دیر بعد سیکیورٹی کے آدمی ایک شخص کو اٹھائے کمرے میں لائے تھے اور نینا نواز نواز کرکے چیخ اٹھی تھی اس کے ساتھ کچھ سامان بھی لایا گیا تھا جو اس کے قریب رکھ دیا گیا تھا جو اس کی جیبوں سے ملا تھا یہ سپر مارکیٹ کا سامان تھا اس میں موبائل فون، وائرلیس ریڈیو، گھڑیاں، الیکٹرک شیور، انگوٹھیاں اور دوسری چیزیں شامل تھیں۔
"یہ سب اس کے بیگ اور جیبوں سے ملا ہے۔" گارڈ نے بتایا۔

"نواز کو قصور وار مت ٹھہراؤ یہ میں نے چرایا تھا۔" نینا نے روتے ہوئے کہا۔ نواز خطرے سے باہر تھا لیکن کئی جگہ سے اس کی جلد جھلس گئی تھی اندر اسٹور میں کسی طرح آگ لگ گئی تھی اور نواز اس میں پھنس گیا تھا کہ سیکیورٹی کے عملے نے وہاں پہنچ کر اس کی جان بچالی تھی اور آگ پر قابو پالیا تھا۔

شازیہ کچھ دیر وہاں رکی تھی پھر سیڑھیاں اترتی نیچے آ گئی تھی اور اپنے ہاسٹل چلی گئی تھی جہاں کچھ دیر بعد ہی جاوید بابر آ گیا تھا۔

"تم نے تو مجھے پریشان ہی کر دیا' ہم سب یہ سمجھے تھے کہ تم کہیں آگ میں تو نہیں پھنس گئیں۔ تم بغیر بتائے چلی آئی تھیں اور سارے لوگ تمہیں ڈھونڈ رہے تھے۔"

"لیکن وہ سیکیورٹی گارڈ جو وہاں موجود تھا اس نے تو مجھے دیکھا تھا۔" شازیہ نے کہا۔

"دیکھا ہوگا لیکن وہ نواز کے ساتھ ہاسپٹل چلا گیا تھا اس لیے کسی کو کچھ بتا نہیں سکا۔" جاوید بابر نے کہا۔

"میں معافی چاہتی ہوں۔ آگ تو بجھ گئی تھی۔" شازیہ نے کہا۔

"ہاں لیکن بعد میں وہ پھر بھڑک اٹھی۔" جاوید بابر نے بتایا۔ "جسے بعد میں فائر بریگیڈ والوں نے بجھایا انہوں نے بتایا تھا کہ کسی نے انہیں فون کیا تھا۔"

جاوید نے شازیہ کو بتایا پھر وہ کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا تھا۔

"شازیہ تمہیں اندازہ ہے کہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو مجھ پر کیا گزرتی؟" جاوید بابر نے کہا اور شازیہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"میرا خیال ہے کہ سپر مارکیٹ کی انتظامیہ کسی بھی ملازم کو تکلیف پہنچنے پر پریشان ہوگی۔" شازیہ نے جواب دیا۔

"لیکن احمق شازیہ تم اب تک یہ نہیں سمجھیں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میرا معاملہ مختلف ہے۔" جاوید نے جواب دیا اور شازیہ حیران رہ گئی اسے کچھ اندازہ تو تھا کہ جاوید بابر اسے پسند کرتا ہے لیکن اس حد تک پسند کرتا ہے اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔

"نینا کا کیا ہوا؟" اس نے موضوع بدلا۔

"اس نے اقرار کرلیا کہ وہ مارکیٹ کے مختلف ڈیپارٹمنٹ سے چیزیں چرا کر انہیں خاص جگہوں پر چھپا دیتی تھی اور بعد میں نواز انہیں لے جاتا تھا۔ لیکن آج آگ لگنے سے یہ راز کھل گیا۔" جاوید بابر نے کہا پھر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم یہ بتاؤ کہ وہ اپنے جرم کا الزام تمہارے سر کیوں لگاتی تھی؟" اس نے پوچھا۔

"اس لیے کہ وہ خیرآباد کے اس پرانے اسٹور میں کام کرتی تھی جہاں میری بہن نازیہ بھی کام کرتی تھی نازیہ اس اسٹور کے ایک منیجر سے محبت کرتی تھی اور شاید نینا بھی اسے پسند کرتی تھی اور یہی بات نازیہ اور نینا کے درمیان اختلاف کی وجہ بنی تھی اور نینا وہاں بھی اپنی عادت کے مطابق چیزیں چراتی تھی اور بدلہ لینے کے لیے میری بہن پر الزام لگا دیتی تھی پھر میری بہن کو محبت میں ناکامی ہوئی اور اس نے دل برداشتہ ہوکر خودکشی کرلی تھی جسے حادثے کا رنگ دیا گیا تھا اور ہم لوگوں نے بھی اس کی وضاحت کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا پھر یہاں پر نینا نے مجھے نشانہ بنایا کیونکہ ایک تو وہ مجھ سے نازیہ کا بدلہ لینا چاہتی تھی اور دوسرے مجھ پر چوریوں کا الزام آسانی سے لگ سکتا تھا کہ میں نازیہ کی بہن تھی اور اس کی عادتیں میری عادتوں سے مشابہہ تھیں۔" شازیہ نے جاوید کو تفصیل بتائی۔

"تم جانتی تھیں کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں؟" جاوید نے اس سے پوچھا اسے یوں لگا جیسے جاوید نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔

"ہاں! لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ نازیہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی زندگی کو بھی اس کے انداز میں ختم کرلوں۔ چنانچہ میں ایک اسٹور منیجر سے محبت نہ کرنے کا عہد کرچکی تھی۔" شازیہ نے سچی بات کہہ دی۔

"پھر کیا تم اس عہد کو پورا کرنے میں کامیاب ہوسکیں؟" جاوید نے پوچھا۔

''نہیں..... '' شازیہ نے آہستہ سے جواب دیا۔

''مجھے معلوم ہے جمیل تمہاری زندگی سے نکل چکا ہے اور ایسا تمہاری مرضی سے ہوا ہے..... مجھے ہادیہ کے بارے میں بھی علم ہے اس لیے میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔''

''لیکن اتنا ضرور پوچھیں کہ جب میں کسی اسٹور منیجر سے محبت نہ کرنے کا عہد کر چکی تھی تو اس عہد کو ہار کیسے گئی۔'' شازیہ نے کہا۔

''ہاں! یہ میں ضرور جاننا چاہوں گا۔'' جاوید بابر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دراصل میں اپنی ملازمت کے پہلے روز سرد خانے میں کام کرنے والے ایک شخص سے ملی تھی اور اسے پسند کر بیٹھی تھی پھر جب مجھے پتا چلا کہ وہ شخص مرچنڈائزر منیجر ہے تو بہت دیر ہو چکی تھی۔'' شازیہ نے مسکراتے ہوئے سر جھکا لیا۔

''ہوں..... گویا تم مجھے سرد خانے میں کام کرنے والا ایک معمولی شخص سمجھی تھیں۔''

''ایک بات جاننا پسند کریں گے؟'' شازیہ نے پوچھا۔

''ہاں پوچھو۔'' جاوید نے جواب دیا۔

''میں یہ تو نہیں سمجھ سکتی کہ آپ نے میرے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے عجلت سے کام لیا ہوگا میرا خیال نہیں کہ آپ نے میری شخصیت کے بارے میں اتنا جانتے ہوں گے کہ مجھے پسند کرنے لگیں۔'' شازیہ نے کہا۔

''دراصل یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ پہلے روز جب سرد خانے میں میں تم سے ملا تو تم مجھے اچھی لگیں' تمہارا گھبرایا' گھبرایا انداز مجھے پسند آیا اندازہ ہوا کہ تم سیدھی سادھی لڑکی ہو دوسری لڑکیوں کی طرح تیز طرار نہیں۔''

''پھر؟'' شازیہ نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر تمہارے اسٹور پر کئی ملاقاتوں اور تمہارے مشوروں نے یہ ثابت کر دیا کہ تم میں کسی بھی جگہ کا انتظام سنبھالنے کی صلاحیت ہے اور تم میں ذمہ داری کا احساس ہے۔''

''اس کے علاوہ بھی کوئی تحقیقات کی ہوں گی۔'' شازیہ نے شرارتی انداز میں کہا۔

''ہاں..... میں نے تمہارے اسٹور کی نگران سے تمہارے بارے میں کافی معلومات لی تھیں اور ان کا بھی یہی خیال تھا کہ تم میرے لیے موزوں ہو۔'' جاوید بابر نے کہا تو شازیہ گھبرا کے حیرت سے دیکھنے لگی۔

''یعنی آپ نے مسز قطب الدین کو میرے بارے میں.....'' شازیہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہاں..... ان سے بہتر اور کون بتا سکتا تھا۔ تم سارا دن ان کے ساتھ ہوتی تھیں وہ تمہاری طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں۔''

''انہوں نے میرے بارے میں کیا کہا؟'' شازیہ نے پوچھا۔

''ان کا کہنا ہے کہ مجھے یہ موقع نہیں گنوانا چاہیے اور میں ان کے فیصلے پر عمل کرتے ہوئے تمہیں آگاہ کرنے آیا ہوں کہ اگر تمہاری مرضی شامل ہو تو میں اگلے ہفتے تمہارے ساتھ [illegible] جاؤں گا اور تمہارے بھائی اور بھابی سے مل کر انہیں [illegible] لیں گے کیوں ٹھیک ہے نا..... ؟ میں تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں۔'' جاوید بابر نے مسکراتے ہوئے کہا' شازیہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔

''اجازت ہے نا؟'' جاوید بابر نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور شازیہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا' جس پر جاوید بابر نے ایک خوبصورت سی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی تھی۔



بھیانک چہرہ

امجد ظہیر

ماورائی کہانیوں کا اپنا ایک رنگ اور ذائقہ ہوتا ہے۔ پڑھنے والا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں' اس میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

ایک قصبے کی کہانی' جہاں خوف و دہشت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے

"میں نے بہت ہی بھیانک چہرہ دیکھا ہے' اُف خدایا! کیسے سمجھاؤں۔" شکیل نے خوف زدہ لہجے میں کہا اور کرسی پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ فیصل اور شہزاد چونک اٹھے اور غور سے اسے دیکھنے لگے۔

"یار! کیا بات ہے اتنا ڈرے ہوئے کیوں ہو؟" شہزاد نے شکیل کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے بہت ہی خوفناک صورت دیکھی ہے۔" شکیل کچھ یاد کرتا ہوا کانپ اٹھا۔ فیصل خاموشی سے شکیل کے کیفیتوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کچھ پتا بھی تو چلے وہ بھیانک شکل کیسی تھی؟" شہزاد نے استفسار کیا۔

"مم.....میں تم دونوں سے مل کر چھٹیاں گزارنے گاؤں گیا تو میں نے ایک بھیانک چہرہ انسان کے بارے میں سنا اور واقعات پر یقین نہ کیا لیکن اُف..... وہ بھیانک شکل میرے اعصاب پر لرزا طاری کر رہی ہے۔" شکیل بولتے بولتے کانپ گیا۔ فیصل نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی کو چھوا' جسم سرد ہو رہا تھا اس نے گھنٹی بجا کر ملازم کو بلایا اور گرما گرم چائے لانے کے لیے کہا۔ شہزاد کے سارے ملازم اس کا حکم بخوبی سمجھتے تھے اس سے مانوس بھی تھے۔

"جو بھی ہے بے خوفی سے بتادو' یہاں کوئی خطرہ نہیں۔" فیصل نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"ہاں تو دوستو......" شکیل اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ "گاؤں والوں نے بتایا کہ گاؤں سے باہر جنگل میں واقع پرانی حویلی سے ایک بہت ہی بھیانک چہرہ انسان نکلتے دیکھا گیا ہے' جس کا چہرہ بڑا ڈراؤنا اور سرخ رنگ کا ہے' ماتھے پر سیاہ داغ ہیں' آنکھیں بھی خون کے مانند سرخ ہیں۔ اس کے سر پر آگ کا شعلہ بھڑک رہا ہوتا ہے' وہ جب بھی حویلی سے نکل کر گاؤں میں داخل ہوتا ہے کوئی نہ کوئی انسان بستی میں گم ہو جاتا ہے اور بستی سے باہر کسی درخت سے اس کی لاش لٹک رہی ہوتی ہے جس سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہوتا ہے۔ وہ شیطان صفت انسان کبھی گھوڑے پر سوار دکھائی دیتا ہے' کبھی شیر چیتے' ریچھ اور ہاتھی تک پر سوار دیکھا گیا ہے۔ بہت سے لوگ بستی چھوڑ کر چلے گئے ہیں لیکن جن کی زمین اور چراہ گاہیں ہیں وہ کہاں جائیں۔" اسے اپنے بڑوں کا آ گیا۔

"میں یقین نہ کرتا لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے بستی کے چوکیدار بخشو کو بھیانک چہرہ انسان کے ہاتھوں پر مچلتے دیکھا ہے۔ وہ ریچھ پر سوار بخشو کو لے جا رہا تھا' میں بدحواس ہو گیا۔" شکیل نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

"اُف اتنا بھیانک چہرہ اور اتنا بھیانک منظر بخشو چیخ رہا تھا اور پوری بستی بستروں میں دبک کر

خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ خود میں بھی خوف سے بے جان لاش بن گیا۔ بندوق میرے ہاتھ میں تھی لیکن حرکت دینے کی سکت نہ تھی۔ شکیل نے خوفزدہ لہجے میں بیان مکمل کیا۔

ملازم چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر لے آیا اور وہ گرم گرم چائے پینے لگے شہزاد کے والد ڈاکٹر اور ملک کے نامور سائنس دان تھے۔ فیصل کے والد ریٹائرڈ پولیس آفیسر تھے شکیل کے والدین گاؤں میں کھیتی باڑی اور جانور پالتے تھے۔

"وہ ضرور کوئی بہروپیا انسان ہے اور انسانی خون سے کوئی خاص مقصد حاصل کر رہا ہے۔" شہزاد نے بھوت اور بدروح کے تصور کو رد کیا۔

"یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہو سکتا ہے وہ بدروح یا شیطان صفت انسان ہو۔" فیصل نے متوازن رائے کا اظہار کیا۔

"اکیسویں صدی میں ایسی انہونی باتیں وہم یا دھوکا ہی ہو سکتی ہیں۔" شہزاد نے مستحکم لہجے میں بیٹھ پر مکا جمایا۔

"ہر قسم کے بھیانک چہرہ ماسک بازار میں عام ہیں میرے فیس روم میں کئی بھیانک چہرہ ماسک لٹک رہے ہیں جو میں اپنی ذاتی فلم میں استعمال کروں گا۔ ان میں سے کوئی ماسک پہن کر بھی انسان بھیانک چہرہ بن سکتا ہے چلو میں دکھاؤں۔" شہزاد نے اٹھتے ہوئے کہا وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

"لیکن وہ مختلف جانوروں پر سوار کیسے دکھائی دیتا ہے۔" شکیل نے حیرت سے پوچھا۔

"جانور تو مداری اور سرکس والے بھی مسخر کر لیتے ہیں۔" شہزاد نے قہقہہ لگایا وہ مختلف راستوں سے گزر کر فیس روم میں داخل ہوئے اور شکیل دروازے پر ہی رک گیا پھر سنبھل کر اندر داخل ہوا۔ کمرا نیم تاریک تھا اور کمرے کی دیواروں میں چھت سے نیچے تین طرف گول خانوں میں کئی بھیانک چہرے لٹک رہے تھے انتہائی ڈراؤنے اور مکروہ۔ جنہیں دیکھ کر انسان خوف سے تھر تھر کانپ اٹھے کئی چہروں کے ساتھ پورے جسم کا بھیانک لباس بھی منسلک تھا۔ شہزاد شکیل سے انگلی کے اشاروں سے پوچھنے لگا۔

"وہ بھیانک چہرہ یہ تھا' وہ تھا' کون تھا؟"

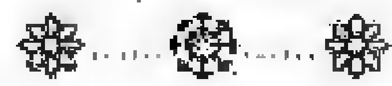
شہزاد نفی میں سر ہلانے لگا آخری خانہ خالی تھا۔

"اس خانے کا بھیانک چہرہ ابھی تیار نہیں ہوا بعض چہرے تو میں نے خود بنوائے ہیں اور بعض بازار سے خریدے ہیں۔" شہزاد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ فیصل ایک چہرے کے قریب جا کر غور سے دیکھنے لگا۔ واقعی بہت دہشت ناک ماسک تھا سرخ و سیاہ چہرہ چہرے پر ہڈیاں ابھری ہوئی جو چمکدار تھیں۔ لمبے لمبے دانت منہ سے باہر لٹک رہے تھے مونچھیں تھیں کہ بالکل سانپ لٹکے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ سر پر چھوٹی چھوٹی کھوپڑیوں سے بنا ہوا تاج سا تھا جو جانے کون سے جانور کی تھیں۔ وہ چہرہ بھیانک انداز میں ہنس رہا تھا اس کی زبان بے حد سرخ تھی۔ تازہ لہو جیسی آنکھیں گول اور گہرے زرد رنگ کی تھیں البتہ ڈھیلا سرخ رنگ کا تھا جسم پر سیاہ بال تھے جن میں چھوٹے چھوٹے انسان اعضا چپکے ہوئے تھے بہت بھیانک منظر تھا۔ فیصل کو جھرجھری سی آگئی شہزاد نے شکیل کو فیصل کے پاس جانے کا اشارہ کیا لیکن شکیل نے ہاتھ ہلا کر بھیانک چہرے کی قریب جانے سے انکار کر دیا۔ شہزاد قہقہہ مارتے ہوئے بولا تھا۔

"یار اب اتنا بھی کیا ڈرنا۔" شکیل نے کوئی جواب نہ دیا اور بدستور خلا میں گھورتا رہا۔

"ہمیں ہر حال میں شکیل کے ساتھ گاؤں جانا ہے۔" فیصل نے ہاتھ اٹھا کر فیصلہ کیا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا اب شہزاد اور فیصل نے فیصلہ کیا کہ یہ مہم سائنس اور روحانیت دونوں کی مدد سے سر کی جائے گی۔



اگلے روز تینوں دوست گاؤں مرشع شاہ پور پہنچ گئے اور آرام کرنے کے بعد سہ پہر کے وقت دوربین کی مدد سے جنگل میں آ کر پرانی حویلی کا جائزہ لینے لگے' اس عمارت کو کسی ہندو راجہ نے بنوایا تھا کیونکہ حویلی کے دروازے پر دائیں بائیں دو بت چبوتروں پر ایستادہ تھے عمارت جالوں اور گردوغبار سے بھری پڑی تھی۔ عمارت پرانی ہونے کے باوجود خاصی مستحکم تھی۔

اس وقت عمارت کے دروازے اور کھڑکیاں اپنے آپ کھلنے اور بند ہونے لگے' وہ چونک اٹھے پھر متجسس ہو کر اپنے سامان کا جائزہ لے کر حویلی کی طرف بڑھنے لگے' سائے لمبے ہو رہے تھے اور ماحول پر سناٹا طاری تھا جیسے کسی خطرے کا پیش خیمہ ہو۔

ایک الو کہیں سے اڑتا ہوا آ کر حویلی کی گیٹ پر بیٹھ گیا اور اپنی منحوس آواز میں چلانے لگا۔ کئی بلیوں کے رونے کی مکروہ آوازیں بھی حویلی کی اندر سے سنائی دینے لگیں۔ اچانک حویلی کا وزنی گیٹ اپنے آپ حرکت میں آ کر پوری طرح کھل گیا' شہزاد کی نے دوربین سے جگہ کا بغور جائزہ لیا لیکن کوئی انسان نظر نہ آیا' البتہ ہوا کا ایک بگولا گیٹ سے نکل کر جنگل کی طرف جاتا نظر آیا۔ شہزاد نے گن اٹھا کر بگولے پر فائر کر دیا جس سے بگولے میں آگ کی چنگاریاں سی اڑیں لیکن بگولا اور تیزی کے ساتھ جنگل کی طرف جانے لگا۔ زمین پر پڑے خشک پتے اور گھاس کے ٹکڑے بگولے کے نیچے ناچ رہے تھے۔

"ابھی تو سمجھ میں نہیں آیا یہ بگولا کیا شے ہے؟" شہزاد نے حیرت کا اظہار کیا۔

"یہ ضرور کوئی پُراسرار علامت ہے' کوئی آفت آیا ہی چاہتی ہے۔" فیصل نے اندازہ لگایا' جلد ہی فیصل کی بات درست ثابت ہوگئی جب جنگل کی طرف سے دس پندرہ خونخوار ریچھ اور بھیڑیے اس طرف غراتے ہوئے آنے لگے' وہ بار بار ناک سکوڑ رہے تھے' انسانی خون کی مہک نے انہیں بے چین کر دیا تھا۔ وہ پشت پر موجودہ درختوں کی جھنڈ کے قریب آ گئے اور دونوں سمت رائفلوں سے گولیوں کی باڑ مارتی نشانے کامیاب رہے اور ریچھ اور

بھیڑیے چیختے چلاتے ہوئے ڈھیر ہو گئے' جسموں سے خون ابلنے لگا۔

ابھی انہوں نے سانس بھی نہ لیا تھا کہ بے شمار سانپوں کو اچھلتے کودتے تیزی سے اس طرف آتے دیکھا' سانپوں کی پھنکار سے ماحول کانپ اٹھا۔

بڑا دہشت ناک نظارہ تھا' شہزاد نے بڑی بے خوفی سے مخصوص گن کے آگے پیٹرول بم لگا کر سانپوں کے راستے میں خشک جھاڑیوں پر پھینکا' بم پھٹا اور جھاڑیاں تیزی سے مسالے کے مانند جلنے لگیں' سانپ آگ سے گھبرا کر واپس پلٹنے لگے۔ آگ اور دھوئیں کی دیوار ان کے آگے حائل ہو چکی تھی' اس وقت بگولا چکراتا ہوا آگ کی اوپر آ گیا اور تیز ہوا سے آگ بجھنے لگی' سانپ پھر ان کی طرف آنے لگے۔ فیصل نے جنگل کی دوسری سمت کا جائزہ لیا تو وہ خوف سے کانپ اٹھا اس طرف سے بے شمار ہاتھی' شیر' چیتے اور زہریلے کیڑے' سانپ اور بچھو جن میں اژدھے بھی شامل تھے انسانی خون کی مہک پر دیوانہ وار لپک رہے تھے۔ اتنے جانوروں کو مارنے کے لیے ان کے پاس گنیں اور گولیاں ناکافی تھیں' اس وقت شہزاد کے چہرے پر خطرناک مسکراہٹ رینگ گئی۔

"دیکھنا ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔" شہزاد نے پراسرار لہجے میں کہا اور جیب سے ریموٹ کنٹرول نکال کے اس کے بٹن دبانے شروع کیے تو پے در پے دھماکوں سے زمین ہل کر رہ گئی' آسمان کانپ اٹھا۔

جانوروں کے قدموں میں طاقتور بم پھٹے اور ان کے پرخچے اڑ گئے' ہاتھیوں کے وزنی جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں اچھلے پھر نیچے آئے۔ انتہائی بھیانک منظر تھا' سانپوں اور بچھوؤں کے جسم بے شمار ٹکڑوں اور ریزوں کی شکل میں بکھر گئے' چند بچنے والے جانور اندھا دھند بھاگ کھڑے ہوئے' ایک ہاتھی کی سونڈ جسم سے الگ ہو کر اڑتی ہوئی ان کے سامنے آ کر گری۔

"میں اس پائپ کا باجا بناؤں گا۔" فیصل نے مسکراتے ہوئے انگلی سے اشارہ کیا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" فیصل اور شکیل نے بیک وقت حیران ہو کر شہزاد سے پوچھا' شہزاد مسکرایا۔

"میں نے دوپہر کے وقت چپکے سے اٹھ کر حویلی کے اطراف میں کئی خطرناک ریموٹ کنٹرول بم کھلونوں میں چھپا کر پھیلا دیے تھے۔"

"تمہارے والد کمال کی ایجادات کرتے ہیں۔" فیصل نے جانوروں کے دور تک بکھرے خون آلود ٹکڑوں کو دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

اس وقت شہزاد نے ایک جھاڑی سے ریموٹ کنٹرول ہیلی کاپٹر نکال کر چلاتے ہوئے حویلی کے مین گیٹ سے ٹکرا کر تباہ کر دیا۔ بم پھٹا اور گیٹ میں کافی بڑا شگاف بن گیا۔

"مار لیا میدان۔" فیصل نے خوش ہو کر مکا لہرایا۔

"آؤ دوستو! اس بہروپیے سے ملاقات کر لیں۔" شہزاد نے گیٹ کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ تینوں حویلی کے گیٹ پر پہنچے اور شگاف سے گزر کر ایک کھلے میدان میں آ گئے جس میں دو طرفہ درختوں کے درمیان بنی پختہ روش پر ان کے قدم ابھر رہے تھے۔ سامنے حویلی کا بڑا سیاہ دروازہ نظر آ رہا تھا جس پر کسی بت کی شبیہ بنی ہوئی تھی' بت کے سر پر ہندوؤں والی چوٹی بھی لٹک رہی تھی۔

ماحول میں ایک پُراسراری سائیں سائیں رچی بسی ہوئی تھی' اچانک ایک مہیب شور بلند ہوا

اور پھر دوڑتے قدموں کی تیز آواز گونجنے لگی پھر آسمان پر بجلی بڑے زور سے کڑکی اور تیزی سے ان تینوں کی طرف آئی۔

"بچو......" فیصل زور سے چیخا اور اس نے ان دونوں کو دھکا دے کر خود بھی روش کے باہر چھلانگ لگا دی۔ وہ آسمان کو بغور دیکھ رہا تھا' بجلی تیز چمک کے ساتھ کسی شعاع کی مانند آکر روش پر پڑی اور فرش میں پگھلتے پگھلتے گہرا گڑھا بن گیا' تینوں خوف سے کانپ اٹھے۔ ایک لمحے کی دیر انہیں راکھ کر دیتی' وہ بسم اللہ پڑھ کر دروازے کی طرف بڑھے۔ اچانک دروازہ کھل گیا اور وہ بے اختیار اندر داخل ہوئے اور دھک سے رہ گئے۔ انہوں نے ایک بھیانک چہرے والے خوفناک وجود کو دیکھا جو نصف دائرے کی شکل کی الماری میں رکھے تین خالی شیشے کے مرتبانوں کی طرف انگلی سے اشارہ کر رہا تھا پھر وہ بھیانک انداز میں مسکرایا۔ وہ مرتبانوں میں انسانی خون بھرا دیکھ کر لرز اٹھے' ان کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ مرنے والوں کے نام متعلقہ مرتبانوں پر لکھے ہوئے تھے۔

"میں تم تینوں کا خون اپنے دانتوں سے نچوڑ کر تین خالی مرتبانوں میں بھروں گا پھر ان سب مرتبانوں کا خون ملا کر دس گھونٹ پیوں گا پھر باقی خون سے نہاؤں گا' اس طرح مجھے حیات ابدی حاصل ہو جائے گی۔" بھیانک چہرہ مسکرایا' وہ انتہائی ڈراؤنی تصویریں بنی ہوئی تھیں' اس کے گلے میں چھوٹی چھوٹی کھوپڑیوں کا ہار تھا۔ شکیل تو تھر تھر کانپ رہا تھا جبکہ شہزاد اور فیصل حواس بحال کر چکے تھے اور بھیانک چہرے کو گھور رہے تھے۔ اچانک فیصل نے پوچھا۔

خاموشی

خاموش رہنا بھی کبھی کبھی سوال بن جاتا ہے اگر یوں کہا جائے کہ خاموشی ہے ہی سوال تو غلط نہ ہوگا۔ خاموشی جہاں دوسروں کے لیے سوال بن جاتی ہے وہاں آپ کے لیے اس سوال کا جواب جو کوئی دوسرا فرد آپ کو نہیں دے سکتا۔ خاموشی تنہائی میں آپ کو وقت دیتی ہے خود کو جاننے پہچاننے کا۔

جہاں یہ آپ کا تعلق دوسروں سے توڑ دیتی ہے وہیں آپ سے آپ کا تعلق بے حد مضبوط بنا دیتی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ سب سے اپنا تعلق توڑ لو اور خود میں ہی کھوئے رہو یوں تو ایسا ہوگا کہ آپ ہو یا نہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑتا اور کبھی کبھی خاموش رہنا بے وقوفی کہلاتا ہے بولو ضرور پر وہاں جہاں بولنا ضروری ہو۔ آپ کے لیے اور سب کے لیے اس طرح خاموشی سوال نہیں بلکہ جواب کے روپ میں سوال بن جاتی ہے۔

مبشرہ سحر...... عبد الحکیم

"وہ ہوا یا بگولا بھی تم تھے جو جانوروں کو حکم دیتا ہے۔"

"ہاں وہ پراسرار روپ بھی میرا ہی ہے میں جنگل کے تمام جانوروں کو اپنے جادو سے مسخر کر چکا ہوں' وہ میرے اشاروں پر چلتے ہیں۔" بھیانک چہرہ مسکرایا۔

شہزاد نے اپنا لیزر پستول' بم اور سب حربے آزمائے لیکن بھیانک چہرے کو سائنس کی ان ایجادوں سے کوئی نقصان نہ پہنچا' وہ مسکرانے لگا۔ شیطان صفت انسان شکیل کی طرف لپکا جو ڈرتے ڈرتے ایک کونے میں چلا گیا تھا' فیصل نے صورتحال خطرناک دیکھ کر اپنی ٹوپی شکیل کی طرف پھینک دی پھر چلا کر اسے پہننے کا اشارہ کیا' شکیل

نے کانپتے ہاتھوں سے ٹوپی پہن لی بھیانک چہرہ اس کے قریب پہنچ چکا تھا وہ ٹوپی پہنتے ہی شکیل غائب ہوگیا۔ شیطان ششدر رہ گیا۔

"وہ مارا۔" فیصل چلایا۔

"بابا ملنگ گرداسپوری کی کرامت جیت گئی۔"

شکیل اچانک نمودار ہوا اور چلتا ہوا دونوں کے پاس آ گیا۔ شہزاد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شکیل کو دیکھنے لگا جو عالم غائب سے ظہور پذیر ہوا تھا۔

شیطان شہزاد کی طرف بڑھا' فیصل نے ٹوپی شکیل سے لے کر شہزاد کی طرف اچھال دی شہزاد نے شیطان کو منہ چڑاتے ہوئی ٹوپی پہن لی اور غائب ہوگیا۔ شیطان جھنجلا گیا' وہ تیزی سے فیصل کی طرف لپکا۔ شہزاد اچانک نمودار ہوا اور اس نے ٹوپی فیصل کی طرف اچھال دی جو خود بخود اڑتی ہوئی فیصل کے سر پر فٹ ہوگئی۔ فیصل غائب ہوگیا۔ شیطان غصے سے غراتا ہوا شہزاد اور شکیل کو دیکھنے لگا۔

اسی لمحے فیصل نمودار ہوا اور اس نے ٹوپی کیا ندر لگے تعویز کو چوم کر کھینچ لیا اور ٹوپی شیطان کے سر پر پھینک دی' ٹوپی غیبی طاقت سے شیطان کے سر پر جا کر فٹ ہوگئی۔ آگے بڑھتا شیطان ٹھٹک کر رک گیا اور ٹوپی کو اتارنے کے لیے زور لگانے لگا لیکن ٹوپی ایسی فٹ تھی ٹس سے مس نہ ہوئی پھر شیطان کا سر دکھنے لگا' ٹوپی کی بندش اس کی سر کو دبا رہی تھی وہ غصے سے دہاڑنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا' شیطان کچھ دیر بعد چکراتا ہوا فرش پر گر پڑا لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے اٹھ کھڑا ہوا لیکن عین اسی لمحے ٹوپی کے کناروں پر تیز چمک نمودار ہوئی اور وہ چھری کے مانند شیطان کی گردن میں اترنے لگی۔ شیطان کی گردن سے خون رسنے لگا وہ سسکیاں بھرنے لگا' اس کی شیطانی قوتیں بے کار ہوگئی تھیں۔ اسے وہ تمام معصوم لوگ یاد آئے جن کی اس نے سنگدلی سے جان لی تھی اور ان کا خون مرتبانوں میں جمع کر رکھا تھا۔ شیطان کی تڑپنے سے ہال میں زلزلہ آ گیا' چھت کا فانوس نیچے گر کر ٹوٹ گیا۔ اس وقت ٹوپی کے چمکدار کناروں نے شیطان کی بھیانک چیخ کے ساتھ اس کا سر تن سے جدا کر دیا' اب شیطان کا چہرہ ٹوپی میں لگا اڑتا ہوا فیصل کی طرف آیا' شکیل کو اس منظر سے جھرجھری سی آ گئی۔

"اب اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں' میرے خاندانی بزرگ کی کرامات ٹوپی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کی ہے وہ شیطان کی عبرتناک انجام سے دوچار کر چکی ہے۔ جو انسانوں کا خون جمع کر کے حیات ابدی کا جام پینا چاہتا تھا۔" فیصل نے تقریر کرتے ہوئی کہا۔

واپسی پر انہوں نے گاؤں میں ٹوپی میں جڑے بھیانک چہرے کی نمائش کی' گاؤں میں ان کی بہادری کے چرچے پھیل گئے۔ لوگ انہیں دیکھنے کے لیے جمع ہونے لگے' ٹوپی کی کرامات کے گیت گائے جانے لگے۔

تینوں دوست بھیانک چہرے کو لے کر شہر لاہور پہنچے اور شہزاد نے فیصل کے اشارے پر فیس روم کے آخری خانے میں ٹوپی سے الگ ہونے والے شیطان کی چہرے کو لٹکا دیا۔

"یہ ہے فیس روم کا اصل بھیانک چہرہ" شہزاد نے مسکراتے ہوئے اعلان کیا۔



آخری خواہش

محمد اعظم خان

ایک مقتول کی روداد' اس نے اپنے قاتل کو قتل سے پہلے ہی معاف کر دیا تھا۔
دو دوستوں کا احوال' پراپرٹی ان کی دوستی کے درمیان آگیا تھا۔
دو بیوہ عورتوں کا افسانۂ غم' ایک کا شوہر قبرستان اور دوسری کا پھانسی کے چبوترے پر کھڑا تھا۔
اس معاشرے کی کہانی' جہاں پیسے کے لیے خون سفید ہو جاتا ہے

شام کا وقت تھا۔ ارشد علی اپنی بیوی راحیلہ کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ دروازہ کھولا تو ان کا دوست ظفر اقبال سامنے کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ارشد علی کا چہرہ کھل اٹھا پھر وہ دونوں یوں گلے لگ کر ملے جیسے برسوں بعد ملاقات ہوئی ہو۔

''تو آپ ہیں...... ذرا یاد کیجئے آپ کو یہیں آنا تھا یا کہیں غلطی سے......'' ارشد علی نے پیار بھرے لہجے میں شکایت کی۔

انہوں نے ابھی بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ ظفر اقبال نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولے۔

''سارے سوال و جواب یہیں کرو گے۔ اندر چلنے کو نہیں کہو گے۔''

''ارے نہیں نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔ آؤ اندر چلیں۔'' وہ اپنے دوست کو لیے اندر چلے آئے اور راحیلہ کو آواز دی، جو کھانا پکانے کی غرض سے باورچی خانے میں چلی گئی تھیں۔

''راحیلہ! ذرا ادھر تو آؤ' دیکھو کون آیا ہے......''

''آہا...... بھائی صاحب آئے ہیں، کیسے ہیں آپ؟'' راحیلہ بیگم نے تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''خدا کا شکر ہے۔''

''شاہدہ بہن کیسی ہیں؟'' انہوں نے ظفر اقبال کی بیوی کی خیریت دریافت کی۔

''وہ بھی ٹھیک ہیں......''

''انہیں بھی ساتھ لے آتے۔''

اس سے پہلے کہ وہ راحیلہ بیگم کی بات کا جواب دیتے راشد علی درمیان میں بولے۔

''باتیں ہی کرتی رہو گی' اپنے بھائی صاحب کو چائے نہیں پوچھو گی؟''

''نہیں نہیں...... کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔'' انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے راحیلہ بیگم کو روکتے ہوئے کہا۔

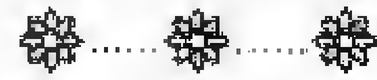
''نہیں بہن اتنے دن بعد تو آپ آئے ہیں، چائے تو پینی ہی پڑے گی اور ویسے بھی چائے تیار ہے' بس میں تھوڑے سے پکوڑے بنا لیتی ہوں تب تک آپ دونوں باتیں کریں۔'' راحیلہ بیگم یہ کہتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔



ارشد علی اور ظفر اقبال ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ اسکول کے بعد کالج میں بھی وہ ایک ساتھ رہے وہاں بھی ان کی دوستی مثالی تھی پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کی دوستی مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ دونوں کے گھر بھی قریب ہی تھے۔ جب تک وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیتے انہیں چین نہیں آتا تھا۔

دونوں نے ایک ساتھ گریجویشن کی تھی مگر دونوں کے گھریلو حالات ایسے نہ تھے کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرتے، اس لیے ملازمت کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ وہ ہر روز کسی نئی جگہ انٹرویو کے لیے جاتے مگر مایوس لوٹتے۔

چھ ماہ کی مسلسل بھاگ دوڑ کے بعد ظفر اقبال کو تو ایک ادارے میں جاب مل گئی تھی جبکہ ارشد علی ابھی تک بے کار تھا۔ اپنی ملازمت کے کچھ ہی دن بعد اس نے ارشد علی کے لیے بھی کوششیں شروع کر دی تھیں، اپنے اخلاق کی وجہ سے اس نے آفس میں کافی تعلقات پیدا کر لیے تھے، جلد ہی ظفر اقبال کی کوششیں رنگ لائیں اور ارشد علی کو بھی اسی دفتر میں ملازمت مل گئی، یوں دونوں دوست پھر سے ایک ساتھ تھے۔ دن گزرتے گئے، دو زندگی کے ہر موڑ پر دکھ سکھ میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے اور عمر کے ساتھ ساتھ ان کی دوستی میں بھی پختگی آتی گئی۔



ایک رات آندھی اور طوفان کے ساتھ زوروں کی بارش بھی ہوئی، جیسے جیسے رات بیت رہی تھی ویسے ویسے بارش میں تیزی آ رہی تھی۔ ارشد علی کا خستہ حال مکان اس طوفان کا مقابلہ نہ کر سکا اور زمین بوس ہو گیا۔ ارشد علی، راحیلہ بیگم اور ان کا بیٹا الیاس تو محفوظ رہے تھے مگر ارشد علی کا جوان بیٹا مکان کے ملبے تلے دب کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

ظفر اقبال کو اپنے جگری دوست کے جوان بیٹے کی موت کی خبر ملی تو وہ دوڑتا ہوا وہاں پہنچے، دونوں میاں بیوی کا بیٹے کی اچانک موت پر رو رو کر برا حال تھا، ارشد علی اپنے دوست کے گلے لگ کر خوب روئے۔

''بس کرو میرے دوست...... مرنے والا تمہارے پاس خدا کی امانت تھا، اس نے اپنی امانت واپس لے لی اور پھر زندگی اور موت تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے جو کچھ ہمارے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے وہ ٹل تو نہیں سکتا۔'' ظفر اقبال نے انہیں تسلی دی مگر ان کے آنسو کسی بھی طرح تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ مکان کا تھا، ان کی مالی حیثیت ایسی نہ تھی کہ وہ فوری طور پر نیا مکان تعمیر کرواتے۔ انہوں نے انہیں اپنے ہاں لے جانے کی بہت کوشش کی تھی مگر اس کے ہاں بھی کب تک رہا جا سکتا تھا، اس لیے انہیں مجبوراً مکان کرائے پر لینا پڑا تھا۔

کرائے پر مکان لیا تو دونوں میاں کے ہوش ٹھکانے آ گئے، اپنا مکان تھا تو جیسے تیسے گزر بسر ہو ہی جاتی تھی لیکن اب ان کی تنخواہ کا زیادہ حصہ مکان کا کرایہ ادا کرنے میں چلا جاتا تھا اور جو باقی بچتا اس میں بجلی، پانی اور گیس کا بل، الیاس کی پڑھائی اور دوسری ضروریات زندگی پوری کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔ بمشکل پچھلے ماہ کا ادھار ادا ہوتا تھا کہ نیا ادھار پھر سے شروع ہو جاتا، غرض یہ کہ انہیں بہت برے دن دیکھنا پڑ رہے تھے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کریں تو کیا کریں۔ ظفر اقبال کو اپنے دوست کے حالات جان کر بہت دکھ ہوتا مگر وہ اپنی جگہ مجبور تھا، اس کے اپنے حالات ایسے نہ تھے کہ وہ ان کے لیے کچھ کر پاتا۔



ظفر اقبال اپنی ملازمت کی مدت پوری کر چکے تھے، انہیں ریٹائرمنٹ ملی تو وہ اپنے گھر جا بیٹھے، اس طرح دونوں دوستوں میں ملاقات کا سلسلہ بہت حد تک کم ہو گیا تھا کیونکہ ارشد علی نے جو مکان کرائے پر لے رکھا تھا وہ ظفر اقبال کے گھر سے کافی دور تھا۔

کافی دن بعد ارشد علی، ظفر اقبال کے ہاں آئے تو بہت پریشان تھے، ظفر اقبال سے ان کی پریشانی دیکھی نہ گئی تو اس نے دریافت کیا۔

"بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو، خیر تو ہے؟"

"کیا بتاؤں، میں حالات کا مقابلہ کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کروں تو کیا کروں؟" ارشد علی نے درد بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"میں تمہارے حالات سے پوری طرح آگاہ ہوں مگر اس کا کوئی دوسرا حل بھی تو نظر نہیں آتا۔"

"میرے ذہن میں ایک حل ہے لیکن تم ساتھ دو تو......" ارشد علی نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی تھی۔

"ہاں ہاں ضرور کہو، میں آج تک تمہارا ساتھ دیتا آیا ہوں، بھلا اب کیوں پیچھے ہٹوں گا۔"

"وہ......وہ یہ ہے کہ......" ارشد علی بات کرتے ہوئے جھجک رہے تھے۔

"جو کہنا ہے صاف صاف کہہ ڈالو۔" ظفر اقبال نے ہمت بندھائی۔

"تمہیں ریٹائرمنٹ پر جو چار لاکھ روپے ملے ہیں اگر تم وہ مجھے دے دو تو میں اپنے گھر کی مرمت کروالوں میری ریٹائرمنٹ میں بھی تھوڑا ہی عرصہ رہ گیا ہے۔ جیسے ہی مجھے رقم ملے گی میں تمہیں لوٹا دوں گا۔" ظفر اقبال کے ہمت دلانے پر انہوں نے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"ہاں......ہاں کیوں نہیں میں اگر تمہارے کسی کام آسکتا ہوں تو میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے اور ویسے بھی مجھے ابھی ان پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ پیسے ابھی گھر پر ہی رکھے ہیں میں نے بینک میں جمع نہیں کروائے تم بیٹھو میں ابھی لے کر آتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور اندر چلا گیا۔

جب ظفر اقبال نے شاہدہ کو چار لاکھ روپے لانے کو کہا تو انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس وقت پیسوں کی کیا ضرورت آن پڑی؟"

شاہدہ بیگم کے دریافت کرنے پر ظفر اقبال نے تمام باتیں دوہرا دیں، شاہدہ بیگم نے بات سنی تو بولیں۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر دیکھ لیں چار لاکھ کی رقم کوئی معمولی نہیں ہوتی، ہماری تو عمر بھر کی پونجی یہی ہے اور پھر......"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو، وہ میرا بچپن کا دوست ہے، اس کے مشکل وقت میں اگر میں بھی کام نہیں آؤں گا تو پھر ایسی دوستی کس کام کی؟ ہمیشہ دوست ہی دوستوں کے کام آتے ہیں۔"

اب مزید کچھ کہنے کی گنجائش کہاں رہی تھی، وہ گئیں اور خاموشی سے رقم لا کر ظفر اقبال کے ہاتھ میں دے دی، وہ ڈرائنگ روم میں آئے تو اس نے ہاتھ میں روپے پکڑ رکھے تھے جو انہوں نے ارشد علی کے حوالے کر دیے۔

گھر مرمت ہوتے ہی ارشد علی بلا تاخیر کرائے کا مکان چھوڑ کر اپنے گھر میں آ بیٹھا تھا، یوں زندگی کی گاڑی ایک بار پھر پہلے کی طرح پرسکون چلنے لگی تھی۔



ظفر اقبال کی بیٹی جوان تھی، اس کی خواہش تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو سکیں، لڑکے والے بھی شادی کے لیے زور ڈال رہے تھے، اس نے بھی یہی سوچ رکھا تھا کہ جیسے ہی وہ ریٹائر ہو گا تو ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم سے اپنی بچی کے ہاتھ پیلے کر دے گا، وہ اسی سلسلے میں ارشد علی کے ہاں آیا تھا کہ اس سے رقم کی واپسی کے لیے بات کرے تاکہ شادی کی تیاری کی جا سکے۔



راحیلہ بیگم چائے لے کر آئیں تو ان کے قدموں

کی آہٹ سن کر وہ دونوں اپنے خیالات سے واپس آ گئے، راحیلہ بیگم چائے کے ساتھ بسکٹ بھی لے آئیں تھیں اور ایک پلیٹ میں پکوڑے بھی رکھے تھے۔
تینوں چائے بھی پی رہے تھے اور باتیں بھی جاری تھیں، ظفر اقبال گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔
''میں تو آپ لوگوں کو یہ بتانے آیا تھا کہ ہم اپنی بیٹی تابندہ کی شادی کر رہے ہیں۔''
''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔'' راحیلہ بیگم جھٹ سے بولیں۔
''ذرا ہمیں بھی تو بتائیں کب ہو رہی ہے شادی؟''
''میں یہی بتانے کے لیے تو آیا ہوں دراصل لڑکے والے بہت زور دے رہے ہیں، میں نے ہی ان کو روکے رکھا کہ ریٹائر ہو جاؤں گا تو شادی ہوگی، اب تو مجھے ریٹائر ہوئے بھی دو سال ہو چکے ہیں، ان کے ہاں سے بار بار پیغام آ رہے ہیں کہ اب وہ مزید انتظار نہیں کر سکتے۔'' ظفر اقبال نے جواب دیا۔
''دیر کس بات کی ہے، یہ نیک کام ہے جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔'' راحیلہ بیگم نے مزید تفصیل چاہی۔
''مجھے ریٹائرمنٹ پر جو رقم ملی تھی وہ میں نے آپ لوگوں کو دے دی تھی تاکہ آپ رہنے کی جگہ بنا سکیں، اب وہ پیسے مل جائیں تو میں اپنی تیاری مکمل کر سکوں گا، آخر زیورات، کپڑا، فرنیچر اور دوسری اشیاء بھی تو خریدنا ہیں۔'' ظفر اقبال نے اپنا مدعا بیان کیا تو ارشد علی بولے۔
''پیسوں کے لیے تم بے فکر رہو، میری پنشن کے تمام کاغذات تقریباً مکمل ہی ہیں۔ دو چار روز میں جیسے ہی مجھے پیسے ملیں گے میں خود پہنچا دوں گا۔''
ارشد علی کی بات سن کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے، انہیں کھڑا ہوتے دیکھا تو راحیلہ بیگم نے دریافت کیا۔
''بھائی صاحب! آپ اٹھ کیوں گئے؟''
''بس اب میں چلتا ہوں، گھر میں میرا انتظار ہو رہا ہوگا'' ظفر اقبال نے جواب دیا۔
''کھانا کھائے بغیر تو ہم نہیں جانے دیں گے۔''
''ہاں بھئی کھانا تو کھانا ہی پڑے گا'' ارشد علی نے بھی راحیلہ بیگم کی بات کی تائید کی، مگر ان کے بار بار اصرار پر بھی ظفر اقبال نہ رکے۔



ارشد علی نے دو چار روز کا کہا تھا مگر کئی روز گزر جانے پر بھی انہوں نے کوئی خبر نہیں دی تھی، ان کے نہ آنے سے ظفر اقبال کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اس لیے وہ ایک بار پھر ارشد علی کے ہاں جا پہنچے۔
''میں آج تمہارے ہاں جانے ہی والا تھا اچھا کیا جو تم آ گئے، دراصل کاغذات تو مکمل ہی ہیں مگر...... پیسے نہیں مل سکے، تم اطمینان رکھو کل نہیں تو شاید پرسوں ہر حال میں مجھے پیسے مل جائیں گے اور تم سے جو قرض لیا تھا وہ لوٹا دوں گا۔'' ارشد علی نے کہا۔
''نہیں نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں، کئی روز سے تم نے کوئی خبر ہی نہیں دی، میں اس لیے چلا آیا تھا'' وہ قرض کی رقم واپس لینے آئے تھے مگر وہاں سے اس امید پر خالی ہاتھ لوٹنا پڑا تھا کہ چلو ایک دو دن اور انتظار سہی۔



ایک ماہ گزر گیا مگر ارشد علی نہ آئے تو ظفر اقبال ایک بار پھر ان کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے، جب انہوں نے پیسوں کی بات کی تو وہ جھٹ سے بولے۔
''بس تمہیں مزید انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ مجھے دفتر کی طرف سے جو رقم ملنی تھی وہ مل گئی ہے، میں کل

ہی بینک سے رقم نکلوا کر تمہاری رقم لوٹا دوں گا۔ تم بے فکر ہو کر لڑکے والوں کے ساتھ شادی کی تاریخ طے کر لو۔"

"میں نے تمہارے کہنے پر شادی کی تاریخ تو پہلے ہی طے کر دی تھی۔ ذرا مہربانی کر کے کل پیسے لے آنا، مجھے ابھی بہت سے انتظامات کرنا ہیں۔"

ظفر اقبال کرسی پر سے اٹھتے ہوئے بولے۔

"تم بے فکر رہو اور گھر جا کر سکون کی نیند سو جاؤ، کل شام سے پہلے رقم تمہارے ہاتھوں میں ہو گی۔"

وعدے کے مطابق اگلے روز ارشد علی کو ظفر اقبال کے ہاں آنا چاہیے تھا، رات گئے تک ظفر اقبال ان کے انتظار میں بیٹھے رہے مگر وہ نہ آئے۔ اگلا دن بھی انہوں نے اسی انتظار میں گزار دیا تھا کہ شاید کسی وجہ سے ارشد علی کل نہ آ سکا ہو اور آج آ جائے لیکن پچھلے روز کی طرح وہ انتظار ہی کرتے رہ گئے اور ارشد علی نہ آئے۔

اگلی صبح ظفر اقبال، ارشد علی کے ہاں پہنچے تو گھر کے اندر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ٹوٹی ہوئی دو کرسیوں اور پرانے میز کی جگہ بہترین صوفہ سیٹ رکھا تھا، بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کی جگہ رنگین ٹیلی ویژن موجود تھا، فرش پر نگاہ ڈالی تو پلستر کیے ہوئے اینٹوں کے فرش کی بجائے خوبصورت اور قیمتی قالین بچھا ہوا تھا، کمرے کے پردے، فرنیچر اور برتن تک ہر چیز نئی دکھائی دے رہی تھی۔

ظفر اقبال ان تمام تبدیلیوں کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ وہ ارشد علی کی آواز پر چونک گئے۔

"تم اس قدر حیرانی سے ان چیزوں کو کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ نہیں رہا بلکہ سوچ رہا ہوں کہ میں کہیں کسی غلط گھر میں تو نہیں گھس آیا؟" انہوں نے بدستور حیرانی سے ان اشیاء کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اللہ کے ذمے

حضرت مبارک بن فضالہؒ ایک روز عباسی بادشاہ المنصور کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اس نے ایک مجرم کو قتل کرنے کا حکم دیا مبارک فضالہؒ نے کہا۔

"امیر المومنین میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے" قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک منادی صدا دے گا کہ اللہ تعالیٰ کے ذمے جن لوگوں کا اجر ہو وہ کھڑے ہو جائیں۔ اس وقت کوئی کھڑا نہ ہو گا سوائے اس شخص کے جس نے کسی کو معاف کیا ہو۔"

یہ سن کر منصور نے کہا "اس شخص کو آزاد کر دو۔"

سائرہ پروا علی ... مرغائی راجن پور

"آئے تو تم صحیح جگہ پر ہو مگر یہ سامان جو تم دیکھ رہے ہو وہ نیا ہے۔ دراصل راحیلہ کی ایک عرصے سے خواہش تھی کہ گھر میں یہ چیزیں تو ہونی چاہئیں اور پھر الیاس بھی بار بار کہتا تھا کہ جب اس کے کالج کا کوئی دوست ان ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر آ کر بیٹھتا ہے تو اسے بہت شرم محسوس ہوتی ہے، بس پھر کیا تھا میں نے سوچا اور کام تو ہوتے ہی رہیں گے پہلے یہ کام کر لیا جائے۔ ابھی کل ہی ہم سارا سامان خرید کر لائے ہیں اور جب تک ماں بیٹے نے ہر چیز کو اپنی جگہ سیٹ نہیں کر لیا سوئے نہیں۔" ارشد علی نے بڑی شان سے بتایا۔

"یہ تو بہت اچھا کیا کیونکہ یہ سب نہ ہو تو زندگی نامکمل سی لگتی ہے۔" ظفر اقبال نے طنز کی۔

وہ ظفر اقبال کے طنز کو سمجھ گئے تھے، جلدی سے کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے بولے۔

"میں یہ سب چیزیں خریدنے میں اس قدر مصروف رہا کہ تمہارے ہاں بھی نہ جا سکا۔ دراصل ہوا یہ کہ میں بینک گیا تو وہاں بہت رش تھا، اس لیے

مجھے خالی ہاتھ واپس آنا پڑا۔ پلیز جہاں اتنے دن صبر کیا ہے وہاں ایک دن...... صرف ایک دن میری خاطر اور صبر کرلو، میرا وعدہ ہے کل شام سے پہلے تمہیں بہر صورت رقم مل جائے گی۔"



اگلے روز شام تک انتہائی بے چینی کے عالم میں ظفر اقبال، ارشد علی کا انتظار کرتے رہے لیکن جب وہ نہ آئے تو انہوں نے ایک بار پھر ان کے دروازے پر جا کر دستک دی، دوبارہ دستک دینے پر بھی جب دروازہ نہ کھلا تو تیسری بار انہوں نے قدرے زور سے دستک دی۔ اس بار تھوڑا سا دروازہ کھل گیا تھا دروازے پر راحیلہ بیگم تھیں انہیں دیکھ کر کہنے لگیں۔

"بھائی صاحب! آپ ہیں آئیے اندر آ جائیے' مگر...... الیاس کے ابو تو گھر پر نہیں ہیں۔"

ظفر اقبال ارشد علی کی آواز پہلے ہی سن چکے تھے وہ غصے سے کانپتے ہوئے چیخے۔

"کون کہتا ہے کہ ارشد علی گھر پر نہیں، میں نے خود اپنے کانوں سے اس کی آواز سنی ہے......" یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک دھکے سے زبردستی دروازہ کھلوایا اور اندر گھس گئے جہاں ارشد علی صوفے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کررہے تھے۔

"آپ تو کہہ رہی تھیں کہ الیاس کے ابو گھر پر نہیں...... یہ کیا اس کا سایہ تھا جو مجھے دیکھ کر صوفے کے پیچھے چھپ گیا ہے۔" انہوں نے راحیلہ بیگم سے کہا۔

اب ارشد علی کے لیے کوئی چارا نہ تھا اس لیے وہ صوفے کے پیچھے سے نکل کر ظفر اقبال کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"آج کچھ بھی ہو میں اپنی رقم لے کر ہی جاؤں گا۔" ظفر اقبال نے فیصلہ کن انداز میں بات کی۔

"کس رقم کی بات کررہے ہو تم......؟" ارشد علی نے سوال کیا۔

"وہی چار لاکھ روپے جو تم نے مجھ سے قرض لے کر یہ مکان بنوایا تھا۔"

"کون سے چار لاکھ' کون سا قرض؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔" ارشد علی نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"اوہ...... تو یہ بات ہے' سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں دفتر سے ریٹائرمنٹ پر جو رقم ملی تھی وہ تم نے اس مکان کی آرائش اور اپنی جھوٹی شان کے لیے خرچ کر ڈالی لیکن میں آج اپنی رقم لیے بغیر یہاں سے نہیں ہلوں گا۔ یاد کرو وہ دن جب تم روتے ہوئے میرے پاس آئے تھے اور میں نے اپنی بیوی کے لاکھ منع کرنے پر بھی اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی تمہارے حوالے کردی تھی تاکہ تم یہ مکان بنا کر سکھ کا سانس لے سکو۔"

"بس کرو ظفر اقبال بہت ہوچکی' کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ میں نے تم سے چار لاکھ روپے قرض لیا تھا؟"

"ثبوت...... کون سا ثبوت دوں تمہیں' کیا تم نے مجھ سے قرض نہیں لیا تھا؟" ظفر اقبال نے غصے اور حیرانی کے عالم میں دریافت کیا۔

"میں نے تم سے کوئی قرض نہیں لیا۔" ارشد علی نے صاف انکار کردیا۔

"اتنی گھٹیا بات مت کرو' میری بیٹی کا بیاہ سر پر ہے۔"

"ارے کمینے اور گھٹیا تو تم ہو' میں پوچھتا ہوں کیا سوچ کر ہر روز یہاں منہ اٹھائے چلے آتے ہو، یہ میرا گھر ہے، تمہارے باپ کا نہیں اور نہ ہی کوئی ہوٹل یا سرائے ہے کہ جب جی چاہا چلے آئے۔"

دونوں میں دیر تک گرما گرم بحث ہوتی رہی،

ارشد علی اس بات سے مسلسل انکاری تھے کہ انہوں نے کوئی قرض لیا ہے، راحیلہ بیگم نے جب کوئی بات بنتی نہ دیکھی تو ظفر اقبال کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔

"آپ دونوں ہی اس وقت غصے میں ہیں۔ خدا کے لیے اس وقت چلے جائیں پھر کبھی سکون سے بیٹھ کر بات کر لیجیے گا۔"

❀......❀......❀

اس وقت تو جیسے تیسے راحیلہ بیگم نے ظفر اقبال کو راضی کر کے واپس جانے پر مجبور کر دیا تھا مگر اگلے ہی روز وہ پھر وہاں جا پہنچے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی ارشد علی برس پڑے۔

"ذلیل آدمی...... پھر آ گئے ہو۔"

"منہ سنبھال کر بات کرو، میں اپنی رقم واپس لینے آیا ہوں، کوئی خیرات مانگنے نہیں آیا۔"

"ذرا ٹھہرو، ابھی دیتا ہوں تمہیں رقم۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے، ظفر اقبال سمجھے کہ وہ پیسے لینے گئے ہیں لیکن جب وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں تیز دھار چاقو تھا، ان کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر ظفر اقبال تیزی سے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوئے۔

ہاتھ میں چاقو لیے ارشد علی کو ظفر اقبال کی طرف بڑھتے دیکھ کر راحیلہ بیگم اور الیاس انہیں روکنے کے لیے دوڑے تھے مگر ان دونوں کے پہنچنے سے پہلے ہی ارشد علی وار کر چکے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ظفر اقبال زمین پر گر پڑے اور ان کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ انہوں نے غصے سے بے قابو ہو کر انہیں موت کی نیند سلا دیا تھا مگر جب لاش دیکھی تو ان کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا، اب انہیں غصے کی جگہ پچھتاوا ہو رہا تھا، ان کا ضمیر انہیں ملامت کرنے لگا تھا لیکن وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا، وہ خاموشی سے گھر سے نکلے اور

> اسے مسکراؤ تا......!
>
> ایک بوڑھی عورت کسی گھر میں تعزیت کے لیے گئی گھر سے نکلتے وقت اس کی نظر ایک کونے میں پڑے مریض پر پڑی۔ اسے دیکھتے ہی وہ واپس پلٹی اور گھر والوں سے بولی۔
>
> "بڑھاپے کی وجہ سے میرے لیے چلنا پھرنا مشکل ہے لہٰذا ان صاحب کی بھی ابھی تعزیت کر دیتی ہوں۔"
>
> نفیسہ حبیب...... بستی اوریٹہ

پولیس اسٹیشن جا کر خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

ظفر اقبال کے اہل خانہ اس دردناک واقعہ سے بے خبر تھے، انہیں ان کے بارے میں تفتیش کے لیے آئے ہوئے پولیس اہلکار کی زبانی قتل کی اطلاع موصول ہوئی، یہ جان کر مقتول کی بیوی اور بچے دھاڑیں مار کر رونے لگے، انہیں کیا معلوم تھا کہ ان پر یوں اچانک قیامت ٹوٹ پڑے گی۔

مقدمہ چلا...... ارشد علی اعتراف جرم کر چکے تھے اس لیے مزید کوئی گنجائش نہ تھی، عدالت نے انہیں سزائے موت سنا دی تھی، ارشد علی چاہتے تھے کہ انہوں نے قتل جیسا سنگین جرم کیا ہے، اسے ان کی سزا بھی ضرور ملنی چاہیے جبکہ راحیلہ بیگم رحم کی اپیل کرنا چاہتی تھیں۔

❀......❀......❀

رات کا وقت تھا، حلیم اور تابندہ سو رہے تھے مگر شاہدہ بیگم ابھی تک جاگ رہی تھیں، کوئی دروازے پر مسلسل ہلکی ہلکی دستک دے رہا تھا، وہ حیران تھیں کہ اتنی رات گئے ان کے ہاں کون آ سکتا ہے؟ انہوں نے دروازہ کھولا تو وہاں راحیلہ کو کھڑے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"تم...... تم اب یہاں کیا لینے آئی ہو؟ ہمارا سب کچھ تو لوٹ لیا تم لوگوں نے، اب کیا باقی رہ گیا ہے

ہمارے پاس۔"

"بہن! مجھے غلط نہ سمجھیں میں تو یہاں سوالی بن کر آئی ہوں۔"

"مگر...... ہمارے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں، جن قدموں سے آئی ہو انہی قدموں سے واپس چلی جاؤ۔"

"جو کہنا ہے کہہ لیجیے، جو کچھ ہوا اس کی سزاوار میں ہوں، میں نے ہی ارشد کو قرض کی رقم واپس دینے سے انکار کرنے کو کہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ بات یہاں تک پہنچ جائے گی۔ بہن! اب میرا سہاگ آپ کے ہاتھ میں ہے، میرا سہاگ اجڑنے سے بچالیں، میرا بچہ یتیم ہو جائے گا۔" راحیلہ بیگم بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

"ارے یتیم تو میرے بچے بھی ہوئے ہیں، بیوہ تو میں بھی ہوئی ہوں، تمہیں بھی تو پتہ چلے کہ بیوہ کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ گھر کا سہارا اٹھ جائے تو کس طرح سسک سسک اور تڑپ تڑپ کر شب و روز گزرتے ہیں۔"

"ایسا نہ کہیے اگر انہیں پھانسی ہوگئی تو ہم جیتے جی مرجائیں گے۔ خدا کے لیے انہیں معاف کر دیجیے۔ زندگی بھر اس احسان کے لیے ہم آپ کے پاؤں دھو دھو کر پیتے رہیں گے۔" یہ کہتے ہوئے راحیلہ بیگم شاہدہ بیگم کے قدموں میں گر پڑیں۔

"یہ آنسو کہیں اور جاکر بہاؤ، یا جب خاوند کا مردہ جسم آئے تو بہالینا، مجھ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہونے والا۔" شاہدہ بیگم نے یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔



جب سے ظفر اقبال قتل ہوئے تھے اس روز سے گھر کا کوئی بھی فرد ان کے کمرے میں نہیں گیا تھا، اس کمرے کو مقفل کر دیا گیا تھا، آج قتل کے کئی روز بعد راحیلہ بیگم نے آکر شاہدہ بیگم کو بے قرار کر دیا تھا، تالا کھول کر وہ اندر داخل ہوئیں اور دیر تک کھڑی وہاں لگی ظفر اقبال کی تصویروں کو دیکھتی رہیں اچانک ان کی نظر تپائی پر رکھے ایک تہہ کیے ہوئے کاغذ پر پڑی انہوں نے کاغذ اٹھالیا اور اسے کھول کر پڑھا۔ یہ مقتول کی تحریر تھی جو ٹھیک قتل کے دن لکھی گئی تھی۔ جس میں تحریر تھا......

"میں...... آج اپنے بچپن کے ساتھی اور دوست ارشد علی کے گھر قرض کی واپسی کے لیے جا رہا ہوں، اس مقصد کے لیے کئی بار پہلے بھی اس کے پاس جا چکا ہوں مگر وہ ہر بار ٹال جاتا ہے، اب حالات ایسے پیدا ہوگئے ہیں کہ ڈرتا ہوں کہیں وہ مجھے جان سے ہی نہ مار ڈالے اگر ایسا ہوا تو شاید عدالت اسے پھانسی کی سزا سنادے مگر میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو کیونکہ خدا کے بعد گھر والوں کا وہی سہارا ہے اگر ان کا یہ سہارا بھی چھن گیا تو اس کی بیوی اور بیٹا بے موت مارے جائیں گے، اس لیے میں اسے معاف کرتا ہوں، میں اپنے اہل خانہ کو بھی وصیت کرتا ہوں کہ وہ بھی اسے معاف کر دیں۔ امید کرتا ہوں کہ میری بیوی اور بچے اسے میری آخری خواہش سمجھ کر ضرور پوری کریں گے اور پھر خدا تعالیٰ بھی معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

تحریر پڑھ کر شاہدہ بیگم بری طرح کانپتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبتی چلی گئی تھیں۔ ان سے فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ خاوند کی آخری خواہش سمجھ کر ارشد علی کو معاف کر دیں یا انہیں پھانسی چڑھ جانے دیں۔

روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

سعدیہ سکندر

جواب:۔ رشتے کے لیے بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74'70 مرتبہ۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

ہر نماز کے بعد 9'9 مرتبہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔

باقی اپنے دونوں مسئلوں کے لیے اچھے طبیب سے رجوع کریں۔

سعدیہ تارڑ...... حافظ آباد

جواب:۔ بعد نماز عشاء ایک تسبیح یا فتاح اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ کامیابی کے لیے دعا کریں۔

ہر نماز کے بعد یا قوی سر پہ ہاتھ رکھ کر 11 مرتبہ پڑھا کریں۔

روبینہ یاسمین...... کراچی

جواب:۔ مسئلہ 1:۔ بعد نماز عشاء 3 مرتبہ سورۃ جن پڑھ کر ایک بوتل پانی پہ دم کرلیں۔ وہ پانی گھر کے سب افراد پئیں۔ یہ عمل روزانہ کرنا ہے۔

مسئلہ 2:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔

صفیہ بی بی...... اسلام آباد

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ کر دعا کریں۔

بعد نماز عشاء یا عدم 313 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود ابراہیمی پڑھ کر اپنے زمین والے مسئلے کے لیے دعا کریں۔

بھائیوں پر سختی کریں۔

شمائلہ ناز...... وہاڑی

جواب:۔ بعد نماز عشاء سورۃ والضحیٰ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ پڑھتے وقت یہ تصور ہو کہ گھر کی ذمہ داریوں کا احساس ہو رہا ہے اور دل میں گھر والوں کی محبت پیدا ہو رہی ہے۔

مہوش کنول...... شور کوٹ

جواب:۔ ہر فرض نماز کے بعد سر پہ ہاتھ رکھ کر 11 مرتبہ یا قوی پڑھا کریں اور تین مرتبہ آیتہ الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا کریں۔

مغرب اور عشاء کی نماز کے بعد 21'21 مرتبہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ کر دم کیا کریں۔ اثرات نہیں رہیں گے۔ گھر کے سب افراد کریں۔

ن۔ ک۔ نور...... چکوال

جواب:۔ سورۃ مائدہ والی آیت رات عشاء کی نماز کے بعد پڑھنی ہے اور یہ وظیفہ آپ کی بہن کرے۔ (جب تک مسئلہ حل نہ ہو جائے)۔

آپ رات کے وقت جب شوہر سو جائیں ان کے پائنتی کھڑے ہو کر یا ممیت 313 مرتبہ پڑھیں۔ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود ابراہیمی پڑھ کر ان پر دم بھی کریں اور ایک گلاس پانی پر بھی۔ صبح نہار منہ ان کو پلائیں۔ تصور یہ ہو کہ بری عادات چھوٹ جائیں اور لڑکی سے نفرت ہو جائے۔

محمد نعمان...... سکھر

جواب: دوا لیتے رہیں۔ تین مرتبہ سورۃ جن، سات مرتبہ سورۃ مزمل، اول و آخر 11/11 مرتبہ درود شریف۔ تیل پہ دم کرلیں اور روزانہ سر کی اچھی طرح مالش کریں اور وہ پانی زیادہ زیادہ استعمال کریں، اس میں اور پانی ملاتے جائیں یہ عمل ایک دفعہ ہی پڑھنا ہے اور پانی، تیل تین مہینے تک استعمال کرنا ہے۔

ثروت انصاری......

جواب: بہتر یہی ہے کہ استخارہ خود کریں یا کسی اور سے کروالیں۔

راجہ محمد عباس بھٹی......

جواب: صدقہ دیں مرغی' بکرے کا جو حسب توفیق ہو (نیت جو رکاوٹ ہے وہ دور ہوجائے ویزا کیس میں) یہی وظیفہ جاری رکھیں جب تک وہاں پہنچ نہیں جاتی آپ کی بیوی۔

فرزانہ انجم......

جواب: فجر والا وظیفہ جاری رکھیں' صدقہ دیتی رہا کریں۔

سمیرا خان......سعودیہ عرب

جواب: ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کریں 11 مرتبہ اور اللہ سے مانگا کریں اس کے معنی بھی ذہن میں رکھیں (رب حب لی ... دعا) سورۃ آل عمران آیت نمبر 38' اس کے علاوہ جتنا ہوسکے یہ دعا پڑھتے رہا کریں آپ دونوں۔ ان شاء اللہ آپ کی اس دعا کی برکت سے مراد پوری کرے گا' خلوص کے ساتھ پڑھیں' زنجوارا کا استعمال کریں رات کو تین دنوں تک۔

ماہ رخ عبدالکریم......

جواب: رشتے کے لیے سورۃ فرقان آیت نمبر 74,70 مرتبہ (اول و آخر درود شریف) فجر کی نماز کے بعد۔ بیٹے کے لیے آپ دعا کیا کریں اللہ ماؤں کی سنتا ہے۔

راحیلہ......مقام نامعلوم

جواب: عشاء کی نماز کے بعد ایک تسبیح استغفار اور ایک درود شریف۔ آپ کے مسئلے کا حل اسی میں ہے رشتے کے لیے 100 مرتبہ استغفار اور درود شریف کی تسبیح کرکے دعا کریں اپنے رشتے کے لیے۔

سید اکبر علی سبزواری......کینیڈا

جواب: آپ نماز کی پابندی کریں' فجر اور مغرب میں 21/21 مرتبہ آیۃ الکرسی' سورۃ اخلاص' سورۃ الفلق' سورۃ الناس پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔ ایک بوتل پر بھی دم کرلیں اور وہ والدہ اور بچے کو پلائیں۔

2) رات کو سونے سے پہلے 11 مرتبہ سورۃ عبس پڑھتے وقت اپنی جاب کا ذہن میں رکھیں' سب معاملات ٹھیک ہورہے ہیں۔ تین مہینے تک یہ عمل کرنا ہے آپ ذہنی طور پر زیادہ بیمار ہیں' اثرات بھی ہیں۔

صفیہ تسیم......امریکہ

جواب: صدقہ دیں۔ فجر کی نماز کے بعد سورۃ فرقان آیت نمبر 74,70 مرتبہ اول و آخر درود شریف پڑھیں اور دعا بھی کریں۔



http://facebook.com/elajbilquran
www.elajbilquran.com

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail @ gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے اگست 2014ء

نام ...... والدہ کا نام ...... گھر کا مکمل پتا ......

......

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پذیر ہیں ......

خوشبوئے سخن

عنبر اسرار

سوچیں پتھر بن جاتی ہیں

رشتے بدلنے سے
محبتیں بکھرنے سے
سوچیں پتھر بن جاتی ہیں
پھولوں کے موسم میں، پھولوں کے کھلنے سے
سوچیں پتھر بن جاتی ہیں
بارشوں کے موسم، بارشیں برسنے سے
سوچیں پتھر بن جاتی ہیں
ساعتیں گزرنے سے
عمروں کے ڈھلنے سے
سوچیں پتھر بن جاتی ہیں
تیرہ شبوں کی راتوں میں
سپنوں کے ٹوٹنے سے
سوچیں پتھر بن جاتی ہیں

ریحانہ سعیدہ ۔۔۔۔۔ لاہور

غزل

گزشتہ سارے غموں سے یہ غم زیادہ ہے
کہ میرا بھائی مرے قتل پر آمادہ ہے
الٰہی قائم و دائم رہے یہ میرا وطن
عدو کے دل میں خطرناک جو ارادہ ہے
وہ جس کے سامنے رہتے ہی سرنگوں کوہسار
ابھی بھی قوم کے دل میں وہی ارادہ ہے
ہیں جس کے دم سے دلوں میں بیداریاں قائم
نظر کے سامنے منظر وہ ایستادہ ہے
اساتذہ کے ہم نقش قدم پہ چلتے ہیں
ہماری شاعری کیا ہے بس استفادہ ہے
مری نظر میں تو یہ بھی بہت غنیمت ہے
جو تار تار بدن پر مرے لبادہ ہے

ہیں سب ہی غیر ضروری وضاحتیں نیر
ہم سادہ لوگ ہیں انداز سخن سادہ ہے

نیر رضا ولی ۔۔۔ کراچی

غزل

غم میں مسکرانا فن ہے گر تو میں فنکار ہوں یارو
بظاہر مسکراتا ہوں مگر بیزار ہوں یارو
لبادہ خوش مزاجی کا کہ پوشیدہ جس میں لاکھوں دکھ
یوں سمجھو پھولوں کی محفل میں ایک خار ہوں یارو
نظریہ ضرورت کے تحت مجھ سے محبت تھی اس کی
آہ، میری یہ خوش فہمی کہ میں اس کا پیار ہوں یارو
وہ وقت رخصت اس کا جو وعدہ واپسی کا تھا
وہی وعدہ ہے میرے پاس سراپا انتظار ہوں یارو
دلیلیں تھیں نہ وضاحتیں تھیں میرے ہونٹوں پر تالے تھے
میری خاموشی اسے یہ کہہ گئی کہ میں گناہ گار ہوں یارو
نظروں کو جھکایا بھی خود کو بچایا بھی مگر حیران ہوں اب تک
لوگ کیسے جان جاتے ہیں عشق کا بیمار ہوں یارو
یہ اس کی ہی کرامت ہے فاروق ورنہ تو پاگل پن
کی سب رشتے ہی رکھتا ہوں اور نادار ہوں یارو

عمر فاروق ارشد ۔۔۔۔۔ فورٹ عباس

غزل

حسرت وصل ابھی اور بڑھا سکتی ہے
زندگی گھر سے مجھے دشت میں لا سکتی ہے
تجھ کو امید ہے جھولی میں ثمر ڈالے گی
تیز آندھی ہے کوئی پیڑ گرا سکتی ہے
اور تو کوئی نہیں بعد مرے یاں لیکن
اک خموشی ہے جو آواز لگا سکتی ہے
یہ مری خاک نشینی اے مرے رب جہاں
عین ممکن ہے کسی کام بھی آ سکتی ہے
تم جسے دیکھنے آئے ہو بصد شوق نشاط
اس تماشے میں مری جان بھی جا سکتی ہے

احمد نشاط ۔۔۔۔۔ سرگودھا

غزل

جو ہم نے کاغذ پر اک سمندر بنا دیا تھا
ہوا نے آتے ہی وہ ندی میں بہا دیا تھا
وصال رت میں اگے ہوئے اک ہرے شجر کو
فراق رت کی تمازتوں نے جلا دیا تھا
نکل نہ آتا میں گھر سے باہر تو مر ہی جاتا
کسی کی یادوں نے حبس اتنا بڑھا دیا تھا
اندھیری راتوں نے تیرے ہونے کی بات کی تھی
حسین ستاروں نے مجھ کو تیرا پتا دیا تھا
نے نہیں ہیں جو تو نے آنسو عطا کیے ہیں
تیرے رویے نے کل بھی مجھ کو رلا دیا تھا

فاروق ماہر......سرگودھا

غزل

سارے عالم سے جدا ہو جیسے
پھول نغمہ کہ صبا ہو جیسے
سوکھے پتوں پہ یہ بارش کی جھلک
میرے نغموں کی صدا ہو جیسے
یوں تیری یاد کی خوش بو آئی
پھول آنگن میں کھلا ہو جیسے
مجھ کو محسوس ہوا ہے اکثر
تو مجھے دیکھ رہا ہو جیسے
یوں تجھے یاد میں کرتا ہوں جمال
تو مجھے بھول گیا ہو جیسے

سمیع جمال......کراچی

غزل

آشیاں میرا جل نہ جائے کہیں
ورد شعاعوں میں ڈھل نہ جائے کہیں
آج وعدہ کیا ہے پھر اس نے
آج سنگدل بدل نہ جائے کہیں
ایک مدت کے بعد دیکھا ہے
دل ہمارا مچل نہ جائے کہیں
اتنی شدت سے پیار مت کرنا
دم ہمارا نکل نہ جائے کہیں

اب تو دے دو سکون رانا کو
عمر یہ تیری ڈھل نہ جائے کہیں

قدیر رانا......راولپنڈی

غزل

وہ حرف حرف محبت کہانیوں میں رہا
سدا وہ میرے لہو کی روانیوں میں رہا
سفینہ آ کر کنارے پر ٹوٹ پھوٹ گیا
بچا ہوا تھا وہ جب گہرے پانیوں میں رہا
ابھی تلک ہے جو بوڑھوں کی ذات میں پنہاں
وہ ولولہ بھی کہاں اب جوانیوں میں رہا
وہ ایک شخص کہ سچی محبتوں کا محل
زمانے بھر کی وہ زندہ نشانیوں میں رہا
جو اعتبار کے پیکر تھے یارا ترے لیے
ترا دھیان فقط بدگمانیوں میں رہا
مٹا کے رکھ دیا اپنا وجود بھی اس نے
وہ شخص عمر بھر جو کھینچا تانیوں میں رہا
وہ ایک گوہر نایاب بن گیا ہے قمر
محیط درد کی جو بے کرانیوں میں رہا

ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

غزل

نہ وہ ملتے نہ ہی دل دکھاتے
نہ پھول چاہتوں کے یوں کبھی مرجھاتے
تھی آرزو اس سے ملاقات کی
وہ اقرار کرتے ہم روز بھول جاتے
تنکے میرے آشیاں کے اے مہرباں
تیری دید کے لیے ہمیشہ دیپ جلاتے
سوچوں کے گہرے سمندر میں ڈوبے رہے ہم
دل سے نفرتوں کے داغ ہم کیسے مٹاتے
مجھے دیکھ کر وہ رخ بدل گئے جاوید
جو ساتھ رہ کر بھی میرے دل کو جلاتے

اسلم جاوید......فیصل آباد



عفان احمد

حدیث مبارکہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس بہترین دن میں سورج طلوع ہوتا ہے وہ جمعہ کا دن ہے۔ جس میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے۔ جس دن حضرت آدم علیہ السلام جنت میں گئے اور جس دن جنت سے خارج کیے گئے اور قیامت بھی جمعے کے دن قائم ہوگی۔"

(سنن ابوداؤد)

انتخاب: حسن اختر...... ناظم آباد

نایاب موتی

- گلاب کا نام خوشبو کے پودوں پر سفر کرتا ہے گلاب ذات ہے اور خوشبو صفت، ذات اپنی صفات کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔
- وہ چیز جو بے سوال کردے وہ لاجواب ہوتی ہے۔
- شکر کرو نعمت محفوظ ہو جائے گی
- دستر خوان کشادہ کرو رزق بڑھ جائے گا
- سجدہ کرو قرب ملے گا
- عزت کرو عزت ملے گی
- صدقہ دو بلا ٹل جائے گی
- توبہ کرو گناہ معاف ہو جائے گا
- رزق صرف یہی نہیں کہ جیب میں مال ہو، بلکہ آنکھوں کی بینائی بھی رزق ہے۔ دماغ میں خیال رزق ہے دل کا احساس رزق ہے رگوں میں خون رزق ہے یہ زندگی ایک رزق ہے اور سب سے بڑھ کر ایمان بھی رزق ہے۔
- جھوٹا اور بدنصیب ہے وہ مرید جو کسی نقصان کو گرو مانے کے بعد اس کے خلاف کوئی الفاظ منہ سے نکالتا ہے چنانچہ استاد کے خلاف بولنے والا انسان علم سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

انتخاب: مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

ایک مال دار بخیل کا قصہ

ایک مال دار بخیل کا لڑکا بیمار تھا خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ اس کی تندرستی کے لیے قرآن شریف کا ختم ہونا چاہیے یا جانور کی قربانی کا صدقہ ہونا چاہیے۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور کہا: قرآن مجید کا ختم زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ بکریوں کا ریوڑ دور جنگل میں چلا گیا ہے لانے میں دشواری ہوگی۔ ایک اللہ والے نے یہ بات سنی اور فرمایا: اس کو ختم قرآن اس لیے پسند آیا کہ قرآن اس کی زبان پر ہے اور مال و زر کی محبت اس کے دل میں گھسی ہوئی ہے۔

(گلستان ص ۱۸۱)

فائدہ: مالی عبادت کی استطاعت ہوتے ہوئے بدنی عبادت پر اکتفا افسوس ناک ہے اگر مالی عبادت کی گنجائش ہو تو اس میں دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

بہادر خان آفریدی...... کوہاٹ

حسد سے بڑا گناہ

حضرت سعدی بیان فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں، میں مدرسہ نظامیہ بغداد میں پڑھتا اور پڑھاتا تھا میرا ایک ساتھی میرے حسن بیان اور شگفتہ تقریر کے باعث مجھ سے بہت حسد کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اپنے استاد محترم سے کہا کہ فلاں شخص میرے لیے پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ وہ میرے کمال کے باعث مجھ سے حسد کرتا ہے۔

استاد محترم نے یہ بات سن کر ناخوشی کا اظہار فرمایا اور کہا۔ "حیرت ہے تو اس کے گناہ سے تو آگاہ ہو گیا کہ وہ حسد کرتا ہے لیکن اپنے بارے میں تو نے سوچا کہ تو بھی غیبت جیسے گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے اگر اس حاسد نے دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنایا ہے تو دوسرے راستے سے تو بھی وہیں پہنچ رہا ہے۔"

حکایات: بوستان سعدی

اسد رضوان...... کراچی

اقبال بزم

کسی اعلیٰ عہدے پر فائز افسر کی گھڑی گم ہو گئی وہ

بہت پریشان ہوئے اور جب گھڑی نہ ملی تو انہوں نے گھڑی کی گمشدگی کی تھانے میں رپورٹ درج کرادی۔ پولیس نے پرجوش کارکردگی میں دن رات ایک کر دیا اور گھڑی کی چوری کے شبے میں بارہ آدمی گرفتار کرلیے اور نہایت شدومد سے پوچھ گچھ شروع کردی۔ دوسرے دن شام کو افسر نے پولیس اسٹیشن فون کرتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر صاحب! ہمیں نہایت شرمندگی ہے کہ ہماری گھڑی غسل خانے سے دستیاب ہوگئی ہے۔ ہم نے آپ کو خوامخواہ زحمت دی، ہم بہت شرمندہ ہیں۔"

دوسری طرف سے انسپکٹر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔

"جناب والا! اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے آپ کی گھڑی کے شبے میں ہم نے بارہ آدمی گرفتار کیے تھے۔ آپ کی دعا اور اللہ کے فضل سے اب تک ان میں سے گیارہ نے تو اقبال جرم کرلیا ہے باقی رہا ایک تو اللہ نے چاہا رات تک وہ بھی اقبال جرم کرلے گا۔"

کامران علی...... لاہور

اخلاق

سب سے وزنی چیز جو قیامت کے دن مومن کے میزان میں رکھی جائے گی وہ اس کا حسن اخلاق ہوگا۔

اقصیٰ نور...... کراچی

دوست

اپنی زندگی میں ایسے دوستوں کو شامل کرو جو کبھی آئینہ اور کبھی سایہ بن جائیں کیونکہ آئینہ جھوٹ نہیں بولتا اور سایہ ساتھ نہیں چھوڑتا۔

ارشاد علی...... برنالی

انتظار

ایک پاگل دوسرے سے "یار اگر کوئی ہاتھی درخت پر چڑھ جائے تو اترے گا کیسے؟"

دوسرا پاگل "یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے کسی پتے پر بیٹھ کر خزاں کا انتظار کرے گا۔"

قرۃ العین...... دراہن کلاں

خوب صورت باتیں

- جب آدم کی اولاد سے حیا، مروت، خلوص اور پاکی اٹھ جائے تو وہ انسان کی بجائے صرف مٹی ہی رہ جاتے ہیں اور بھلا مٹی سے امیدیں کیسی؟
- رشتے اور سودے میں بہت فرق ہے رشتے قائم کیے جاتے ہیں اور سودے طے کیے جاتے ہیں۔

جاوید یوسف...... راولپنڈی

کھانے کا اسلامی طریقہ

- پہلے لقمہ پر بسم اللہ دوسرے سے قبل بسم اللہ الرحمن اور تیسرے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھیے۔
- بسم اللہ زور سے پڑھیے تاکہ دوسروں کو بھی آواز آجائے۔
- یاواجد...... جو کوئی کھانا کھاتے وقت ہر نوالہ پر پڑھا کرے گا تو ان شاء اللہ اس کے پیٹ میں نور پیدا ہوگا اور بیماری دور ہوگی۔
- مٹی کے برتن میں کھانا افضل ہے۔
- سالن یا چٹنی کی پیالی روٹی پر مت رکھیں۔
- ہاتھ یا چھری کو روٹی سے نہ پونچھیے۔
- زمین پر دسترخوان بچھا کر کھانا سنت ہے۔
- ٹیک لگا کر ننگے سر لیٹے لیٹے یا چوکڑی مار کر کھانا مت کھائیے۔
- اول آخر نمک یا نمکین کھائیے اس سے بیماریاں دور ہوتی ہیں۔
- روٹی ایک ہاتھ سے نہ توڑیے کہ مغروروں کا طریقہ ہے۔
- روٹی الٹے ہاتھ میں پکڑ کر سیدھے ہاتھ سے توڑیے سنت ہے۔
- سیدھے ہاتھ سے کھائیے الٹے ہاتھ سے کھانا پینا لینا دینا شیطان کا طریقہ ہے۔
- کھانا کھانے سے پہلے پھل کھائیے مفید ہے۔

غلام فاطمہ...... ہمیرپال

⌘

قسط نمبر 12

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے...... جور و جبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے ٹکراجاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانۂ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ درا صل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے۔ "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں چھایا سا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔

"جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا' آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

"امید کے خلاف۔" سوہن سنگھ بولے۔ "اسے سزا کم ہونے کی امید نہیں تھی۔"

"تب وہ خوش ہوا ہوگا۔" ماں جی کی ممتا متجسس ہو رہی تھی۔

"ہاں، خوش ہوا تھا۔" سوہن سنگھ نصف سچ بولے۔ "وہ ہماری طرح ہمت ہارنے والا نہیں ہے۔" وہ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولے "اور ہاں بہو...... تمہیں اسے کل ملاقات کے لیے جیل جانا ہے میں انتظام کر کے آیا ہوں۔"

چندن کو مسرت ہوئی۔ "ماں جی کو بھی ساتھ لے جاؤں گی۔"

"نہیں جیل والے ایک شخص کو ملاقات کرنے دیتے ہیں۔" سوہن سنگھ نے کہا "اور پھر تمہاری ساس کو لاہور تک کے سفر میں مشکل ہوگی۔ تمہارے لیے میں نے ساتھ تلاش کرلیا ہے۔

ہمارے وکیل کو کاپی لینے کورٹ جانا ہے اس کے ساتھ ہوا نا۔"

"پھر تو آج میں ویرو سے مل آؤں۔" چندن بول اٹھی۔

ماں جی کو یہ بات پسند نہیں آئی جبکہ سسر نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ "کیوں؟"

چندن کچھ ہچکچائی ماں کی جانب ایک نظر دیکھ کر بولی۔ "فیصلے کی خبر دے آؤں۔ بے چاری بے چین ہوگی۔"

دونوں میں سے کوئی کچھ کہے اس سے پیشتر وہ تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ سوہن سنگھ نے جماہی لی اور ماں جی کی آہ نکل گئی۔

❁......●......❁

"جگا تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ سزا کم ہوئی اس کی مسرت کا اظہار کیا مگر جواب نہ دیا۔ جیل کے

افسران متعجب ہو گئے۔ قیدی خوش ہو گئے مگر تم خاموش ہو۔" اودھم سنگھ جیل کی کوٹھری میں ٹہلتے ہوئے جگت کو سنا رہا تھا۔ عدالت سے لوٹنے کے بعد دو دن سے وہ آتش فشاں کی طرح اوپر سے پرسکون مگر اندر سے جوش مار رہا تھا۔ اس کے دل کا حال معلوم کرنے کے لیے اودھم سنگھ نے کوشش جاری رکھی۔ "جگا تم قسمت والے ہو سزا بیس سال سے کم ہو کر دس سال ہو گئی۔"

ٹہلتا ہوا جگا رک گیا۔ اودھم سنگھ اسے بلائے بغیر نہیں مانے گا یہ سوچ کر تیز نظروں سے اس کی جانب دیکھا پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"تمہیں مسرت ہو رہی ہوگی اس کوٹھری میں دس سال دبے رہنے کے بعد بوڑھا ہو کر باہر آؤں گا جب میرے بازوؤں میں طاقت نہیں ہوگی۔ زندگی کا جوش ٹھنڈا پڑ چکا ہوگا پھر اس نے دانت پیس کر کہا۔

"دس سال میں تم جیل والے میری پچاس سال کی طاقت چھین لو گے یہ میں جانتا ہوں۔"

"میں بھی جانتا ہوں کہ تمہارے دماغ میں کیا ہلچل ہو رہی ہے جگا۔" اودھم سنگھ بلند آواز میں بولا۔ پھر آس پاس نظر گھما کر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بیٹا فرار ہونے کی کوشش کرنے والے سو میں سے ایک آدھ زندہ نکل سکے ہیں۔ بقایا لوگوں کے نصیبوں میں جہنم کی تکلیف اور برا انجام لکھا ہوتا ہے۔ فرار ہوتے ہوئے جو پکڑا جاتا ہے اسے کیسی سزا دی جاتی ہے اس کی شاید تمہیں خبر نہیں ہوگی۔ کمر کے گوشت کے لوتھڑے نکل نہیں آتے اس حد تک کمر پر تھپتے ہوئے کوڑے مارے جاتے ہیں۔ پھر اندھیری کوٹھری میں بند کر کے رکھا جاتا ہے جہاں بڑی مشکل سے سانس لی جا سکتی ہے۔ سورج کی روشنی کا وہاں گزر نہیں ہوتا۔ قیدی کو باہر کے کسی فرد کا چہرہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ دروازے کے نیچے سے روٹی پانی دیا جاتا ہے۔ کچھ دن میں ہی آدمی گھبرا کر پاگل ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے ہمت والے قیدیوں کو دیوار سے سر ٹکرا کر ادھ موا ہوتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔" ایک ہی سانس میں مگر دھیمے لہجے میں اودھم سنگھ سب کچھ کہہ گیا۔

جگت پیشانی پر بل ڈالے اسے دیکھنے لگا۔ اسے حیرت ہوئی کہ بھولے بھالے چوکیدار کو کیسے پتا چلا کہ وہ فرار ہونے کی فکر میں ہے۔ ممکن ہے وہ جس قدر سمجھ رہا ہے اودھم اتنا بھولا نہ ہو؟

"مگر چاچا یہ سب آپ مجھے کیوں سنا رہے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں میں ڈر جاؤں گا۔"

"نہیں، تم پچھتاؤ گے ایسا میں مانتا ہوں اسی وجہ سے کہ میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ رو بخش کا نتیجہ تمہیں معلوم ہے۔"

"مجھے خبردار کرنے کے بجائے جیلر کو ہوشیار کیوں نہیں کرتے؟" جگت نے اودھم کو تکتے کے لیے پوچھا مگر چوکیدار خاموش رہا۔

"کیوں میرے سوال کا جواب نہیں دیا آپ نے چاچا؟"

"تمہارے سوال کا جواب۔" اودھم سنگھ نے آہ بھر کر کہا۔

"تم مجھے چاچا کہتے ہو اور میں تمہیں بیٹا کہتا ہوں اسی میں آ جاتا ہے۔" چوکیدار کے گھبرائے ہوئے لہجے میں محبت کی جھلک تھی۔

جگت جھینپ گیا۔ جو شخص اس کی رہائی کے لیے منت مانے، کیس سننے کے لیے عدالت میں آٹھ گھنٹے پہلے ہی آ بیٹھے اور یہ کہ میں فرار ہونا چاہتا

ہوں یہ بات جانتے ہوئے بات دل میں دبائے رکھے ایسے شخص کی محبت نہ سمجھ سکنے پر جگت پچھتایا مگر وہ کچھ بول نہیں سکا۔ کیونکہ ڈپٹی جیلر راؤنڈ پر آ نکلا تھا۔ اودھم سنگھ اٹینشن ہو گیا۔

جگت کے سیل کے پاس آ کر ڈپٹی جیلر نے کہا۔

"نو سو ساٹھ تمہاری بیوی کا نام چندن کور ہے؟"

جگت کو حیرت ہوئی پھر بھی سر جھکا کر "ہاں" کہا۔

تب دوسرا سوال پھینکا گیا۔ "تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟"

جگت احمقوں کی طرح اس کی صورت دیکھنے لگا۔ ڈھائی سو میل کا سفر کر کے عورت ملاقات کے لیے آئے اور کیا مرد ملاقات کرنے سے انکار کر دے؟

ڈپٹی نے اسے سمجھایا "میں نے اسے ملاقات کی منظوری دے دی ہے مگر جیل کا قانون ہے کہ تمہاری مرضی معلوم کر لی ہے بہت سے اپنی بیوی سے ملنے سے انکار کر دیتے ہیں۔"

"صاحب میں انکار نہیں، انتظار کر رہا ہوں۔" جگت نے ہنس کر کہا۔

ڈپٹی چلا گیا تو اودھم مسکراتا ہوا قریب آیا۔

"جگا اب میری ایک بات کا مان رکھنا۔ گھر والی آئے تب مسکرا کر اس سے بات کرنا۔ تمہارا ہنستا چہرہ دو ماہ تک اسے سکون سے جینے دے گا۔"

جگت ہنس دیا اسی لمحے ملاقات کا وقفہ ہوا۔ عام طور پر ملاقات کے لیے جیل میں الگ جگہ ہوتی ہے جہاں قیدی کو لے جاتے ہیں مگر جگت کو باہر نکالے بغیر کوٹھڑی میں ملاقات کا انتظام کیا گیا۔

پہلی بار جیل کی دنیا میں قدم رکھتی چندن کور کو جگت سے ملاقات کی مسرت ہونے کے باوجود انجانی بچویشن میں وہ گھبرا گئی تھی۔ ایک سنتری کے عقب میں نظریں جھکا کر چلتی ہوئی چندن کوٹھڑی کی جانب بڑھنے لگی۔ سنتری رک گیا جب اس کی نظر بلند ہوئی۔ سامنے سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہوا جگت نظر آیا۔ سارے جسم میں مسرت بھری کپکپاہٹ دوڑ گئی۔ آنکھیں ملیں۔ جگت کے لبوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ چندن کے دل پر لگی مگر اسے خیال ہوا کہ چوکیدار اسے غور سے دیکھ رہا ہے۔ تب اس نے نظریں جھکا لیں۔ سنتری نے اودھم سنگھ سے کہا۔

"صاحب نے ملاقاتی پر کڑی نظر رکھنے کا کہا ہے۔" پھر سنتری لوٹ گیا۔

جگت نے اشارہ کر کے چندن کو دروازے کے قریب بلایا۔ چندن شرماتی، ہچکچاتی ہوئی قریب ہو گئی۔ اس نے ملاقات کے دوران بہت سی باتیں کرنے کے متعلق سوچا تھا۔ باریک باریک نقطے تک یاد کر لیے تھے مگر جب سامنا ہوا تو لب چپک کر رہ گئے۔

"چندن ملنے آئی ہو اور سر جھکا کر خاموش کھڑی ہوئی ہو؟" جگت اسے سرتاپا دیکھ کر بولا۔ "کچھ دیر بعد وہ سنتری تمہیں واپس لے جائے گا۔"

چندن نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کی پلکوں پر آنسو چمک رہے تھے۔ دونوں ہاتھ سلاخوں پر جما کر کھڑے ہوئے جگت کی جانب اس نے لرزتا ہوا ہاتھ بڑھایا مگر چوکیدار کا خوف محسوس کر کے ہاتھ ہٹا دیا۔ اودھم سنگھ سمجھ گیا۔ وہ پشت پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹی میں نے اب نظر پھیر لی ہے۔" وہ بولا۔ چندن چونک گئی۔ جیل میں بھی اسے بیٹی کہنے والا کوئی ہوگا اس کا گمان بھی نہیں تھا۔ اس کی ہچکچاہٹ ختم ہوگئی۔ اس نے جگت کے ہاتھوں پر اپنے مرمریں ہاتھ رکھ دیے۔ اس لمس سے دونوں کے دل دھڑک اٹھے۔

چندن نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"آپ کیسے ہیں؟"

"بہت مزے میں۔" جگت نے کہا اور اس کا یقین کرنے کے لیے اس نے جگت کی آنکھوں میں دیکھا۔ نہیں وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔ تھوڑی بہت باتیں ہوئیں جگت نے سب کے متعلق پوچھا۔ چندن نے دیکھا کہ اس کا دھیان جواب سننے میں نہیں تھا۔

"ویرو کی کیا خبر ہے؟"

"مزے میں ہے میں اس سے مل کر آرہی ہوں تمہارے لیے پرچی لکھ کر دی ہے۔" چندن نے دوپٹے کے کونے میں بندھی ہوئی پرچی کھولی اسی لمحے آواز آئی۔

"ملاقات میں کسی چیز کا لین دین کرنا منع ہے۔" اودھم سنگھ نے پشت پھیرے بغیر کہا۔

چندن ڈر گئی مگر جگت نے اشارے سے کہا۔

"لاؤ، مجھے دو۔" چندن نے ترچھی نظروں سے اودھم سنگھ کی پشت پر دیکھ کر کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے پرچی جگت کے ہاتھ میں سرکا دی۔ پھر بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ کچھ دیر بعد سنتری آ گیا۔ چندن کو وہ موت کا فرشتہ نظر آیا۔ تڑپتی ہوئی ایک نظر سے اس نے جگا کو دیکھا۔

"سنبھل کر رہنا ہماری فکر نہ کرنا۔" اس قدر کہنے کے بعد چلی گئی اودھم سنگھ اٹین شن کھڑا ہو گیا۔ چندن کور سنتری کے عقب میں چلی گئی تب جگت اور اودھم سنگھ خاموش رہے۔ پھر اودھم سنگھ نے چوک کا دروازہ کھولا پھر بند کیا اور اندر جا کر کوٹھڑی کا تالا لگایا۔ جگت کے اندر جانے کے بعد اس کی پشت پر اودھم سنگھ کی آواز سنائی دی۔

"پرچی پڑھ کر پھاڑ دینا کسی کو پتا چلا تو میری ملازمت جائے گی۔"

جگت کچھ کہے بغیر کونے میں جا کر جلدی سے پرچی پڑھنے لگا۔

"جگت سنگھ، جیل والے رشتے داروں کے علاوہ کسی کو ملنے نہیں دیتے اور میں تمہاری رشتے دار نہیں ہوں۔ لہٰذا الفاظ کی آنکھوں سے مل رہی ہوں۔ دوسرے کے سکھ کے لیے تم دکھ جھیل رہے ہو اور اس میں حصے دار نہیں بن سکتی اس کا مجھے افسوس ہے۔ میری فکر نہ کرنا ہاں ایک بات میں تمہاری اجازت چاہیے میں نے طلاق لینے کے متعلق فیصلہ کیا ہے تمہارا جواب ملنے کے بعد عمل کروں گی۔ ایک التجا بھی ہے جو قدم بڑھایا ہے اس سے واپس نہ لوٹنا۔ سب کا امتحان ہے اس پر پورا اترنا پڑے گا۔ کوئی تمہیں نہیں کہے گا مگر میں کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اگر جیل توڑ کر باہر آئے تو میری صورت نہیں دیکھو گے اور رہا ہو کر آئے تو مجھے آپ کے پاس آنے سے کوئی روک نہیں سکے گا دل کا قول ہے اس سے زیادہ کیا کہوں۔" ویرو

جگت نے پھر پرچی پڑھی۔ اس نے سوچا چندن نے بھی یہ پرچی پڑھی ہوگی ممکن ہے اس نے چندن سے ہی لکھوائی ہوگی جگت نے محسوس کیا کہ جیل کی پتھر کی دیواروں، فولادی دروازوں اور ہاتھ پیر کی بیڑیوں سے زیادہ مضبوط بندھن میں وہ جکڑا گیا ہے۔ دوسرے بندھن توڑنے کی طاقت

ہونے کے باوجود اس سے بندھن نے اسے ایسا جکڑ لیا تھا کہ سزا بھگتے نہیں چھوٹ سکتا تھا۔

"پرچی پڑھ لی جگت؟" اودھم سنگھ اس کا پیچھا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اس نے پوچھا۔ "کیا لکھا ہے؟"

جگت دروازے کے قریب آیا آنکھ مار کر بولا۔

"چاچا تمہاری جیت ہوگئی اب دس سال تک تمہاری نظر میں جکڑا رہوں گا اسی کوٹھڑی میں۔"

وہ غیر یقینی انداز میں آنکھیں پھیلا کر جگت کو دیکھنے لگا پھر مسکرا کر سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا مسکرا کر بولا۔ "میرے ان سفید بالوں سے زیادہ ان سیاہ بالوں کا تم پر اثر ہوا۔"

اسی لمحے شام کی گنتی کا گھنٹہ بجا۔ سورج چھپنے سے پہلے آسمان کے کناروں پر شفق کی سرخی نے آسمان پر گلابی رنگ کھول دیے تھے۔ ایک پنچھی پنکھ پھیلا کر آسمان کی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ جگت کو فولادی سلاخوں کے پیچھے سے دکھائی دیتی ہوئی شفق کی سرخی بھی نظر آ رہی تھی۔



سپریم کورٹ میں کیس لڑنے کی خاطر مکان اور کھیت گروی رکھ دیے گئے۔ گھر کے زیورات فروخت ہوئے۔ جہاں سے ادھار مل سکا روپیہ خرچ کیا آخری داؤ جیت لینے کی کوشش شروع ہو گئی۔ سرجن صاحب نے گورنر صاحب کی سفارش لگائی۔ کرپچن ڈاکٹر نے تین ججوں کو انسانی نظریے سے فیصلے دینے کی گزارش کی۔ ماں جی اور چندان نے بڑی منتیں مانیں اور بھگوان کی دوسرے ہاتھ کی مٹھی سے خیرات حاصل کرنے کی کوششیں جاری ہو گئیں۔

پچھلی کورٹ نے چار قتل کی سزا کے طور پر بیس سال قید سنائی۔ ہائی کورٹ نے دو قتل ثابت ہونے پر سزا آدھی کر دی سپریم کورٹ کسی صورت میں اس سزا کو رد نہیں کر سکتی تھی۔ دو قتل ثابت ہو چکے تھے۔ اس سے ہٹ کر فیصلہ دینا انصاف کا مذاق اڑانے کے مترادف تھا۔ اس کے مقابلے میں گورنر کے سامنے مضبوط دلیل پیش ہوئی۔ "پولیس ڈیپارٹمنٹ کے قول پر وہ تابع ہوا تھا اگر اسے رحم نہ ملے تو ناانصافی بھی جائے گی۔" جگت کی تقدیر دلیل کے دونوں پلڑوں میں جھول رہی تھی اور اس تقدیر پر دوسروں کی آرزوئیں لٹک رہی تھیں۔

آخری ڈیڑھ مہینے کی تنگ دلی کے بعد سپریم کورٹ نے انصاف اور انسانیت کے پلڑوں کو برابر کر کے فیصلہ سنایا۔

"دونوں قتل کی سزا قائم رہے گی۔" یہ سن کر سب کے دل بیٹھ گئے۔ مگر پھر آگے کہا گیا۔

"دونوں سزاؤں پر ایک ساتھ عمل ہوگا۔"

"کیا مطلب؟" جگت کے نانا، باپو اور ماما نے ایک ساتھ کرپچن ڈاکٹر کی جانب دیکھا۔ اس نے مسکرا کر سمجھایا۔

"ہماری محنت کامیاب ہوئی سزا پانچ سال کی رہ گئی ہے۔"

بھگوان نے دوسری مٹھی کھول کر دان دے دیا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کا سب نے خوشی خوشی استقبال کیا۔ رتیا گاؤں کے لوگوں اور لاہور جیل کے قیدیوں نے جشن منایا۔ جگت کے قرض دار خاندان نے گاؤں اور جیل کو ایک وقت کا کھانا کھلایا۔ جگت نے پہلی بار اطمینان کا سانس لیا۔ پانچ سال کی سزا کے لیے وہ پہلے سے تیار تھا۔ پانچ سال میں چھ ماہ تو وہ جیل میں گزار چکا تھا۔

ساڑھے چار سال باقی تھے اس میں اچھے برتاؤ کی وجہ سے چھ ماہ کی مزید معافی مل سکتی تھی۔ چار سال چٹکی بجاتے میں گزر جائیں گے۔ پھر جگت ڈاکو کی جگہ اچھا شہری بن کر گھر جائے گا۔ ماں جی اور چندن کور مسرت سے پاگل ہو رہی تھی۔ دکھ کے دن اب ختم ہو جائیں گے۔ سکھ کا سورج پھر طلوع ہوگا صرف چار سال بعد......

مگر چار سال بعد کیا ہونا تھا؟ اس کی کس کو خبر ہوتی ہے؟ انسان کی بنائی ہوئی سپریم کورٹ کا فیصلہ آ گیا مگر ایشور کی عدالت کا فیصلہ چار سال بعد آنا تھا......!



"ڈاک......!" آواز لگاتا ہوا ڈاکیہ آنگن میں داخل ہوا اور ماں کے ساتھ ناشتے پر بیٹھی ہوئی چندن کور اٹھ کر تیزی سے اس کی جانب لپکی۔ اس دروازے پر ڈاک لانے پر ڈاکیے کو بھی مسرت ہوتی تھی۔ چندن کور کبھی لسی کا پیالہ، کبھی شربت کبھی پراٹھے پر مکھن لگا کر اچار کے ساتھ ناشتا کراتی تھی۔ ایک بار کھانے کے وقت ڈاک دینے آیا تھا اسے کھانا کھلا کر بھیجا۔ پہلی بار جب جگت کا خط چندن کے ہاتھ میں آیا اس نے فوراً چاندی کی چوڑی ڈاکیے کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ہر پندھرواڑے جیل میں خط لکھنے کی چھوٹ ملتی ہے۔ یہ حساب ڈاکیے کو اچھی طرح یاد ہو گیا تھا۔ لہٰذا اگر اٹھارہویں دن بھی خط نہ آئے تو چندن کور کی طرح ڈاکیہ بھی پریشان ہو جاتا تھا۔

"دیال چاچا، بیٹھیے میں ناشتہ لاتی ہوں۔"

لفافہ ہاتھ میں لے کر چندن جلدی سے اندر دوڑ گئی۔ ماں جی محبت بھری آواز میں ڈانٹتی ہوئی بولیں۔

"دیال، آج لیٹ کیوں آئے ہو بھئی؟ بہو کبھی کی انتظار کر رہی ہے۔"

"کیا کروں ماں جی آج ٹرین لیٹ تھی۔" دیال جانتا تھا کہ یہ سوال ہوگا "ورنہ جس دن آپ کے گھر کی ڈاک ہو میں سب سے پہلے یہاں آ جاتا ہوں۔"

لفافہ چاک کر کے چندن کور اسے پڑھنے کو بے چین ہو گئی۔ دیال ناشتا کر کے جائے اس کا انتظار کرنے لگی۔ کسی غیر مرد کی موجودگی میں اپنے شوہر کا خط پڑھتے ہوئے اس کو حیا آ رہی تھی۔

ایک بار ڈاکیہ خط لے کر لسی پینے کے بعد کچھ زیادہ دیر رک گیا تب چندن نے بڑی صفت سے اسے یاد دلایا۔ "چاچا، آپ کو دوسری جگہ خط پہنچانے جانا ہے لہٰذا لیٹ ہو جائیں گے۔" تب دیال سمجھ گیا کہ چندن کور اور اس کے شوہر کے خط کے درمیان وہ آڑ بنا ہوا ہے۔ لہٰذا آج جلدی ناشتا کر کے کھڑا ہو گیا۔ جاتے ہوئے ایک آہ بھر کر بولا۔

"بس اب تو ایک آدھ چکر اس مکان کا ہوگا پھر تو خط لکھنے والا خود ہی گھر آ جائے گا۔" چندن متعجب ہو گئی۔

"دیال چاچا آپ کو بھی یاد ہے کہ ان کی رہائی کا وقت قریب ہے؟"

"کیوں یاد نہ ہو بٹیا، سارا گاؤں باتیں کر رہا ہے کہ جگا جیل سے گھر آنے والا ہے۔" دیال نے دروازے کی چوکھٹ پر پیر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے اس کے متعلق بہت ساری باتیں سنی ہیں مگر دیکھا کبھی نہیں۔"

دیال کے جاتے ہی چندن نے جلدی سے کھڑکی بند کر لی۔ ماں جی بھی بیٹے کا خط سننے کے

لیے بے تاب تھیں۔ جیسے شوہر کے رخسار پر چٹکی لے رہی ہو اس طرح اس نے لفافے کی کنار پھاڑ دی اور اندر سے خط نکالا۔ بہو کے چہرے پر پھوٹتی ہوئی مسرت دیکھ کر ماں جی مسکرا رہی تھیں۔ خط کے اوپری حصے پر چندن کی نظر جم گئی۔ ''پیاری چندن۔'' دوپٹے کی کنار دانتوں تلے دبا کر اس نے کئی بار دل میں یہ لفظ رٹ ڈالا پھر زور سے خط پڑھنے لگی۔

''ملتان ڈسٹرکٹ جیل سے جگت سنگھ کی یاد پڑھنا میرے خط برابر مل رہے ہوں گے۔ اس میں الفاظ بھی برابر پڑھے جا رہے ہوں گے ہمارے ساتھ جیل میں پرشوتم نامی پڑھا لکھا نوجوان ہے وہی سب قیدیوں کے خط لکھ دیتا ہے الفاظ بہت عمدہ بنا لیتا ہے اس بے چارے کا کوئی نہیں جس کو خط لکھے لہٰذا دوسروں کے خط لکھ کر مسرور ہو جاتا ہے۔ ملتان جیل سے میرا آخری خط ہے آنے والے مہینے میں مجھے لاہور بھیجا جائے گا اس پھر وہاں صرف ایک ماہ رہوں گا سوا مہینے بعد میری رہائی کا حکم آ جائے گا پھر بھی کافی بوریت ہوتی ہے جلدی سے گھر لوٹنے کے لیے دل بے چین ہو رہا ہے۔ ہزارہ ماما اگلے ماہ یہاں ملاقات کے لیے آئے تھے تب کہہ رہے تھے کہ باپو قرض ادا کرنے کے لیے دن رات مشقت کر رہے ہیں ابھی نصف قرض باقی ہے اس کی انہیں بہت فکر ہے۔ مگر اب باپو کو معلوم ہو کہ میں گھر آ کر انہیں کھیت پر نہیں جانے دوں گا۔ دو فصلیں اچھی ہوئیں تو قرض کا بوجھ ختم ہو جائے گا۔ مجھے اس کے علاوہ اب کرنا بھی کیا ہے۔

نانا جی اب ٹھیک نہیں رہتے یہ سن کر افسوس ہوا۔ انہیں کچھ دن کے لیے اپنے گھر لا کر تمہیں پھر طبیعت سنبھل جائے گی۔ تم لوگوں نے میرے لیے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ یہ میں جانتا ہوں مگر اب وہ برے دن ختم ہو رہے ہیں سب ساتھ رہ کر کام کریں گے تو قرض کا بوجھ بھی محسوس نہیں ہوگا۔ ماں سے ملنے کو جی چاہتا ہے انہیں اب رات کو نیند آ جاتی ہوگی ہزارہ ماما کے لیے لڑکی تلاش کر لیں پھر آنے والی سردیوں میں ماما کی شادی کی خوشی منائیں گے۔ لاہور جیل میں ایک بار ملاقات کی اجازت ہوگی تو چندن تم ہی ملنے آ جانا اور دوسری ایک خاص بات۔'' اچانک چندن رک گئی۔

ماں جی مسرت سے دیکھ رہی تھیں۔ ''بہو بیٹی رک کیوں گئیں کیا خاص بات لکھی ہے وہ پڑھ ڈال۔'' چندن نے دل ہی دل میں پڑھ لیا تھا اسی وجہ سے رک گئی تھی۔ ساس کو پسند نہیں آئے گی ایسی بات لکھی ہوئی تھی۔ ماں نے پھر کہا۔

''خط پورا کر چندن۔'' اور چندن کو مجبوراً پڑھنے لگی۔

''آخری تین چار ماہ سے ویرو کی اطلاع نہیں ملی اسے یہاں سے خط لکھ رہا ہوں وہ مل بھی رہے ہوں گے یا نہیں یہ بھی نہیں جانتا۔ چندن تم لاہور آنے سے پیشتر ویرو کی خبر ضرور لے آنا۔''

دنیا میں جنگ زوروں پر ہو رہی ہے ایسی خبریں مل رہی ہیں مگر سب کہہ رہے ہیں کہ ہمیں لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماں، باپو، نانا، ماما اور تایا کے گھر سب خوش ہوں گے۔ سب کو جے گرو نانک، جب لاہور آؤ تو میرا بتایا ہوا کام نہ بھولنا...... تیرا اپنا...... جگت سنگھ۔''

خط پڑھ کر چندن نے سر اٹھایا۔ ماں جی کے چہرے کے تاثرات تنگ نظر آ رہے تھے۔ وہ سمجھ گئی کہ جگت نے ویرو کی خبر منگوائی تھی لہٰذا انہیں یہ

بات پسند نہیں آئی۔ پہلے دو تین بار ساس بہو کے درمیان کافی جھک جھک ہو چکی تھی۔ ماں جی کہہ رہی تھیں۔

"اب ویرو کی مصیبت کیوں مول لے رہی ہے؟" چندن کو تعجب ہو رہا تھا۔ "مگر ماں جی کو چندن کا سوال پسند نہیں تھا۔ "بہو! تم میری بات نہیں سمجھتیں مگر عمر بھر پچھتاؤ گی شوہر کو دوسری عورت سے محبت ہو جائے یہ کوئی بدنصیب عورت ہی برداشت کر سکتی ہے۔" چندن اس وقت خاموش ہو گئی مگر ساس بڑبڑائی۔ "اس دن اس نے طلاق لینے کی بات کی تھی تب ہی میں سمجھ گئی کہ تیرے گھر میں وہ ہولی جلائے گی۔ جگت نہ مانے مگر تمہیں کہے دیتی ہوں کہ تم اسے اپنے پہلو سے نہیں لگاؤ گی۔"

ماں جی کے چہرے کے تاثرات چندن سے کچھ کہہ رہے تھے پھر بھی اس نے کہا۔

"ماں جی، میں لاہور جانے سے پہلے ایک بار ویرو سے ملاقات کروں گی۔" ساس خاموش رہیں۔ ان کی خاموشی میں انکار جھلک رہا تھا۔ چندن نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "آخری بار جیل میں ملاقات کے لیے جا رہی ہوں لہٰذا ان کا دل دکھانا اچھی بات نہیں ہوگی۔ خط میں انہوں نے پورے وزن سے کہا ہے کہ ویرو سے ملاقات کرنا نہ بھولنا۔"

"اچھی بات ہے تمہیں بھگوان جو راستہ دکھائے کرو....." ماں جی نے آہ بھر کر کہا۔

"ویرو سے کہنا کہ جگت رہا ہو کر آئے اسی لمحے یہاں دوڑ کر چلی آنا۔" ساس کے اس حکم کا چندن فوراً جواب نہ دے سکی وہ سر ہلا کر رہ گئی مگر وہ ویرو سے یہ بات نہیں کہہ سکے گی اس کا اسے یقین تھا۔

❀......◉......❀

دس دن کے بعد جب چندن میکے کا چکر لگا کر آئی تب ویرو سے ملنے بھی گئی۔ دوپہر ماں جی چندن کے لیے ٹفن تیار کر رہی تھیں جب وہ واپس لوٹی۔ رات کی ٹرین سے چندن کو لاہور روانہ ہونا تھا ساتھ میں جگت کا ماما ہزارہ سنگھ جا رہا تھا۔

"آ گئی چندن، تیرے باپو کیسے ہیں؟" ماں جی نے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں۔" چندن نے مختصر سا جواب دیا۔ ماں جی نے دیکھا چندن کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا گھر سے جب گئی بڑی خوش تھی۔ جگت سے ملاقات کے لیے لاہور جانے کو بے چین ہو رہی تھی۔ پھر اسے اچانک کیا ہو گیا۔ ماں جی سوچ رہی تھیں۔ اسی لمحے چندن کی سسکی سنائی دی اور وہ چونک گئیں۔ ماں جی ہاتھ خشک کرتی ہوئی باہر آ گئیں۔ زمین پر چارپائی کے کنارے سر ٹکا کر چندن رو رہی تھی۔

"کیا ہوا چندن؟" انہوں نے پوچھا مگر جواب نہیں ملا تب انہیں یاد آیا کہ وہ ویرو کے گھر جانے والی تھی۔ شاید اس سے جھگڑا ہوا ہوگا۔

"ویرو سے جھگڑا ہوا؟" ماں جی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ روتے ہوئے چندن نے انکار میں سر ہلا دیا پھر رک کر بولی۔

"ویرو بہن ملی نہیں۔"

"اس میں رونے کی کیا بات ہے بہو؟" ماں جی کچھ سختی سے بولیں۔

"ویرو نہیں ملی تو آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا تم پر جگت سے کہنا میں اس کے گھر گئی مگر وہ نہیں تھی۔" اب تک چندن نے سر اٹھا کر ساس کو نہیں دیکھا تھا اس کی سسکیاں اچانک رک گئیں۔

"آسمان ٹوٹ چکا ہے ماں جی۔" پھر کچھ دیر رک کر بچتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان بولی۔

"ویرو گھر سے بھاگ گئی۔" اور پھر چارپائی پر سر رکھ کر دل کھول کر رونے لگی۔

ماں جی دہل گئیں ویرو بھاگ گئی یہ بات نہ ماننے والی تھی ویرو ایسا نہیں کرے گی۔ یہ دلیل دل میں بیدار ہوئی مگر انہوں نے دل کو منا لیا۔ وہ کیوں ایسا نہیں کر سکتی؟ ایک بار جگت کے ساتھ بھاگ چکی ہے ایک بار عورت کا پیر دروازے سے باہر نکل آئے پھر وہ کہاں رکے گا یہ نہیں کہا جا سکتا۔ انہیں اس کے لیے بے چین نہیں ہونا چاہیے۔ چندن کو اس طرح رونے کی کیا ضرورت ہے؟ بھگوان نے اس کے راستے کے ایک پتھر کو ہٹا دیا ہے۔ یہ تو خوش ہونے والی بات ہے۔ مگر یہ سب چندن سے کہنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ انہوں نے اتنا ہی پوچھا۔ "کیوں بھاگی؟ کس کے ساتھ بھاگ گئی رونا بند کر کے مجھے بتاؤ تو سہی۔" ماں جی پانی کا پیالہ بھر کر لے آئیں۔

چندن کا رونا تھم گیا۔ اس نے اٹھ کر منہ دھویا پھر ایک گھونٹ پانی پیا ماں جی متجسس نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ نظر جھکا کر چندن بولی۔

"ویرو بہن کے باپو سے میں نے پوچھا کہ وہ گھر چھوڑ کر کیوں چلی گئی تو انہوں نے بے رخی سے جواب دیا۔ "وہ اسی سے جا کر پوچھ لو۔" میں نے عاجزانہ لہجے میں ان سے معلوم کرنے کی کوشش کی تو مجھے برے الفاظ میں سنا دیا۔"

"کیا بولا ویرو کا باپ؟" ماں جی بلند آواز میں بولیں۔ چندن اب ان کے سامنے دیکھ کر بولی۔

"ویرو بہن کے باپو نے کہا" وہ تمہارے شوہر جیسے ڈاکو کے ساتھ بھاگ گئی۔" اور میرے سامنے دروازہ زور سے بند کر دیا۔"

"اس نے تمہیں ایسا کہا؟" ماں جی کو جوش آ گیا مگر سارا جوش انہوں نے ویرو پر ڈالا۔

"میں تمہیں کہہ رہی تھی کہ اس کی حرکات اچھی نہیں دیکھا آخر بھاگ گئی کسی ڈاکو کے ساتھ۔"

ماں جی کا غصہ حد سے بڑھ چکا تھا۔

"مگر ماں جی میں انہیں کیا کہوں۔ یہ سن کر وہ ایک دن بھی جیل میں نہیں رہ سکیں گے۔" چندن کی آواز دب گئی۔ "ہے بھگوان، کنارے آتی ہوئی کشتی ڈوب جائے گی۔"

"نہیں نہیں چندن ایسا نہ بول۔" ماں جی چیخیں۔ "ویرو کا جو کچھ بھی ہو جگت پر اس کا اثر نہیں پڑنے دوں گی میں راست کرالوں گی تم لاہور جانے کی تیاری کرو۔" ماں جی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ جگت معلوم کرے تو کہنا ویرو مرے میں ہے۔"

چندن آنکھیں پھیلا کر ساس کو دیکھنے لگی۔ وہ الجھن میں پڑ گئی۔ اب مضبوط بنے بغیر چھٹکارا پانا مشکل تھا۔

"نہیں ماں جی! میں ان سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

"شوہر کے سکھ کی خاطر عورت کو جھوٹ بولنا پڑتا ہے بہو۔" ماں جی بولیں۔

"آج تک میں نے تمہیں بہو سمجھ کر رکھا ہے مگر آج ساس بن کر کہہ رہی ہوں کہ تمہیں جگت کو یہ بات کسی قیمت پر نہیں بتانی۔"

"پھر میں ان سے ملاقات کے لیے نہیں جاؤں گی۔" چندن نے ہچکچائے بغیر کہا۔ ساس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ چندن کو ان کے چہرے پر مضبوطی نظر آ رہی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ چندن جگت سے جھوٹ نہیں بولے گی اسی لیے جگت سے ملنے

سے انکار کر رہی تھی۔

"اگر تم نہیں گئیں تو جگت کسی بھی جاننے والے سے ضرور پوچھے گا کہ چندن کیوں نہیں آئی؟ تو کیا جواب دوں؟"

"جس طرح مناسب سمجھو۔" چندن نرم آواز میں بولی۔ "کہہ دینا بیمار ہو گئی ہے۔"

"وہ بھی جھوٹ ہی ہوگا۔" ساس کی آواز کا طنز چندن سمجھ گئی وہ تڑپ کر روتی ہوئی بولی۔

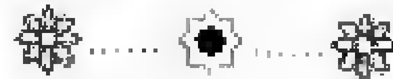
"پھر کیا کروں ماں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا؟"

"میں جاؤں گی چندن۔" ماں جی نے تیزی سے فیصلہ کیا۔ "چاہے مجھے دو آدمیوں کے منہ پر جھوٹ بولنا پڑے۔"

"دو کون ماں جی؟" چندن سامنے آ گئی۔

"ہاں ایک تیرے سسر جو مجھ سے پوچھیں گے کہ آخری لمحے بہو کیوں نہیں جا رہی؟ انھیں کہوں گی کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی بجائے میں جا رہی ہوں۔ یہی جھوٹ مجھے جگت سے بھی بولنا پڑے گا۔" ماں جی سانس لینے کے لیے رکیں۔ "مگر کوئی پروا نہیں بیٹے کی بھلائی کی خاطر میں لاکھ جھوٹ بولتے نہیں پچھتاؤں گی۔"

ان کا اٹل فیصلہ سن کر چندن خاموش ہو گئی۔ ماں جی لاہور جانے کی تیاری کرنے لگیں۔



"جگت سنگھ، یقیناً تم مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتے۔" نئے ڈپٹی سپر کیدار ناتھ نے جگت کو آفس میں بلا کو پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے پوچھا۔ جگت مسکراتا ہوا سامنے کھڑا تھا۔ ہفتے میں چوتھی بار ڈپٹی جیلر نے اس سے یہی سوال کیا تھا کیدار ناتھ کو مجرموں کی نفسیات معلوم کرنے کا شوق تھا۔ اصل میں بہار کے رہنے والے تھے مگر آخری ایک سال سے لاہور جیل میں ان کا تبادلہ ہوا تھا۔ ملتان جیل سے جگا اپنی سزا کا آخری مہینہ گزارنے کے لیے ان کی جیل میں آنے والا تھا یہ جانتے ہی انہوں نے جیل کی فائل سے اس کا ریکارڈ نکال کر چیک کیا جیل کے پرانے قیدی اور چوکیدار سے بھی اس وقت کے ڈاکو کے بارے میں معلومات پوچھنے لگے۔ انہیں دو سوال ستا رہے تھے۔ "جگت کیوں ڈاکو بنا؟ کون سی وجہ تھی جس سے کہ وہ پولیس کے تابع ہوا؟"

"جگت سنگھ، تمہارے متعلق مجھے کافی معلومات ملی ہیں۔" کیدار ناتھ نے پائپ کا کش لے کر دھواں منتشر کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے وقت کے شیخوپورہ کے انسپکٹر سنہا سے بھی مل آیا۔"

کیدار ناتھ نے دیکھا یہ سن کر جگت کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ انہوں نے مزید کہا۔ "سنہا صاحب بھی بہار کے ہیں باپ دادا کی دشمنی کی وجہ سے تم ڈاکو بنے یہ بات سنہا صاحب نے بتائی مگر تم پولیس کے سپرد کیوں ہوئے یہ اسرار میں حل نہیں کر سکا۔"

"سنہا صاحب پنجاب میں ہیں؟" جگت نے پوچھا۔ "میں سمجھ رہا تھا کہ اپاہج ہو کر وہ اپنے وطن لوٹ گئے ہوں گے۔" کیدار ناتھ نے دیکھا جگت سنہا کے لیے نفرت کی بجائے ہمدردانہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ڈپٹی جیلر نے ایک آہ بھری۔

"سنہا صاحب ایک پیر سے اپاہج تھے۔ اب ان کا نصف جسم بھی فالج سے سن ہو گیا۔ دو سال پہلے ان کی بیوی مر گئی۔" جگت کے ہاتھ کی زنجیر کھنکھنائی۔ کیدار ناتھ کہہ رہے تھے۔ "اب وہ بھی پنجاب نہیں چھوڑیں گے بے چارے کہہ رہے تھے

کہ اس دھرتی پر اپاہج ہوا۔ بیوی کی جدائی بھی ہولی اب زندگی نہیں گزاروں گا۔ بارہ تیرہ سال کی لڑکی ہے اسے بیاہ کر بے چارے اکیلے پڑ جائیں گے۔" سنہا صاحب کے ساتھ آخری لڑائی تھی مگر وہ بدنصیب تھے۔ ان کی طرح میرا جگری ساتھی بھی ہمیشہ کے لیے اپاہج ہو گیا۔" جگت کو ہنومان یاد آ گیا۔ "کرپچن ڈاکٹر مدد نہ کرتا تو اس کی جان نہیں بچ سکتی تھی۔" جگت رو میں بول گیا مگر پھر ہوشیار ہو گیا۔ "خیر جانے دو بابو جی ابھی یہ سب یاد کرنے سے فائدہ بھی کیا؟"

"نہیں جگت سنگھ تمہیں بتانا پڑے گا۔" کیدار ناتھ پائپ کو ایش ٹرے میں الٹتے ہوئے بولے۔ "مجھے یہ سب معلوم کرنا ہے۔"

"معلوم کر کے آپ کو کیا کرنا ہے؟" جگت بھول گیا کہ وہ جیل کے ڈپٹی سے بات کر رہا ہے۔ "میری مدد کرنے والوں کو پریشان کرنا ہے کیا؟"

کیدار ناتھ کی گردن تن گئی۔ جگت کے چہرے کے سخت تاثرات دیکھ کر وہ اس کا مزاج سمجھ گئے۔

"ارے یہ تمہاری غلط فہمی ہے تم ڈاکو سے اب پرامن شہری اور اچھے انسان بن جاؤ گے۔ یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ مجھے تم سے یہ اطلاع نہیں چاہیے وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔" کچھ دیر رک کر پھر پوچھا۔

"کیا تم موت کے ڈر سے پولیس کے تابع ہوئے؟"

"کیا کہا؟" جگت کا جوش بڑھ گیا۔ "موت کے ڈر کی بات کرتے ہو بابو جی؟" پھر دل کا غصہ نکالتا ہوا قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

"میں اب تک زندہ ہوں اسی بات کا مجھے تعجب ہے۔"

دو طرح کے آدمی

آدمی دو طرح کے ہوتے ہیں اہل نفس خواہشات کے بندے اور اہل اللہ۔ خدا کے اطاعت گزار بندے نفس دنیا اور شیطان تینوں کافر ہیں۔ جس شخص پر غضب الٰہی ہوتا ہے وہ شخص نفس پرست شہوت پرست خواہش پرست دنیا پرست حسن پرست زینت پرست اور شیطان کا ہمجولی بن جاتا ہے۔ ہر وقت اس کی جان لذت نفسانی اور معصیت اور گناہ میں غرق رہتی ہے اس کا دل سیاہ اور عشق و محبت اور انوار الٰہی سے جدا اور اس کا دل مردہ کی طرح جسد گور میں معرفت سے اندھا اور بے نور رہتا ہے۔ نفس کس کو کہتے ہیں؟ نفس وہ ہے کہ جو راہ خدا سے روکتا ہے اور غیر اللہ کی طرف بلاتا ہے پس دنیا نفس اور شیطان تمام آدمیوں کا دشمن ہے۔ نفس شہوت کی وجہ سے غالب اور غصہ کی حالت میں درندہ ہوتا ہے اور گناہ کرنے کی حالت میں نفس طفل (بچہ) بن جاتا ہے نعمتوں کے کھانے کی حالت میں نفس فرعون بن جاتا ہے اور سخاوت کی حالت میں نفس قارون بن جاتا ہے۔ بھوک کی حالت میں نفس دیوانہ کتا اور شکم سیری کی حالت میں متکبر اژدھا ہوتا ہے۔

(اقتباس: از محبت رسول)

انتخاب: امجد علی ...... کراچی

مگر کیدار ناتھ اس طرح چھوڑنے والے نہیں تھے۔

"پھر تمہیں زندگی سے محبت پولیس کے تابع لے آئی۔"

جگت کچھ دیر تک ڈپٹی جیلر کی آنکھوں میں دیکھتا رہا وہ مسکراہٹ نہیں روک سکا۔ "بابو جی تم پڑھے لکھے لوگ بات کا بتنگڑ بنانے بیٹھ جاتے ہو میں کیوں تابع ہوا اس کی مجھے خود خبر نہیں ہے۔ میں

نے اپنے آپ سے کبھی یہ سوال نہیں پوچھا۔"
"سچ بتاؤ جگت سنگھ پولیس سے معاہدہ کرتے ہوئے تمہارے ذہن میں کس کے خیالات تھے؟"
کیدار ناتھ کی ضد بھی جاری تھی۔
"ڈپٹی بابو آپ بھی کمال ہیں۔" جگت اتنا کہہ کر رک گیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "اس وقت میرے ذہن میں تین عورتوں کے خیالات تھے۔"
کیدار ناتھ کی آنکھیں سوالیہ انداز پوچھنے لگیں، کون سی؟"
"ایک تو میرے لیے تڑپتی ہوئی ماں، دوسری مجھ سے بیاہ کر جدائی برداشت کرتی ہوئی میری بیوی اور تیسری......!" جگت رک گیا لہٰذا کیدار ناتھ نے فوراً پوچھا۔
"اور تیسری کون؟"
جگت نظر جھکا کر بولا۔ "میرے دشمن کی بیوی...... جو میرے ساتھ بھاگ آئی تھی۔ وہ یہ ضد نہ کرتی تو آج بھی میرے ہاتھ میں زنجیر کی جگہ رائفل ہوتی۔" پھر مذاق میں بولا۔
"اور آپ مجھ سے کچھ معلوم کرنے کی ہمت نہ کر سکتے۔"
"عجیب بات ہے۔" میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کیدار ناتھ بولے۔ "دشمن کی عورت نے تمہیں ٹھیک کر دیا۔"
"میں بگڑا ہوا بھی نہیں تھا۔" انہیں درمیان میں روک کر جگت بولا۔ "اور سدھرا ہوا بھی نہیں ہوں جیسا تھا ویسا ہی ہوں۔" پراسرار نظروں سے ڈپٹی اسے دیکھنے لگے۔ اسی لمحے اردلی اندر آ گیا۔
"صاحب قیدیوں سے ملاقات کے لیے آنے والے لوگوں کی درخواستوں پر دستخط کر دیں۔"
انہیں یہ دخل اندازی پسند نہیں آئی مگر دیوار گیر کلاک نے چار بجائے لہٰذا وہ جلدی سے دستخط کرنے لگے جگت کو یاد آیا کہ اس سے کوئی ملاقات کرنے آیا ہو گا۔
"نمبر نو سو ساٹھ۔" صاحب ایک خط پر دستخط کرتے ہوئے رک گئے۔
"اچھا ہوا تین عورتوں میں سے ایک سے ملاقات کا تمہیں موقع ملے گا۔" پھر سر اٹھا کر بولے۔
"تمہاری ماں ملنے آئی ہیں۔"
"ماں ملنے آئی ہیں؟" جگت چونک گیا۔ پھر دل میں بڑبڑایا۔ "مگر چندن آنے والی تھی۔"
کیدار ناتھ نے ملاقاتی لوگوں کے کاغذات پر دستخط کر کے ایک درخواست اپنے پاس رکھ لی، باقی کاغذات اردلی کو لوٹا دیے۔ "نو سو ساٹھ کے ملاقاتی کو یہاں لے آؤ۔"
جگت کو تعجب ہوا۔ "مگر بابو جی ماں کو یہاں کیوں بلا رہے ہیں؟"
کیدار ناتھ مسکرائے مگر کچھ بولے نہیں۔ جگت دروازے ہی کی جانب ایک ٹک گھورنے لگا۔ چندن آتی تو بہتر تھا۔ وہ یہ کے متعلق ماں سے معلوم کرتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ ماں جی دروازے میں کھڑی نظر آئیں۔ ان کے پیچھے جیل کا میٹ تھا۔ جگت کو دیکھ کر پل بھر کے لیے ان کے پیر تھم گئے۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے صاحب کو دیکھ کر ماں جی نے آنکھوں سے چھلکنے والے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا۔ قریب آ کر نظر بھر کر بیٹے کو دیکھا۔
"بیٹا!" ان کے لب کپکپائے اور جگت نے باہیں پھیلا دیں اور ماں جی نے اسے سینے سے لگا لیا۔ کیدار ناتھ بیٹھے ماں بیٹے کا ملن دیکھ رہے تھے۔ بیٹے کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ماں

نے محسوس کیا کہ بیٹے کا جسم کافی پھیل گیا ہے۔ ان کی باہنوں میں نہیں آ رہا تھا رکے ہوئے آنسو جگت کے شانے پر بہہ رہے تھے۔ بیٹے کی جدائی میں وقت سے پہلے بوڑھی بنی ماں کے آنسوؤں کی آنچ جگت نے محسوس کی۔

"ماں گھر تو سب مزے میں ہیں؟" ڈپٹی سپر کی موجودگی محسوس کر کے اس نے ماں کو اپنے سے الگ کر لیا۔

"ہاں بیٹے ہم سب مزے میں ہیں تم ٹھیک تو ہو؟"

"تم ہی کہو میں کیسا نظر آتا ہوں؟" جگت نے ماں کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم مجھے پہچان نہیں سکو گی۔"

"چل پاگل کہیں کا ماں اندھی ہو کر بھی بیٹے کو بغیر دیکھے پہچان لیتی ہے۔" ماں جی نے لاڈ میں جگت کے رخسار پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

"لیکن اکثر بیٹا آنکھیں ہونے کے باوجود ماں کو پہچان نہیں سکتا۔" پھر فوراً ہی بولیں۔ "مگر جگت تم ایسے نہیں ہو۔"

جگت پوچھنا چاہتا تھا کہ چندن کیوں نہیں آئی مگر ایسا پوچھنا مناسب نہیں تھا کیونکہ جیل میں ملاقات کے لیے ایک رشتے دار کی چھوٹ ہوتی ہے چندن آئی تو ماں سے ملاقات نہ ہوتی۔

"ماں چندن کور ٹھیک تو ہے؟" اس نے دوسرے طریقے سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا وہ بھی آنے والی تھی اس عمر میں ٹرین کا سفر مجھ سے نہیں ہو سکتا مگر آخری لمحے میں وہ رک گئی۔"

"رک کیوں گئی؟" جگت نے پریشان آواز میں پوچھا۔

"ہاں، تین دن کے لیے باہر نہیں آ سکتی تھی۔"

ماں نے نظر جھکا کر کہا۔ جگت سمجھ گیا وہ بار بار ایک ایک کی خبر پوچھ رہا تھا مگر ویرو کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کی زبان نہیں اٹھ رہی تھی ماں جی کو بھی اس سوال کا ڈر تھا۔

انہوں نے بات کو گھمانے کے لیے کہا۔

"جگت تمہارے لیے کپڑے لائی ہوں مگر جیل والوں نے دروازے پر رکھ لیے۔"

"آپ فکر نہ کریں ماں جی۔" کیدار ناتھ پہلی بار بولے۔ "کپڑے ہم سنبھال کر رکھ لیں گے رہائی کے دن اس کے سپرد کر دیں گے۔"

ماں جی صاحب کی جانب دیکھنے لگی جگت نے کہا۔

"ماں یہ ڈپٹی صاحب ہیں اچھے آدمی ہیں میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔"

ماں جی نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے والے لہجے میں کہا۔

"آپ کا احسان صاحب جی کپڑے سنبھال کر رکھیں کہیں چوہے کاٹ نہ ڈالیں۔"

کیدار ناتھ مسکرا دیے۔ جگت کو چڑ سی ہو رہی تھی وہ ماں کو ایک جانب لے جا کر بولا۔

"ماں ویرو کی کیا خبر ہے؟" تب ماں کا دل دھڑک اٹھا مگر چہرے پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کہے بغیر چارہ نہیں تھا۔

"ویرو مزے میں ہے اس نے کہا ہے کہ جیل سے چھوٹ کر آؤ گے تو وہ خود ملنے آ جائے گی۔"

جگت نے اطمینان کی سانس لی اس کے دوسرے سوال سے بچنے کی خاطر ہتھکڑی پر انگلیاں پھیرتی ہوئی بولیں۔

"بیٹے تم جلدی سے گھر آ جاؤ اس وقت کا ہم سب انتظار کر رہے ہیں تمہارے آنے کے بعد ہزارہ کی شادی کرنی ہے وہ بے چارہ میرے ساتھ آیا ہے مگر تمہیں مل نہیں سکتا۔"

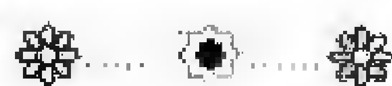
"جلد سب آرام سے ملیں گے مہینہ یوں بیت جائے گا۔" جگت نے چٹکی بجا کر کہا۔

ملاقات کا وقت پورا ہو گیا۔ ماں بیٹا الگ ہوئے کیدار ناتھ جگت کی ماں کو دروازے تک چھوڑنے آئے جاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"ماں جی آپ کا بیٹا گھر آ جائے تو میں ایک دن ملاقات کے لیے آؤں گا، ہاں......!"

"ضرور تشریف لائیے صاحب۔" جگت کی ماں نے کہا۔

"آپ جیسے مہمان ہمارے بھاگ میں کہاں؟"



جیل سے رہا ہو کر آنے والے جگت کے استقبال کی مہینہ بھر پہلے سے تیاریاں ہونے لگیں۔ ماں جی اور چندن کور کی مسرت کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ مگر کبھی کبھی چندن اداس ہو جاتی تھی۔ وہ ساس سے پوچھتی۔

"ماں جی اگر وہ ویرو کے متعلق پوچھیں گے پھر؟" مگر ماں جی اس کی بات سنی ان سنی کر دیتیں۔ مگر جگت کی آمد میں جب چار پانچ دن باقی تھے تو چندن نے پھر یہی سوال کیا اور ماں جی کو غصہ آ گیا۔

"بہو، تم بھی اپنے ذہن سے ویرو کو نہیں نکال سکتیں، پھر یہ بات پوچھی تو میں تمہیں سخت سزا دوں گی سمجھیں؟" وہ ہانپتی ہوئی بلند آواز میں بولیں۔

"اگر تم نے جگت کو سچ بات بتائی تو تمہیں اپنی ساس کی قسم ہے۔" چندن سر تا پا لرز گئی۔



پیشانی پر سزا کی مہر لگا کر عدالت روز نئے مجرم کو جیل بھیجتی ہے۔ پھر اسے نمبر سے پہچانا جاتا ہے۔ سزا ختم کر کے جانے والوں کو کارکن ان کے پرانے کپڑے اور چیزیں سزا کے دوران مزدوری کی ملی ہوئی رقم لوٹاتے ہیں جس کے ساتھ قیدی کو اپنا نام بھی واپس لوٹایا جاتا ہے۔ بدنامی کے اس داغ کو لے کر باہر جانے والا شخص کہاں جائے گا؟ اس کی جیل والوں کو فکر نہیں ہوتی۔ ممکن ہے وہ پھر جیل میں واپس لوٹ آئے اس صورت میں انہیں حیرت نہیں ہوتی۔ صرف دو تین سوال پوچھے جاتے ہیں۔

"پھر کیوں آنا ہوا؟ کتنی سزا لکھوا کر آیا ہے؟"

وہ جواب دے اس دوران جیل کے رجسٹر میں اس کا نام لکھ لیا جاتا ہے اور نام کی جگہ اسے نمبر دیا جاتا ہے یہ چکر صدیوں سے چل رہا ہے اور نجانے کب تک چلتا رہے گا؟

آج جگت کو اس کا نام واپس ملنا تھا۔ صبح کے وقت ہی چوکیدار خوشخبری سنانے آ گیا۔

"نمبر نو سو ساٹھ لوہار تمہاری ہتھکڑی اور بیڑیاں توڑنے ابھی آئے گا۔ تم تیار ہو؟" جگت کی نظریں بیڑی اور ہتھکڑی پر جم گئیں۔ سو چار سال سے وہ ان کا وزن اٹھا رہا تھا۔ اسے چوکیدار کے سوال پر ہنسی آ گئی۔

"بیڑیاں تڑوانے کو کون تیار نہیں ہو گا؟"

ڈپٹی جیلر کیدار ناتھ کے عقب میں جیل کا لوہار اوزار کی تھیلی اٹھا کر آتا ہوا نظر آیا۔ اس کے چہرے پر لہراتی مسرت قیدی کی رہائی کے لیے نہیں بلکہ قیدی سے ملنے والی بخشش کی وجہ سے تھی کہ صاحب

کو سلام کر کے چوکیدار نے سیل کا دروازہ کھولا۔ کیدار ناتھ نے اندر داخل ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"نو سو ساٹھ تمہارے بابو آ گئے ہیں تمہیں لے جانے کے لیے انہیں میں نے آفس میں بٹھایا ہے۔"

جیل میں آنے اور جانے والوں کے بندھن اور رہائی کا پیغامبر لوہار اوزار لے کر کھڑا ہوا تھا۔ صاحب کے حکم کا انتظار تھا سیل کے اندر کا دروازہ کھلا اور جگت باہر آ گیا کیدار ناتھ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"کیوں..... گھر جانا ہے؟" جگت کو بھی مذاق کرنے کا جی چاہا۔

"بابو جی گھر نہ جانا ہو تو آپ مجھے یہاں رہنے دیں گے؟"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" کیدار ناتھ نرمی سے بولے۔ "مدت ختم ہونے کے بعد ہم ایک لمحہ نہیں روک سکتے۔" پھر پائپ کا کش لگا کر ناک سے دھواں نکالتے ہوئے مزید کہا۔

"ہاں اگر کوئی واپس لوٹنا چاہے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔"

پھر صاحب کا اشارہ پا کر لوہار قیدی کے ہاتھ پیروں کی بیڑیاں توڑنے لگا۔ جگت سنجیدہ انداز میں اس کا کام دیکھ رہا تھا۔ لوہے کی زنجیر پر پڑنے والی ہتھوڑے کی ہر ضرب پکار رہی تھی۔

"رہائی..... رہائی۔" آخری کڑی ٹوٹ گئی۔ لہٰذا جگت نے جلدی سے زنجیر اپنے جسم سے الگ کر لی۔ زنجیر لوہار کے سپرد کرنے سے پیشتر چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر سوا چار سال تک جکڑے ہوئے ہاتھ پیر پہلی بار اوپر نیچے ہلانے لگا۔ رہائی کی مسرت اس کے جسم کے ہر حصے سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کی خوشی دیکھ کر مسکراتے ہوئے کیدار ناتھ نے چوکیدار سے کہا۔

"اسے نہانے کے لیے لے جاؤ اور دیکھو آفس میں کارکن کے پاس نئے لباس کا بنڈل ہے وہ لا کر اسے دینا۔" پھر جگت سے بولے۔

"اچھی بات ہے نو سو ساٹھ تیار ہو کر آفس میں آ جانا میں تمہارے کاغذات تیار کرتا ہوں۔"

ڈپٹی صاحب کے جانے کے بعد لوہار کی زبان چل پڑی۔ "اس فولادی زنجیر کو واپس لوٹاتے ہوئے بخشش بھی دینی ہوتی ہے۔" جگت ہنس دیا۔

"مگر اس وقت میرے پاس ایک پائی بھی نہیں ہے۔"

"یہ بھی جانتا ہوں رقم تو جاتے ہوئے دینی ہوتی ہے لہٰذا ابھی بتا دو کتنی دو گے؟"

"جاؤ، پانچ چونی دوں گا بس......!"

یہ سن کر خوش ہوتا ہوا وہ چلا گیا سوا روپے کی بخشش سے اس کا دن اچھا ہو گیا تھا۔

جیل کے ڈپٹی میز پر سر جھکائے کچھ لکھ رہے تھے۔ جب جگت ان کے آفس میں داخل ہوا سر اٹھا کر جگت کو دیکھتے ہی وہ حیرت میں ڈوب گئے جیسے ان کی آنکھیں یہ ماننے کو تیار نہیں تھیں کہ جسے کچھ دیر پہلے قیدی کے لباس میں دیکھا تھا یہ وہی نوجوان ہے۔ دودھ جیسی سفید لنگی، ہوا چوغا اس پر ابھری ہوئے جاٹ سر پر سفید صافہ، پتلی مونچھوں کے کناروں کو بل دے کر اوپر کی طرف چڑھا دیا گیا تھا داڑھی کے بال چمک رہے تھے۔

"واہ نو سو ساٹھ تمہارا تو روپ ہی بدل گیا ہے۔" کیدار ناتھ کی حیرت کم نہیں ہوئی تھی۔

"بابو جی اب نو سو ساٹھ نہیں" جگت نے فخریہ

لہجے میں کہا۔ ''جگت سنگھ چنگا کہیں۔''

''بات تیرے کی۔'' کیدار ناتھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تم تو باہر نکلنے سے پہلے ہی بدل گئے۔''

جگت کے لب مسکرائے۔ ''صاحب میں جیل میں تھا مگر میرا دل باہر بھٹکتا تھا۔'' کیدار ناتھ کا پوچھنے کو جی چاہا کہ باہر کیوں بھٹک رہا تھا؟ کس کے فراق میں بھٹکتا تھا۔ مگر وہ سوال مناسب نہیں تھا لہٰذا خاموش رہے تب جگت نے پوچھا۔

''بابو جی...... میرے باپو کہاں ہیں؟''

''وہ ابھی آتے ہیں۔'' کیدار ناتھ نے جگت کے کھلے ہوئے پیروں کی جانب دیکھ کر کہا۔

''کہہ رہے تھے کہ ہم جگت کے جوتے لانا بھول گئے ہیں لہٰذا جوتے خریدنے گئے ہیں۔''

''جوتے خریدنے۔'' جگا کو عجیب سا لگا۔ ''اتنے سے کام کی خاطر اس وقت بازار میں دھکے کھانے کی ضرورت کیا تھی؟''

''ہاں بھئی، جیسے تمہاری بارات لے جانی ہو، ایسے جوش اور مسرت سے تمہارے باپو اور ماما آئے ہیں۔'' جگت نے ہلکی سی آہ بھری۔

''جب میری شادی ہوئی تو بارات لے جانے کی انہیں حسرت رہ گئی تھی۔''

اسی لیے سوہن سنگھ اور ہزارہ آگئے۔ بن ٹھن کر کھڑے ہوئے جوان بیٹے کو دیکھ کر باپ کا دل پیار سے بھر گیا۔ پردیس گیا ہوا بیٹا کبھی واپس نہ لوٹنے والا ہو اور اچانک آجائے ویسی انہیں مسرت ہو رہی تھی۔ جگت آگے بڑھ کر باپو کے چرنوں میں بیٹھ گیا۔ چار سال بعد جگت کے جوان بازو پر انہوں نے ہاتھ پھیرا اور بھرائے ہوئے لہجے میں صرف اتنا بول سکے۔

''بیٹا......!''

جگت ہزارہ کے چرن چھونا چاہتا تھا مگر اس نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ دونوں جوان سینے تک ایک دوسرے سے مل گئے ہزارہ نے جگت کے رخسار چوم لیے۔ ڈپٹی سپر کرسی سے کھڑے ہوگئے۔

''چلو اپنا حساب لے آؤ پھر میں تمہیں دروازے تک چھوڑنے آؤں گا۔''

''کیوں بابو جی مجھے بھگانے کی اتنی جلدی ہے؟'' جگت بھی اب دل کھول کر مذاق کر رہا تھا۔

''ارے ہاں جگت سنگھ۔'' انہوں نے اچانک یاد کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی جاتے ہوئے سپر صاحب کو سلام کرنا نہ بھولنا۔'' جگت کے چہرے پر اچانک تلخی آگئی۔ کیدار ناتھ نے ابھی اس جانب دیکھا نہیں تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''رہا ہونے پر ہر قیدی انہیں سلام کرنے جاتا ہے صاحب نصف گھنٹے میں آجائیں گے انہیں اچھا محسوس ہوگا۔''

جگت کے چہرے مزید سخت ہوگئے گرو بخش کو شوٹ کرنے والے میکلین کو وہ سلام کرنے جائے اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ سوہن سنگھ سمجھ گئے انہوں نے معاملہ سنبھال لیا۔

''صاحب! انہیں ٹرین پکڑنی ہے زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہیں ہے۔'' سوہن سنگھ کی آواز میں عاجزی تھی۔ ''پھر کبھی جگت بڑے صاحب کو مل جائے گا۔'' پھر جگت کا دھیان بٹانے کے لیے کاغذ میں لپٹے ہوئے جوتے نکال کر کہا۔ ''جگت انہیں پہن کر دیکھو پیروں میں برابر تو آرہے ہیں؟''

جیل کے حساب دان نے نو سو ساٹھ نمبر قیدی کا

حساب تیار کر رکھا تھا۔ ”تمہارے کھاتے میں ایک سو چھبیس روپے سات آنے اور تین پائی جمع ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے کاغذ اور قلم بڑھایا۔

”اس پر دستخط کر دو۔“

جگت نے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا بڑھایا حساب دان سمجھ گیا لہٰذا انگوٹھے کا نشان لگا کر رقم ہاتھ میں لیتے ہوئے جگت کو عجیب سا محسوس ہوا لوٹ میں ہزاروں روپے کی ہیر پھیر کرنے والے کی سخت مزدوری کی یہ پہلی کمائی تھی۔

”برابر گن لو۔“ حساب دان نے کہا تب وہ مسکرا دیا۔

”گنتی کی ضرورت نہیں ہے۔“ پھر کچھ روپے مزید اس پر رکھ کر بولا۔ ”میری جانب سے یہ روپے سب کو تقسیم کر دینا ان میں سے جوا روپے لوہار کو دینا نہ بھولنا۔“

جیل کے بڑے دروازے کی کھڑکی کھلی۔ جگت کے باپو اور ماما پہلے باہر نکلے۔ ڈپٹی سپر جگت کو رخصت کرنے دروازے تک آئے۔ جگت نے ہاتھ جوڑے تب اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولے۔

”جگت سنگھ گھر جا رہے ہو تو گھر والوں کے ہو کر رہنا۔ پرانی دشمنی کو بھول جانا۔“ پھر پیار سے پشت تھپتھپا کر بولے۔ ”جاؤ تمہیں دیر ہو گی۔“

گیٹ کی کھڑکی کے باہر نکلنے کے لیے جگت کو جھکنا پڑا۔ باہر کی کھلی ہوائیں تازگی نظر آئی۔ بلند گیٹ پر نظر ڈال کر اس نے منہ پھیر لیا۔ اس کے نتھنے پھول گئے مگر سامنے کھلا آسمان دیکھا اور چہرے پر روشنی آ گئی۔ بیڑی یا رائفل کے بغیر ہاتھ اسے کچھ ہلکے معلوم ہونے لگے دور کھڑے ہوئے ہزارہ اور باپو کو انتظار کرتا دیکھ کر وہ تیزی سے ان کی جانب چلا گیا۔

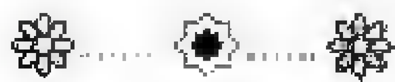
حضرت عمر ابن عبد العزیز کی حکایت

ایک عقل مند نے یہ قصہ بیان کیا ہے کہ حضرت عمر ابن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کی انگوٹھی میں ایک بہت قیمتی نگینہ تھا جوہری اس کی قیمت لگانے سے عاجز تھے۔ اتفاقاً ایک ایسا خشک سال آیا کہ لوگوں کے چودھویں رات کے چاند جیسے چہرے کمزور اور زرد ہو کر پہلی تاریخ کے چاند کی طرح ہو گئے۔ جب انہوں نے لوگوں میں آرام اور قوت نہ دیکھی تو خود آرام میں رہنا اچھا نہیں سمجھا نگینہ بیچنے کا حکم دے دیا اور وہ پیسے درویش مسکین مسافر اور یتیموں پر خرچ کر ڈالے کسی نے ان کو طعنہ دیا کہ ایسا نگینہ اب دوبارہ ہاتھ میں نہیں آئے گا۔

میں نے سنا وہ کہہ رہے تھے اور آنسوؤں کی بارش ان کے رخسار پر شمع کے موم کی طرح بہہ رہی تھی بادشاہ کے لیے زینت بری ہے جب کسی بھی آدمی کا دل کمزوری سے زخمی ہو میرے لیے بے نگ کی انگوٹھی مناسب لیکن رعایا کے دل غمگین ہوں یہ مناسب نہیں ہے۔

عقل مند حاکم دوسروں کے غم کی حالت میں اپنے عیش و آرام میں رغبت نہیں کرتے اس آدمی کا دل ٹھنڈا ہے جو لوگوں کے آرام کو اپنے آرام پر ترجیح دیتا ہے خدا کا شکر ہے کہ یہ عادت اور سیدھا راستہ میرے زمانہ کے بادشاہ اتابک ابوبکر بن سعد کو حاصل تھا۔

فرح ناز...... کوئٹہ



رتیا گاؤں میں جگہ جگہ یہی بحث جاری تھی کوئی کہتا ”شام کو جگار رہا ہو کر آ رہا ہے کہتے ہیں کہ اب ٹھیک ہو گیا ہے بایا کور اور چندن کور کے لیے سونے کا سورج طلوع ہو گا۔ بے چاری دونوں عورتوں نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ بہو نے تو اطمینان سے اپنے شوہر کا پہلو بھی گرم نہیں کیا آخر

بھگوان نے ان کی جانب دیکھا۔"
کوئی پرانی دشمنی کو یاد کر کے بول اٹھتا۔
"بھگوان کسی کو ایسی دشمنی کے چکر میں نہ ڈالے۔ دونوں خاندانوں نے کیسی خواری اٹھائی۔ موہن سنگھ کے تو نصیب ہی پھوٹ گئے۔ تین جوان بھائی مارے گئے اور بیوی نے طلاق لے لی۔ جگت کی نظر میں نہ آنے کی خاطر بے چارہ گھر اور کھیت فروخت کر کے چاچی کے ساتھ دوسری جگہ چلا گیا۔"

"مگر اس کی بیوی کا کیا ہوا؟" کسی غیبت خور عورت نے زبان چلائی۔

"وہ عورت بھی بڑی زبردست نکلی اب شوہر کے بغیر ساری زندگی کیسے گزارے گی؟"

"اس نے موہن سنگھ کو مرد ہی نہیں مانا تھا۔" دوسری نے آنکھ مار کر کہا۔

"اس کے تو اب مزے آ جائیں گے جگا جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ چندن کور کی سوت نہ بنے تو مجھے کہنا۔"

"نہیں رے، مایا بڑھیا ایسی نہیں بچی۔" ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ "ان کی زندگی میں جگا کی طاقت نہیں کہ وہ دوسری عورت کو گھر میں لا سکے۔"

اسی بحث میں شام ہوگئی۔ جگت کے مکان میں صبح سے مسرت کی شہنائیاں بج رہی تھیں۔ دوسرے گاؤں سے رشتے دار باراتیوں کی طرح مہمان بلائے گئے تھے۔ ماں جی کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے بار بار کہتیں۔

"آج میرا جگت آنے والا ہے کبھی کسی بات کی کمی نہ رکھنا سب کو پیٹ بھر کر مٹھائی کھلانا شکر پارے تقسیم کرنا۔" پھر چندن کور سے کہنے لگتیں۔

"بہو فوراً تیار ہو جاؤ شادی والی اوڑھنی پہننا۔ ارے کوئی چندن کور کے بال بنا دو سہاگ رات جیسا اس کا سنگھار کرو۔" چندن حیا سے سمٹ جاتی آج تک برداشت کیے گئے دکھوں کا بھگوان نے ایک دن میں بدلا اتار دیا تھا۔ ایسی مسرت میں وہ ڈول رہی تھی۔

ڈھلتے ہوئے سرخ رنگ نے پورے آسمان پر رنگین لہریے دیے تھے جگت کو لے کر آنے والے ریڑھے کے بیل کے گلے کی گھنٹیوں کی جھنکار اس کے ارمان بھرے دل میں گدگدیاں کرنے لگی۔

"آ گیا...... آ گیا......!" کا شور سن کر چندن کور نے سہاگ رات کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے شوہر کی آمد کی گھڑی جیسی مسرت محسوس کی۔ گلی کے راستے، کھڑکیاں، دروازے، چھتیں سب انسانی سروں سے بھری ہوئی تھیں۔ سب لوگ جگا کو دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔ کچھ لوگ احترام سے، کچھ تجسس سے کچھ لوگ ناراضگی سے جگا کو دیکھنے کا لالچ نہ روک سکے۔ گاؤں کے بچے شور کرتے ہوئے ریڑھے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

اور ریڑھا دروازے کے قریب جا رکا پہلے سوہن سنگھ، پھر ہزارہ اور آخر میں جگت ریڑھے سے نیچے کودا۔ لکھن کا قتل کر کے گاؤں سے فرار ہونے کے بعد جگا کو سات آٹھ سالوں کے بعد لوگ دیکھ رہے تھے۔ بہت سے اسے پہچان نہیں سکے اب وہ ایک قد آور شخص بن گیا تھا۔

وہ چوکھٹ پر آ کر ٹھہر گیا۔ اس وقت بہت سی عورتوں کے درمیان کھڑی ہوئی اور ہاتھ میں تھال لے کر استقبال کرنے کے لیے بے چین ماں جی نظر آئیں۔

"بیٹا کچھ دیر ٹھہر جا۔ میں تیری آرتی اتاروں

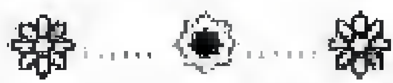
گی۔" جگت ارد گرد دیکھنے لگا اور چندن کور پر نظر جما کر کھڑا ہو گیا۔ ماں جی آنسو بھری آنکھوں سے جگت کی آرتی اتار رہی تھیں۔ ایک بار اس کی نظر سامنے والے مکان پر بھی چکر لگا کر لوٹ گئی۔ وہاں تالا لٹکتا دیکھ کر اسے حیرت ہوئی فوراً ہی ویرو یاد آ گئی اور ویرو کی تلاش میں اس کی نظریں ایک ایک عورت کے چہرے کو دیکھنے لگیں۔ مگر وہ نظر نہ آئی۔ ہلکی سی آہ نکل گئی۔ اندر آنگن میں چارپائی پر لیٹے ہوئے نانا کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ بیٹے کو کسی کی بری نظر نہ لگے اس ارادے سے ماں نے جگت کے رخسار پر کاجل کا نشان لگا دیا۔ پھر اسے اندر آنے دیا۔ بیٹے کو سینے سے لگانے کے لیے ماں نے بانہیں پھیلا دیں مگر جگت کو جیسے ایسا جوش آ گیا کہ اس نے ماں کو دونوں ہاتھوں سے بلند کر کے گول گول گھومنا شروع کر دیا۔ ماں مسرت کی ماری چیخی۔

"ارے پاگل مجھے مار ڈالے گا۔ سب کے درمیان اس طرح۔" اور اس نے مسکرا کر ماں جی کو زمین پر ٹکا دیا اور ان کے سینے میں منہ چھپا دیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ چندن کو بھی اسی طرح ہاتھ پر اٹھا کر گھمائے مگر لوک لاج کے مارے ضبط کر گیا۔ نانا کے پاس جا کر ان کے چرن چھوئے اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے نانا سے پوچھا۔

نانا نے جواب دینے کی بجائے جگت کی ماں سے کہا۔

"مایا کور تمہیں آج تمہارا بیٹا لوٹا دیا میری زندگی کا سب سے بڑا طعنہ آج ختم ہو گیا۔" پھر جگت سے بولے۔ "نواسے اب بھگوان مجھے اوپر جا لے تو کوئی بات نہیں میں یہی دن دیکھنے کے لیے زندہ رہا تھا۔



چار دن گھر میں شور بپا رہا جیسے میلہ بھرا ہوا ہو۔ چھوٹے بڑے سب اسے گھیر کر بیٹھتے۔ جیل میں گزارے ہوئے دنوں کی داستان تفصیل سے سنانے کے لیے مجبور کرتے۔ جیل میں کیسا کھانا ملتا ہے؟ کس طرح کام کیا جاتا ہے؟ کام نہ کرنے کی صورت میں کیا سزا ملتی ہے؟ اس طرح عجیب عجیب سے سوالات کی بوچھاڑ ہوتی۔ یہ سب دیکھ کر ماں جی خوش ہوتیں۔

تایا کے تیرہ سال کے لڑکے کو جگت سے اس کی بغاوت کے کارناموں کو سننے کی بے چینی تھی۔

"بابا جی، جیل کی بات پھر کرنا پہلے ہمیں ہنگامے اور ڈاکے کے قصے سنائیں۔"

تب ماں جی کے کان چوک جاتے۔ انھیں ڈر لگتا کہ پرانی باتیں یاد کرنے سے اس کے ذہن پر غلط اثر ہو گا وہ بول اٹھیں۔

"بچو! اس مکان میں لوٹ، ڈاکہ، قتل کے قصے سنانے کی کوئی بات نہ کرنا گزرے ہوئے ماضی کی کوئی مت چھیڑو۔"

رشتے داروں اور مہمانوں کی بھیڑ میں جگت اور چندن کو تنہائی نہیں ملتی تھی۔ دونوں کی نظریں ٹکراتیں ان میں ملن کی پیاس بھڑکتی نظر آتی مگر اسی لمحے کوئی آ جاتا اور دونوں نظریں چرا لیتے۔ ماں جی نے ایک بار چندن کے کان میں کہا بھی۔

"بہو اتنے سالوں بعد شوہر گھر آیا ہے اور تو کھنچی دور دور رہتی ہے کبھی اوپری منزل پر تنہائی میں مل لیا کر۔"

چندن بار حیا سے سمٹ کر رہ گئی۔ وہ بمشکل کہہ

سکی۔ "ماں جی ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ مہمان زیادہ دن نہیں رہیں گے پھر ساری زندگی ساتھ ہی ہیں۔"

حیا کی وجہ سے چندن ایسا کہہ رہی ہے یہ ماں جی سمجھ رہی تھیں کیونکہ اس کی آنکھوں میں فراق کی تڑپ صاف نظر آرہی تھی۔ جگت کے دل میں چندن سے زیادہ پیاس تھی۔ پہلے پہل اسے رشتے داروں کی بھیڑ اور شور اچھے محسوس نہیں ہوئے۔ ان سب کی موجودگی میں وہ اپنے آپ کو پرایا محسوس کرنے لگا۔ وہ چندن سے تنہائی میں مل نہیں سکتا تھا۔ پھر ویرو کے متعلق بھی معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ سب لوگ ملاقات کر گئے مگر ویرو اب تک نظر نہیں آئی۔ رات اچانک نیند سے بیدار ہو کر چھت پر کھڑا ہو گیا۔ سنسان رات میں وہ ویرو کا خالی مکان ہیبت ناک نظر آرہا تھا۔ اس نے اس جگہ کھڑے ہو کر پہلی بار ویرو کو دیکھا تھا۔ کپڑے سکھاتی ہوئی گیت گنگناتی ہوئی اس کی کلائیوں کی چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔ جگت کو خالی چھت پر اس کے موجود ہونے کا احساس ہوا ماضی کی یادوں سے اس کا ذہن بھر گیا اور وہ بری طرح بے چین ہو گیا۔

"ویرو کیوں نہیں آئی؟ کہاں ہوگی؟ موہن سنگھ گھر خالی کر کے کیوں چلا گیا؟" سوالات ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر ضربیں لگا رہے تھے۔

پانچویں دن مہمان رخصت ہو گئے۔

پہلی بارش کو دھرتی نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا پیاسی دھرتی کھل اٹھی اور سوندھی دھرتی کی مٹی کی مہک نے دھرتی کے بیٹوں کے ذہنوں میں خوشبو کے خزانے بھر دیے۔ شام ڈھلے بارش جی بھر کے برسی اور دھرتی جل تھل ہو گئی۔ رات گھر کی اوپر منزل پر جگت اور چندن پہلی بار تنہائی میں ملے۔ پیار کی پیاس دونوں کو پاگل بنا رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا چاہتے تھے۔ پیاسے دلوں کی پیاس بجھ رہی تھی مگر اس پر مسرت گھڑی میں جگت کے ذہن میں ایک خیال مسلسل گردش کر رہا تھا وہ ویرو کے متعلق معلوم کرنے کو بے چین تھا۔ اس کی خبر معلوم کرنے کی خواہش زور کرنے لگی۔ مگر بات لبوں تک آکر واپس لوٹ گئی تنہائی کے اس نازک لمحہ میں چندن سے ویرو کے متعلق معلوم کرنا مناسب نہیں تھا۔ اپنے شوہر کے ملاپ کے وقت وہ کسی دوسری عورت کو یاد کرے یہ کون سی بیوی برداشت کر سکتی ہے جگت کو ضبط کرنا تھا۔

صبح کی دھوپ نے دھرتی کی گیلاہٹ چوس لی۔ جگت نے کھڑے ہو کر چھت پر سے راستے کی جانب دیکھا۔ کسان ہل لے کر کھیتوں کی سمت جا رہے تھے وہ تیزی سے نیچے آیا چندن باورچی خانہ میں تھی لہذا ماں جی سے بولا۔

"مجھے ناشتہ دے دیں مجھے باہر جانا ہے۔"

ماں جی چونک اٹھیں۔ وہ باہر کہاں جانا چاہتا تھا ویرو کے پاس؟" انہوں نے چھپاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بیٹے اس وقت کہاں جا رہے ہو؟"

"پہلے مجھے ناشتہ دو پھر بتا دوں گا۔" جگت پر اسرار انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ماں جی کو خوف محسوس ہوا چندن ناشتے لے کر مسکراتی ہوئی آگئی۔

"ہاتھ منہ دھو لیں ناشتہ حاضر ہے۔" اس کے جسم کے ہر عضو سے خوشی چھلک رہی تھی۔ مگر ماں جی کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ ناشتا کرتے ہوئے جگت سے انہوں نے دو ایک بار پوچھا۔

"بیٹے بہت جلدی ہے باہر جانے کی، ایسا کوئی خاص کام ہے؟"

تب جگت نے اڑا او جواب دیا۔

"ہاں ماں گئے بغیر کام نہیں چلے گا۔ مجھے حیرت ہے کہ چار پانچ دن سے مجھے کیوں یاد نہیں آیا؟"

ماں جی خوف زدہ نظروں سے جگت کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ پھر دھیمے لہجے میں بولیں۔

"تمہارے باپو سوئے ہوئے ہیں وہ بیدار ہوں پھر جانا۔"

"نہیں ماں، وہ بیدار ہوں اس سے پیشتر مجھے جانا ہے ورنہ وہ روک لیں گے۔" اور ماں جی کو یقین ہوگیا کہ وہ آج تک جس گھڑی کو ٹال رہی تھیں وہ آگئی ہے۔ جگت ناشتا ختم کر کے پانی پی رہا تھا تب انہوں نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ اسے جانے نہیں دیں گی انہوں نے شوہر کو بیدار کرنے کے لیے قدم بڑھائے مگر یہ کیا؟ جگت کا دوسرا ہی ارادہ نکلا۔ اس نے برآمدے میں سے ہل اٹھا کر شانے پر رکھا تب ماں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ خوف کی جگہ مسرت نے لے لی۔

"اے چندن دیکھنا تو جلدی سے یہاں آؤ۔" چندن باہر دوڑ آئی۔ جگت کو دیکھ کر اس کے پیر تھم گئے نظر ناچ اٹھی۔ ہل شانے پر رکھ کر کھڑے ہوئے جگت میں اسے پہلی بار کسان نظر آیا۔ ماں جی جگت کے پاس دوڑ گئیں۔

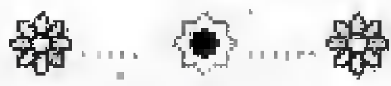
"ارے ابھی اس کی جلدی کیا ہے؟ کچھ دیر آرام کرو کھیتی تو ساری زندگی کرنی ہے۔"

"نہیں ماں، اب بیٹھے بیٹھے سستی ہورہی ہے باپو سے کب تک محنت کرائی جائے؟" پھر ہنس کر بولا۔ "ہل نہیں اٹھایا تو رائفل اٹھانے کو دل چاہے گا۔"

ماں جی لرز گئی۔ "نہیں، نہیں جگت تمہیں ہل کے ساتھ دیکھ کر میں خوش ہوگئی ہوں۔ کسان کے بیٹے کی ماں تو دھرتی ہوتی ہے۔ آج مجھے یقین ہوگیا کہ میرا بیٹا ہمیشہ کے لیے گھر لوٹ آیا ہے جاؤ جگت تمہارے ہاتھوں دھرتی سے اگائے گئے سنہری دانے مجھے امرت سے زیادہ میٹھے لگیں گے۔"

جگت دروازے کے قریب آیا۔ اسی لمحے عقب سے چندن کوئل کی طرح چہکی۔

"میں کھیت پر روٹی لاؤں کیا؟" جگت نے سر گھما کر دیکھا۔ چندن کی آنکھوں میں مدبھری مستی چھلک رہی تھی۔ صبح کی دھوپ کی طرح روشن مسکراہٹ لبوں پر پھیلا کر جگت نے "ہاں" میں جواب دیا اور دروازے سے باہر چلا گیا۔ بدلتی زندگی کا یہ پہلا موڑ تھا۔



شانے پر ہل رکھے جگت کو آتے دیکھ کر ارد گرد کے کھیتوں والے کسان کام چھوڑ کر دوڑ آئے۔ ان کی آنکھوں میں تجسس دکھائی دے رہا تھا۔ ایک بوڑھے نے مسکرا کر پوچھا۔

"ارے جگت تمہیں ہل چلانا آتا ہے۔" اس پر جگت نے الٹا اسی سے سوال کیا۔

"چاچا آپ کو رائفل چلانی آتی ہے؟" یہ سن کر سب ہنس دیے۔

بہت چھوٹا تھا ان دنوں جگت اسکول سے بھاگ کر کھیت پر آجاتا۔ باپو پوچھتے تو کہتا "ماسٹر صاحب کے پیٹ میں تکلیف تھی لہٰذا چھٹی ہوگئی۔" جگت کا پہلے ہی خیال تھا باپو کے سامنے جھوٹ بولنا پاپ نہیں مگر ماں سے جھوٹ بولنا بہت بڑا پاپ ہے۔ کھیت میں باپو کے ساتھ ہل چلانے کی ضد کرتا تب سوہن سنگھ کہتے "پہلے الف لکھنا

سیکھ کھیتی تو ساری زندگی کرنی ہے۔" پھر کچھ غصے میں کہتے۔ "جگت تمہارے ماسٹر جب ملتے ہیں تمہاری شکایت کرتے ہیں کہ تعلیم میں بالکل صفر ہو۔" جگت ہونٹ سکوڑ کر پوچھتا۔ "باپو صفر کیا ہے؟"

تب باپو بیل کی دم مروڑتے ہوئے کہتے۔ ایک کے بعد کا چھوٹا ہندسہ۔ یہ بھی تمہیں نہیں آتا؟"

"نہیں باپو۔" بھولے جگت نے جواب دیا۔ "میں تو ابھی تین کا ہندسہ لکھ رہا ہوں۔"

وہ بے فکرا بچپن جگت کو یاد آ گیا۔ اسے افسوس ہوا کہ وہ نہ تو لکھنا پڑھنا ہی سیکھا نہ کھیتی کرنا جو کچھ سیکھا تھا وہ چھوڑنا پڑ گیا۔

دوپہر کو چندن کھانا دینے آئی۔ کھیت پر کام کرتے ہوئے شوہر کو کھانا پہنچانے کے لیے آنے کا زندگی میں پہلا واقعہ تھا۔ چال میں پھرتی اور چہرے پر حیا کی سرخی لیے وہ جگت کو ہل چلاتے ہوئے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر جب اس نے یقین کر لیا کہ کوئی نہیں ہے تو آواز دی۔ "ارے چلیے روٹی کھا لیجیے۔"

لنگی سے ہاتھ اور چہرے کا پسینہ خشک کرتا ہوا جگت آ گیا۔ "اری تم کہاں سو گئی تھیں؟ یہاں دو گھنٹے سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ ایسی تیز بھوک لگی تھی کہ دل میں دو چار گالیاں بک دیں۔"

"اچھا؟" وہ آنکھیں نچاتی ہوئی بولی۔ "پھر آپ کی گالیاں مجھ تک پہنچ گئیں کیونکہ دو گھنٹے سے مجھے ہچکی آ رہی تھی۔" چندن نے کھانا نکالتے ہوئے مزید کہا۔

"میں تو کھانا لانے کے لیے بے چین تھی مگر ماں نے روک لیا۔ کہنے لگیں "اری ابھی سورج سر پر آنے دے پھر کھانا دینے جانا ابھی کھیت کی طرف گئی تو دیکھنے والے مذاق اڑائیں گے۔"

جگت کچھ دیر تک کھانے میں مشغول رہا۔ پھر پیٹ میں کچھ جانے کے بعد بولا۔ "چندن تمہارے ہاتھ کے پراٹھے بڑے میٹھے معلوم ہو رہے ہیں۔"

چندن کو رجگت کو کھاتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ شادی کے اتنے سالوں بعد اس طرح کھلے عام اپنے شوہر کو کھانا کھلا رہی تھی۔ "میرے ہاتھ کے پراٹھے تو چار دن سے کھا رہے ہو مگر مٹھاس آج محسوس ہوئی؟" چندن نے ہنس کر کہا۔

"ابھی تم کھلا نے بیٹھی ہو لہٰذا میٹھے لگ رہے ہیں۔"

"نہیں بھی آپ نے آج ہل چلانے کی مشقت کی ہے یہی وجہ ہوگی۔" چندن نے لاڈ سے کہا اور دو پراٹھے اور تھالی میں رکھ دیے پانی پیتے ہوئے جگت نے اچانک پوچھا۔

"چندن اپنے پڑوسی کا کھیت آج کل کون سنبھال رہا ہے؟"

چندن خوفزدہ ہوگئی اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا جیسے کھیت میں کام کرنے والے کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو اس طرح پیشانی پر ہاتھ کا چھجا کر کے بولی۔ "ہوگا کوئی ہمیں کیا لینا ہے؟"

"گھر اور کھیت سب کچھ چھوڑ کہاں چلا گیا؟" جگت نے بھاری لہجے میں پوچھا۔

تب چندن الجھن میں پڑ گئی۔ پھر مجبوراً جواب دیتی ہوئی بولی۔ "ایسے لوگوں کو یاد کرنے سے فائدہ کیا؟ جہاں بھی گیا ہو جان چھوٹی ہماری۔"

"مگر چندا! ویرو کے متعلق تم نے کوئی خبر نہیں دی۔" چندن جس سوال کو ٹالنا چاہتی تھی وہی اس کے دل پر نشتر کی طرح لگا۔ ہنستا چہرہ بنائے بغیر چھٹکارا نہیں تھا۔ جگت نے بے چینی کا اظہار کیا۔ "تم اس سے ملنے جاتی تھیں یا نہیں، وہ مزے میں تو ہے نا؟"

"ہم..... ہاں، ہاں.....!" چندن الجھن میں پڑ گئی۔ "آخری بار اس کے گھر گئی تب وہ نہیں ملی۔" پھر زیادہ جھوٹ نہ بولنا پڑے لہٰذا بولی۔

"ارے ہاں، ایک بار تو برقعہ اوڑھ کر ہمارے ہاں آئی تھی بڑی عدالت کا فیصلہ معلوم کرنے۔" یہ سن کر جگت خوش ہوا مگر یہ خوشی عارضی رہی۔

"پھر اتنے دنوں سے ملنے کیوں نہیں آئی، مجھے فکر ہو رہی ہے۔"

"کیوں ویرو بہن سے ملنے کی بہت جلدی ہے؟" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ مگر پھر وہ سنبھل گئی۔

"وہ بہت سمجھدار ہے جانتی ہوگی کہ گھر رشتے داروں سے بھرا ہوگا اس نے سب کے درمیان آنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔"

یہ دلیل جگت نے قبول کرلی۔ اسے اطمینان ہوگیا چندن گھر جانے کو دیر ہوگئی کا بہانہ کرکے وہاں سے سرک گئی۔ اسی وقت سے وہ جگت سے تنہائی میں ملاقات ٹالتی رہی۔ ایک جانب جگت سے تنہائی پانے کے لیے دل تڑپتا، دوسری جانب ہلکا سا خوف اس پر غالب رہتا۔ ویرو کی بات ہوگی پھر؟ وہ بار بار جھوٹ بول کر لیا خطرہ مول لے رہی تھی۔ ایک بار خیال آیا کہ انہیں سچ کہہ دیا جائے کہ اب مجھے ویرو کے متعلق نہ پوچھنا مجھے اچھا نہیں لگتا مگر ایسا کہہ کر وہ جگت کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

وہ سچ نہیں کہہ سکتی تھی۔ جھوٹ سہہ نہیں سکتی تھی۔ دو ہفتے سلامت گزر گئے۔ جگت اب گھر کی ذمہ داریوں میں دلچسپی لینے لگا۔ قرض کتنا بھرا جانا ہے؟ اس کا حساب بھی باپو کے پاس بیٹھ کر سمجھ لیا۔ ہزارہ کی شادی کے لیے ایک مانگ آئی تھی اس کے متعلق بھی ایک بار گھر والوں سے بات چیت کی۔ ماں جی کو دل میں یقین ہوگیا کہ جگت اب ٹھیک ہوگیا ہے۔ ان کا بیٹا بھی گھر چھوڑ کر جانے کا نام نہیں لے گا۔ ویرو کو شاید وہ بھول چکا ہے۔ اتنے عرصے میں اس نے ایک بار بھی نہیں پوچھا تھا گھر پر آخر کس کا سایہ ہوا۔

اسی رات جگت چندن سے جیل کے دنوں کی باتیں کر رہا تھا اچانک اسے کچھ یاد آیا اسی طرح بولا۔ "چندن تمہیں یاد ہے ایک بار جب تم لاہور جیل میں مجھ سے ملنے آئیں تب ویرو کی پرچی لائی تھیں؟" چندن پر جیسے برق گری ہو وہ بھڑک گئی۔

"کون سی پرچی؟ کتنے سال پہلے کی بات کر رہے ہو آپ کی جدائی میں تو میں بہت کچھ بھول گئی ہوں۔"

"تم نے اگر وہ پرچی پڑھی ہوتی تو کبھی نہ بھولتیں۔" جگت پرمسرت انداز میں بولا۔ "تمہیں معلوم ہے اس میں کیا لکھا تھا؟" چندن نے انکار میں سر ہلایا۔

"تمہیں ویرو نے بھی نہیں بتایا؟" جگت چندن کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ "وہ بڑی غضبناک عورت ہے سچ بات یہ ہے کہ میں نے اس کی پرچی پڑھنے کے بعد جیل سے فرار ہونے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا" اور جگت پرچی کے الفاظ یاد کرنے لگا۔ چندن کو اس کا ایک ایک لفظ یاد تھا۔

مگر زبان الٹی چل جانے کے بعد انجان بننے کی اداکاری کرلی تھی۔

''ٹھہرو، میں تمہیں بھی پرچی پڑھواتا ہوں۔ میں نے اسے حفاظت سے رکھا ہوا ہے۔'' یہ کہتا ہوا جگت بستر سے کھڑا ہوگیا برابر والے کمرے میں جا کر بڑا صندوق کھولتے ہوئے دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی چندن سے پوچھا۔ ''ارے چندن صندوق میں ایک پیتل کی ڈبیہ رکھی تھی وہ کہاں گئی؟'' چندن سرتاپا لرز گئی۔ پیتل کی ڈبیا ان کے ہاتھ کہاں سے لگ گئی؟ اس میں تو اس نے انجانے شخص کا انگوٹھا چھپا کر رکھا تھا۔ کیا انہوں نے اسے دیکھا ہوگا؟ چندن کے کپکپاتے ہوئے ہاتھ جڑ گئے۔

''بھگوان، دو ہاتھوں سے دیا ہوا سکھ اب چار ہاتھ سے چھین نہ لینا۔''

''چند ڈبیہ مل گئی۔'' جگت کے ان الفاظ کو سنتے ہی وہ اس کے پاس دوڑ گئی۔

''لائیے میں وہ چٹھی پڑھ کر سناتی ہوں۔'' ایسا کہہ کر ڈبیہ اس سے لینا چاہتی تھی مگر اس سے پیشتر جگت ڈبیہ کا ڈھکن اٹھا چکا تھا۔

گھر آ کر سب سے پہلا کام اس نے اوپر آتے ہوئے صندوق کھول کر پرچی سنبھال کر رکھنے کا کیا تھا۔ چار سال سے اس نے جان کی طرح اس پرچی کی حفاظت کی تھی۔ کسی کے ہاتھ نہ لگ جائے اس نے پرچی چھپانے کے لیے صندوق پسند کیا۔ صندوق کی تہہ میں وہ پرچی دبانا چاہتا تھا مگر اس کے ہاتھ ڈبیہ لگ گئی۔ لہٰذا اندھیرے میں جلدی سے پرچی ڈبیہ میں رکھ کر صندوق کی تہہ میں رکھی اور تیزی سے نیچے چلا آیا اس کو یہ خیال نہیں ہوا کہ ڈبیہ میں کچھ اور بھی ہے۔

مگر اس وقت ڈبیہ کھول کر وہ پرچی ہاتھ میں لی کہ اس کے نیچے پڑی ہوئی چیز پر جگت کی نظریں جم گئیں۔

''ارے..... اس میں کیا ہے؟'' یہ سن کر چندن کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ جگت کی حیرت بڑھ گئی۔

''ارے..... یہ تو کسی کا ناخن ہے، انگوٹھے کا ناخن معلوم ہوتا ہے۔'' اس نے سر گھما کر چندن کی جانب دیکھا۔ چندن کا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا تھا جیسے ابھی رو دے گی۔ ٹوٹ جائے گی وہ لرز رہی تھی۔ تب جگت نے محسوس کیا کہ کوئی غلط بات ہوگئی ہے جو اس سے چھپائی گئی ہے۔

''چندتم اتنی گھبرا کیوں گئی ہو؟'' جگت نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔

''ارے پسینے سے تمہاری پشت بھیگ گئی ہے۔'' پھر ڈبیہ میں دیکھنے لگا۔ ناخن کے ساتھ ہی سوکھے ہوئے گوشت کے ذرے بھی نظر آئے۔ اس نے یاد کیا کہ گھر میں کس کا انگوٹھا کٹا ہوا نہیں تھا پھر یہ کس کا انگوٹھا تھا؟ کیوں حفاظت سے رکھا گیا تھا؟

چندن نے محسوس کیا کہ جگت بپھر جائے گا۔ اس صورت میں غلط فہمی پیدا ہوگی۔ اس خطرے سے پیشتر کہہ دینا چاہیے ہمت کرتی ہوئی بولی۔

''چلیے میں آپ کو سب بتاتی ہوں۔ یہ انجانے شخص کا انگوٹھا ہے۔''

''انجانے آدمی کا انگوٹھا ہے؟'' جگت کی حیرت بڑھ رہی تھی مگر انجانے شخص کا انگوٹھا ہے اتنا جاننے کے بعد اسے اطمینان ہوا کہ دیرو کا نہیں ہے۔

''اوپر والی کورٹ کا فیصلہ سننے باپو جی لاہور گئے ہوئے تھے اس رات میں اور ماں جی گھر میں

اکیلی تھیں۔" چندن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"پھر نصف شب کے بعد کوئی شخص چھت پر چڑھ کر گھر میں داخل ہونے کے لیے دروازے کی زنجیر کھول رہا تھا۔ پہلے تو میں گھبرا گئی پھر نجانے کس طرح مجھ میں ہمت آ گئی اور صندوق سے تلوار نکال کر میں نے زنجیر پر وار کیا اور انگوٹھے کا ٹکڑا اڑ گیا وہ فرار ہو گیا مگر نشانی چھوڑ گیا۔"

جیسے ماننے کی بات نہ ہو اس طرح وہ تحسین اور حیرت کے ملے جلے انداز میں چندن کو دیکھنے لگا۔

"ہم تو آپ نے اس وقت بہادری دکھائی اور اب اس کا سوچ کر لرز رہی ہو چندن؟" اس کی پشت پر چپت جھاڑ کر وہ بولا۔ "مجھے تمہیں شاباش دینی پڑے گی۔"

جیسے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو اسی طرح چندن ہنسی۔

"مجھے آپ سے شاباش نہیں ایک قول چاہیے۔"

"قول؟" جگت نے متعجب لہجے میں کہا۔

"آپ تم بڑی پراسرار بن گئی ہو۔"

"اب یہ اسرار نہیں رہا۔ آپ سے بات چھپائی تھی کیونکہ مجھے ڈر تھا۔" پھر کچھ ٹھہر کر بولی۔

"یہ واقعہ سننے کے بعد آپ اس شخص کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ پھر انتقام کے لیے میدان میں کود پڑیں گے یہ قول دیں آپ ایسا نہیں کریں گے۔" چندن کی پلکیں بھیگ گئیں۔

جگت نے اسے پیار بھرے انداز میں پہلو میں دبا لیا۔ "اپنے دل سے ڈر نکال دو چندن مگر مجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کرنے کی ہمت کس نے کی؟ ہمارے دشمن نے۔"

"نہیں نہیں۔" چندن نے اسے درمیان میں روک لیا۔ "وہ مسلمان تھا۔ اس کے ناخن پر مہندی لگی ہوئی تھی ممکن ہے چوری کرنے آیا ہو بے چارہ۔"

"بے چارہ......!" جگت نے سخت لہجے میں کہا۔ "ڈاکو کے گھر میں گھسنے کی تم نے سزا دے دی ہے چندن۔"

"گھر میں نہیں، صرف چھت پر چڑھنے کی سزا ہے کیے معلوم اندر آ کر واپس لوٹتا بھی یا نہیں؟" اتنا کہہ کر چندن چونک گئی۔ "مگر دیکھو باپو سے نہ کہنا میں نے اور ماں جی نے ان سے چھپایا ہے۔"

"تم ساس بہو نے اور کیا کیا چھپایا ہے؟" جگت نے مذاق میں کہا۔ مگر چندن تڑپ گئی اور جو کچھ چھپایا تھا کہہ دینے کی خواہش زور کرنے لگی۔ مگر ساس کی قسم نے اس کی زبان روک دی۔ چندن نے بات ٹالنے کی غرض سے جگت کے ہاتھ سے ڈبیہ لیتے ہوئے کہا۔

"لائیے، میں اسے پھینک دوں میں نے آپ کو بتانے کے لیے اسے حفاظت سے رکھا تھا۔" مگر جگت نے ڈبیہ نہیں دی۔ "اس کی کیا جلدی ہے ابھی یہ تو تمہاری بہادری کی نشانی ہے ہم اسے حفاظت سے رکھیں گے۔"

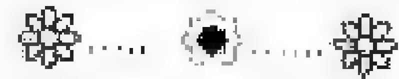
"مجھے آپ کے علاوہ کسی کو نہیں بتانا۔" چندن نے ضد کی۔

مگر جگت نہ مانا۔ "مجھے ایک شخصیت کو بتانے کے لیے اسے رکھنا ہے۔" چندن چونکی ویرو کو بتانے کی بات ہو رہی تھی۔

"کسے بتانے کے لیے؟" چندن نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

جگت نے اس کے رخسار پر چٹکی لیتے ہوئے کہا "ہمارے بیٹے کو بڑا ہو کر وہ کہہ سکے گا کہ میرا باپ ڈاکو تھا تو ماں بھی کم نہیں تھی۔"

یہ سن کر چندن نے شرما کر جگت کی گود میں منہ چھپا لیا۔ جگت نے آج پہلی بار باپ ہونے کی آرزو کی تھی جس کی خوشی کے طور پر چندن کی آنکھیں مسرت کے آنسو بہانے لگیں۔



بوائی کے لیے بیج لینا تھا لہٰذا سوہن سنگھ سحر کے وقت ہی بیدار ہو گئے سب ناشتہ کر کے جائیں اس کا چندن انتظار کرنے لگی۔ جگت بیدار ہونے کے بعد نیچے اتر آئے اس سے پیشتر وہ ماں جی سے سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی۔ سوہن سنگھ دروازے کی کھڑکی بند کر کے گئے تب ماں جی پوجا کرنے بیٹھ رہی تھیں۔ چندن ان کے قریب آگئی۔

"ماں جی آپ پوجا میں بیٹھیں، اس سے پیشتر میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" سرگوشیانہ لہجے میں کہتی ہوئی چندن کو ماں جی دیکھنے لگیں۔

"کہہ ڈالو، کیا بات ہے؟"

"میں نے رات انہیں وہ بات بتا دی۔"

"کون سی بات۔" ماں جی کی بھویں تن گئیں۔

"ویرو کی بات؟"

"نہیں، انگوٹھے والی بات مجھے کبھی پڑی ان کے ہاتھ میں ڈیپا آگئی تھی۔" چندن بچاؤ کے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"سن کر جگت پر کیا اثر ہوا؟" ماں جی کا تجسس بڑھ گیا۔

"جیسا میں نے سوچا تھا ویسے غصے نہیں ہوئے، بلکہ خوش ہوئے۔"

ماں جی کو اطمینان ہوا۔ "جگت اب بدل گیا ہے بات بات پر بپھرے گا نہیں۔" یہ کہہ کر وہ مالا گھمانے لگیں۔

"مگر ماں جی میں کہہ رہی ہوں کہ اب ویرو والی بات بھی کہہ دو تو بہتر ہوگا۔" چندن کا جملہ مکمل ہونے سے پیشتر ماں جی کے چہرے کے تاثرات تنگ ہو گئے۔ چندن کچھ ہچکچائی پھر بولی۔

"مجھے وہ بار بار پوچھتے ہیں تب مجھے بات اڑانی پڑتی ہے۔ دیر ہوا اس سے بہتر ہے بتا دینا چاہیے۔" چندن کی آواز میں عاجزی تھی۔

"دیر یا جلدی ہوا اس میں اب فرق نہیں آئے گا۔" ماں جی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں تم سے زیادہ مردوں کے مزاج پہچانتی ہوں بہو، ویرو کی فکر کرنے کے بجائے تم میرے بیٹے کو اس طرح اپنی محبت کا اسیر کر لو کہ پھر کسی کی فکر نہ کرنی پڑے۔"

چندن کو یہ بات کچھ کڑوی لگی۔ اس نے پر جوش انداز میں دلیل دی۔ "مگر ماں، باہر سے انہیں معلوم ہو گیا کہ ویرو لاپتا ہے اس سے تم انہیں بتا دیں تو انہیں کم دھچکا محسوس ہوگا۔"

جب چندن یہ کہہ رہی تھی جگت اوپری منزل سے نیچے آنے کے لیے پہلی سیڑھی پر پیر رکھ رہا تھا۔ وہ وہیں جم گیا۔ ویرو لاپتا ہے؟ اس کے جسم میں آگ بھڑک اٹھی۔ ماں جی نے چندن کو جواب دیا وہ غور سے سننے لگا۔ "بہت تمہیں میری قسم سے بڑھ کر کہنا ہے تو کہہ سکتی ہو۔"

اور جگت نے دانت بھینچ لیے۔

"میری سگی ماں نے مجھے اندھیرے میں رکھنے کے لیے چندن کو قسم دی تھی؟ کس کے لیے؟ جس ویرو نے میری خاطر گھر چھوڑ دیا بھولی کو واپس دی، طلاق لی سماج میں بدنامی مول لی۔ ویرو کی مدد

کرنے کے بجائے اس کے کم نصیب پر چھوڑ دیا۔"

اوپری منزل سے کودنے کو جگت کا دل چاہا مگر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اندر کے کمرے میں جا کر صندوق کھولا، صافہ باندھ لیا تلوار لینی چاہیے یا نہیں؟ یہ سوچا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر کوئی اسے روکے گا اور اسے جہاں جانا ہے وہاں نہیں جانے دیں گے۔ اسے نانا والی لاٹھی یاد آ گئی فولادی خول والی لاٹھی اٹھائی اس لمحے پانچ سال سے ذہن میں سویا ہوا شیطان پھر جگت کے ذہن پر سوار ہو گیا۔ صندوق بند کر کے اس کی نظر ڈبیہ پر گئی جس میں ویرو کی پرچی اور انگوٹھے کا ناخن حفاظت سے رکھے ہوئے تھے۔ ڈبیہ کو جیب میں رکھ کر وہ دھڑ دھڑ اوپر منزل کی سیڑھیاں اتر گیا۔ اس کا ہیبت ناک روپ دیکھ کر ماں جی لرز گئیں۔ جگت ماں جی کو سخت نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے نتھنے پھول گئے جیسے آتش فشاں پھٹنے والا ہو ایسے دبدبے سے وہ کھڑا ہوا تھا۔

"جگت، اس وقت کہاں جا رہے ہو؟" ماں جی نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

"جہاں تم لوگ مجھے جانے نہیں دینا چاہتے۔" جگت نے دانت پیس کر کہا۔ "ویرو سے ملنے۔"

ماں جی کے پیروں تلے سے دھرتی کھسکتی نظر آنے لگی۔ چندن کے دل پر نشتر لگا۔

"پرائی عورت کو ملنے کی جلدی اچھی نہیں۔" ماں جی نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ "میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی۔"

"جس کو تم پرائی عورت کہہ رہی ہو ماں اس نے تمہیں اپنا سمجھ کر قربانی دی ہے یہ کیوں بھول رہی ہو؟" جگت نے بلند آواز میں کہا۔ "تم یا چندر نے جو کچھ میرے لیے کیا ہے ویرو نے بھی اس سے کم نہیں کیا۔"

"اس کا مطلب ہے اسے اپنی ماں اور بیوی کے برابر درجہ دے رہے ہو؟" ماں جی گرجیں۔ جگت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

"ماں تم گاؤں کو جگاؤ گی تب بھی میرا ارادہ متزلزل نہیں ہوگا۔"

ماں جی پھرتی سے دروازے کے قریب دوڑ گئیں اور ہاتھ پھیلا کر بولیں۔ "میرے جسم پر سے جانا ہے تو جاؤ۔"

"تم میرا راستہ نہ روکو ماں۔" جگت نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھ سے سچ بات چھپا کر تم نے میرے دل کو صدمہ دیا ہے میں یہ بھی بھول نہیں سکوں گا۔" کہتا ہوا جگت آگے بڑھا ماں اس سے لپٹ گئی۔ غصے کے جوش میں جگت کی لاٹھی بلند ہوئی مگر سامنے ماں کھڑی ہوئی ہے لاٹھی رک گئی کیونکہ ماں نے کہا تھا۔

"بیٹا میرا کہنا مان جا، میں تمہیں سب باتیں بتاتی ہوں تم جس عورت کی خاطر ماں کا سامنا کر رہے ہو وہ کسی عورت کی ہے جگت۔" وہ بری طرح بپھر گیا۔

"ویرو کے بارے میں ایک غلط لفظ میں برداشت نہیں کر سکتا میں تمہیں بتا رہا ہوں ماں۔"

"نہیں بیٹا، میں تمہارے بھلے کی خاطر کہہ رہی ہوں۔ میں جو جانتی ہوں تم نہیں جانتے جگت۔" بیٹے کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر ماں رو رہی تھی۔

"وہ گھر سے بھاگ گئی تم رہا ہوئے اس سے پیشتر بھاگ گئی۔"

جگت کا غصہ اور بھڑک گیا۔ "اور یہ بات تم نے مجھ سے کیوں چھپائی ماں؟" جگت ماں کو الگ

کرنے کے لیے زور آزماتا ہوا بولا۔ ''میں ویرو کو جانتا ہوں اتنی بڑی دنیا میں اسے کوئی پہچان نہیں سکا ماں، مجھے جانے دو اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔''

جگت کھڑکی کی جانب بڑھ رہا تھا ماں جی اسے پوری قوت سے روک رہی تھیں وہ بھی جگت کے ساتھ گھسٹ رہی تھیں۔ چندن ایک طرف کھڑی بری طرح رو رہی تھی۔ نہ تو ساس کو سمجھا سکتی تھی اور نہ جگت کو لوٹا سکتی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ بھگوان ایک بار پھر اس کا سکھ لوٹ رہا ہے۔

''جگت خبردار جو تم نے گھر کی چوکھٹ پار کی۔'' ماں جی حلق پھاڑ کر بولی مگر جگت کے سر پر سوار ہونے والے شیطان نے اس کی پروا نہیں کی۔ آنکھ سے سیلاب کی طرح بہتے آنسوؤں کے ساتھ روتے ہوئے ماں نے آخری کوشش کی۔

''اس گھر کی چوکھٹ پار کرو گے تو اس صورت میں تم ماں کی لاش پر واپس لوٹو گے۔''

''تم کہتی ہو تو میں کبھی اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گا۔'' کہتے ہوئے جگت نے جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا اور ایک ہی جست میں چوکھٹ پار کر گیا اور ایک جھٹکے سے باہر کی زنجیر لگا دی۔ جاتے جاتے اس نے سنا ماں بند کھڑکی پر سر پٹخ رہی تھی۔ مگر جگت طوفان کی طرح نکل ہو گیا......!

❁......●......❁

تاؤ کے کھیت پر سے لی ہوئی گھوڑی پر بیٹھ کر وہ ویرو کے گھر پہنچا۔ وہاں تالا تھا قلی کے بچے کو ساتھ لے کر جہاں ویرو کا باپ کھیت میں کام کر رہا تھا وہاں چلا گیا۔ اس کا نام سن کر ویرو کے باپ کا دل بیٹھ گیا۔

''ویرو کہاں ہے؟'' اس نے جاتے ہی سوال کیا جواب کے انتظار میں اس نے لاٹھی کی برچھی سے اس کا نشانہ لیا۔ ویرو کے باپ نے لرزتے ہوئے کہا۔

''آپ ابھی آ رہے ہیں بیٹھیں پانی وغیرہ پئیں پھر بتاتا ہوں۔''

''مجھے ابھی جواب چاہیے اور سچا جواب چاہیے۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔

''سچا ہی بتاؤں گا بھائی۔'' ویرو کا باپ رونی صورت بنا کر بولا۔

''وہ غلط عورت تھی چار سال بمشکل حفاظت کر سکا مگر تین ماہ پہلے نظر بچا کر بھاگ گئی۔''

''بھاگ گئی یا کوئی اغوا کر کے لے گیا؟'' جگت گرجا۔

''دونوں باتیں سچ ہیں میرے باپ، میرے نصیب پھوٹ گئے۔''

''نصیب پر پھر رونا پہلے بھونک کہ کون اغوا کر کے لے گیا؟'' جگت کا چہرہ سرخ ہو گیا مگر جب اغوا کرنے والے کا نام سنا تو اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

''چین اغوا کر کے لے گیا ہے تمہارا ساتھی۔''

''چین؟'' جگت نے ہونٹ کاٹے۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

''تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''مجھے جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ؟'' وہ چار آنسو گراتا ہوا بولا۔ ''جاتے ہوئے کہتا گیا کہ جگت جیل سے رہا ہو اس سے پیشتر ویرو میری ہو جائے گی۔''

جگت نے گھوڑی کو ایڑ لگائی پھر رک کر بولا۔ ''اگر تیری بات جھوٹ ثابت ہوئی تو واپس لوٹ کر تیری کھال اتار دوں گا۔''

بھوک پیاس کی پروا کیے بغیر...... آرام کے لیے رکے بغیر جگت دہکتی ہوئی گرمی میں بچن کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔ نفرت کا زہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ ہاتھ پیر میں فولادی زنجیر پہن کر جیل کی اندھیری کوٹھری میں پانچ سال تک وہ کیوں پھنسا رہا تھا؟ یا جس گھر کی عداوت کی خاطر وہ ڈاکو بنا اس گھر کے سکون کی خاطر پولیس کے حوالے ہوا اسی گھر میں اس کی ماں نے قدم رکھنے کی ممانعت کی، کیوں؟ ویرو سے ملنے جاؤں کیا یہ پاپ تھا کیوں اس نے مجھ سے سچی بات چھپائی؟ چندن کو جنم دے کر ماں نے اس کے لب سی دیے۔ ویرو کا پتا ہے یہ جاننے کے باوجود اتنے دن گھر میں بند رکھا؟ میں رہا ہو کر آیا اس کی خوشی منائی سارے گاؤں کو کھانا کھلایا، شکر تقسیم کی۔ سب نے موج اڑائی اور ویرو کی کیا حالت ہوئی ہوگی اس کا خیال کسی نے نہ کیا۔ سب مفاد کے رشتے دار ہیں ماں، باپو، عورت نہیں چندن کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ اب یاد آ رہا ہے کہ جب میں ویرو کے متعلق معلوم کرتا وہ اداس ہو جاتی گھر سے نکل رہا تھا تب ماں نے روکا مگر وہ بے چاری ایک لفظ نہیں بولی۔

”اور بچن؟“ جگت نے گھوڑی کے پہلو میں زور سے ایڑ لگائی۔ پھر دانت پیس کر بڑبڑایا۔

”بچن...... میرا جگر جان دوست...... جسے میں نے ویرو کی دیکھ بھال کے لیے کہا تھا وہی ویرو کو اغوا کر کے لے گیا۔ نہیں، نہیں...... دل نہیں مانتا۔ ویرو کا باپ اس قدر جھوٹ کس لیے بولے گا ممکن ہے بچن کو میں نے اس کی محبوبہ چلا سے الگ رکھا اس کا اس نے انتقام لیا ہو؟ مگر میں اسے نہیں چھوڑوں گا بے ایمانی کا حساب سود سمیت وصول کروں گا چاہے پھانسی چڑھ جاؤں۔“

ویرو کیا اتنی خوشی بچن کے ساتھ فرار ہو گئی نہیں ویرو تمہاری خاطر تمہاری پریچی کے اعتماد پر میں نے جیل کے برے دن سہہ لیے۔ میں شان سے تمہارے پاس آنا چاہتا تھا۔ دنیا نے مجھے ٹھکرایا سماج نے مجھے بدنام کیا اس عورت کا ہاتھ تھام کر میں گھر لانا چاہتا تھا اب بھی پاتال میں سے تمہارا پتا لگا کر تمہیں حاصل کر کے دم لوں گا۔“ خیالات کا ہجوم اس کے ذہن کو گھیر رہا تھا۔ دل کے نرم احساسات کے درخت زمین بوس ہوتے جا رہے تھے۔ بچن کی تلاش میں اسے بہت بھٹکنا پڑا پرانے انفار مروں سے اس کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا جگت کو دیکھ کر سب خوش ہوئے مگر بچن کہاں ہے؟ اس کی اطلاع انہیں بھی نہیں تھی۔ اس نے دو چار کی زبانی بھی سنا کہ بچن اب غروب ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھی ٹوٹ چکے ہیں۔ چھپنے کے لیے روز نئی جگہ بدلنی پڑتی ہے۔ پولیس بری طرح تعاقب کر رہی ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کے پاس اسلحہ اور کارتوس تک نہیں ہوتے اب وہ زیادہ دیر نہیں رہ سکے گا۔

سورج ڈھل رہا تھا تب جگت کی ایک پرانے انفارمر سے ملاقات ہوئی جسے بچن کا پتا تھا۔ ”مگر جگت سنگھ ہم رات کے اندھیرے میں جائیں یہ بہتر رہے گا۔ آج کل پولیس نگاہ رکھتی ہے۔ آپ کو دیکھ کر شک کرے گی۔ اس صورت میں پوری پارٹی پکڑی جائے گی۔“ اس نے جگے کو سمجھایا مگر جگت ایک لمحہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔

”پولیس کی ایسی کی تیسی، مجھے اسی لمحے پہنچنا ہے۔“ جگت کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں۔

"چل بیٹھ جا گھوڑی پر۔"
افقار مڑ کر گیا۔
"کیا جگا پھر ڈاکو گیری شروع کرے گا؟" مگر جگت کا مزاج دیکھ کر وہ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا نہ ہی جگت نے بچن کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ گھوڑی کے منہ سے جھاگ بہنے لگا تب افقار مر نے توجہ دلائی۔ "اب یہ گر پڑے گی۔ اسے تھوڑا آرام کرنے دو۔" مگر جگت نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ دن ڈوبتے وقت وہ پڑاؤ پر آ گئے۔
جگت اس پرانے کھنڈر میں داخل ہوا اس سے پیشتر پہرہ دیتے ہوئے بچن کے ساتھی نے مسرت کا اظہار کیا۔ "سردار کی جیل سے رہا ہو کر آ گئے ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔" پھر اس نے جگت کی گھوڑی کی لگام تھام لی۔ "ہمارے تو اب آخری دن گنے جا رہے ہیں۔"
مگر جگت کی آنکھوں میں پھنکارتے ہوئے غضب کو دیکھ کر اس کی مسرت ہوا میں اڑ گئی۔ جگت کے ساتھ آئے ہوئے افقار مر نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔
"معاملہ بہت سنجیدہ ہے میں دو گھنٹے سے ساتھ ہوں مگر جگت نے ایک لفظ نہیں بولا مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ بچن سے لڑائی ہو گی۔"
جگت کو کھنڈر میں داخل ہوتے دیکھ کر بچن کے بیٹے پرانے ساتھی حیرت میں پڑ گئے۔ مشعل کی روشنی میں رائفل صاف کرتے ہوئے دو آدمیوں کے ہاتھ رک گئے، جگت کی پہچان والے مسرت بھرے انداز میں چیخ اٹھے۔ "جگت سنگھ......!"
جگت ان میں سے ہر ایک کے چہرے کو دیکھ کر ہاتھ میں تھامی ہوئی لاٹھی فرش پر مارتا ہوا بولا۔
"کہاں ہے بچن؟" پانچ سال بعد واپس لوٹے ہوئے جگت کا غضب ناک روپ دیکھ کر سب لرز گئے۔ کھنڈر میں سناٹا پھیل گیا۔ جگت پھر سوال پھینکنا چاہتا تھا اسی لمحے برابر والے کمرے سے کھٹ کھٹ کی آواز قریب آنے لگی۔ جگت چار قدم آگے بڑھا۔ اب اس نے لاٹھی بلند کر لی تھی۔ نزدیک آتی ہوئی آواز نے اس کے ذہن کو پر جوش بنا دیا تھا۔ اس کے سینے میں طوفان کروٹیں لے رہا ہو اس طرح وہ ہانپ رہا تھا۔ وہ کیسی آواز ہے اس کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی نظر میں زہر بھرا ہوا تھا آہستہ آہستہ اس کے جبڑے سخت ہو گئے۔
سامنے ہنومان نظر آیا۔ دونوں بغلوں میں لکڑی کی گھوڑی دبائے وہ اس کے سہارے آ رہا تھا جگت کو دیکھتے ہی ہنومان کی آنکھوں سے پیار کے چشمے پھوٹ پڑے۔
"ارے......ج......گ......ت......!" کسی سرنگ سے آواز آ رہی ہو ایسا محسوس ہوا۔ وہ جوش میں یہ بھول گیا کہ وہ اپاہج ہے جگ سے لپٹنے کے لیے اس نے ہاتھ پھیلا دیے۔ اس کے ساتھ لکڑی کی گھوڑیاں بغلوں سے سرک کر گر گئیں۔ ہاتھ میں پھرتی ابھر رہی تھی مگر اسے یہ خیال نہیں رہا کہ پیر ساکت ہیں۔ اس کا اسے جب خیال آیا تو وہ توازن کھو کر لڑکھڑاتا ہوا گرا۔ اسی لمحے جگت لاٹھی پھینک کر جھپٹا اور ہنومان کو بازوؤں میں تھام لیا۔
"ارے......ارے......سنبھل ہنومان۔"
جگت کے شانے پر لٹک کر ہنومان اس سے بغل گیر ہو گیا۔ پوری قوت سے ہاتھوں کا دباؤ دیا۔
"جگت یار تم آ گئے۔" بولتے ہوئے اس کی آواز بھیگ گئی۔

"جیل سے رہا ہونے کی خبر ملی اس دن سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ میں سمجھنے لگا کہ گھر کی محبت میں دوست کو بھول گیا ہوگا۔" ہنومان آنسو نہ روک سکا جگت کے سینے پر اس کے گرم گرم آنسو بہنے لگے۔ "دوست تمہارے ساتھ جیل آنا تھا مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔" پھر وہ ایک سسکیاں لیتا ہوا بولا۔ "یہاں بچن پر بوجھ بن کر پڑا ہوا ہوں۔"

بچن کا نام آتے ہی جگت کا خون جوش میں آ گیا۔ "ہنومان بچن کہاں ہے؟" جگت کی آواز کی کڑواہٹ ہنومان سمجھ گیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا جگت کا چہرہ غضب ناک ہو رہا تھا اتنے سال بعد یار ملا ہے اس کے باوجود جگت کے چہرے پر خوشی نہیں تھی۔ ہنومان چونک گیا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو بھاپ بن کر اڑ گئے۔

"جگت کیا بات ہے تم کس مصیبت میں ہو؟ اتنے غضبناک کیوں ہو رہے ہو؟"

"میں بچن سے حساب لینے آیا ہوں۔" دانت پیس کر جگت بولا۔ تب ہنومان ہوشیار ہو گیا نہیں، جگت صرف اسے ملنے نہیں آیا تھا۔

آس پاس کھڑے ہوئے ساتھیوں کی موجودگی کی جانب اشارہ کر کے بولا۔

"جگت چلو ہم اندر جائیں گے بچن کچھ دیر میں آ جائے گا۔" نیچے پڑی ہوئی ہنومان کی کھوڑی لینے کے لیے جگت جھکا مگر ہنومان نے اسے روک دیا۔

"نہیں..... جگت تمہارے شانوں کے سہارے چلنے کو جی چاہتا ہے۔ جیل کی خوراک کھا کر تم تگڑے ہو رہے ہو۔"

جگت کے سہارے چلتا ہوا ہنومان اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جگت کے شانے پر رکھا ہوا ہاتھ زور سے دبا لہٰذا اسے خیال آ گیا۔

"ارے جگت تمہارا جسم گرم ہے۔"

"جسم نہیں ہنومان میرا خون گرم ہے جب تک بچن سے حساب نہیں لوں گا ٹھنڈا نہیں ہوگا۔" کمرے میں داخل ہو کر ہنومان نے کہا۔ "جگت تم کو دیر ہو گئی بچن تمہارا حساب نہیں دے سکے گا۔" پھر اس نے دیکھا یہ سن کر جگت کی بھویں تن گئی تھیں۔ پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں۔ ہنومان نے مزید کہا۔

"تم دو مہینے لیٹ ہو گئے جگت تمہاری امانت ہم سنبھال نہیں سکے۔"

"ہنومان، تم ایسا بول رہے ہو۔" جگت کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ "تمہارے اعتماد پر میں نے جیل میں پانچ سال مزدوری کی اور باہر آ کر دیکھتا ہوں جسے دوست سمجھا تھا وہی بے ایمان نکلا۔"

اب ہنومان برداشت نہیں کر سکا۔ "جگت تم حد سے باہر جا رہے ہو۔ یہاں سے گئے ویسے جگت تم نہیں ہو۔" ہنومان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ "جاتے وقت تمہارے حصے کی رقم ہم نے تمہارے سپرد کی تب تم نے خود کہا تھا کہ مجھے لوٹ کی کمائی نہیں چاہیے۔" اتنا سن کر جگت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اسے روک کر ہنومان بولا۔ "پھر بھی ہم نے آج تک تمہاری رقم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ تم نے ہماری حالت جاننے کی پروا کی ہوتی تو تمہیں معلوم ہوتا کہ آخری چھ ماہ سے کس مصیبت میں جی رہے ہیں۔ پولیس ساری پارٹی کو صاف کرنے پر تل گئی ہے۔ ڈاکہ ڈالنا اب کافی مشکل ہو گیا ہے کھانے کی بات چھوڑو کارتوس بھی قرض سے لے رہے ہیں۔ مجبوراً تمہارے حصے کی رقم استعمال کی اور وہ

بھی میں نے اسے بہت سمجھایا تب بچن مانا۔ بولا جگت، اب تمہیں دوستی سے دشمن پیارا لگا ہے کہ اس طرح حساب لینے دوڑے آئے؟'' ہنومان ایک سانس میں بول گیا۔

جگت کے چہرے کی سرخی ختم ہوگئی۔ پھر بھی وہ غصے کو قابو میں نہ رکھ سکا اور ہنومان کے جبڑے پر چانٹا مار دیا۔ ''بے وقوف تم یہ سمجھتے ہو کہ میں پیسے کا حساب لینے آیا ہوں مجھے ایسا کم ظرف سمجھ لیا ہے؟ پھر پیارے دوست کو چانٹا مارتے ہوئے پچھتایا اور اس طرح گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہنومان، میں پیسے کا حساب نہیں آیا ویرو کی تلاش میں آیا ہوں پوری بات سے بغیر الٹی سیدھی ہانکنے لگتے ہو پھر مجھے کہتے ہو کہ میں پہلے جیسا نہیں رہا۔''

چانٹے کے جواب میں ہنومان نے شاید جگت کے جبڑے پر گھونسا مار دیا ہوگا مگر ویرو کی بات آئی تب اس کے ہاتھ کی مٹھی کھل گئی۔

''جگت..... ویرو کی تلاش۔ یہاں کیا ہوا ویرو کو؟'' اس نے جلدی سے پوچھا تب جگت نے ایک آہ بھری۔

''معلوم ہوتا ہے کہ بچن نے تمہیں خبر نہیں ہونے دی۔'' پھر آپ ہی آپ اس کے دانت پس گئے۔ ''ہنومان بچن ویرو کو اغوا کر کے لے گیا ہے میرے ساتھ اس نے غداری کی ہے۔ دوست مانا تھا اور دغاباز نکلا۔''

''جگت تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ تمہارے دماغ میں شیطان داخل ہو گیا ہے شاید۔'' ہنومان پھر ہوشیار ہو گیا۔ ''تم بچن پر ایسا الزام دھر رہے ہو جس نے ویرو کی سلامتی کی خاطر رات کی نیند حرام کی اور اس کی قدر اس طرح کر رہے ہو۔''

''ہنومان تم نہیں جانتے اس وقت میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ تین ماہ سے ویرو لاپتا ہے اور تم یہ کہہ رہے ہو کہ بچن اس کی سلامتی کی خاطر نیند حرام کر رہا ہے؟ بولو تمہیں خبر ہے کہ ویرو کو کوئی اغوا کر کے لے گیا ہے؟''

بچویشن کافی گرم ہو گئی۔ ہنومان پاگلوں کی طرح سن رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا بھاری لہجے میں اس نے کہا۔ ''جگت ویرو لاپتا ہے تمہیں کس نے کہا؟''

''میں خود اس کے گھر سے ہو آیا ہوں اور میری ماں کو رہائی سے پہلے یہ معلوم تھا۔'' جگت نے دانت پیس لیے۔ ''مگر ماں نے مجھ سے چھپایا کیونکہ اس عورت کی مجبوری کا خیال نہیں آیا۔ ویرو کے لیے میری محبت کا خیال نہیں کیا۔'' جگت کی آواز بھیگ گئی۔

''جگت تمہاری یہ بات سچ ہے کہ تین ماہ سے تم نے اس کی خبر نہیں لی۔'' ہنومان پچھتانے والے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''اس میں بے چارے بچن کا قصور نہیں ہے۔ پولیس کو پتا چل گیا کہ بچن ہر ماہ ویرو کے باپ کو پیچھے رقم بھیجنے آتا ہے لہٰذا بچن کو پھنسانے کے لیے جال بچھایا گیا۔ بچن بمشکل جان بچا سکا۔ وہ تو جان کی بازی لگا کر جانے کو تیار تھا مگر میں نے اسے روک لیا۔ تمہاری رہائی کا وقت ہو گیا تھا لہٰذا میں نے اسے خطرے میں نہیں پڑنے دیا۔''

جگت الجھن میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سچ کیا ہے؟ ہنومان جھوٹ بولے یہ وہ مان نہیں سکتا تھا اور خود وہ جو جانتا تھا وہ بھی جھوٹ نہیں ہو سکتا تھا۔

''ہنومان، بچن ویرو کو اغوا کرے یہ بات میں

کبھی نہ مانتا مگر خود ویرو کے باپ نے کہا کہ تمہاری رہائی سے پہلے بچن خود سے اٹھا لے گیا۔"

"اور تم نے مان لیا؟" ہنومان غصے سے بولا۔

"ویرو کا باپ لالچی ہے پولیس نے اسے لالچ دے کر گانٹھ لیا ہوگا اور اسے یہ بات پڑھائی۔ یہ اس طرح ہمیں آپس میں لڑانے کی ایک چال ہے جگت۔"

"ویرو کو اغوا کرنے کی اور کوئی شخص ہمت نہیں کر سکتا یہ تمہیں ماننا پڑے گا۔ ہنومان، میری رہائی کی خبر سن کر کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔" جگت رک گیا۔

اب اسے جو کچھ کہنا تھا وہ کہتے ہوئے زبان اٹک رہی تھی۔ ہچکچاتے ہوئے آخر اس نے کہا۔ "ممکن ہے ہنومان کہ بچن نے اپنی بے ایمانی تم سے چھپائی ہو۔" ہنومان سوچ میں ڈوب گیا لہٰذا اس نے دوسرا سوال کیا۔

"تمہیں بچن کے برتاؤ میں کچھ فرق محسوس ہوا آخری تین ماہ کے دوران۔"

ہنومان لرز گیا۔ خالی نظروں سے وہ جگت کو دیکھتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی عقل گم ہوگئی ہے جگت جواب کے انتظار میں تھا لہٰذا کہنا پڑا۔

"ہاں، ابھی یہ کچھ بے چین نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی رات کو نہیں لوٹتا۔" پھر ہنومان نے جلدی سے کہا۔ "مگر وہ تو پیسے ہتھیار اور پولیس سے بچاؤ کی فکر کی وجہ ہے۔"

"نہیں ہنومان......!" جگت نے اسے روک لیا۔

"پھر تو ضرور اس نے ویرو کو کسی جگہ رکھا ہوگا اچلا کی محبت نہ مل سکی اس کا انتقام مجھ سے لینا چاہتا ہوگا ویرو کی عزت لے کر پیاس بجھا رہا ہوگا۔"

جگت کا جوش بڑھتا جا رہا تھا آخری الفاظ اس نے دانت پیس کر ادا کیے تھے۔ "مگر میں بچن کو چھوڑوں گا نہیں اس کی جان لے کر اطمینان ہوگا، بے ایمان......دغاباز۔"

یہ الفاظ جگت کی زبان سے ادا ہو رہے تھے کہ عقب سے پھینکی ہوئی رائفل اس کے قدموں کے پاس آ گری۔ دونوں چونک گئے۔ بچن دروازے کے درمیان کھڑا تھا اس کے چہرے پر درد ابھر آیا تھا۔ آنکھوں سے غم جھلک رہا تھا۔

"لو جگت اٹھاؤ رائفل......اپنی خواہش پوری کرو ظالم تم نے قاتل الفاظ سے میرا دل چیر دیا ہے اب جسم بھی چیر ڈالو۔"

بچن کی اچانک آمد اور مضبوطی کے لیے جگت تیار نہیں تھا۔ وہ سناٹے میں کبھی بچن کو کبھی قریب پڑی ہوئی بندوق کو دیکھنے لگا۔ پھر رائفل ہاتھ میں لے کر برق سی پھرتی سے کھڑا ہو گیا ہنومان کی سانس اوپر ہو گئی۔ مگر بچن بے ڈر کھڑا رہا۔ دونوں کی آنکھیں ٹکرائیں۔ جگت کو بچن کی آنکھوں میں سچائی نظر آئی جرم کا ایک بھی نشان اس کی آنکھوں میں نہیں تھا۔ جگت الجھن میں پڑ گیا کیا کہنا؟ کیا کرنا؟ "بچن تم ہو گیا اس سے پہلے پوچھا۔

"بچن میں نے ہنومان سے جو کچھ کہا تم نے سنا؟" بچن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا اطمینان جگت کو بے چین کرنے لگا۔

"پھر بتاؤ تمہارا کیا جواب ہے میرا شک سچ ہے یا جھوٹ؟"

"جواب تو جگت تمہیں دینا ہے۔" بچن ذرا بھی حرکت کیے بغیر بولا۔ "اگر تمہیں اب بھی یہ یقین ہو کہ میں نے ویرو کو اغوا کیا ہے تو اس کا جواب رائفل کی گولی سے دو ورنہ......!" وہ رک گیا۔

جگت نے جلدی سے پوچھا "ورنہ کیا؟"
"اور اگر تمہیں مجھ پر اعتماد ہے تو پانچ سال بعد ملتے ہوئے یار کے جوش سے مجھے بانہوں میں بھر لے۔"
"نہیں، نہیں!" جگت نے پریشانی سے کہا۔
"میں بے وقوف ہوں میرا دماغ گھوم گیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے وہ قفل پھینک دی۔ "بچن! میں دشمنوں کی چال میں پھنس گیا تھا۔ غلط الزام کے لیے مجھے معاف کر دینا دوست۔" کہتا ہوا جگت دوڑ کر بچن سے لپٹ گیا۔ بہت دیر تک دونوں لپٹے رہے ہنومان نے تو جدا کیا۔
"جگت تمہارے برابر ہوشیار بھی کھڑا ہے۔"
تب جگت کو خیال آیا کہ تیسرا دوست بھی حاضر ہے۔ وہ ہوشیار سے بھی گلے ملا۔
"ہوشیار اچھا ہوا تم سب ایک ہو گئے۔" پھر افسوس کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے کرپال کی موت کی خبر جیل میں ملی تھی بے چارہ وہ بری طرح مارا گیا۔" پھر فوراً ہی بولا۔ "پھر بھی آخر تک ہمارے دوست نے بہادری سے مقابلہ کیا۔"
کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی پرانے ساتھیوں کے ملاپ کی خوشی جگت کو نہیں ہو سکی۔ ویرو کے خیال نے اسے پھر غمگین بنا دیا۔ بچن اس کی اداسی سمجھ گیا۔ "جگت ویرو کی تلاش میں، میں تمہارے ساتھ رہوں گا سب سے پہلے ہمیں اس کے باپ کو پکڑنا پڑے گا۔" پھر بچن دانت پیس کر بولا۔ "اس حرام زادے کی ہڈیاں میں توڑوں گا بدمعاش نے میرا نام لیا ہے۔"
"مگر بچن.....!" ہنومان نے لکڑی کی گھوڑی کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "اس کا فائدہ ہی ہوا اگر تیرا نام نہ لیا جاتا تو جگت ہمیں منہ دکھانے آتی جلدی نہ آتا۔"
جگت نے واپس لوٹنے کے لیے جلدی کی مگر تینوں ساتھیوں نے اسے کھانا کھا کر جانے پر زور دیا۔
"جگت، ویرو کے باپ کے پاس جانے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ ذرا اندھیرا ہونے دو پھر ہم چلیں گے۔"
"نہیں یہاں تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔ آج رات ہمیں جگہ بدلنی پڑے گی اس جگہ کی پولیس کو بو آ چکی ہے۔"
نصف شب کو جگت اور بچن ویرو کے میکے میں داخل ہوئے جگت نے بچن کو بہت سمجھایا کہ تم گاؤں سے باہر رہو، میں جا کر اس کے پیٹ سے سچ اگلواتا ہوں تمہارے لیے پولیس کا خطرہ ہے مگر بچن نہیں مانا۔
"جگت تم جوش میں آ کر اسے ختم کر دو گے تو تمہاری آزادی چھن جائے گی۔ میں ساتھ رہوں گا تو وہ کام مجھ سے ہو گا۔"
جگت نے دروازے کی زنجیر بڑی آہستگی سے کھڑکائی، پھر بچن کو اشارے سے سمجھایا کہ تم وار کرنے میں جلد بازی نہ کرنا۔ پہلے مجھے اس سے بات اگلوانی ہے یہ یاد رکھنا۔"
"بہتر.....!" بچن نے کہا ضرور لیکن اس کے ہاتھ ویرو کے باپ کو ختم کرنے کے لیے مچل رہے تھے۔ دو تین بار زنجیر کھڑکانے پر اندر سے جواب ملا۔
"کھولتا ہوں، کون ہے اس وقت؟" جگت نے بچن کو آنکھ مار دی۔ دونوں میں سے کسی نے جواب نہیں دیا کچھ دیر بعد کسی کی آہٹ سنائی دی۔ دروازے کے تھوڑے سے کھلے ہوئے حصے

سے فانوس کی روشنی دکھائی دی۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ دروازے کھلتے ہی دونوں چپ چاپ اندر داخل ہونے کے لیے تیار کھڑے تھے دروازے کے پاس آ کر آہٹ رک گئی۔ دونوں نے سانس روک لیے مگر اچانک کھلے ہوئے حصے سے روشنی باہر آئی اور بچن نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس حصے سے دو آنکھیں نظر آنے لگیں۔ وہ ویرو کے باپ کی آنکھیں تھیں۔ مگر وہ دونوں کو دیکھ کر ایسا خوفزدہ ہو گیا کہ اس کے ہاتھ سے فانوس گرنے کی آواز سنائی دی۔

"وہ ہمیں دیکھ گیا ہے اب دروازہ نہیں کھولے گا۔" بچن نے دانت پیس کر کہا۔ اس کی بات سچ تھی اندھیرے میں اندر جانے کی کھڑکھڑاہٹ دونوں نے سنی۔

"کوئی بات نہیں ہم عقب سے دیوار کود کر اندر داخل ہوں گے۔" جگت نے کہا اور بچن اس کے عقب میں سرکنے لگا۔ دونوں کو ڈر تھا کہ بوڑھا شور مچائے گا تو لوگ بیدار ہو جائیں گے۔ ہوشیاری سے دونوں دیوار پھلاند کر اندر کودے۔ ایک دھماکے سے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ بچن کا غصہ بڑھ گیا۔

"بے وقوف ہمارے سامنے آتے ہوئے گھبرا رہا ہے۔"

جگت نے کمرے کا دروازہ ہلاتے ہوئے دھمکی دی۔

"بوڑھے دروازہ کھول ورنہ مکان کو آگ لگا دوں گا اور تو زندہ جل مرے گا۔" دونوں نے بہت کوشش کی مگر دروازہ نہیں کھلا۔ جگت نے نقلی رحم لا کر کہا۔ "اگر تم ہمیں سچ بتا دو گے تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔" اس کا جواب بھی نہیں ملا تب بچن کا ضبط چھوٹ گیا۔

"وہ بدمعاش کھسک جانے کی فکر کر رہا ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ دروازے پر زور سے لات مارنے لگا اب جگت نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ دونوں کی مار سے پرانے دروازے دھماکے سے کھل گئے۔ دونوں اندھیرے کمرے میں جھپٹے بچن نے ٹارچ کی روشنی میں سب کونے دیکھ لیے۔ چارپائی خالی تھی۔ روشنی کی لکیر گھومتی ہوئی ایک جگہ رک گئی۔ دونوں کے لبوں سے "اوہ...." نکل گیا۔ ویرو کا باپ چھت سے لٹک رہا تھا اس کے حلق میں پگڑی کا پھندہ پھنسا ہوا تھا۔ چہرے پر روشنی ڈالی۔ ویرو کے باپ کی لمبی زبان نکل پڑی تھی۔ جگت نے آہ بھر لی۔

"اب یہ زبان بھی ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی، بے کار گیا موت سے ڈر کر نالائق نے خودکشی کر لی۔" لاش کو اسی حالت میں چھوڑ کر دونوں باہر نکل گئے۔ جگت کے ذہن میں لاش کی طرح ایک سوال لٹک رہا تھا۔

"اب......"

گاؤں سے باہر آنے تک دونوں خاموش رہے پھر اچانک جگت بولا۔

"اب ایک جگہ تلاش کرنا ہے۔ موہن سنگھ کے گھر......!"



"جگت کی ماں! نصف شب ہونے کو آئی۔ دروازے کی طرف نظریں جما کر کب تک بیٹھی رہو گی؟ اٹھو ذرا جسم کو آرام دینے کے لیے لیٹ جاؤ۔" موہن سنگھ نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا مگر ماں جی حرکت کیے بغیر بیٹھی رہیں۔ ان کی کھلی ہوئی آنکھیں دروازے پر جمی رہیں۔ رو رو کر ڈھلی

ہوئی آنکھوں کی پتلیاں بھی سفید نظر آ رہی تھیں۔ سوہن سنگھ کا دل رو دیا۔ بیٹے کے غم میں کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے انہوں نے جگت کے نانا کی جانب لاچار نظروں سے دیکھا جیسے سر سے التجا کر رہے ہوں کہ وہ بیٹی کو سمجھائیں..... منائیں۔

نانا گہری سوچ میں غرق سناٹے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سوہن سنگھ نے شانہ ہلایا تب چونک کر بولے "ہاں.....؟"

جگت کے باپو نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"اس طرح کب تک بیٹھے رہیں گے؟ ان کے دل کو سب سے زیادہ صدمہ ہوا ہے شاید برداشت نہیں کر سکیں گی۔"

نانا نے کھنکھارا، چارپائی سے کھڑے ہو کر جگت کی ماں کے قریب گئے اور ان کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"بیٹی مایا تم ذرا بہو کا خیال کرو اس کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی اس کا تمہیں خیال ہے؟ تمہیں تو اسے ہمت دینی چاہیے بیٹی۔"

ماں جی کے شانے کپکپائے ہونٹ لرز گئے۔ آنکھیں چکرانے لگیں اور حلق سے ایک سسکی باہر آ گئی۔ آنسو نہیں دکھائی دیے۔ پیشانی پر بندھی ہوئی پگڑی پر ہاتھ مار کر وہ بڑبڑائیں۔

"کس منہ سے ہمت دوں؟ کس ماں نے بیٹے کے گھر میں قدم رکھنے کی ممانعت کر دی میری زبان اس وقت کیوں نہ کٹ گئی؟"

نانا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "اب افسوس کرنے سے فائدہ کیا؟ غصے میں آ کر الٹا سیدھا بول دے تو اس سے بیٹا منہ پھیر لے گا؟" پھر بیٹی کا سر سینے میں دبا کر بولے۔ "گھر میں آنے کی اسے ممانعت کر دی پھر بھی وہ آ رہے اس انتظار میں تم جاگ رہی ہو کیونکہ تمہیں یقین ہے کہ جگت واپس لوٹے گا۔"

"نہیں باپو نہیں۔" ماں جی کی آواز سسکی کی وجہ سے رک گئی۔ پھر بمشکل آگے بولیں۔

"جیسا آپ کا ہزارہ ویسا میرا جگت، آپ نے ہزارہ کو ایک بار ممانعت کر دی یہ تو یاد ہوگا کہ جب تک آخری دشمن زندہ ہے اس وقت تک گھر کی چوکھٹ پر قدم نہ رکھنا۔ کتنے سال بیت گئے اس بات کو پھر بھی اب تک ہزارہ کے قدم دھرم پور کی جانب نہیں بڑھے ہیں۔" نانا کا دل چھلنی ہو گیا۔ پرانا زخم کھل گیا ہو ایسا دل میں درد ہونے لگا۔ ماں جی سانس لے کر بولیں۔

"بس..... اسی طرح میرا جگت ہے آخر جاٹ کا بچہ ہے ضد نہیں چھوڑے گا چاہے ماں کی جان چلی جائے۔" بولتے ہوئے ماں جی کی آنکھیں برسنے لگیں۔

کمرے میں بیٹھی ہوئی چندن نے جلدی سے دوپٹے سے آنکھیں خشک کیں اور پانی کا پیالہ بھر لائی ساس کے چہرے کے قریب پیالہ رکھ کر خاموش کھڑی رہی۔ نانا نے پیالا اٹھا کر ماں جی کے ہونٹوں سے لگایا۔

"لو..... دو گھونٹ پی لو۔ بہو کا مان رکھ لو ورنہ یہ بے چاری دل ہی دل میں بجھ جائے گی۔"

ماں جی نے آنکھیں اٹھا کر چندن کی جانب دیکھا۔ چندن نے آنکھوں پر پلکیں گرا لیں۔ اس کے تاثرات سے عاری چہرے پر نہ ہی سوگ کا پتا چلتا تھا نہ شکایت کا۔ ماں جی نے تھوڑا سا پانی پی کر حلق تر کیا۔

"بہو تمہاری بات مان کر اگر جگت سے صاف کہہ دیا ہوتا تو بیٹا اس طرح منہ پھیر کر نہ جاتا۔"

پھر آہ بھر کر بولیں۔ ''بیٹی! میں نے تمہاری بھلائی کی خاطر ایسا کیا مجھے کیا خبر تھی کہ میری یہ حرکت تم پر برے دن لائے گی۔''

چندن کور نے بمشکل آنسو روکے۔ بزرگوں کے مان کی وجہ سے دل کھول کر رو بھی نہیں سکتی تھی۔ ساس کی ہمت بندھاتی ہوئی بولی۔ ''اس میں تمہارا کیا قصور ماں جی، جہاں نصیب ہی پھوٹے ہوں وہاں سب الٹا ہوتا ہے۔''

''تم ساس بہو ضبط سے کام لو، میں سب ٹھیک کرلوں گا۔'' نانا بولے۔ ''دوپہر سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے جگت کے پیچھے جانے دو ہاتھ تھام کرا سے یہاں لے آتا ہوں۔''

''اس گھر میں تو اب وہ مر کر بھی نہیں آئے گا باپو جی، ایک بار تم نے اسے میرے سپرد کیا اب وہ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

''اس گھر میں نہ آتا ہو تو میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گا۔ میرا اجزا رہ تمہارے گھر رہتا ہے تو تمہارا جگت میرے گھر رہے گا۔ اس میں راتی بے چینی کس کام کی؟'' نانا نے کچھ غصے سے کہا۔

''ماں جی چپ ہوگئیں۔ پھر کچھ سوچ کر آہ بھرتی ہوئی بولیں۔ ''یہ بھی ناممکن ہے باپو جی۔''

''بابا تم اپنے باپ کو سمجھ کر بھی ایسی بات کررہی ہو؟''

''میں آپ کو سمجھتی ہوں تب ہی کہہ رہی ہوں کہ یہ آپ سے نہیں ہوسکے گا۔'' ماں جی مضبوط لہجے میں کہنے لگیں۔ نانا ہاتھ پھیلا کر کچھ کہنا چاہتے تھے اسی لیے ماں جی نے کہا۔ ''جگت ویرو کو لینے گیا ہے جہاں ہوئی وہاں سے لے آئے گا کیا آپ اسے ویرو کے ساتھ گھر میں آنے کی اجازت دیں گے؟ آپ سے ایسا ہوسکے گا؟''

نانا کا منہ کھل گیا۔ ذہن جلنے لگا۔ زبان پہ الفاظ سوکھ گئے۔ چندن بھی جھٹکے سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ماں جی نے ایسی بات کہہ دی تھی کہ نانا کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ تڑپ گئے اور خاموشی چھا گئی۔ ماں جی کا سوال نانا کے دل میں نشتر کی طرح چبھ گیا۔

''بولیں..... ایسا ہوسکتا ہے؟'' پھر دانت پیس کر کہنا چاہتی تھیں کہ ''نہیں ایسا کبھی نہیں ہوسکے گا دشمن کی بیاہتا، چندن کی سوت بن کر گھر میں قدم رکھے تو میرا بڑھاپا شرما جائے گا۔'' مگر وہ الفاظ لبوں تک آنے سے پہلے حلق میں لوٹ گئے۔ ہاتھ کی مٹھیاں مسل کر انہوں نے جنون کو سل دیا۔ کڑوا گھونٹ حلق سے اتار گئیں وقت کو بھانا تھا بات بدلنی تھیں۔

''مگر یہ سوال تو وہ عورت آئے تبھی ہی ہوگا۔''

نانا کو خیال نہیں تھا کہ جگت کی ماں پر الٹا اثر ہوگا۔ ماں جی آنکھیں پھیلا کر دیکھنے لگیں۔ ان کی نظروں میں شک جھلکنے لگا۔ ''کیا مطلب آپ نے ویرو کو.....!'' اس سے آگے ماں جی نہ بول سکیں۔ نانا درمیان میں کود پڑے۔

''کیا سمجھی ہو؟ مجھے اور لے کیا؟'' پھر بگڑتی ہوئی بازی سنبھالنے کی غرض سے بولے۔

''میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ ویرو کو کس نے اغوا کیا؟ کہاں گئی وہ واپس لوٹنے کی یا نہیں کون جانتا ہے؟'' پہلی بار نانا کی زبان پھسل گئی۔ دشمن کی عورت کا نام لے لیا مگر جوش میں ہوش نہیں رہا۔ ''ابھی ہمیں اس کی بحث کیوں کرنی چاہیے؟ جگت کو میں کہیں سے پکڑ لاؤں گا۔ تلاش کرکے گھر لے جاؤں گا۔''

چندن چپ نہ رہ سکی۔

"نانا، وہ جہاں گئے ہیں وہاں آپ نہ جائیں۔" نانا چونک گئے۔ ماں جی اور موہن سنگھ بھی اس کی بات سے خوفزدہ ہو گئے مگر چندن بولتی رہی۔

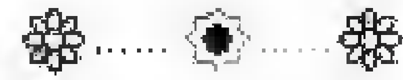
"ویرو کے باپ یا اس کے شوہر کے گھر آپ کس طرح جائیں گے؟"

"کس طرح سے کیا مطلب؟" نانا نے پوچھا مگر چندن کا مطلب سمجھ گئے۔

"آج تم لوگ من چاہے سوال کر کے مجھے کیوں الجھن میں ڈال رہے ہو بچی؟ سب مجھ پر چھوڑ دو۔" نانا اب بہت زیادہ غصے میں تھے۔ اس خیال سے ماں جی اور چندن خاموش ہو گئیں۔ نانا بات ختم کرنے کے لیے چارپائی پر لیٹ کر بولے۔

"صبح میں جاؤں گا مگر اس سے پہلے تم لوگ ناشتا کر لو گے بھوکے رہنے سے جگت واپس نہیں لوٹے گا سمجھے؟"

کوئی کچھ نہ بولا۔ ماں جی کا ہاتھ تھام کر چندن انہیں اندر والے کمرے میں لے گئی اور چارپائی پر لٹا دیا پھر خود اوپری منزل پر چلی گئی۔ دل کھول کر رونے کے لیے۔



نصف شب سے سحر ہونے تک جگت اور بچن موہن سنگھ کا پتا معلوم کرنے کے لیے بھٹکتے پھرے۔ ایسے وقت خاص با اعتماد لوگوں سے سوال کسی اور سے بات کرنی مناسب نہیں تھی۔ لہٰذا بھٹکنا بے کار گیا۔ جگت تلاش موقوف رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ویرو کے علاوہ دوسرا کوئی خیال اس کے ذہن میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ویرو کو غائب کر کے کسی نے اس سے زبردست انتقام لیا تھا مگر وہ کون ہو سکتا ہے؟

"بچن تمہارا کیا خیال ہے ویرو کو کس نے اغوا کیا ہوگا؟" گھوڑے روک کر اچانک جگت نے سوال کیا۔

بچن کے دل میں جگت کی اس حالت پر ہمدردی جاگی اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر بھی بولا۔

"پہلے میں سمجھ رہا تھا کہ اس کا شوہر بھگا کر لے گیا ہوگا مگر اس شخص میں اتنی طاقت نہیں تھی اور موہن سنگھ اسے لے جا کر کہاں رکھے گا؟ جس عورت نے اسے بدنام کیا اسے گھر میں لا کر مزید بدنامی کیوں اپنے سر لے؟"

"ہمارے ساتھ پرانی دشمنی کا انتقام لینے۔" جگت بولا۔

"اس کے علاوہ ویرو کا باپ مجھے الٹے راستے پر نہ چلاتا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ہم آپس میں لڑ مریں گے اور وہ بچ جائیں گے۔"

مگر بچن کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ اسے جو خوف تھا اس کا اظہار کیا۔

"ممکن ہے جگت، ویرو کا پتا نہ ملے پھر؟"

جگت کی آنکھیں جل اٹھیں۔

"بچن ایسا پھر تم مجھے باولا نہ کرو میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

پھر اس کی آواز اچانک بھیگ گئی۔

"ویرو کے بغیر زندہ رہنے کی خواہش کسے ہے بچن؟ اس کے تصور میں، میں نے پانچ سال کی سخت سزا کاٹی ہے۔ نہیں تو بہت پہلے چھوٹ کر تم سے مل گیا ہوتا میں کہیں سے بھی اس کا پتا حاصل کر کے رہوں گا۔"

بچن کو یقین ہو گیا کہ جگت کو اس راستے سے واپس لوٹایا نہیں جا سکتا۔

"اچھا دوست، جب تک تمہیں اطمینان نہیں ہوگا میں تمہارا ساتھ دیتا رہوں گا۔"

جگت نے محبت بھری نظروں سے بچن کو دیکھا، مگر دوسرے لمحے چہرہ بدل گیا۔

"نہیں بچن! یہ نہیں ہوگا میں کھلے عام ہر جگہ گھوم سکتا ہوں کوئی میری طرف انگلی نہیں اٹھا سکتا جبکہ تمہیں پولیس سے بچتے رہنا ہے اب یہ کام تم مجھے میرے طریقے سے کرنے دو۔" پھر بچن کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر جگت نے کہا۔

"میں تیری محبت سمجھتا ہوں دوست مگر یہ ایک دن کا سوال نہیں کیا معلوم ویرو کا پتا لینے میں کتنا وقت خراب ہو اور اگر تم ساتھ ہوئے تو تمہیں پولیس سے چھپنا پڑے گا۔"

جگت کی بات صحیح تھی بچن نے بھی محسوس کیا کہ اگر جگت اس کے ساتھ ہوا تو اس کا نام بھی پولیس کی ڈائری میں چڑھ جائے گا۔

"اچھا جگت، میں تمہارے ساتھ رہنے کی ضد نہیں کرتا مگر ایک عہد کرو کہ جذبات میں تم کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤ گے کہ تمہیں بمشکل ملی ہوئی آزادی پھر چھن جائے۔"

جگت الجھن میں پڑ گیا بچن نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

"جگت تمہارا گھر ہے ماں، باپو ہیں اور چندن بھائی جیسے رشتے کے لوگ ہیں کوئی قدم اٹھانے سے پیشتر ان کا خیال کرنا۔"

جگت نہ کہہ سکا کہ ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ دیا ہے۔ ممکن ہے بچن کو پتا چل گیا تو بازی بگڑ جائے گی۔ بچن سے لپٹ کر اس نے اتنا ہی کہا۔

"دوست، فکر نہ کرو یا اطمینان نہ دلاؤں تو برا نہ ماننا میں ویرو کے لیے تڑپ رہا ہوں وہ مل گئی تو اسلحہ سنبھالنے کا وقت نہیں آئے گا۔" پھر صبح کی کرن پھوٹتے ہی دونوں اپنے اپنے راستے ہولیے۔ جاتے ہوئے بچن نے کہا۔

"ضرورت محسوس کرو تو بے دھڑک کہلوا دینا۔ ابھی کچھ دن ہمارا مقام ناگ نگر میں قبرستان کے عقب میں ہے۔"

"بہتر۔" کہتے ہوئے ہاتھ بلند کر کے جگت نے اسے رخصت کیا اور گھوڑی آگے بڑھا دی۔ اکیلا پڑنے پر اس کے ذہن میں خون گردش کرنے لگا۔ موہن سنگھ نے گاؤں اور مکان چھوڑا اس میں ضرور کوئی اسرار ہے۔ اس نے دانت پیس لیے مگر وہ بے وقوف مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا؟

آخر ڈھلتی دوپہر کو موہن سنگھ کے گھر کا پتا مل گیا۔ وہ اپنی چاچی کے گاؤں میں ہی رہتا تھا۔ گاؤں کے سرے پر کوارٹر ٹائپ کا مکان تھا مکان میں کون کون رہتا ہے یہ جان کر جگت مایوس ہو گیا چاچی، بھتیجا اکیلے رہتے ہیں پھر ویرو کہاں ہوگی؟ موہن سنگھ سے بات نکالنی پڑے گی۔

وہ دروازے سے نصف فرلانگ کے فاصلے پر ایک درخت سے گھوڑی باندھ رہا تھا اسی لمحے موہن سنگھ کے مکان سے اس نے کسی عورت کو نکلتے دیکھا وہ چاچی کو پہچان گیا لہٰذا درخت کے تنے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا کیونکہ بڑھیا اگر دیکھ لیتی تو شور مچا دیتی۔ بڑھیا نے دروازے کو باہر سے تالا نہیں لگایا تو اسے یقین ہو گیا کہ موہن سنگھ اندر ہی ہے۔ چاچی دور نکل گئی پھر جگت نے آہستگی سے دروازہ دھکیلا۔

دروازہ کھل گیا موہن سنگھ برآمدے میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بوتل تھی اسے دیکھتے ہی جگت کی آنکھوں سے نفرت

بڑھنے لگی مگر ضبط سے کام لینا تھا اس خیال سے وہ پرسکون ہو گیا تھوڑی شراب اس کے پیٹ میں جائے پھر اندر داخل ہو گا۔ نشے کی وجہ سے کام جلدی ہو جائے گا اس نے بمشکل ضبط کیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد لات مار کر دوسرا دروازہ بھی کھول دیا۔

سامنے جگت کو کھڑا دیکھ کر موہن سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ہاتھ میں تھاما ہوا شراب کا جام لرزنے لگا۔ لاٹھی تھام کر وہ چارپائی سے اٹھنا چاہتا تھا مگر جگت کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر پھر بیٹھ گیا دروازہ بند کر کے جگت آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آ گیا۔ موہن سنگھ کا خوف دور کرنے کے لیے اس نے لاٹھی دیوار سے ٹکا دی۔ کچھ دیر تک دونوں ایک دوسرے کو بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہے۔ موہن سنگھ جگت کے ذہن کو سمجھنے کے لیے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جگت بمشکل دل کی آگ چھپائے ہوئے تھا موہن سنگھ بے چین ہو گیا۔ جگت جیل سے رہا ہو کر اتنی جلدی سامنے آئے گا یہ اس نے سوچا نہیں تھا مگر وہ کیوں آیا؟ پہلے جیسا خوف ناک نہیں معلوم ہوتا۔ سب کہتے ہیں کہ جیل سے رہا ہو کر وہ ٹھیک ہو گیا ہے۔

"موہن سنگھ میں ویرو کی خبر معلوم کرنے آیا ہوں۔" آخر جگت نے شروعات کی۔

ویرو کا نام سن کر موہن سنگھ خوفزدہ ہو گیا۔ مگر پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

آؤ......آؤ......!" کہہ کر اس نے چارپائی پر برابر بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا دل میں چاہتا تھا کہ جگت دور رہے اس میں ہی سلامتی ہے جگت بیٹھا نہیں تھا تب اسے اطمینان ہوا۔

"لو! ذرا تازے ہو جاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے شراب کی بوتل بڑھائی مگر اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا

جگت نے ہاتھ نہیں بڑھایا صرف سر انکار میں ہلا دیا۔ جسم سنبھالنے کی خاطر موہن سنگھ ایک سانس میں جام پی گیا۔

"تم جیل میں جا کر ٹھیک ہو گئے یہ بات سچ ہے۔" پھر شراب سے بھیگی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔

"یہ اچھا ہوا ہم باپ دادا کی دشمنی میں خواہ مخواہ زندگی ختم کر لیتے۔" یہ کہہ کر اس نے کن انکھیوں سے جگت کی ہانچلوں اور چہرے کے تاثرات دیکھے جگت سمجھ گیا کہ وہ ویرو کی بات ٹال رہا ہے۔ مگر جذبات میں آئے بغیر بولا۔

"میں ویرو کی خبر معلوم کرنے آیا ہوں۔"

"ہا......ہا......ہا......!" موہن سنگھ نے پھیکا سا قہقہہ لگایا۔

"تم بھول گئے جگت سنگھ تمہیں خبر نہیں کہ تمہارے ساتھ بھاگ جانے کے بعد وہ بھی پھر سے گھر نہیں آئی۔ بڑی ضدی عورت ہے۔" یہ کہہ کر وہ رکا۔ پھر نظر جھکا کر بولا۔

"اس کے باپ کے گھر جانا تھا۔"

"وہاں معلوم کر آیا۔" اس کی آواز میں ہلکا سا غصہ تھا۔ "اسے کسی نے اغوا کر لیا یہ اس کا باپ کہہ رہا تھا۔"

"پھر مجھے اس کی کہاں سے خبر ہو گی۔" موہن سنگھ نے بے پروائی دکھائی۔ شراب کا اثر ہو رہا تھا سر ہلا کر بولا۔

"جس کے ساتھ رشتہ نہ ہو اس کی فکر میں کیوں کروں......؟"

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

